A Brief History Of
Humankind

مصنف: یووال نوح ہراری
مترجم: سعید نقوی

SAPIENS

A Brief History of Humankind

بندہ بشر

انسان کا ماضی، حال اور مستقبل

مصنف: یووال نوح ہراری

مترجم: سعید نقوی

CITY BOOK POINT

Naveed Square. Urdu Bazar, Karachi

Ph # 021-32762483

E-mail: citybookurdubazaar@gmail.com

City Book Point

باذوق لوگوں کے لیے خوب صورت معیاری کتاب

بیاد

HASSAN DEEN

ادارہ City Book Point کا مقصد ایسی کتب کی اشاعت کرنا ہے جو تحقیق کے لحاظ سے اعلیٰ معیار کی ہوں۔ اس ادارے کے تحت جو کتب شائع ہوں گی اس کا مقصد کسی کی دل آزاری یا کسی کو نقصان پہنچانا نہیں بلکہ اشاعتی دنیا میں ایک نئی جدت پیدا کرنا ہے۔ جب کوئی مصنف کتاب لکھتا ہے تو اس میں اس کی اپنی تحقیق اور اپنے خیالات شامل ہوتے ہیں۔ ضروری نہیں کہ آپ اور ہمارا ادارہ مصنف کے خیالات اور تحقیق سے متفق ہوں۔ ہمارے ادارے کے پیش نظر صرف تحقیقی کتب کی اشاعت ہے۔

کتاب : ہندو بشر

مصنف : یووال نوح ہراری

تعداد : 500

سن اشاعت : 2019,

قیمت : 1200روپے

علیزہ سیدہ علی

کے نام

جو شاید پچاس سال بعد ہمیں بتا سکے کہ ہم کیا چاہتے ہیں

فہرست

حصہ چہارم...... سائنسی انقلاب

پس نوشت

O

تعارف

کتاب انسان کی بہترین دوست بھی ہے اور بدترین دشمن بھی۔ یہ واضح نہیں کہ اس بات کا تعین ظرف بادہ خوار سے ہوتا ہے، تلخی ءِ مے سے یا ساقی کے لطف و کرم سے۔ کم از کم استفادے کا بوجھ تو مصنف کے شانوں پر نہیں رہ جاتا۔ جو تحقیق کے بوجھ سے ویسے ہی ڈھلکے ہوتے ہیں۔ "سیپین، بشریات کی ایک مختصر تاریخ" یووال نوح ہراری کی کشید کی ہوئی ایک نایاب نان فکشن ہے۔ اس کے مطالعے سے آپ کے ذہن کے دریچے وا ہو سکتے ہیں، اور آپ چاہیں تو اسے حرام سمجھ کر اس سے اجتناب بھی برت سکتے ہیں۔ یہ آپ کی طلب اور پیاس پر منحصر ہے۔ کتابوں کے عادی تو اگر کچھ روز ناغہ کر لیں تو ان پر تشنج کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔

ابتدائے آفرینش سے تین دریافتوں نے ہماری تاریخ پر بہت اہم اثرات مرتب کیے ہیں: جوہری دریافت، ڈی این اے کی جینیات اور پھر کمپیوٹر کی باشری لسانیات۔ اب تک سائنسی فکر پر ڈاروِن کے فطری چناؤ کا نظریہ غالب تھا۔ لیکن جینیاتی انجینئرنگ کی اہمیت نے "ذہین ساخت" (Intelligent design) کو فطری چناؤ پر حاکمیت دے دی ہے۔ یہ ایک بہت اہم فقرہ ہے۔ ڈاروِن کے مخالفین ذہین ساخت کا سہرا اپنے عقائد کے مطابق کسی خدا کے سر باندھتے رہے ہیں۔ اب بشر خود قدرتی ساخت کو اپنی ضرورت و ذہانت کے اعتبار سے تبدیل کرنے کا اہل ہے۔ اہلیت کا یہ موڑ ہمارے بنیادی ایمان و سمجھ بوجھ پر ضرب لگاتا ہے۔ اور یہ تو محض ابتدا ہے۔ یہ کتاب سیپین لاکھوں برس پہلے انسان کی آمد سے اس موڑ تک پہنچنے کا سفر ہے۔ اس موڑ پر پہنچ جانا ایک بات ہے، اس سے آگے کا سفر ایک اور ہی کہانی ہے جسے ہراری ہمارے فکری اور تصوراتی رویوں کے لیے چھوڑ دیتا ہے۔ ترقی پذیر ممالک میں شاید اس بات کا ادراک نہ ہو کہ جینیاتی انجینئرنگ اور کمپیوٹر کا الحاق کیا گل کھلا رہا ہے۔ ایک دعویٰ جو اکثر دہرایا جا رہا ہے اور اس کتاب کی بھی زینت بنا ہے، وہ یہ کہ ۲۰۵۰ کے بعد ہم اس بات پر قادر ہوں گے کہ چاہیں تو انسان صرف حادثاتی موت مر سکے۔ اور یہ محض دعویٰ ہی نہیں ہے، کیچوے کی عمر میں چھ گنا اضافہ کیا جا چکا ہے۔ نینو ٹیکنالوجی کی مدد سے ایسے خونی ذرات پیدا کیے جا رہے ہیں جو جسم میں داخل ہو کر شریانوں کی رکاوٹ، جراثیم کا خاتمہ اور سرطان کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ دل، گردے اور پھیپھڑوں کے مشینی نعم البدل موجود ہیں۔ چوہے کی پشت پر انسانی کان اگایا گیا ہے۔ ہتھنی کے رحم میں قدیم میمتھ جانور کے ڈی این اے سے اسے دوبارہ زندہ کرنے کا ارادہ ہے۔ یہ تمام امثال اس کتاب میں معہ حوالوں کے موجود ہیں۔ جیوراسک پارک اب محض فکشن نہیں رہ

جائے گا۔ کتاب کا سب سے اہم باب سب سے آخری ہے کہ اب ہم یہاں تک تو آ گئے ہیں، اب یہاں سے کہاں جائیں۔ جس طرح جانوروں کی مختلف نسلیں ہوتی ہیں، مثلاً کتوں میں ایلسیشن، بل ڈاگ، پوڈل، جرمن شیپرڈ اسی طرح انسانوں کی بھی مختلف اقسام تھیں۔ نینڈرتھال، ہوموایرکٹس، ہوموسیپین وغیرہ۔ ہم یعنی ہوموسیپین سب کو مٹا کر اپنی نوع کی واحد مثال رہ گئے ہیں۔ اب اگر ہم خود اپنے سے بہتر قسم پیدا کر دیں، جس کی ذہانت فراواں ہو، یادداشت کامل ہو اور بڑھاپے کی علت سے مبرا ہو، جس کے دست و بازو بایونک ہوں تو یہ سپرمین ہماری نسل کی جگہ لے سکتا ہے۔ یہ ایک اندھی باؤلی کی جانب نابینا کا سفر ہے۔ ہریری ہمیں اس کتاب میں ٹھہر کر غور وفکر کی یاد دلاتا ہے کہیں فرینکسٹائن کا فکشن حقیقت نہ بن جائے۔

مغرب میں نان فکشن پر بہت کتابیں لکھی جاتی ہیں۔ ان میں عام دلچسپی کے سائنسی مضامین پر کتابیں ہیں۔ جو کتابیں قبولیت عام حاصل کرتی ہیں ان میں قدر مشترک بیانیہ کی سہولت، تحقیق اور پرلطف انداز بیان ہے۔
The emperor of all maladies, n intimate history of Gene, Welcome to the universe , Sapiens وغیرہ شامل ہیں۔ اپنے کامیاب ہم عصر لکھاریوں کی طرح ہریری کی تحریر میں اس کا وسیع مطالعہ ظاہر ہوتا ہے۔ اس موضوع پر دوسری ہزاروں کتابوں کے مقابلے میں اس کتاب کی کامیابی کی ایک وجہ شگفتہ انداز بیان ہے۔ یہی وصف جنوبی امریکہ میں فکشن لکھنے والوں کی کامیابی کی سند ثابت ہوا۔ نان فکشن کے خشک موضوعات کے لیے تحریر کی شگفتگی اور زیادہ اہم ہے کہ کڑوی گولی شہد میں لپٹی ہو تو زیادہ آرام سے نگلی جا سکتی ہے۔
کتاب کو بہت شعوری کوشش سے غیر متعصبانہ رکھا گیا ہے۔ تاریخ بشریات ایک خطرات سے پر میدان ہے۔ اس میں سلطنتیں، ریاستیں، زبانیں، مذاہب سب ہی زیر بحث آئے ہیں۔ لہٰذا امکان تھا کہ مصنف کا قدم کسی بھی بارودی سرنگ پر پڑ سکتا تھا۔ بہرحال اس شعوری کوشش میں جہاں لسانی، مذہبی و نسلی تعصب کے ضمن میں امریکیوں اور نازیوں کا تذکرہ ہے، وہاں فلسطینیوں کی بات نہیں ہوتی، جو ایک کھلے آسمان والے زندان میں اسی تعصب کے گزشتہ ستر برسوں سے قیدی ہیں۔ کتاب مدلل انداز میں لکھی گئی ہے۔ بات کو پراثر کرنے کے لیے مناسب تصاویر اور تشبیہات نے اسے اور موثر بنا دیا ہے۔ لیکن یہ موضوع اتنا وسیع ہے کہ اکثر ابواب میں تشنگی کا احساس رہ جاتا ہے۔

کتاب کا آغاز انسانی اہلیت میں انقلاب سے ہوتا ہے۔ وہ کیا وجہ تھی کہ اچانک تقریباً ستر ہزار سال پہلے ہماری ترقی کو مہمیز ملی۔ گو انسان پچیس لاکھ سالوں سے موجود رہا ہے، لیکن پہلے چوبیس لاکھ سالوں کی ترقی کا موازنہ آخری ستر ہزار برسوں سے نہیں کیا جا سکتا۔ اس کی وجہ ہماری اہلیت کی بیداری ہے۔ ہراری کے مطابق دوسرا اہم موڑ دس ہزار سال پہلے زرعی انقلاب کی شکل میں آیا جب گندم نے انسان کو اپنا غلام بنا لیا۔ انسان شکاری و متلاشی بود و باش چھوڑ کر گندم کی غلامی میں پالتو ہو گیا۔ تاریخ کے ساتھ سفر کرتے ہوئے ہراری نے سلطنتوں کے عروج و زوال پر بحث کی ہے، لسانیات کی کھوج میں نکلا ہے۔ اپنی کتاب میں وہ سفید فاموں کے تعصب، جبر اور توسیع پسندی کی تاریخ رقم کرتا ہے، تو ساتھ ہی چینیوں، ہندوستانیوں اور مسلمانوں کو پندرھویں صدی اور اس کے بعد خواب غفلت کا بھی طعنہ دیتا ہے۔
سیپین میں قوموں کے عروج و زوال کے معاملات جس طرح بیان ہوئے ہیں، اور تعصب و تنگ نظری

کے نقصانات کا جو تذکرہ ہے وہ ہماری ریاست کے لیے بالخصوص دلچسپی کا باعث ہونا چاہیے۔ ہمارے تمام منتخب نمائندوں کے لیے یہ کتاب لازمی مطالعہ قرار دیا جائے۔ اسے محض داخل نصاب کرنے سے کام نہیں بنے گا، کیوں کہ اس سے کچھ منتخب نمائندوں کے بچ نکلنے کا امکان ہے۔

انسان اس خلاقِ اعظم کی ناول کا سب سے پیچیدہ کردار ہے۔ اب یہ کردار خود اپنی ناول تخلیق کر رہا ہے۔ ہراری ہمیں خبردار کرتا ہے کہ نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں۔ یہ کتاب ایک لازمی مطالعہ ہے۔

○

تاریخ کا روزنامچہ

موجود سے پہلے کے سال

ساڑھے تیرہ ارب	مادہ اور توانائی نمودار ہوئے۔ طبیعات کا آغاز۔ جواہر اور سالمے بنے۔ کیمیا کی ابتدا
ساڑھے چار ارب	سیارے زمین کی پیدائش
تین اعشاریہ آٹھ ارب	حیات نمودار ہوئی۔ حیاتیات کا آغاز
ساٹھ لاکھ	انسانوں اور بوزنوں کے درمیان آخری جد مشترک
پچیس لاکھ	جنس (Genus) ہوموکا افریقہ میں ارتقا۔ پتھر کے اولین اوزار
بیس لاکھ	انسان افریقہ سے یورپ میں پھیل گئے۔ مختلف انواع انسانی کا ارتقا
پانچ لاکھ	نینڈرتھال کا یورپ اور مشرق وسطیٰ میں پھیلاؤ
تین لاکھ سال	آگ کا روزانہ استعمال
دو لاکھ سال	ہوموسیپین کا مشرقی افریقہ میں پھیلاؤ
ستر ہزار	ادراکی انقلاب۔ خیالی زبان کا آغاز
پینتالیس ہزار	سیپین آسٹریلیا میں بس گئے۔ آسٹریلیا کے حیوانی ماحول کا نابود ہونا
تیس ہزار	نینڈرتھال کا نابود ہونا
سولہ ہزار	سیپین امریکہ میں بس گئے۔ امریکی حیوانی ماحول کا نابود ہونا
تیرہ ہزار	ہوموفلوروسینسس (Homo Floresiensis) کا نابود ہونا۔ ہوموسیپین ہی واحد نوع انسانی رہ گئی
بارہ ہزار	زرعی انقلاب۔ حیوانات و نباتات کا پالنا۔ مستقل بستیاں
پانچ ہزار	پہلی مملکت، تحریر اور کرنسی۔ بہت سے خداؤں کے مذاہب
بیالیس سو پچاس	پہلی مملکت، سرگون کی پہلی اکاڈین مملکت
ڈھائی ہزار	سکوں کی ایجاد۔ ایک آفاقی کرنسی

	سلطنت فارس۔۔تمام عالم انسان کی بہتری کے لیے ایک آفاقی سیاسی نظام
	انڈیا میں بدھ مت۔۔یک آفاقی سچ تمام عالم انسان کو دکھ سے نجات دلاتا
دو ہزار	ہن سلطنت چین میں۔رومن سلطنت بحیرہ روم میں۔عیسائیت
چودہ سو	اسلام
پانچ سو	سائنسی انقلاب۔نوع انسان کا اپنی لاعلمی کا اعتراف۔غیر معمولی قوت اختیار کرنے کا آغاز۔یورپین امریکہ اور سمندروں کو فتح کرنے کا آغاز کرتے ہیں۔تمام سیارہ ایک واحد سیاسی اکھاڑا بن جاتا ہے۔سرمایہ داری کا آغاز
دو سو	صنعتی انقلاب۔خاندان اور معاشرے کی جگہ ریاست اور مارکیٹ۔نباتات وحیوانات کی بڑے پیمانے پر نابودگی
موجود	انسان سیارے کی حدود پھلانگتا ہے۔جوہری ہتھیار نوع انسانی کی بقا کو خطرے میں ڈالتے ہیں۔حیات زیادہ سے زیادہ فطری چناؤ کے بجائے ذہین ڈیزائن سے تراشی جاتی ہے
مستقبل	ذہین ڈیزائن زندگی کا بنیادی اصول بن جائے گا؟ ہوموسیپین کی جگہ مافوق الانسان ہستیاں لے لیتی ہیں

حصہ اوّل: ادراکی انقلاب

تصویر نمبرا

جنوبی فرانس کے شاوے پون ڈی آرک (Chauvet-Pont-d'Arc) غار میں تیس ہزار سال قدیم انسانی ہاتھ کا نقش۔
جیسے کوئی بتا رہا تھا کہ 'میں یہاں تھا'

ایک غیر اہم جانور

تقریباً ساڑھے تیرہ ارب سال قبل مادہ، توانائی، زمان، ورمکان اس دھماکے سے وجود میں آئے جسے بگ بینگ کہتے ہیں۔ ہماری کائنات کے ان بنیادی خدوخال کی کہانی کو طبیعات کہتے ہیں۔

اپنے نمود کے تین لاکھ سال بعد مادہ اور توانائی کے باہم ملاپ سے پیچیدہ اجزا یعنی جوہر تشکیل پانے لگے، جنہوں نے مل کر سالموں کو تشکیل کیا۔ جواہر، سالمات اور ان کے باہم روابط کو کیمیا کہا جاتا ہے۔

تقریباً 3.8 ارب سال پہلے، زمین نامی سیارے پر کچھ سالموں نے مل کر زیادہ بڑے اور پیچیدہ ڈھانچے وضع کیے، جنہیں اجسام کہا گیا۔ اجسام کے علم کو حیاتیات کہتے ہیں۔

تقریباً ستر ہزار سال قبل ہوموسیپین کے اجسام نے مل کر زیادہ مفصل نظام وضع کیے، جنہیں ثقافت کہا گیا۔ انہی انسانی ثقافتوں کی بالیدگی سے تاریخ مرتب ہوئی۔

تین اہم انقلابات نے تاریخ کا راستہ متعین کیا۔ تقریباً ستر ہزار سال قبل ادراکی انقلاب نے تاریخ کا آغاز کیا۔ پھر بارہ ہزار سال پہلے زرعی انقلاب سے تاریخ کو مہمیز ملی۔ سائنسی انقلاب جو محض پانچ سو سال قبل ہی شروع ہوا، ممکن ہے تاریخ کو ختم کر کے کچھ بہت مختلف شروع کر دے۔ یہ کتاب ان تین انقلابات کا انسانوں اور اس کے مصاحب حیوانوں پر اثرات کا بیانیہ ہے۔

تاریخ کی ابتدا سے بہت پہلے بھی انسان موجود تھا۔ جدید انسان کی مانند حیوانات بھی تقریباً پچیس لاکھ سال پہلے نمودار ہوئے۔ لیکن ان گنت نسلوں تک اسی مشترکہ زمین پر یہ دوسری اقسام کی حیات سے زیادہ ممتاز نہیں تھے۔

اگر آپ بیس لاکھ سال پہلے افریقہ کی سیر کو نکلتے، تو شاید آپ کو انسانوں میں وہی مانوس خصوصیات ملتیں: فکرمند مائیں اپنے بچوں کو لپٹائے ہوئے، بے فکر بچوں کے مٹی میں کھیلتے گروہ، سماجی پابندیوں سے الجھتے مزاج دار نوجوان، اور عاجز بزرگ جن کی بس یہی خواہش ہوتی کہ انہیں تنہا چھوڑ دیا جائے، سینہ کوبی مردانگی جو مقامی حسینہ کو متاثر کرنے کے لیے بے چین تھی، اور دانا بوڑھی مائیں جو یہ سب پہلے بھی دیکھ چکی تھیں۔ یہ قدیم انسان بھی محبت کرتا، کھیل کود میں مصروف ہوتا، قریبی رفاقتیں قائم کرتا اور رتبے و طاقت کے لیے پنجہ آزمائی کرتا۔ لیکن یہ رویے تو بن مانس، لنگور اور ہاتھیوں میں بھی عام تھے۔ انسانوں میں کوئی خاص بات نہیں تھی۔ اس وقت کوئی بھی، خاص طور پر انسان یہ نہیں جانتا تھا کہ ایک دن اس کی آل میں سے کوئی چاند پر چہل قدمی کرے گا، جوہر کو توڑے گا، جینیاتی کوڈ کی

گرہ کھولے گا اور تاریخ کی کتابیں تصنیف کرے گا۔ قبل از تاریخ انسان کے بارے میں جاننے کی سب سے اہم بات یہ ہے کہ وہ بھی غیر اہم جانوروں کی مانند تھا، جس کا اپنے ماحول پر بوزنوں، جگنوؤں یا جیلی فش سے کچھ زیادہ اثر نہیں

حیاتیات دان اجسام کو دو اسپیسی میں تقسیم کرتے ہیں۔ وہ تمام جانور جو ایک دوسرے سے جنسی عمل کے ذریعے افزائش نسل کرتے ہیں، وہ سب ایک ہی اسپیسی میں شامل ہیں۔ گھوڑوں اور گدھوں کا مشترکہ جد بہت زیادہ پرانا نہیں، اور ان کی جسمانی ہیئت بھی بہت مماثل ہے۔ لیکن وہ ایک دوسرے کے لیے کوئی جنسی میلان نہیں رکھتے۔ اگر انہیں اکسایا جائے تو وہ جفتی کر لیں گے، لیکن ان کی اولاد جو خچر کہلاتی ہے، بانجھ پیدا ہوگی۔ یوں گدھے کے ڈی این اے کے تغیرات کبھی بھی گھوڑے میں نمودار نہیں ہوتے، اور نہ گھوڑے کے گدھے میں۔ اسی لیے جانوروں کی ان دو اقسام کو مختلف اسپیسی سمجھا جاتا ہے، جو اپنے مختلف ارتقائی راستوں پر گامزن ہیں۔ اس کے مقابلے میں ایک بل ڈاگ اور اسپینیل کتے بہت مختلف لگتے ہیں، لیکن ان کا تعلق ایک ہی اسپیسی سے ہے اور ان کا ڈی این اے ذخیرہ مشترکہ ہے۔ وہ بخوشی آپس میں جنسی ملاپ کرتے ہیں، اور ان کی اولادیں بھی دوسرے کتوں سے جفتی کر کے افزائش پر قادر ہوتی ہیں۔

وہ اسپیسی جن کا جد مشترک ہو انہیں ایک ہی گروہ میں رکھا جاتا ہے جسے جینس (Genus) کہتے ہیں (جمع ہے جنزا، Genera)۔ شیر، چیتے، تیندوے، باگھ مختلف اسپیسی ہیں جن کا ایک ہی جینس ہے، پینتھیرا (Panthera)۔ حیاتیات دان اجسام کو دو حصوں پر مشتمل لاطینی نام دیتے ہیں، پہلے جینس پھر اسپیسی۔ مثلاً شیر کو پینتھیرا لیو (Panthera Leo) کہتے ہیں۔ اسپیسی لیو، جس کا جینس پینتھیرا ہے۔ اس کتاب کا ہر قاری امید ہے کہ ہوموسیپین ہے۔ اسپیسی سیپین (ذہن رکھنے والے) اور جینس ہومو (انسان)۔

پہلے جنزا کو جمع کر کے خاندان بنائے جاتے ہیں، مثلاً بلی (شیر، چیتا، گھریلو بلی)، کتا (بھیڑیا، لومڑی، گیدڑ) اور ہاتھی (ہاتھی، فیل پیکر میسٹوڈون)۔ ایک خاندان کے تمام اراکین کے آبائی ماں یا باپ مشترکہ ہوتے ہیں۔ مثلاً بلی کے خاندان کے تمام اراکین، پالتو بلی کے چھوٹے بچے سے لے کر انتہائی خونخوار شیر تک ایک جد مشترک رکھتے ہیں، جو تقریباً پچیس لاکھ سال پہلے پایا جاتا تھا۔

ہوموسیپین کا تعلق بھی ایک ہی خاندان سے ہے۔ یہ عام حقیقت تاریخ کا سب سے پوشیدہ راز ہوا کرتا تھا۔ ایک عرصے تک انسان اپنے آپ کو دوسرے جانوروں سے علیحدہ رکھنے کی کوشش کرتا رہا، خاندان سے بچھڑا یتیم، جس کے کوئی بہن بھائی یا عم زاد نہ ہوں۔ اور زیادہ اہم یہ کہ بغیر جدی آبا کے۔ لیکن یہ بات درست نہیں، آپ اسے پسند کریں یا نہ کریں، ہم ایک بہت بڑے اور پرشور خاندان کے افراد ہیں۔ ہمارے قریب ترین زندہ عزیزوں میں بن مانس، گوریلے اور بوزنے شامل ہیں۔ محض ساٹھ لاکھ سال پہلے ایک واحد مادہ بن مانس کی دو بیٹیاں تھیں، ایک تمام بن مانسوں کی جدا ماں بنی، جب کہ دوسری ہماری جدی مادر ہوئی۔

پوشیدہ اسرار

ہوموسیپین نے ایک اس سے بھی زیادہ پریشان کن راز پوشیدہ رکھا ہے، نہ صرف ہمارے جنگلی عم زاد ہیں، بلکہ ایک زمانے میں بہت سے جنگلی مادرزاد بھی تھے۔ ہمیں عادت ہوگئی ہے کہ ہم اپنے آپ کو صرف انسان ہی تصور کریں، کیوں کہ گزشتہ دس ہزار سال سے ہماری اسپیسی میں صرف انسانی اسپیسی ہی رہی ہے۔ لیکن لفظ انسان کے اصل معنی ہیں ' وہ جانور جن کا تعلق جینس ہوموسے ہے"۔ اور اس جینس میں ہوموسیپین کے علاوہ بہت سی دوسری اسپیسی بھی ہوا کرتی تھیں۔ پھر جیسا کہ ہم اس کتاب کے آخری باب میں دیکھیں گے، ہوسکتا ہے کہ مستقبل میں جو بہت زیادہ دور نہیں، ہوسکتا ہے کہ ہمیں دوبارہ غیر سیپین انسانوں کو برداشت کرنا پڑے۔ اس نکتے کو سمجھانے کے لیے، میں لفظ سیپین عموماً اس اسپیسی ہوموسیپین کے تمام اراکین کے لیے استعمال کروں گا۔ جب کہ اصطلاح "انسان"، اس جینس ہوموکے صرف موجودہ اراکین کے لیے استعمال کروں گا۔

انسان سب سے پہلے مشرقی افریقہ میں بن مانسوں کے ایک اولین جینس آسٹریلوپیتھیکس (Australopithecus)، یعنی جنوبی بن مانس سے پچیس لاکھ سال پہلے پیدا ہوا۔ تقریباً بیس لاکھ سال پہلے ان میں سے چند خواتین وحضرات اپنا ملک چھوڑ کر شمالی افریقہ، یورپ اور ایشیا کے وسیع میدانوں میں بسنے کے لیے عازم سفر ہوئے۔ کیوں کہ شمالی یورپ کے برفیلے جنگلات میں زندگی کے لیے انڈونیشیا کے گرم جنگلات سے بہت مختلف اوصاف کی ضرورت تھی، لہٰذا انسانی آبادیوں نے مختلف انداز میں بالیدگی پائی۔ نتیجے میں کئی مختلف اسپیسی نمودار ہوئیں، جن میں سے ہر ایک کے لیے سائنسدانوں نے ایک انوکھا لاطینی نام تجویز کیا۔

ہمارے مادرزاد، تصوراتی تصاویر بائیں سے مشرقی افریقہ کے ہوموروڈولفینسس (Homo Rudolfensis)، مشرقی ایشیا کے ہومواریکٹس (Homo Erectus) اور ہومونینڈرتھیلنسس (Homo Neanderthalensis) یورپ اور مغربی ایشیا سے۔ یہ سب بھی انسان تھے۔

یورپ اور غربی ایشیا کے انسانوں کو ہومونینڈرتھالینسس (نینڈرتھال وادی کے انسان)، یا عام طور پر صرف نینڈرتھال کہا جاتا ہے۔ نینڈرتھال جو موجودہ سیپین سے زیادہ جسیم اور بھاری بھرکم تھے، غربی یوریشیائی برفیلے موسم کے لیے زیادہ موزوں تھے۔ جب کہ ایشیا کے بیشتر علاقے ہومواریکٹس سے آباد تھے، "سیدھا آدمی" جو وہاں تقریباً بیس لاکھ سال تک زندہ رہا، یہ سب سے زیادہ پائیدار انسانی اسپیسی ثابت ہوئی۔ یہ ریکارڈ شاید خود ہماری اپنی

اسپیسی بھی نہ توڑ پائے۔ یہ بات مشکوک ہے کہ ہوموسیپین ہزار سال بعد زندہ ہوں گے، بیس لاکھ سال ہماری اوقات سے زیادہ ہیں۔

ہوموسولوینسس (Homo Soloensis) انڈونیشیا کے جزائر جاوا میں رہتے تھے۔ سولویعنی وادی کا انسان، گرم آب وہوا ان کے لیے موافق تھی۔ انڈونیشیا کے ایک اور چھوٹے جزیرے فلورس میں انسان ایک پستہ قدی کے دور سے گزرے۔ ابتدا میں انسان اس وقت فلورس پہنچے جب سطح سمندر بہت نیچی تھی، اور جزیرہ مرکزی زمین سے باآسانی قابل دسترس تھا۔ جب سطح سمندر دوبارہ بلند ہوئی تو کچھ لوگ جزیرے پر ہی مقید رہ گئے جہاں وسائل کی کمی تھی۔ جسیم افراد جنھیں زیادہ خوراک کی ضرورت تھی، پہلے ہلاک ہوئے۔ پستہ قد افراد نسبتا بہتر رہے۔ نسلیں گزرنے کے ساتھ فلورس کے باشندے پستہ قد ہو گئے۔ یہ مخصوص اسپیسی جسے سائنسدانوں نے ہومو فلوریئنسس کہا، محض ایک گز گد حاصل کر پاتے، اوران کا وزن پچیس کلو سے زیادہ نہیں بڑھتا۔ پھر بھی وہ پتھر کے اوزار بنانے میں کامیاب رہے، بلکہ کبھی تو وہ جزیرے کا ہاتھی بھی شکار کر لیتے، پھر بھی انصاف کی بات تو یہ ہے کہ وہ ہاتھی بھی پستہ قد ہی رہے۔

2010 میں ایک اور گمشدہ ماں جایا دریافت ہوا، جب سائبیریا کے ڈینی سوواغار کی کھدائی میں سائنس دانوں کو ایک فوسل (fossil) انگلی ملی۔ جینیاتی تحقیق سے انکشاف ہوا کہ یہ انگلی ایک ہنوز لاعلم انسانی اسپیسی کی ہے، اسے ہوموڈینی سووا کا نام دیا گیا۔ کون کہہ سکتا ہے کہ ہمارے کتنے اور گمشدہ عزیز دوسرے غاروں اور سرزمینوں میں دریافت کے منتظر ہیں۔

جب انسان ایشیا اور یورپ میں ارتقائی منازل طے کر رہا تھا، تو مشرقی افریقہ میں بھی ارتقا رک نہیں گیا تھا۔ انسانیت کا گہوارہ کئی نئی اسپیسیز کی پرورش کرتا رہا، جیسے ہوموروڈولفینسس (Homo Rudolfesis)، یعنی جھیل رڈولف کا آدمی۔ ہوموارگاسٹر (Homo Ergaster) یعنی کارکن انسان اور پھر ہماری اپنی اسپیسی جسے ہم نے بے شرمی سے ہوموسیپین کا نام دیا، ذہین آدمی۔

ان میں سے کچھ اسپیسی کے اراکین بہت جسیم تھے، تو کئی پستہ قد۔ کچھ بہت دلاور شکاری تھے تو دوسرے مسکین پودے جمع کرتے رہے۔ ان میں سے کچھ محض ایک ہی جزیرے پر رہتے تو بہت سے دوسرے براعظموں میں گھومتے رہے۔ لیکن ان سب کا تعلق جینس ہوموسے تھا اور یہ سب ہی انسان تھے۔

یہ ایک عام غلطی ہے کہ ان تمام اسپیسی کو ایک سیدھی ارتقائی لکیر کی صورت دیکھا جائے۔ ارگاسٹر، پھر ارکٹس سے نینڈرتھال پیدا ہوئے اور نینڈرتھال سے ہم۔ اس سیدھی لکیر سے یہ غلط فہمی جنم لیتی ہے کہ کسی ایک وقت میں زمین پر فقط ایک ہی قسم کے انسان زندہ تھے، اور تمام پرانی اسپیسی محض ہمارے پرانے نمونہ تھے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ کوئی بیس لاکھ سال پہلے سے لے کر دس ہزار سال قبل تک یہ زمین مختلف انسانی اسپیسی کی بیک وقت میزبان تھی۔ اور کیوں نہیں؟ آج لومڑیوں، ریچھ اور خنزیر کی بہت سی اسپیسی موجود نہیں کیا؟ دس لاکھ سال پہلے زمین پر انسانوں کی کم از کم چھ مختلف اسپیسی موجود تھیں۔ اب ہمارا اکیلے رہ جانا عجیب بات ہے۔ ماضی میں مختلف اسپیسی کے انسانوں کی موجودگی عجیب نہیں تھی، اور یہ شاید ہمارے جرائم کا ثبوت بھی ہے۔ جیسا کہ ہم جلد ہی دیکھیں گے، ہم انسانوں کے پاس اپنے مادرزادوں کو بھلادینے کی وجہ بھی ہے۔

تفکر کی قیمت

بہت مختلف ہونے کے باوجود تمام انسانی اسپیسی میں بہت سی خصوصیات مشترک ہیں۔ دوسرے جانوروں کے مقابلے میں انسانوں کے دماغ غیر معمولی طور پر بڑے ہیں۔ ساٹھ کلوگرام کے پستانیے جانوروں میں اوسطاً دوسو کیوبک سینٹی میٹر کا دماغ ہوتا ہے۔ جدید انسانوں کے دماغ کا اوسط وزن بارہ سے چودہ سو کیوبک سینٹی میٹر ہے۔ نینڈرتھال کے دماغ تو اس سے بھی زیادہ بڑے تھے۔

یہ تو ایک واضح دماغی بات ہے کہ ارتقا بڑے دماغوں کو منتخب کرے گا۔ ہم اپنی ذہانت پر اس قدر اتراتے ہیں کہ ہمارے خیال میں جہاں تک دماغی قوت کا تعلق ہے، تو جتنی زیادہ اتنا اچھا۔ لیکن اگر یہ درست ہوتا تو بلی کی نسل سے بھی ایسی اولادیں پیدا ہوتیں جو الجبرا حل کرسکتیں، اور مینڈکوں نے اب تک خود اپنا خلائی پروگرام شروع کردیا ہوتا، آخر بڑے دماغ حیوانی دنیا میں اتنے کمیاب کیوں ہیں؟

حقیقت یہ ہے کہ ایک بڑا دماغ جسم پر ایک بوجھ ہوتا ہے۔ اسے لے کر پھرنا، خاص طور پر اس بڑی کھوپڑی میں آسان نہیں۔ پھر اسے خوراک فراہم کرنا اور بھی دشوار ہے۔ ہوموسیپین میں دماغ جسمانی وزن کا بس دو یا تین فیصد ہوتا ہے، لیکن جب باقی جسم آرام کررہا ہوتو یہ توانائی کا پچیس فیصد استعمال کررہا ہوتا ہے۔ اس کے مقابلے میں بن مانس آرام کے وقت توانائی کا محض آٹھ فیصد استعمال کرتے ہیں۔ قدیم انسانوں نے اپنے بڑے دماغوں کی قیمت دو طریقوں سے ادا کی۔ پہلے تو یہ کہ انہوں نے اپنا بیشتر وقت غذا کی تلاش میں گزارا۔ دوسرے یہ کہ ان کے عضلات سکڑ گئے۔ جیسے کوئی حکومت اپنے وسائل دماغ سے منتقل کر کے تعلیم پر خرچ کررہی ہو۔ اسی طرح انسانوں نے اپنی توانائی عضلات سے نکال کر اعصابی خلیوں میں منتقل کردی۔ یہ بات یقینی نہیں ہے کہ چراگاہوں میں زندہ رہنے کی یہ کوئی بہترین حکمت عملی تھی۔ ایک بن مانس کسی انسان سے بحث میں تو نہیں جیت سکتا، لیکن بن مانس انسان کو کپڑے کی گڑیا کی مانند چیر پھاڑ ضرور سکتا ہے۔

آج ہمارے بڑے دماغ اپنی قیمت چکا دیتے ہیں، کیوں کہ ہم وہ کاریں اور بندوقیں بنالیتے ہیں جو بن مانس سے زیادہ تیز رفتار ہیں، اور بجائے کشتی لڑنے کے ہم اسے ایک محفوظ فاصلے سے گولی مار سکتے ہیں۔ لیکن کاریں اور بندوقیں تو جدید ایجادیں ہیں۔ انسانی دماغ میں اعصابی خلیے مسلسل بڑھتے ہی رہے لیکن محض چند سنگی چاقو اور نوکدار چھڑیوں کے سوا انسان کے پاس دکھانے کو کچھ نہیں تھا۔ تو پھر وہ کیا تھا کہ جس نے ان بیس لاکھ سالوں میں انسانی دماغ کو یہ زبردست نشوونما بخشی، ایمانداری کی بات یہ ہے کہ ہمیں علم نہیں۔

انسانوں کی ایک اور یکتا خصوصیت یہ ہے کہ وہ دو پاؤں پر سیدھا چلتے ہیں۔ کھڑے ہوکر گھاس کے میدانوں میں شکار اور دشمن کا بہتر جائزہ لیا جاسکتا ہے۔ اور بازو جو چلنے کے لیے درکار نہ ہوں، دوسرے کاموں کے لیے استعمال کیے جاسکتے ہیں، مثلاً پتھر پھینکنے یا متوجہ کرنے کے لیے۔ جتنا ان ہاتھوں کا استعمال بڑھتا گیا، اتنا ہی ان ہاتھوں کے مالکان کی کامیابی بڑھتی گئی۔ یوں ارتقائی دباؤ سے ہتھیلیوں اور انگلیوں میں رگیں اور نفیس عضلات جمع ہوگئے۔ جن کے نتیجے میں انسان اپنے ہاتھوں سے بہت باریک کام انجام دے سکتا ہے۔ خاص طور پر وہ بہت معیاری اوزار بنا اور استعمال کرسکتا ہے۔ اوزاروں کی پیداوار کی ابتدائی مثال ہمیں ڈھائی لاکھ سال پہلے ملتی ہے۔

اوزاروں کی تیاری اور استعمال ہی وہ معیار ہے جس سے ماہرین بشریات قدیم انسانوں کو شناخت کرتے ہیں۔

لیکن سیدھا چلنے کے نقصانات بھی ہیں۔ ہمارے اجداد کے ڈھانچے لاکھوں سال سے ایسے سانچے میں ڈھلے تھے جو چاروں پاؤں پر چلنے، اور چھوٹی کھوپڑی کے لیے موزوں تھے۔ سیدھا کھڑے ہونا اتنا آسان نہیں تھا، انسانی جسم کو ایک بڑی کھوپڑی کو سہارا دینا پڑا۔ اپنی بلند نگاہی اور کارگر ہاتھوں کے لیے نسل انسانی کو کمر کے درد اور اکڑی گردن جھیلنی پڑی۔

عورتوں نے مزید نقصان اٹھایا۔ سیدھا کھڑے ہونے کے لیے پتلے کولہے درکار تھے، جس سے زچگی کا درہ تنگ ہو گیا۔ اور یہ ایک ایسے وقت کہ جب نوزائیدہ بڑے سے بڑے ہو رہے تھے۔ انسانی عورتوں کے لیے دوران زچگی موت ایک بڑا خطرہ بن گئی۔ وہ عورتیں جن کے ہاں بچے قبل از وقت پیدا ہو گئے، جب کہ بچے کا دماغ ابھی نسبتاً چھوٹا اور نرم تھا، وہ بہتر رہیں، اور زندہ بچ کر انہوں نے مزید بچوں کو جنم دیا۔ یوں فطری چناؤ نے بچوں کے جلدی پیدا ہونے کو ترجیح دی۔ یوں یقیناً دوسرے جانوروں کے مقابلے میں انسان جلدی اور قبل از وقت پیدا ہو جاتے ہیں جب کہ ان کے اہم جسمانی نظام ابھی نامکمل ہی ہوتے ہیں۔ گھوڑے کا بچہ پیدا ہونے کے تھوڑی دیر بعد بھاگ سکتا ہے۔ بلی کا بچہ محض چند ہفتوں میں ہی اپنی ماں سے علیحدہ ہو کر اپنی خوراک تلاش کرتا ہے۔ لیکن انسانی بچے بے بس ہوتے ہیں۔ وہ کئی سالوں تک اپنی غذا، تحفظ اور تربیت کے لیے اپنے بزرگوں پر انحصار کرتے ہیں۔

اس حقیقت نے نسل انسانی کی غیر معمولی سماجی اہلیت، اور اس کے منفرد سماجی مسائل کو جنم دیا۔ اکیلی مائیں بمشکل اتنی غذا اکٹھی کر پاتیں جو خود ان کے اور ان کی اولاد کے لیے کافی ہو، جب کہ طلب گار بچے تعاقب میں ہوں۔ بچوں کی نشو و نما کے لیے خاندان کے دوسرے افراد یا پڑوسیوں کی مستقل مدد درکار ہوتی۔ ایک انسان کی پرورش کے لیے ایک قبیلہ درکار تھا۔ ارتقا نے ان کی طرف داری کی جو مضبوط سماجی رشتے استوار کرنے کے قابل تھے۔ مزید یہ کہ کیوں کہ انسانی بچہ تیار پیدا نہیں ہوتا ہے، تو اسے دوسرے جانوروں کے مقابلے میں زیادہ تعلیم اور سماجی شعور درکار ہوتا ہے۔ زیادہ تر پستانیے رحم سے ایسے برآمد ہوتے ہیں جیسے بھٹی سے نکلے مٹی کے برتن۔ انہیں دوبارہ شکل دینے کی کوشش سے وہ تڑخ سکتے ہیں یا ٹوٹ سکتے ہیں۔ انسان رحم سے ایسے نکلتا ہے جیسے بھٹی سے پگھلا شیشہ۔ اسے گھمایا جا سکتا ہے، کھینچا جا سکتا ہے، اور حیرت انگیز آزادی سے اس کی شکل سنواری جا سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج ہم اپنے بچوں کو تعلیم دے کر انہیں عیسائی یا بدھ کے پیروکار، سرمایہ دار یا سوشلسٹ، جنگجو یا امن کا خواہاں بنا سکتے ہیں۔

ہمارا خیال ہے کہ بڑے دماغ، اوزار کا استعمال، سیکھنے کی اعلی استعداد اور پیچیدہ سماجی ڈھانچے بہت فائدہ مند ہیں۔ یہ تو آپ اپنی مثال ہے کہ انہوں نے انسان کو زمین کا سب سے طاقتور جانور بنا دیا ہے۔ لیکن یہ فوائد تو انسان کو بیس لاکھ سال حاصل رہے، جس کے دوران وہ کمزور اور ایک حاشیائی مخلوق رہا۔ دس لاکھ سال پہلے کا انسان بھی اپنے بڑے دماغ اور تیز نوکدار ہتھیاروں کے باوجود مستقل شکاری جانوروں کے خوف میں مبتلا رہا، وہ شاذ و نادر ہی بڑا جانور شکار کرتا، اور زیادہ تر نباتات، حشرات ارضی، چھوٹے جانوروں اور زیادہ طاقت ور گوشت خور جانوروں کے جھوٹے مردار پر ہی زندہ رہا۔

ابتدائی پتھریلے اوزار کا ایک بہت اہم استعمال یہ تھا کہ اس سے ہڈیوں کو توڑ کر اس میں سے گودا نکالا

جائے۔ کچھ محققین کا خیال ہے کہ یہ ہماری اولین مشاقی تھی۔ بالکل جیسے ہدہد درخت کے تنے سے کیڑے حاصل کرنے میں کمال رکھتا ہے، اولین انسان کو ہڈی سے گودا نکالنے میں کمال حاصل تھا۔ گودا ہی کیوں؟ فرض کیجیے کہ آپ مغرور شیروں کے ایک ٹولے کو ایک زرافہ شکار کرتے دیکھتے ہیں۔ آپ صبر سے ان کا طعام ختم ہو جانے کا انتظار کرتے ہیں کہ پہلے وہ فارغ ہولیں۔ لیکن آپ کی باری اس کے بعد بھی نہیں آتی کیوں کہ ابھی گیدڑ اور لکڑ بھگے باقی ہیں، اور آپ ان کی ضیافت میں دخل اندازی نہیں کر سکتے۔ اس کے بعد ہی آپ دائیں بائیں دیکھتے اپنے گروہ کے ساتھ محتاط انداز میں اس ڈھانچے کی جانب بڑھتے ہیں، اور باقی ماندہ قابل خوردن پر دانت لگاتے ہیں۔

اپنی نفسیات اور تاریخ کو سمجھنے کے لیے یہ اہم کلید ہے۔ ابھی زیادہ پرانی بات نہیں کہ اس جینس ہومو کو غذائی فراہمی میں صرف درمیانی حیثیت حاصل تھی۔ لاکھوں برسوں تک انسان محض چھوٹی مخلوق کو شکار کرتا رہا، اور جو ممکن ہوا اسے سمیٹتا رہا، جب کہ ہر لحظہ خود بھی بڑے جانوروں سے خطرے میں رہا۔ یہ محض چار لاکھ سال پہلے کی بات ہے کہ انسان نے تسلسل سے بڑے جانوروں کا شکار کھیلنا شروع کیا۔ اور محض ایک لاکھ سال پہلے انسان اپنے عروج کے ساتھ پہلی بار غذائی زینے پر سب سے اوپر بیٹھا ہے۔

درمیان سے اٹھ کر سب سے بالائی منزل تک چھلانگ کے بہت سے مضمرات تھے۔ اس چوٹی پر پہلے سے موجود جانور مثلاً شیر یا شارک اس اونچائی تک لاکھوں سالوں میں بتدریج پہنچے تھے۔ اس درمیان ماحول کو اتنا وقت مل گیا تھا کہ وہ ایسی قدغن لگا سکیں کہ یہ شیر اور شارک زیادہ تباہی نہ لا سکیں۔ جیسے اگر یہ شیر زیادہ خونخوار ہو گئے تو ہرن بھی زیادہ تیز دوڑنے کے قابل ہو گئے، لکڑ بھگے زیادہ تعاون کرنے لگے اور گینڈے مزید بد دماغ ہو گئے۔ ان کے مقابلے میں انسان اس مقام پر اتنی تیزی سے بلند ہوا کہ ماحول کو سنبھلنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ پھر خود انسان بھی مطابقت پیدا کرنے میں ناکام رہے۔ اس سیارے کے زیادہ تر بڑے شکاری بہت شاہانہ طبیعت کے مالک ہیں۔ لاکھوں برس کے غلبے نے اس میں خود اعتمادی بھر دی ہے۔ اس کے مقابلے میں انسان کسی معذور جمہوریت کے ڈکٹیٹر کی مانند ہے۔ اتنے عرصے تک گھاس کی چراہ گاہوں میں مغلوب رہنے سے ہم اپنی حیثیت کے بارے میں بے چینی اور خوف کا شکار ہیں، جس نے ہمیں سب سے زیادہ ظالم اور خطرناک بنا دیا ہے۔ بہت سی تاریخی تباہ کاریاں، ہلاکت خیز جنگوں سے لے کر ماحولیاتی تباہ کاریوں تک، اسی جلد بام عروج کا نتیجہ ہیں۔

باورچیوں کی دوڑ

اس بلندی تک عروج کا ایک اہم قدم آگ پر قابو پانا تھا۔ کچھ انواع انسانی نے تو تقریباً آٹھ لاکھ سال پہلے ہی کبھی کبھی آگ کا استعمال شروع کر دیا تھا۔ لیکن کوئی تین لاکھ سال پہلے ہومو ایریکٹس، نینڈرتھال اور انسانوں کے آبا آگ کو روزانہ استعمال کر رہے تھے۔ اب انسانوں کو روشنی، حرارت اور شکار کے متلاشی شیروں کے خلاف ایک قابل اعتماد ہتھیار مہیا تھا۔ اس کے کچھ ہی عرصے بعد شاید انسانوں نے اپنے اطراف کے علاقوں کو نذر آتش کرنا شروع کر دیا تھا۔ احتیاط سے لگائی ہوئی آگ سے ناقابل عبور جنگل کو گھاس کے کھلے میدانوں میں بدلا جا سکتا تھا، جس میں شکار کی بہتات ہو۔ پھر یہ کہ آگ بجھنے کے بعد، پتھر کے زمانے کے بیوپاری، راکھ کرید کر بھنے ہوئے جانور، میوہ اور جڑیں جمع کر سکتے تھے۔

لیکن آگ نے جو سب سے اہم کام کیا وہ پکانا تھا۔ وہ غذا جو انسان اس کی اصل شکل میں ہضم کرنے سے قاصر تھا، مثلاً گندم، چاول اور آلو، وہ پکنے کے بعد ہماری روز مرہ غذا کا حصہ بن گئی۔۔ آگ نے نہ صرف غذا کی کیمیا بلکہ اس کی حیاتیات بھی بدل دی۔ پکانے سے غذا میں موجود جرثومے بھی مر گئے۔ انسانوں کو پنی پرانی مرغوب غذا چبانے اور ہضم کرنے میں آسانی ہوگئی۔ مثلاً پھل، میوے، حشرات ارضی اور مردار گوشت۔ اگر بن مانس دن کے پانچ گھنٹے کچی غذا کو چبانے میں صرف کرتے ہیں، تو انسانوں کو پکی غذا کھانے کے لیے ایک گھنٹہ ہی کافی تھا۔

پکانے کی اہمیت سے انسان مزید انواع کی غذا کھانے کے قابل ہوگیا۔ غذا کھانے میں کم وقت صرف ہونے لگا۔ اب ان کے چھوٹے دانت اور چھوٹی آنتیں کارگر ہونے لگیں۔ کچھ عالموں کا خیال ہے کہ پکانے کی ایجاد کا انسانی آنت کے اختصار اور انسانی دماغ کی بالیدگی سے براہ راست تعلق ہے۔ کیوں کہ لمبی آنتیں اور بڑے دماغ دونوں بہت توانائی خرچ کرتے ہیں، تو دونوں چیزوں کا ساتھ ہونا دشوار ہے۔ آنتوں کو مختصر کر کے ان کی توانائی کی ضرورت محدود کرنے سے، پکانے کے عمل نے غیر ارادی طور پر نینڈرتھال اور انسانوں کے بڑے دماغوں کی راہ ہموار کر دی۔

آگ نے ہی انسان اور دوسرے قابل ذکر حیوانات کے درمیان پہلی قابل ذکر خلیج حائل کی۔ تقریباً تمام جانوروں کی قوت ان کے جسم پر منحصر ہے۔ ان کے عضلات کی قوت، ان کے دانتوں کا حجم اور ان کے پروں کی چوڑائی۔ جب انسانوں نے آگ کو تابع کیا، تو انہوں نے ایک فرمانبردار اور ممکنہ طور پر بے انتہا قوت کو زیر کر لیا۔ چیل کے مقابلے میں، یہ انسان کے بس میں ہے کہ وہ کب اور کہاں شعلہ جلائے، وہ لاتعداد کاموں کے لیے آگ کو استعمال کر سکتا تھا۔ سب سے اہم بات یہ کہ آگ کی طاقت انسانی جسم کی ہیئت، ساخت یا قوت پر منحصر نہیں تھی۔ ایک تنہا عورت چقماق یا ماچس کی تیلی سے چند گھنٹوں میں ایک پورے جنگل کو بھسم کر سکتی ہے۔ آگ پر قابو پالینے کی صلاحیت آنے والے زمانوں کی خبر دے رہی تھی۔

ہمارے بھائی کے رکھوالے

آگ کے فوائد کے باوجود ڈیڑھ لاکھ سال پہلے تک، انسان محض حاشیائی مخلوق تھے۔ لیکن اب وہ شیروں کو ڈرا کر بھگا سکتے تھے۔ سرد راتوں میں خود کو گرم رکھ سکتے تھے، اور کبھی کبھار کسی جنگل کو جلا کر خاک کر سکتے تھے۔ لیکن تمام اسپی شی کو زیر غور لائیں، تو بھی تقریباً دس لاکھ انسان جو انڈونیشیا کے جزیروں سے آئی بیریا کے جزیرے تک آباد تھے، ماحول کے افق پر محض ایک نقطہ تھے۔

ہماری اپنی نسل، ہوموسیپین، دنیا کے اسٹیج پر موجود تو تھی، لیکن افریقہ کے ایک کونے میں محض اپنے کام سے کام رکھ رہی تھی۔ ہمیں نہیں معلوم کہ وہ جانور جنہیں ہم ہوموسیپین شمار کرتے ہیں، کب اور کہاں اولین انسانوں سے تشکیل پائے۔ لیکن زیادہ تر سائنس دانوں کے خیال میں کوئی ڈیڑھ لاکھ سال پہلے ایسا ہوا۔ مشرقی افریقہ میں بالکل ہمارے جیسے انسان آباد تھے۔ اگر ان میں سے کسی کی لاش جدید مردہ خانے میں نمودار ہو جائے تو مقامی پیتھالوجسٹ کو کوئی فرق محسوس نہیں ہوگا۔ آگ کا شکریہ کہ ان کے دانت اور جبڑے ان کے آبا سے چھوٹے تھے، جب کہ ان کے دماغ بہت بڑے، بالکل ہماری قسم کے۔

سائنس دان اس بات پر بھی متفق ہیں کہ کوئی ستر ہزار سال پہلے انسان مشرقی افریقہ سے نکل کر جزیرہ نما عرب میں پھیل گئے، پھر جلد ہی وہاں سے یوریشیا کی زمین پر۔ جب ہوموسیپین عربیہ پہنچے تو اس وقت یوریشیا میں دوسرے انواع کے انسان پہلے ہی سے آباد تھے۔ ان کا کیا ہوا؟ اس کے متعلق دو متضاد نظریات ہیں: باہمی اختلاط کا نظریہ۔۔ یہ تیر نظر، ہم بستری اور میل ملاپ کی کہانی ہے۔ جب یہ افریقی مہاجر دنیا بھر میں پھیلے، تو انہوں نے دوسری انواع انسانی کے ساتھ اختلاط کیا، اور موجودہ انسان اسی ہم بستری کا کارنامہ ہیں۔

مثال کے طور پر جب سیپین مشرق وسطی اور یورپ پہنچے تو ان کا سامنا نینڈرتھال سے ہوا۔ انسانوں کی یہ قسم سیپین سے زیادہ عضلاتی تھی۔ ان کے دماغ بھی زیادہ بڑے تھے اور وہ سرد آب وہوا کا بہتر مقابلہ کر سکتے تھے۔ وہ آگ اور اوزار کا استعمال جانتے تھے، اچھے شکاری تھے اور غالبا اپنے بیمار اور کمزور کا خیال رکھتے تھے (ماہرین بشریات نے بہت سے ایسے نینڈرتھال کی ہڈیاں دریافت کی ہیں جو سخت جسمانی معذوری کے باوجود برسوں زندہ رہے، جو ان کے اعزا کی مدد کے بغیر ممکن نہیں تھا)۔ خاکوں میں نینڈرتھال کو اکثر قدیم جنگلی اور احمق غار کے مکینوں کے طور پر پیش کیا جاتا ہے، لیکن جدید تحقیق نے ان کا روپ بدل دیا ہے۔

باہمی اختلاط کے نظریے کے مطابق جب سیپین نینڈرتھال کے علاقوں میں پہنچے تو انہوں نے نینڈرتھال سے اختلاط کیا۔ یہاں تک کہ دونوں آبادیاں باہم ہو گئیں، اگر یہ درست ہے تو آج کے یوریشین خالص سیپین نہیں ہیں۔ وہ سیپین اور نینڈرتھال کا آمیزہ ہیں۔ اسی طرح جب سیپین مشرقی ایشیا پہنچے تو انہوں نے مقامی ہوموایرکٹس کے ساتھ اختلاط کیا، یوں چینی اور کوریائی باشندے سیپین اور ایرکٹس کا مرکب ہیں۔

اس کا متضاد نظریہ، " نظریہ تبدیلی " ایک بہت مختلف کہانی سناتا ہے، جس میں نامناسبت، نفرت اور نسل کشی تک شامل ہے۔ اس نظریے کے مطابق سیپین اور انسانوں کی دوسری انواع کی اناٹومی مختلف تھی، اور غالبا ان کے جسم کی بو اور اختلاطی رویے بھی۔ انہوں نے ایک دوسرے میں کوئی جنسی کشش محسوس نہیں کی ہوگی۔ اور اگر کوئی نینڈرتھال رومیو کسی سیپین جولیٹ کے عشق میں گرفتار ہو بھی گیا، تو بھی وہ بانجھ اولاد ہی پیدا کر سکتے تھے، کیوں کہ دونوں آبادیوں کے درمیان جینیاتی تفریق ناقابل عبور تھی۔ دونوں آبادیاں ایک دوسرے سے بالکل علیحدہ رہیں۔ جب نینڈرتھال ختم ہو گئے یا ختم کر دیے گئے تو ان کے ساتھ ان کی جینیات بھی دفن ہو گئی۔ اس نظریے کے مطابق سیپین نے ان سے اختلاط کیے بغیر، تمام اقسام کی انسانی آبادیوں کی جگہ لے لی۔ اگر یہ درست ہے تو تمام عصری انسانوں کا نسب ستر ہزار سال پہلے کے مشرقی افریقہ سے جا ملتا ہے، ہم سب خالص سیپین ہیں۔

اس بحث پر بہت کچھ منحصر ہے۔ ارتقائی زبان میں ستر ہزار برس ایک بہت قلیل مدت ہے۔ اگر نظریہ تبدیلی درست ہے اور تمام زندہ انسانوں کا جینیاتی ورثہ مشترک ہے، تو ان کے درمیان تمام نسلی تفرقات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ لیکن اگر باہمی اختلاط کا نظریہ درست ہے تو پھر افریقیوں، یورپین اور ایشیائیوں کے درمیان لاکھوں سال پرانے جینیاتی فرق موجود ہیں۔ یہ سیاسی اعتبار سے بہت دھماکہ خیز ہے، جو دھماکہ خیز نسلی نظریات کو ہوا دے گا۔

حالیہ دہائیوں میں نظریہ تبدیلی ہی اس میدان میں زیادہ مقبول رہا ہے۔ اس کی پشت پر بشریاتی سائنس کے زیادہ ثبوت ہیں، اور یہ سیاسی طور پر زیادہ قابل قبول ہے (سائنس دانوں کو اس بات کی کوئی تمنا نہیں تھی کہ یہ دعوی کر کے کہ جدید انسانی آبادی میں بہت اہم جینیاتی تفرقات ہیں، وہ نسلی تضاد کی پوٹلی کھول دیتے)۔ لیکن یہ نظریہ

اس وقت مشکل میں گرفتار ہو گیا جب 2010 میں چار سال کی محنت کے بعد نینڈرتھال کا مکمل جینیاتی نقشہ مرتب ہو گیا۔ زمین سے حاصل ہوئے فوسل سے جینیات دانوں کو اتنا نینڈرتھال ڈی این اے میسر ہو گیا کہ وہ اس کا موجودہ انسانی ڈی این اے سے موازنہ کر سکیں۔ اس کے نتیجے نے سائنسی دنیا کو حیرت میں ڈال دیا۔
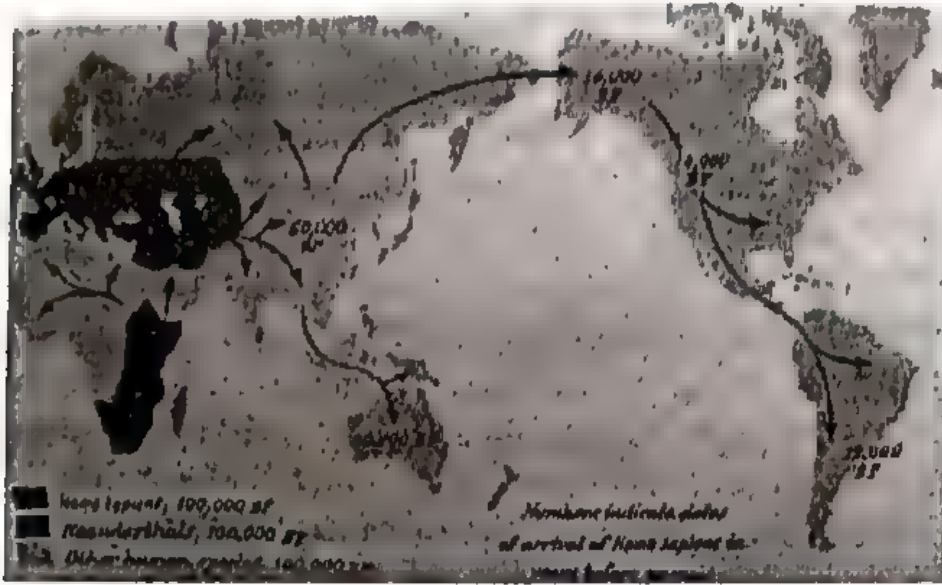
ہوموسیپین دنیا فتح کرنے نکلے

یہ معلوم ہوا کہ مشرق وسطیٰ اور یورپ کے جدید انسانوں کے مخصوص ڈی این اے کا ایک سے چار فیصد نینڈرتھال کا ڈی این اے ہے۔ یہ بہت زیادہ نہیں لیکن اہم مقدار ضرور ہے۔ ایک دوسرا جھٹکا کئی ماہ بعد لگا جب ڈینی سووا میں ملنے والی فوسل انگلی کا ڈی این اے مرتب کیا گیا۔ معلوم ہوا کہ جدید ملیشیائی جزیرے کے باشندوں اور اصیل النسل آسٹریلین کا ڈی این اے، ڈینی سووین ڈی این اے سے چھ فیصد مطابقت رکھتا ہے۔

اگر یہ نتائج درست ہیں، اور یہ ذہن میں رکھیے کہ مزید تحقیق جاری ہے جو اس نتیجے کی تائید یا تردید کر سکتی ہے، تاہم باہمی اختلاط کے نظریہ دانوں کا خیال کسی حد تو درست تھا۔ لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں ہوا کہ نظریہ تبدیلی مکمل طور پر غلط تھا۔ کیوں کہ نینڈرتھال اور ڈینی سووین ہمارے موجودہ ڈی این اے کی ایک معمولی مقدار سے مطابقت رکھتے ہیں، تو یہ کہنا ناممکن ہے کہ سیپین اور دوسری انسانی انواع کے درمیان مکمل ملاپ ہو گیا تھا۔ گو ان کے درمیان فرق اتنا زیادہ نہیں تھا کہ جو ہم بستری سے افزائش نسل میں مانع ہو، لیکن اتنا ضرور تھا کہ ملاقاتیں بہت کمیاب تھیں۔

تو پھر کیا اب ہمیں سیپین، نینڈرتھال اور ڈینی سووین کی حیاتیاتی رشتہ داری پر غور کرنا چاہیے؟ ظاہر ہے کہ گدھے گھوڑے کی مانند وہ بالکل مختلف اسپیسی تو نہیں تھے۔ لیکن وہ ایک ہی اسپیسی کی مختلف انواع بھی نہیں تھے کہ جیسے بل ڈاگ اور اسپینیل کتے۔ حیات میں عزیز داری اتنی سفید وسیاہ بھی نہیں بلکہ اس میں کچھ اہم درمیانے علاقے بھی ہیں۔ ہر دو اسپیسی جو ایک ہی جد کی اولاد تھیں جیسے گدھے اور گھوڑے، تو کسی وقت وہ ایک ہی اسپیسی کی دو مختلف آبادیاں تھیں جیسے بل ڈاگ اور اسپینیل۔ کوئی ایسا مقام ضرور رہا ہو گا کہ جہاں یہ دو اسپیسی ایک دوسرے سے خاص مختلف تھیں، لیکن پھر بھی کبھی کبھار ہم بستری کر کے زرخیز اولاد پیدا کرنے کے قابل تھیں۔ پھر ڈی این اے میں ایک اور تبدیلی (mutation) سے یہ آخری بندھن بھی ٹوٹ گیا، اور دونوں اقسام اپنے علیحدہ ارتقائی سفر پر گامزن ہو گئیں۔

ایک نینڈرتھال بچے کی خیالی تصویر۔اس بات کا جینیاتی ثبوت موجود ہے کہ کم از کم کچھ نینڈرتھال کی جلد اور بالوں کا رنگ صاف تھا۔

لگتا ہے کہ شاید پچاس ہزار سال پہلے سیپین، نینڈرتھال اور ڈینی سووین ایسے نکتہ ارتکاز پر تھے۔ وہ تقریبا لیکن نامکمل طور پر جداگانہ اسپیسی تھے۔جیسا کہ ہم آئندہ باب میں دیکھیں گے، سیپین اس وقت سے ہی نینڈرتھال اور ڈینی سووین سے بہت مختلف تھے۔نہ صرف اپنے جینیاتی پیغام اور طبعی اوصاف میں بلکہ سماجی اور ادراکی اہلیت میں بھی۔لیکن پھر بھی لگتا ہے کہ اس وقت بھی، گو شاذو نادر ہی، یہ ممکن تھا کہ سیپین اور نینڈرتھال ہم بستری کر کے ایک زرخیز اولاد پیدا کریں۔تو آبادیوں کا ملاپ نہیں ہوا بلکہ کچھ خوش قسمت نینڈرتھال کی جین سیپین کی جین میں شامل ہوگئی۔یہ بات پریشان کن لیکن شاید سنسنی خیز ہے کہ ہم کسی زمانے میں ایک مختلف اسپیسی کے جانور سے ہم بستری کرکے اولاد پیدا کرنے پر قادر تھے۔

لیکن اگر نینڈرتھال، ڈینی سووان اور دوسری انسانی اقسام سیپین میں مدغم نہیں ہوگئیں تو غائب کیوں ہوگئیں؟ ایک امکان تو یہ ہے کہ ہومو سیپین نے انہیں مار کے ختم کر دیا۔ایک سیپین کا گروہ تصور کیجیے جو وادی بلقان کی جانب بڑھ رہا ہے، جہاں نینڈرتھال لاکھوں سال سے آباد ہیں۔یہ نو وارد ہرن شکار کرتے ہیں، خشک میوہ اور بیر چنتے ہیں جو نینڈرتھال کی روایتی غذا تھی۔اپنی بہتر صنعت و حرفت اور سماجی اہلیت کی بنا پر سیپین زیادہ بہتر شکاری اور اکٹھا کرنے کے قابل تھے، لہٰذا ان کی تعداد بڑھ گئی اور وہ پھیل گئے۔کم وسائل والے نینڈرتھال کے لیے اب خوراک کی تلاش دشوار ہوگئی۔ان کی آبادی کم ہو کر ختم ہوگئی، ماسوا اکا دکا نینڈرتھال کے جو اپنے پڑوسی سیپین میں

شامل ہو گئے۔

ایک دوسرا امکان یہ ہے کہ وسائل کے لیے مقابلہ جنگ اور نسل کشی کا سبب بنا۔ برداشت سیپین کا طرہ امتیاز نہیں۔ دور جدید میں جلد کا رنگ، تلفظ یا مذہب کے معمولی فرق سے سیپین کا ایک گروہ دوسرے کو مٹانے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ کیا قدیم سیپین ایک بالکل ہی مختلف اسپیسی کو برداشت کرنے پر آمادہ ہوتے؟ ممکن ہے کہ جب سیپین کا نینڈرتھال سے سامنا ہوا تو نتیجے میں تاریخ کی پہلی اور سب سے اہم نسل کشی نے جنم لیا۔

تو جو بھی ہوا، نینڈرتھال (اور دوسری انسانی انواع) تاریخ کا سب سے اہم سوال اٹھاتی ہیں کہ اگر یوں ہوتا تو کیا ہوتا؟ سوچیے کیا ہوتا اگر ہوموسیپین کے ساتھ ہی نینڈرتھال اور ڈینی سووَن بھی زندہ رہ جاتے۔ ایک ایسی دنیا میں جہاں انسانوں کی مختلف اقسام زندہ ہوتیں، کس قسم کی ثقافت، معاشرہ اور سیاسی نظام وضع ہوتا۔ مثلاً مذہبی اعتقادات کس صورت میں جگہ پاتے؟ کیا کتاب تخلیق (بک آف جینیسس) میں نینڈرتھال کو آدم اور حوا کی اولاد بتایا جاتا؟ کیا عیسیٰ ڈینیسووَن کے گناہوں کی پاداش میں مصلوب ہوتے، اور کیا قرآن میں ہر اچھے انسان کے لیے، خواہ اس کا تعلق کسی بھی نوع سے ہو، جنت میں داخلے کی بشارت ہوتی؟ کیا نینڈرتھال رومن فوج میں بھرتی ہوتے، یا چینی بادشاہت کی وسیع نوکر شاہی میں کام کر پاتے؟ کیا امریکہ کا اعلان آزادی جینس ہومو میں شامل تمام انواع انسانی کو برابر قرار دیتا؟ کیا کارل مارکس اسپیسی کے تمام اراکین کو متحد ہو جانے کا پیغام دیتا؟

گزشتہ دس ہزار برسوں میں ہوموسیپین کو واحد انسانی قسم ہونے کی اتنی عادت ہو گئی ہے کہ ہم نے کسی دوسرے امکان پر غور کیا ہی نہیں۔ ہمارے عم زادوں کی غیر موجودگی نے ہمیں یہ باور کرا دیا کہ ہم ہی تخلیق کا خلاصہ ہیں، اور ایک خلیج ہمیں باقی حیوانی دنیا سے علیحدہ کرتی ہے۔ جب چارلس ڈارون نے یہ نشاندہی کی کہ انسان محض ایک مختلف قسم کا جانور ہی ہے تو لوگوں میں غصہ پھیل گیا۔ آج بھی بہت سے لوگ اسے ماننے سے انکار کرتے ہیں۔ اگر نینڈرتھال زندہ ہوتے تو کیا پھر بھی ہم اپنے آپ کو علیحدہ تخلیق تصور کرتے؟ شاید اسی وجہ سے ہمارے آبا نے نینڈرتھال کا صفایا کر دیا۔ وہ اتنے مماثل تھے کہ نظر انداز کرنا مشکل تھا لیکن اتنے مختلف بھی کہ برداشت نہ ہوتے۔

خواہ سیپین پر الزام آئے یا نہ آئے، جیسے ہی وہ کسی نئی جگہ نمودار ہوئے تو مقامی آبادی نابود ہو گئی۔ ہومو سولینسس کے آخری باقیات تقریباً پچاس ہزار سال پرانے ہیں۔ اس کے کچھ ہی عرصے بعد ہوموڈینی سووان ختم ہو گئے۔ نینڈرتھال کا استعمال تقریباً تیس ہزار سال قبل ہوا۔ جزیرہ فلورس سے بونے نما آدمی تقریباً بارہ ہزار سال قبل ختم ہوئے۔ ان کی باقیات میں کچھ ہڈیاں، پتھریلے اوزار، ہمارے ڈی این اے میں ان کی چند جین اور بہت سے کھلے سوالات ہیں۔ انہوں نے ترکے میں ہوموسیپین، انسان کی آخری قسم چھوڑی ہے۔

سیپین کی کامیابی کا راز کیا تھا؟ ہم اتنی سرعت سے اتنے دور دراز، مختلف ماحولیاتی جگہوں پر کیسے پھیل گئے۔ ہم نے باقی تمام انواع انسانی کو کیسے ختم کر دیا؟ ہمارے اس جیلے سے طاقتور، ذہین، سردی برداشت کرنے پر قادر نینڈرتھال کیوں نہیں بچ سکے؟ یہ بحث جاری ہے۔ سب سے ممکنہ امکان وہی نکتہ ہے جو یہ بحث جاری رکھے ہوئے ہے۔ ہوموسیپین نے ساری دنیا اپنی منفرد زبان کے بل بوتے پر فتح کی۔

شجر معرفت

گزشتہ باب میں ہم نے دیکھا کہ گو سیپین مشرقی افریقہ میں ڈیڑھ لاکھ سال پہلے آباد ہو چکے تھے۔ لیکن انہوں نے کرہ زمین پر پھیل کر دیگر انواع انسانی کو تقریباً ستر ہزار سال پہلے ختم کرنا شروع کیا۔ درمیان کے لاکھوں سالوں میں گو وہ قدیم سیپین ہم جیسے ہی لگتے تھے، اور ان کے دماغ بھی ہم جتنے ہی بڑے تھے۔ لیکن انہیں دوسری انواع انسانی پر کوئی فوقیت حاصل نہیں تھی۔ انہوں نے کوئی زیادہ معیاری ہتھیار بنائے اور نہ ہی کوئی دوسرا اہم کام کیا۔

بلکہ دستیاب شہادتوں کے حساب سے جب سیپین اور نینڈرتھال پہلی بار آمنے سامنے ہوئے تو نینڈرتھال فاتح رہے۔ کوئی ایک لاکھ سال پہلے سیپین کے چند گروہوں نے شمال میں لیوانٹ کی جانب پیش قدمی کی، جو نینڈرتھال کا علاقہ تھا۔ لیکن وہ قدم جمانے میں ناکام رہے۔ اس کی وجہ جنگجو مقامی، موسم کی سختیاں یا غیر مانوس مقامی جراثیم ہو سکتے ہیں۔ وجہ جو بھی رہی ہو، سیپین بہرحال پسپا ہو گئے، اور نینڈرتھال مشرقی وسطی پر حاکم رہے۔

کامیابیوں کے اس برے ریکارڈ کی وجہ سے اسکالروں کا خیال ہے کہ ان سیپین کے دماغ کا اندرونی ربط شاید ہمارے دماغوں سے مختلف تھا۔ وہ ہم سے مشابہ تو تھے، لیکن ان کی ادراکی اہلیت جیسے سیکھنا، یاد رکھنا، بات ترسیل کرنا خاصی محدود تھی۔ ایسے قدیم سیپین کو انگریزی پڑھانا، عیسائی فکر کی سچائی کی جانب راغب کرنا یا انہیں نظریہ ارتقا سمجھانا غالباً وقت کا زیاں ہوتا۔ اور اس کے مقابلے میں خود ہمارے لیے بھی ان کی زبان سیکھنا اور ان کا انداز فکر اپنانا بہت دشوار ہوتا۔

لیکن پھر ستر ہزار سال پہلے ہوموسیپین نے بہت خاص امور انجام دیے۔ اس زمانے کے آس پاس سیپین کا ایک گروہ دوبارہ افریقہ سے نکلا۔ اس دفعہ وہ نہ صرف نینڈرتھال بلکہ باقی تمام انواع انسانی کو نہ صرف مشرق وسطی بلکہ پوری دنیا سے مٹانے میں کامیاب رہے۔

بہت کم مدت میں سیپین یورپ اور مشرقی ایشیا پہنچ گئے۔ تقریباً پینتالیس ہزار سال پہلے وہ کسی طرح سمندر عبور کر کے آسٹریلیا جا پہنچے، ایک براعظم جس پر ابھی تک انسان نہیں پہنچے تھے۔ ستر ہزار سال سے تقریباً تیس ہزار سال قبل مسیح کے زمانے نے جو ایجادات دیکھیں ان میں کشتیاں، تیل کے چراغ، تیر کمان اور سوئیاں شامل تھیں (جو صرف گرم کپڑے سینے کے کام آتی تھیں)۔ اسی زمانے میں وہ پہلی شبیہ جسے آرٹ کہا جا سکے نمودار ہوئی (اسٹیڈل کے غار سے شیر کے منہ والے آدمی کا بت)۔ پہلی بار مذہبی، تجارتی اور سماجی طبقات کی موجودگی کا ثبوت ملا۔

زیادہ تر محققین کا خیال ہے کہ یہ غیر معمولی کامیابیاں سیپین کی ادراکی اہلیت میں انقلابی تبدیلی کا نتیجہ

تھیں۔ ان کے نزدیک وہ لوگ جنہوں نے نینڈرتھال کو ختم کیا، آسٹریلیا میں آباد ہوئے اور شیر نما آدمی کا مجسمہ تراشا، ویسے ہی ذہین، تخلیق کار اور حساس تھے جیسے ہم۔ اگر ہم اسٹاڈیل کے غار کے بت تراش سے ملتے تو ہم ان کی زبان سمجھ لیتے اور وہ ہماری۔ ہمیں جو بھی معلوم ہے ہم انہیں سکھانے میں کامیاب رہتے۔ 'ایلس ان وںڈر لینڈ' کی مہم جوئی سے لے کر' کوانٹم طبیعات' کے اسرار تک، اور وہ ہمیں بتاتے کہ ان کے لوگ دنیا کو کیسے دیکھتے ہیں۔

ستر سے تیس ہزار سال قبل مسیح کے دوران، سوچ اور رابطے کی نئی راہیں نمودار ہونے سے ادراک کی اہلیت میں انقلاب پیدا ہوگیا۔ یہ کس چیز سے پیدا ہوا یہ ہم نہیں جانتے۔ سب سے زیادہ مقبول نظریہ ہمیں یہ بتاتا ہے کہ غالب اتفاقی جینیاتی تبدیلی (میوٹیشن) نے دماغ کے اندرونی رابطوں پر اثر ڈالا، جس سے سیپین کی فکر میں غیر معمولی اضافہ ہوا، اور ایک نئے طرز کی زبان اختراع ہوئی۔ ہم اسے شجر معرفت کی میوٹیشن کہہ سکتے ہیں۔ یہ سیپین کے ڈی این اے میں کیوں ہوئی، نینڈرتھا کے دماغ میں کیوں نہیں، جہاں تک ہمیں معلوم ہے یہ عمل محض اتفاقی تھا۔ لیکن اس شجر معرفت کی میوٹیشن کے اثرات کا جائزہ اس کی وجوہات سے زیادہ اہم ہے۔ سیپین کی نئی زبان میں ایسی کیا خاص بات تھی کہ وہ ساری دنیا فتح کرنے میں کامیاب ہوگئے۔

یہ کوئی پہلی زبان تو نہیں تھی۔ ہر جانور کی اپنی زبان ہوتی ہے۔ حشرات الارض، مثلاً مکھیاں اور چیونٹیاں تک بہت موثر انداز میں رابطہ قائم کرنے پر قادر ہیں۔ وہ ایک دوسرے کو یہ بتا سکتے ہیں کہ غذا کہاں موجود ہے۔ نہ ہی یہ بولی جانے والی پہلی زبان تھی۔ بہت سے جانور، جن میں تمام بن مانس اور بندر کی اسپیسی شامل ہیں، آواز گفتگو پر قادر ہیں۔ مثلاً ہرے بندر مختلف قسم کی آوازوں سے رابطہ قائم کرتے ہیں۔ علم الحیوانات کے ماہرین ایک ایسی بولی پہچان گئے ہیں، جس کا مطلب ہوتا ہے " خبردار، چیل قریب ہے!" ایک ذرا سی مختلف صدا کا مطلب ہوتا ہے " خبردار، خبردار، شیر آیا!۔ جب محققین نے پہلی بار صدا ریکارڈ کر کے بندروں کے ایک گروہ کو سنائی، تو بندر اپنا کام چھوڑ کر ، خوف سے آسمان کی جانب دیکھنے لگے۔۔ جب اسی گروہ کو دوسری صدا سنائی دی، شیر کے خطرے والی، تو وہ فوراً درخت پر چڑھ گئے تھے۔ سیپین ہرے بندروں سے کہیں زیادہ صدائیں لگانے پر قادر ہیں۔ وہیل اور ہاتھی بھی ایسی ہی قابل رشک اہلیت کے عادی ہیں۔ ایک طوطا وہ سب دہرا سکتا ہے جو البرٹ آئن اسٹائن کہہ سکتا ہے، ساتھ ہی فون کی گھنٹی، دروازہ بند ہونے اور سائرن بجنے کی آوازوں کی نقل اتار سکتا ہے۔ آئن اسٹائن کو طوطے پر جو بھی فوقیت حاصل ہو، وہ بہرحال زبانی تو نہیں۔ تو پھر ہماری زبان میں ایسی کیا خاص بات ہے؟

سب سے عام جواب تو یہ ہے کہ ہماری زبان بہت نرم ہے۔ ہم چند آوازوں اور اشاروں کو جوڑ کر لا تعداد فقرے بنا سکتے ہیں، جن میں سے ہر ایک کا اپنا علیحدہ مفہوم ہے۔ یوں ہم اپنے اردگرد کی دنیا کے بارے میں بے انتہا معلومات سمیٹ کر اسے احتیاط سے ترسیل کر سکتے ہیں۔ ایک ہرا بندر اپنے ساتھیوں کو چیخ کر خبردار کر سکتا ہے کہ "خبردار یہاں ایک شیر ہے"۔ لیکن ایک جدید انسان اپنے ساتھیوں کو بتا سکتا ہے کہ آج صبح، دریا کے موڑ پر، اس نے ایک شیر کو بھینسوں کے ایک ریوڑ کے تعاقب میں دیکھا۔ پھر وہ جگہ کی درست نشاندہی کر سکتا ہے۔ اس معلومات کی روشنی میں، اس علاقے کو جانے والے مختلف راستوں کے بیان سمیت، اس کے گروہی ساتھی یہ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ آیا دریا کے کناروں تک جایا جائے، شیر کو بھگا کر بھینسے کا شکار کیا جائے۔

ایک دوسرا نظریہ بھی اس بات سے متفق ہے کہ ہماری زبان دنیا کی معلومات ایک دوسرے تک پہنچانے

کے نتیجے میں پنپ سکی۔ لیکن سب سے اہم معلومات جس کے بارے میں ترسیل ضروری تھی وہ شیر اور بھینسے کے بارے میں نہیں، بلکہ خود انسانوں کے بارے میں تھی۔ ہماری زبان کا ارتقاء بے مقصد گفتگو سے ہوا۔
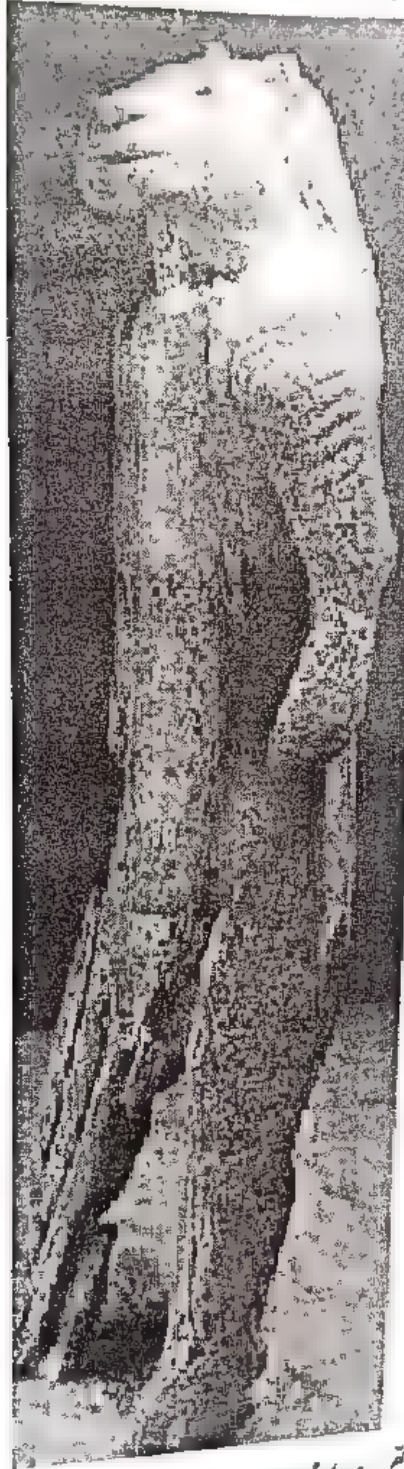
شیر جیسے منہ کا آدمی یا عورت، ایک ہاتھی دانت کا مجسمہ (32000 سال پرانا)، جو جرمنی کے اسٹاڈیل غار سے دریافت ہوا۔
اس انسانی دھڑ پر شیر کا منہ لگا ہوا ہے۔ یہ غیر متنازعہ طور پر آرٹ کا پہلا نمونہ ہے،
اور شاید مذہب کا، اور انسانی دماغ کی اس اہلیت کا کہ وہ غیر موجود اشیا کا تصور کر سکیں۔

اس نظریے کے مطابق بنیادی طور پر ہوموسیپین ایک سماجی جانور ہے۔ اس کے بچاؤ اور نسلی تسلسل کے

لیے سماجی تعاون ضروری ہے۔ محض یہی کافی نہیں کہ کسی مرد یا عورت کو شیروں اور بھینسوں کے جائے مقام کا علم ہو، ان کے لیے یہ بہت زیادہ اہم ہے کہ انہیں یہ معلوم ہو کہ ان کے گروہ میں کون کس سے نفرت کرتا ہے، کون کس سے ہم بستری کر رہا ہے، کون دیانت دار ہے اور کون دھوکے باز۔ محض چند درجن افراد کے درمیان بھی ہمیشہ بدلتے تعلقات پر نظر رکھنے کے لیے معلومات کا ایک بڑا ذخیرہ درکار ہے (پچاس لوگوں کے گروہ میں بارہ سو پچیس انفرادی تعلقات ممکن ہیں، اور ان گنت زیدہ پیچیدہ تعلقات)۔ تمام بن مانس بھی ایسی سماجی معلومات کے حصول میں بہت زیادہ دلچسپی رکھتے ہیں، لیکن انہیں موثر انداز میں غیبت کرنا نہیں آتی۔ نینڈرتھال اور قدیم ہوموسیپین کو بھی غالباً غیبت میں دشواری ہوئی، ایک بہت بدنام اہلیت جو بڑے گروہوں میں تعاون کے لیے بہت ضروری ہے۔ جدید انسان نے ستر ہزار سال پہلے جو زبان کی نئی اہلیت اختیار کی اس سے وہ گھنٹوں بحث کرنے کے قابل ہو گیا۔ اس قابل بھروسہ معلومات کے ساتھ کہ کس پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے، چھوٹے گروہ بڑھ کر بڑے گروہ بن سکتے ہیں، اور سیپین زیادہ قریبی اور پیچیدہ روابط قائم کر سکتے ہیں۔

غیبت کا یہ نظریہ شاید مذاق محسوس ہو، لیکن متعدد تحقیقات نے اس کی تائید کی ہے۔ آج بھی انسانی روابط کا بیشتر حصہ، خواہ وہ ای میل کی شکل میں ہو، فون یا اخباری کالم، غیبت پر مشتمل ہے۔ یہ ہمارے لیے اتنی فطری ہے کہ ایسا لگتا ہے کہ ہماری زبان نے اسی مقصد کے لیے بالیدگی پائی۔ آپ کا کیا خیال ہے کہ جب تاریخ کے پروفیسر ظہرانے پر ملتے ہیں، تو وہ پہلی جنگ عظیم کی وجوہات پر گفتگو کرتے ہیں؟ یا جوہری طبیعات دان کسی سائنسی میٹنگ میں وقفے کے دوران کوارکس (quarks) پر بحث کرتے ہیں؟ کبھی کبھار۔ لیکن زیادہ تر وہ اس پروفیسر کے بارے میں بات کرتے ہیں جس نے اپنی بیوی کو رنگے ہاتھوں بے وفائی کرتے پکڑا تھا، یا سربراہ شعبہ کا ڈین سے جھگڑا موضوع گفتگو ہوتا ہے، یا یہ افواہ زیر بحث آتی ہے کہ کیسے ایک ہم عصر نے اپنا تحقیقی فنڈ ایک لیکسس (Lexus) کار خریدنے پر صرف کر دیا۔ غیبت عموماً غلط کاریوں کے بارے میں ہوتی ہے۔ افواہ تراش ہی اصل چوتھی ریاست ہیں، ایسے صحافی جو معاشرے کو دھوکے بازوں اور مفت خوروں کے بارے میں خبردار کر کے ان سے بچنے کا موقع فراہم کریں۔

غالباً دونوں ہی نظریات، نظریہ غیبت اور دریا کے کنارے پر شیر ہے کا نظریہ، سچے ہیں۔ لیکن ہماری زبان کا سب سے اہم پہلو انسانوں یا شیروں کے بارے میں معلومات پھیلانے کی اہلیت نہیں، بلکہ جو اشیا موجود ہی نہیں ان کے بارے میں معلومات پھیلانے کی اہلیت ہے۔ جہاں تک ہمیں معلوم ہے صرف سیپین ہی ان کے بارے میں گفتگو کر سکتے ہیں جو نہ کبھی انہوں نے دیکھی، نہ چھوئی اور نہ سونگھی۔

روایات، اساطیر، خداوند اور مذاہب پہلی بار ادراکی اہلیت میں انقلاب کے ساتھ نمودار ہوئے۔ بہت سے جانور اور انسانی قسمیں پہلے بھی کہہ سکتی تھیں کہ 'خبردار، شیر' یا۔ لیکن ادراکی اہلیت میں انقلاب کا شکریہ کہ اب ہوموسیپین یہ کہنے پر قادر ہے کہ 'شیر ہمارے قبیلے کی نگہباں روح ہے'۔ سیپین زبان کی سب سے اہم خصوصیت اسی تصور کا بیان ہے۔

یہ کہنا نسبتاً آسان ہے کہ صرف ہوموسیپین ہی ان چیزوں کے بارے میں گفتگو کر سکتے ہیں جو موجود نہ ہوں، اور ناشتے سے بھی پہلے چھ ناممکن چیزوں پر ایمان لا سکتے ہیں۔ آپ کسی بندر سے یہ وعدہ کر کے اس سے کیلا حاصل نہیں کر سکتے کہ مرنے کے بعد بندروں کی جنت میں تمہیں لاتعداد کیلے ملیں گے۔ لیکن یہ کیوں اہم ہے؟ بہر

حال مفروضہ (فکشن) خطرناک حد تک گمراہ کن اور توجہ ہٹانے کا باعث ہوسکتا ہے۔ وہ لوگ جو جنگل میں پریوں اور خیالی جانوروں (یونی کورن) کی تلاش میں جاتے ہیں ان کے بچ جانے کا امکان کم ہوتا ہے، بہ نسبت ان لوگوں کے جو مش روم اور ہرن کی تلاش میں جائیں۔ اور اگر آپ گھنٹوں لاموجود نگراں روح کی تلاش میں عبادت کرتے رہیں، تو کیا آپ اپنا وہ قیمتی وقت ضائع نہیں کر رہے جو غذا کی تلاش، جنگ، یا ہم بستری کے ہنر میں صرف کر سکتے تھے؟

لیکن مفروضوں نے ہمیں اس قابل بنادیا ہے کہ ہم نہ صرف چیزوں کو تصور کریں، بلکہ اجتماعی طور پر ایسا کریں۔ ہم روایات گھڑ سکتے ہیں، مثلاً بائبل کی تخلیق کی داستان، اصلی آسٹریلیائی باشندوں کی خوابوں کی داستان، یا جدید ممالک کی قوم پرستی کی کہانیاں۔ ان داستانوں نے سیپین کو یہ بے مثال اہلیت دی کہ وہ کثیر تعداد میں لچکدار تعاون کا برتاؤ کریں۔ چیونٹیاں اور شہد کی مکھیاں بھی بڑی تعداد میں ایک ساتھ کام کر سکتی ہیں، لیکن ان کا تعاون قریبی اعزا سے بہت غیر لچکدار انداز میں ہوتا ہے۔ بھیڑیے اور لنگور چیونٹیوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ لچکدار تعاون کرتے ہیں، لیکن وہ بھی یہ رویہ بہت مختصر تعداد میں محض ان ہمراہیوں کے ساتھ روا رکھتے ہیں جنھیں وہ بہت قریب سے جانتے ہوں۔ سیپین انتہائی لچکدار انداز میں لاتعداد اجنبیوں کے ساتھ معاون ہوسکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سیپین دنیا پر حاکم ہیں، جب کہ چیونٹیاں ہمارا جھوٹا کھاتی ہیں، اور بن مانس چڑیا گھر یا تحقیقی لیبارٹریوں میں بند ہیں۔

پیجو (Peugeot) کی داستان

ہمارے عم زاد بن مانس کئی درجن پر مشتمل چھوٹے گروہوں میں رہتے ہیں۔ وہ آپس میں گہری دوستیاں قائم کرتے ہیں، مل کر شکار کرتے ہیں اور شانہ بہ شانہ دشمن سے لڑتے ہیں، مثلاً لنگوروں، چیتوں اور دشمن بن مانسوں سے۔ ان کا سماجی نظام شاہانہ ہے۔ سردار، جو تقریباً ہمیشہ نر ہی ہوتا ہے، اسے 'الفا' نر کہتے ہیں۔ دوسرے نر اور مادہ اپنی تابعداری کا اظہار اس کے سامنے جھک کر غراتی آواز نکال کر کرتے ہیں، جیسے کسی بادشاہ کے سامنے اس کی رعایا۔ یہ الفا نر اپنے گروہ میں سماجی امن قائم رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ جب دو بن مانسوں میں جنگ چھڑ جائے تو یہ مداخلت کرکے تشدد کو رکواتا ہے۔ لیکن اتنا فیاض بھی نہیں، وہ پسندیدہ غذا صرف اپنے لیے مخصوص کر لیتا ہے۔ اکثر نچلے طبقے کے نر کو مادہ سے ہم بستری سے بھی روک سکتا ہے۔

جب الفا پوزیشن کے لیے دو نر دعویدار ہو جائیں، تو وہ گروہ کے اندر ہی اپنے حمایتیوں کے چھوٹے گروہ بنا لیتے ہیں، جن میں نر و مادہ دونوں ہی شامل ہوتے ہیں۔ ایک گروہ کے اراکین کے درمیان تعلقات کا انحصار ان کے روزمرہ کے قریبی روابط پر ہے: معانقہ، لمس، بوسہ بازی، پرورش اور باہمی رعایت۔ بالکل جیسے انسانی سیاست دان الیکشن کی مہم کے دوران مصافحے اور بچوں کو پیار کرنے کے دورے پر نکلتے ہیں، اسی طرح بن مانسوں کے گروہ میں سربراہی کا دعویدار خاصا وقت معانقوں، پشت پر ہاتھ مارنے اور بن مانس بچوں کو پیار کرنے میں صرف کرتا ہے۔ الفا نر عموماً اس عہدے کے لیے یوں کامیاب ہوتا ہے کہ طبعی طور پر زیادہ طاقت ور نہ بھی ہو لیکن ایک زیادہ بڑے اور متوازن گروہ کا لیڈر رہو۔ یہ تعلقات نہ صرف الفا پوزیشن حاصل کرنے کے لیے جنگ میں کام آتے ہیں، بلکہ تقریباً تمام روزمرہ کے کاموں میں بھی۔ ایک گروہ کے ممبران اپنا بیشتر وقت ساتھ ہی گزارتے ہیں، غذا میں اشتراک کرتے ہیں اور مشکل وقت میں ایک دوسرے کے کام آتے ہیں۔

اس طرح سے گروہ بندی کر کے اسے قائم رکھنے میں اراکین کی محدود تعداد ہی ممکن ہے۔ صحیح طور پر کام کرنے کے لیے گروہ کے تمام اراکین کا ایک دوسرے کو قریب سے جاننا بہت ضروری ہے۔ وہ بن مانس جو کبھی نہیں ملے، کبھی ساتھ لڑے نہیں، اور جنھوں نے مل کر پرورش نہیں کی، انہیں نہیں معلوم ہوگا کہ وہ ایک دوسرے پر بھروسہ کر سکتے ہیں یا نہیں۔ کیا ایک دوسرے کے کام آنا مفید ہوگا؟ اور پھر ان دونوں میں سے کسے سماجی برتری حاصل ہے؟ عام قدرتی حالات میں بن مانسوں کے کسی گروہ میں بیس سے پچیس افراد ہوتے ہیں۔ جب گروہ کے اراکین کی تعداد تجاوز کرنے لگے تو معاشرتی نظام میں خلل پڑنے لگتا ہے، یہاں تک کہ وہ بکھر جائے اور گروہ کے کچھ اراکین ایک نیا گروہ بنا لیں۔ شاذ ہی ماہرین حیوانات نے سو اراکین سے زیادہ پر مشتمل گروہ دیکھے ہیں۔ علیحدہ گروہ ایک دوسرے سے تعاون نہیں کرتے۔ علاقے اور غذا کے لیے مقابلہ بازی رہتی ہے۔ محققین نے گروہوں کے مابین طویل جنگیں دیکھیں ہیں، اور کم از کم ایک معاملے میں نسل کشی بھی دیکھی جب ایک گروہ نے باقاعدگی سے پڑوسی گروہ کے بیشتر اراکین کو منظم طریقے سے قتل کیا۔

غالباً قدیم انسان، جن میں قدیم ہوموسیپین بھی شامل تھے، انہی سماجی اصولوں پر کاربند تھے۔ بن مانسوں کی مانند انسانوں میں بھی سماجی حسیت ہوتی ہے، جس نے ہمارے آبا کو دوستی اور طبقے قائم کرنے میں مدد دی، مل کر شکار کھیلنا اور لڑنا سکھایا۔ لیکن بن مانس کی مانند انسانوں کی سماجی حسیت بھی چھوٹے قریبی گروہوں کے لیے موزوں تھی۔ جب گروہ بہت بڑے ہو جاتے تو ان کا سماجی نظام بگڑ جاتا اور گروہ ٹوٹ جاتے۔ اگر کوئی مخصوص ہریالی وادی پانچ سو سیپین کو غذا فراہم کرنے کے لیے کافی بھی ہوتی، تب بھی اتنے سارے اجنبی ساتھ مل کر رہنے سے قاصر تھے۔ وہ یہ کیسے طے کرتے کہ سربراہ کون ہوگا، کس کو کہاں شکار کھیلنا ہے اور کون کس سے جفتی کرے گا۔

ادراکی انقلاب میں غیبت نے ہوموسیپین کی مدد کی کہ وہ بڑے اور مستحکم گروہ بنا سکیں۔ لیکن غیبت کی بھی حدود ہیں۔ سماجی تحقیق سے ثابت ہوا ہے کہ محض غیبت کی بنیاد پر قائم بڑے سے بڑا گروہ ڈیڑھ سو افراد کا ہوتا ہے۔ زیادہ تر لوگ ڈیڑھ سو سے زیادہ انسانوں کو نہ قریب سے جان سکتے ہیں اور نہ ان کے بارے میں غیبت کر سکتے ہیں۔

آج بھی بیشتر انسانی تنظیموں میں تقریباً اسی جادوئی تعداد کی ایک نازک حد قائم ہے۔ اس حد سے کم تعداد میں بہت قریبی تعلقات اور افواہ طرازی سے برادری، تجارت، سماجی نیٹ ورک اور فوجی گروہ قائم رکھ سکتے ہیں۔ یہاں تک امن قائم رکھنے کے لیے رسمی عہدہ، خطاب یا قانونی کتب ضروری نہیں ہیں۔ تیس فوجیوں کی ایک پلاٹون یا سو فوجیوں کی ایک کمپنی بھی قریبی تعلقات کی بنا پر، بغیر کسی رسمی پابندیوں کے خوب کام کر سکتی ہے۔ ایک بہت قابل عزت سارجنٹ بھی کمپنی کا 'بادشاہ' بن سکتا ہے، وہ کمیشنڈ افسران تک پر حکم چلا سکتا ہے۔ ایک چھوٹی خاندانی تجارت بغیر بورڈ آف ڈائرکٹرز، رسمی سربراہ یا خزانچی کے بھی پھل پھول سکتی ہے۔

لیکن ایک بار ڈیڑھ سو نفوس کی حد سے بڑھ جائے تو چیزیں اس طرح خوب کام نہیں کرتیں۔ آپ ہزاروں فوجیوں پر مشتمل ڈویژن اس طرح نہیں چلا سکتے جیسے کوئی پلاٹون۔ کامیاب خاندانی تجارت جب بڑھ جائیں تو عموماً مشکل کا شکار ہو جاتے ہیں، انہیں مزید ملازم رکھنے پڑتے ہیں، اگر وہ از سر نو منظم نہیں ہوتے تو ختم ہو جاتے ہیں۔

ہوموسیپین نے اس نازک حد کو عبور کر کے کیسے لاکھوں شہریوں پر مشتمل شہر بنائے اور کروڑوں کی رعایا پر

حکومت کی؟ اس کا راز غالب مفروضوں کی پیدائش سے ہوا۔ بڑی تعداد میں اجنبی کسی مشترکہ مفروضے کی بنیاد پر ایک
دوسرے سے کامیابی سے تعاون کر سکتے ہیں۔

کوئی بھی بڑی انسانی معاونت، خواہ ایک جدید ریاست ہو، ایک پرانا چرچ، کوئی قدیم شہر یا قدیم
قبیلے، ان سب کی بنیاد کسی مشترکہ داستان سے وابستہ ہے، جو محض لوگوں کی مشترکہ فرضی سوچ ہے۔ چرچوں کی بنیاد
مذہبی مفروضوں پر ہے۔ دو کیتھولک جو کبھی نہیں ملے ہوں، مل کر صلیبی تحریک کے لیے کام کر سکتے ہیں، یا کوئی ہسپتال
قائم کرنے کے لیے چندہ اکٹھا کر سکتے ہیں۔ کیوں کہ دونوں گروہوں کو یقین ہے کہ خداوند انسانی شکل میں اتر آیا تھا
اور اس نے ان کے گناہوں کی پاداش میں خود کو مصلوب کیے جانے کی اجازت دی تھی۔ ریاستیں مشترکہ قومی روایات
پر قائم ہیں۔ دو سربین افراد جو پہلے کبھی نہ ملے ہوں، ایک دوسرے کی جان بچانے کے لیے خود اپنی جان خطرے
میں ڈال سکتے ہیں، کیوں کہ وہ دونوں سربین قومیت کے وجود پر یقین رکھتے ہیں، سربیا کا وطن اور سربیا کا جھنڈا۔
عدالتی نظام مشترکہ خاندانی روایات پر قائم ہے۔ دو وکیل جو ایک دوسرے سے ناواقف ہیں، پھر بھی مل کر ایک اجنبی
کے دفاع کے لیے کام کر سکتے ہیں، کیوں کہ وہ دونوں قانون، انصاف اور انسانی حقوق کے وجود پر یقین رکھتے ہیں،
اور ہاں اپنی فیس پر بھی۔

لیکن پھر بھی ان میں سے کوئی بات ان کہانیوں سے باہر نہیں جو لوگ تراشتے ہیں، اور ایک دوسرے کو
سناتے ہیں۔ افراد کے مشترکہ تصور سے باہر کائنات میں کوئی خدا، کوئی مملکت، کوئی دولت، کوئی انسانی حقوق، کوئی
قوانین، کوئی انصاف وجود نہیں رکھتا۔

لوگ یہ بات با آسانی سمجھ جاتے ہیں کہ ابتدائی انسانوں نے اپنے سماجی نظام کی تشکیل کے لیے بھوت
پریت پر یقین کیا، اور ہر پُر نکس چاند راتوں میں مل کر آگ کے گرد رقصاں ہوئے۔ جو بات ہم سمجھ نہیں پاتے وہ یہ کہ
ہمارے جدید ادارے بھی ان ہی بنیادوں پر کام کر رہے ہیں۔ مثلاً تجارتی کارپوریشنوں کی دنیا کو دیکھیے۔ جدید تاجر
اور وکیل دراصل طاقت ور فسوں طراز ہیں۔ ان میں اور قبائلی جادوگروں میں واحد فرق یہ ہے کہ یہ اور بھی زیادہ
ناقابل یقین کہانیاں سناتے ہیں۔ پیوجو (Peugeot) کی کہانی ایک اچھی مثال ہے۔

اسٹاڈیل کے شیر نما آدمی کا نشان آج ہمیں پیرس سے سڈنی تک کاروں، ٹرکوں اور موٹر سائیکلوں پر نظر آتا
ہے۔ یہ وہ زیور ہے جس سے پیوجو کمپنی کی بنی گاڑیاں آراستہ ہوتی ہیں۔ یورپ کی قدیم ترین اور سب سے بڑی
کمپنیوں میں سے ایک، پیوجو کا آغاز اسٹاڈیل غار سے محض تیس کلومیٹر دور وادی ویلنٹگنی (Valentigney) میں
ایک چھوٹے خاندانی بزنس کے طور پر ہوا۔ آج اس کمپنی میں دو لاکھ افراد ملازم ہیں، ان میں سے بیشتر ایک دوسرے
سے ناواقف ہیں۔ یہ اجنبی ایک دوسرے سے اتنا قریبی تعاون کرتے ہیں کہ ۲۰۰۸ میں پیوجو نے پندرہ لاکھ سے
زیادہ گاڑیاں تیار کیں، جن سے پچپن ارب یورو سے زیادہ کی آمدنی ہوئی۔

ہم کس بنیاد پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ پیوجو ایس اے (کمپنی کا سرکاری نام) وجود رکھتی ہے؟ پیوجو کی بہت سی
گاڑیاں ہیں، مگر ظاہر ہے کہ یہ تو کمپنی نہیں۔ اگر دنیا کی تمام پیوجو گاڑیاں بھی ایک ساتھ ختم ہو کر کباڑیے کے ہاں
فروخت ہو جائیں، تب بھی پیوجو ایس اے تو باقی رہے گی۔ یہ مزید نئی کاریں بناتی رہے گی، اور نئی سالانہ رپورٹ کا
اجرا بھی کرتی رہے گی۔ اس کمپنی کی اپنی فیکٹریاں ہیں، مشینیں ہیں، شوروم ہیں۔ یہ میکانک، اکاؤنٹنٹ اور سیکریٹری

ملازم رکھتی ہے لیکن یہ سب مل کر بھی پیوجو نہیں ہیں۔ کوئی حادثہ ان سب پیوجو کے ملازمین کو ختم کر دے اور اس کی کاریں بنانے کی تمام فیکٹریاں اور افسروں کے دفاتر تباہ کر دے، پھر بھی کمپنی قرض لے کر نئے ملازم بھرتی کر سکتی ہے، نئی فیکٹریاں تعمیر کر سکتی ہے اور نئی مشینیں خرید سکتی ہے۔ پیوجو کے مینیجر ہیں، اس کے حصص کے مالکان ہیں لیکن یہ بھی مل کر پیوجو نہیں بناتے۔ سب مینیجر برطرف کر دیے جائیں، تمام حصص فروخت ہو جائیں، لیکن پھر بھی کمپنی قائم رہے گی۔
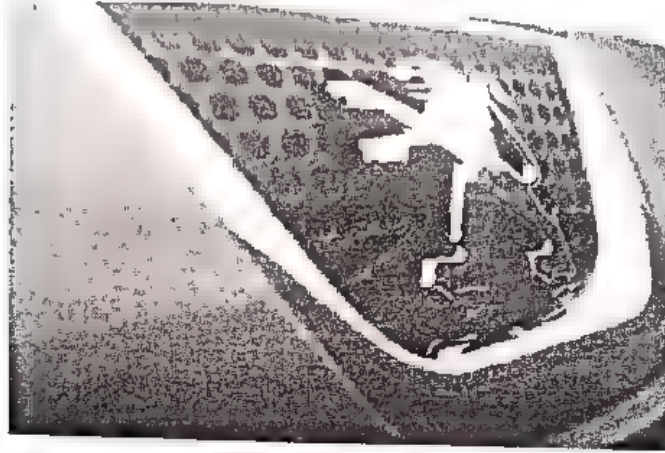
پیوجو کمپنی کا شیر نما آدمی کا نشان

اس کا یہ مطلب نہیں کہ پیوجو کمپنی کو دوام حاصل ہے، یا وہ لازوال ہے۔ اگر کوئی جج کمپنی کو بند کرنے کا حکم جاری کر دے، تو اس کی فیکٹریاں لگی رہیں گی، اس کے کارکن اکاؤنٹنٹ، مینیجر، حصص بردار سب زندہ رہیں گے۔ لیکن پیوجو ایس اے فوراً ختم ہو جائے گی۔ مختصر یہ کہ لگتا ہے کہ پیوجو ایس اے کا طبعی دنیا سے کوئی رابطہ نہیں ہے، کیا وہ واقعی وجود رکھتی بھی ہے؟

پیوجو ہمارے مشترکہ مفروضے کی ایک مثال ہے۔ قانون دان اسے قانونی مفروضہ (لیگل فکشن) کہتے ہیں۔ یہ کوئی طبعی شے نہیں ہے، آپ اس کی نشان دہی نہیں کر سکتے، لیکن یہ ایک قانونی وجود ہے۔ میرے اور آپ کی مانند یہ اپنے میزبان ملک کے قوانین کی پابندی کرتی ہے۔ یہ بینک اکاؤنٹ کھول سکتی ہے، جائیداد کی خرید و فروخت کر سکتی ہے، یہ مالیہ ادا کرتی ہے اور اس پر دعویٰ کیا جا سکتا ہے۔ جو لوگ اس میں کام کرتے ہیں، یا اس کے مالک ہیں، ان سے علیحدہ بھی اس پر فرد جرم عائد ہو سکتی ہے۔

پیوجو کا تعلق قانونی مفروضوں کے ایک مخصوص قبیلے سے ہے جسے محدود ذمہ داری کی کمپنی کہتے ہیں۔ ان کمپنیوں کے پس منظر میں جو سوچ کارفرما ہے، وہ انسانیت کی ذہین ترین ایجادات میں سے ہے۔ ہوموسیپین ان کے بغیر بھی ہزاروں سال زندہ رہے۔ بیشتر تحریری تاریخ میں جائیداد کا مالک صرف گوشت پوست کا انسان ہو سکتا تھا، وہ قسم جو پچھلے پاؤں پر کھڑی ہوتی ہے، اور جو بڑے دماغ کی مالک ہے۔ اگر تیرھویں صدی فرانس میں جین نے ایک ویگن بنانے کا کارخانہ لگایا تو وہی اس کا کاروبار تھا۔ اگر کوئی ویگن خریداری کے ایک ہفتے بعد خراب ہو جاتی، تو معترز گاہک جین پر فوجداری کر دیتے۔ اگر جین نے وہ کارخانہ لگانے کے لیے ایک ہزار طلائی سکے مستعار لیے ہوتے، اور کاروبار ناکام ہو جاتا تو اسے وہ قرضہ اپنی ذاتی جائیداد فروخت کر کے ادا کرنا پڑتا، جس میں گھر، گائے، زمین سب

شامل تھے۔ ممکن ہے کہ اسے اپنی اولاد تک غلامی میں دینی پڑتی۔ اگر وہ قرضہ واپس نہیں دے پاتا تو ممکن ہے کہ ریاست اسے پس زنداں ڈال دیتی، یا اس کے قرض خواہ اسے غلام بنا لیتے۔ وہ بنا کسی حدود کے، قرضے کی واپسی کا مکمل ذمہ دار تھا۔

اگر آپ اس زمانے میں زندہ ہوتے تو کوئی کارخانہ لگانے سے پہلے دو بار سوچتے۔ یقیناً یہ قانونی صورت حال کاروبار کے فروغ میں مانع تھی۔ لوگ نیا کاروبار شروع کرنے اور اقتصادی خطرہ مول لینے سے ڈرتے تھے۔ وہ ایسی قسمت آزمائی کو تیار نہ ہوتے جس میں ان کے خاندان کو مکمل تباہی کا شکار ہو جانے کا امکان ہو۔

یہی وجہ ہے کہ لوگوں کی مشترکہ سوچ میں محدود ذمہ داری کی کمپنیوں کا خیال پیدا ہوا۔ یہ کمپنیاں ان لوگوں سے قانونی طور پر علیحدہ تھیں جنہوں نے اس میں سرمایہ کاری کی۔، اسے قائم کیا یا اس کا نظم و نسق سنبھالا۔ گزشتہ چند صدیوں میں ایسی کمپنیاں اقتصادی میدان کی اہم کھلاڑی بن گئی ہیں۔ ہم ان کے اس قدر عادی ہو گئے ہیں کہ یہ بھی فراموش کر بیٹھے کہ یہ محض تصوراتی ہیں۔ امریکہ میں محدود ذمہ داری کی کمپنی کی اصطلاح کارپوریشن ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ یہ لاطینی لفظ کارپس (یعنی جسم) سے ماخوذ ہے، وہ واحد چیز جو ان کارپوریشنوں میں مفقود ہے۔ اصل جسم نہ ہونے کے باوجود، امریکی قانون کارپوریشن کو ایک قانونی فرد کی طرح برتتا ہے، جیسے وہ گوشت پوست کے انسان ہوں۔

فرانسیسی قانون بھی ۱۸۹۶ میں کارپوریشن کو فرد ہی سمجھتا تھا، جب آرمنڈ پیوجو نے اپنے والدین سے ایک دھاتی کارخانہ وراثت میں حاصل کیا، جس میں اسپرنگ، آری اور سائیکلیں بنتی تھیں۔ اس نے کاروں کی تجارت شروع کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس مقصد کے لیے اس نے ایک محدود ذمہ داری کی کمپنی قائم کی۔ اس نے کمپنی کو اپنا نام ضرور دیا لیکن وہ اس سے علیحدہ تھی۔ اگر کوئی کار خراب ہو جاتی تو خریدار کمپنی پر نالش کر سکتا تھا لیکن آرمنڈ پیوجو پر نہیں۔ اگر یہ کمپنی لاکھوں فرانک قرض لے کر ختم ہو جاتی تو بھی آرمنڈ پیوجو قرضداروں کو ایک فرانک بھی واپس کرنے کا پابند نہیں تھا۔ یہ قرضہ بہرحال پیوجو کمپنی کو دیا گیا تھا، آرمنڈ پیوجو ہوموسیپین کو نہیں۔ آرمنڈ پیوجو کا ۱۹۱۵ میں انتقال ہو گیا، کمپنی اب تک قائم ہے اور ترقی کر رہی ہے۔

تو اس شخص آرمنڈ پیوجو نے بھلا کمپنی کیسے قائم کی؟ بالکل اسی طرح تاریخ کے دورانیے میں فسوں طرازوں اور راہبوں نے شیاطین اور خداؤں کو تراشا ہے۔ جس میں ہزاروں فرانسیسی پادری ہر اتوار کو اپنے گرجا میں یسوع مسیح کو دوبارہ زندہ کرنے کی سعی کرتے ہیں۔ اس تمام کی بنیاد داستان گوئی اور لوگوں کو ان داستانوں پر یقین کرنے کے لیے ترغیب دینا ہے۔ فرانسیسی پادریوں کے لیے کیتھولک چرچ کی سنائی یسوع مسیح کی زندگی و موت کی کہانی اہم ہے۔ اس کہانی کے مطابق اگر ایک کیتھولک پادری اپنے عبا میں ملبوس، صحیح موقع پر صحیح الفاظ عقیدت سے ادا کرے تو دنیاوی روٹی اور شراب خداوند مسیح کے گوشت اور خون میں بدل جاتی ہے۔ پادری لاطینی میں کہتا ہے " یہ میرا جسم ہے اور جنتر منتر سے روٹی خداوند مسیح کے عضلات میں بدل جاتی ہے۔ یہ دیکھ کر کہ پادری نے تمام ارکان درست انہماک سے انجام دیے ہیں، لاکھوں عقیدت مند فرانسیسی کیتھولک یہ ایمان لے آتے ہیں کہ خداوند مسیح کی روح اس مقدس روٹی اور شراب میں سرایت کر گئی ہے۔

پیوجو ایس اے کے معاملے میں اصل کہانی فرانسیسی پارلیمنٹ کے لکھے فرانسیسی قانونی ضابطے میں

ہے۔فرانسیسی قانون سازوں کے مطابق اگر ایک سند یافتہ وکیل، رسوم وارکان احسن طریقے سے انجام دے، تمام شقیں اور حلف ایک دیدہ زیب کاغذ پر اندراج کرے، اور اس دستاویز کے دامن پر اپنی دستخط سجادے، تو جنتر منتر ایک نئی کمپنی قائم ہوجاتی ہے۔ جب ۱۸۹۶ میں آرمنڈ پیوجو یہ کمپنی بنانا چاہتا تھا، تو اس نے ایک وکیل کو ان تمام مقدس مراحل سے گزرنے کے لیے معاوضہ دیا۔ ایک دفعہ اس وکیل نے تمام ضروری رسومات مکمل کرلیں، اور تمام لازمی منتر پھونک دیے، حلف داخل کردیے، تو لاکھوں نیک فرانسیسی شہری ایسے بن گئے جیسے پیوجو کمپنی واقعی وجودی حقیقت ہو۔

موثر کہانی سنانا آسان نہیں ہے۔ دشواری کہانی سنانے میں نہیں، بلکہ لوگوں کو اس کہانی پر یقین کرنے پر آمادہ کرنے میں ہے۔ بیشتر تاریخ اسی نکتے کے گرد گھومتی ہے کہ کیسے کہانی گو لاکھوں انسانوں کو خدا، ریاست یا محدود ذمہ داری کی کمپنیوں پر یقین کرنے پر آمادہ کرے۔۔ پھر بھی جب یہ کامیاب ہوجائیں تو سیپین کو بہت قوی کرتی ہیں، کیوں کہ اب لاکھوں اجنبی ایک مشترکہ مقصد کے حصول کے لیے کام کرنے پر تیار ہوجاتے ہیں۔ ذرا سوچیے کہ ریاست، چرچ یا نظام عدالت قائم کرنا کتنا دشوار ہوتا اگر ہم صرف وجودی اشیا کا ہی ذکر کرتے مثلاً دریا، درخت یا شیر۔

گزرتے زمانے کے ساتھ لوگوں نے انتہائی پیچیدہ کہانیوں کا سلسلہ بنا لیا ہے۔ اس سلسلے میں مفروضے مثلاً پیوجو نہ صرف موجود ہیں، بلکہ طاقتور ہوجاتے ہیں۔ کہانیوں کے ان سلسلوں کی وساطت سے لوگ جو تخلیق کرتے ہیں، تدریسی دنیا میں اسے فکشن، سماجی تعمیر یا فرضی حقیقتوں کا نام دیا جاتا ہے۔ ایک فرضی سچائی جھوٹ نہیں ہے۔ جھوٹ میں اس وقت بول رہا ہوں گا جب میں کہوں کہ دریا کے پاس ایک شیر موجود ہے، جب کہ میں اچھی طرح واقف ہوں کہ وہاں کوئی شیر موجود نہیں تھا۔ دروغ میں کوئی خاص بات نہیں ہے۔ ہرے بندر اور بن مانس بھی جھوٹ بول سکتے ہیں۔ مثلاً دیکھا گیا ہے کہ ہرا بندر، جب کوئی شیر موجود نہ ہو تب بھی "خبردار شیر ہے!' کی پکار لگاتا ہے۔ اس خطرے کی گھنٹی کو سن کر وہ رفیق بندر ڈر کر بھاگ جاتا ہے جس نے ابھی ایک کیلا تلاش کیا تھا، یوں اس دروغ گو کو وہ انعام چرانے کے لیے تنہا چھوڑ دیتا ہے۔

دروغ کے مقابلے میں فرضی حقیقت ایک ایسا امر ہے جس پر سب یقین رکھتے ہیں۔ جب تک یہ گروہی یقین برقرار رہے، وہ فرضی حقیقت دنیا پر اپنا اثر ڈالتی رہتی ہے۔ اس اسٹاڈیل کے غار کا بت تراش ہوسکتا ہے کہ واقعی ایک شیر نما نگراں روح کی موجودگی پر یقین رکھتا ہو۔ کچھ فسوں طراز شعبدے باز ہوتے ہیں، لیکن اکثر خدا اور بھوت پریت کے وجود پر یقین رکھتے ہیں۔ کچھ لکھ پتی واقعی دولت اور محدود ذمہ داری کی کمپنیوں کے وجود پر یقین رکھتے ہیں۔ بہت سے انسانی حقوق کے علم بردار انسانی حقوق پر یقین رکھتے ہیں ۲۰۱۱ میں اس وقت کوئی بھی جھوٹ نہیں بول رہا تھا جب اقوام متحدہ نے لیبیا سے مطالبہ کیا کہ وہ اپنے شہریوں کے حقوق کو پامال نہ کرے۔ جب کہ اقوام متحدہ، لیبیا اور انسانی حقوق سب ہمارے زرخیز ذہن کی پیداوار ہیں۔

ادراکی انقلاب کے بعد سے سیپین ایک دہری حقیقت کے ساتھ زندہ ہیں۔ ایک طرف تو دریاؤں، درختوں اور شیروں کی اصل حقیقت ہے اور دوسری جانب خداؤں، ریاستوں اور کارپوریشنوں کی فرضی حقیقت۔ وقت گزرنے کے ساتھ یہ فرضی حقائق اور زیادہ طاقتور ہوگئے۔ یہاں تک کہ آج دریاؤں، درختوں اور شیروں کا وجود

ہی فرضی حقیقتوں مثلاً امریکہ اور گوگل (Google) کے رحم وکرم پر ہے۔

جینیاتی نقشے سے کنارہ کشی

لفظوں سے ایک فرضی حقیقت تراشنے سے اجنبیوں کی ایک بہت بڑی تعداد موثر انداز میں باہمی تعاون کے قابل ہوگئی۔ لیکن دراصل اس کا اثر اس سے بھی زیادہ تھا۔ کیوں کہ بڑے پیمانے پر انسانی تعاون کی بنیاد روایت ہے، تو لوگوں کے تعاون کا انداز بھی روایت بدلنے سے تغیر پذیر ہوسکتا ہے، مثلاً کوئی مختلف داستان سنا کر۔ موزوں حالات میں تو روایات تیزی سے بدل سکتی ہیں۔ ۱۷۸۹ء میں فرانسیسی عوام نے تقریباً راتوں رات بادشاہ کے خدائی حقوق سے منہ موڑ کر عوام کی حاکمیت کی روایت پر ایمان قائم کیا۔ لہٰذا ادراکی انقلاب کے بعد سے ہوموسیپین بدلتی ضرورتوں کے ساتھ تیزی سے اپنا رویہ بدلتے رہے ہیں۔ یوں سماجی انقلاب کی ایک تیز رفتار راہ کھل گئی، جو جینیاتی ارتقا کے ٹریفک جام سے کنارہ کش ہوگئی۔ اس تیز رفتار راہ پر دوڑتے ہوئے، ہوموسیپین نے نوع انسانی کی دیگر تمام اقسام اور حیوانات کو تعاون کی اہلیت میں پیچھے چھوڑ دیا ہے۔

دوسرے سماجی جانوروں کے رویے کا بیشتر حصہ ان کی جین سے متعین ہوتا ہے۔ ڈی این اے کوئی آمر نہیں ہے، حیوانات کا رویہ ماحولیاتی اور ذاتی اثرات سے بھی اثرانداز ہوتا ہے۔ پھر بھی اگر ماحول ایک جیسا ہو تو کسی مخصوص اسپیسی کے جانور ایک ہی طرح کا رویہ رکھتے ہیں۔ سماجی برتاؤ میں کوئی قابل ذکر اضافہ کسی جینیاتی تبدیلی (میوٹیشن) کے بغیر رونما نہیں ہوتا۔ مثلاً عام بن مانسوں کا جینیاتی رویہ یہ ہے کہ وہ طبقاتی گروہ بندی کریں، جس کا سربراہ ایک الفا نر ہو۔ جب کہ ایک بہت قریبی بن مانس کی اسپیسی، بونابوس کے اراکین مساوی انداز میں رہتے ہیں، اور رہ نمائی عموماً کوئی عورت کرتی ہے۔ لیکن عام مادہ بن مانس اپنی بونابوس رشتہ دار سے متاثر ہوکر حقوق نسواں کا انقلاب برپا نہیں کرسکتی۔ نر بن مانس کسی قانون ساز اسمبلی میں بیٹھ کر الفا نر کا عہدہ ختم نہیں کرسکتے۔ نہ ہی یہ اعلان کرسکتے ہیں کہ آج سے طبقاتی فرق ختم اور تمام بن مانسوں سے یکساں سلوک ہوگا۔ رویوں میں یہ ڈرامائی تبدیلی اسی صورت ممکن ہے کہ اگر بن مانس کے ڈی این اے میں کوئی تبدیلی آجائے۔

انہی وجوہات کی بنا پر قدیم انسانوں نے بھی کسی انقلاب کا آغاز نہیں کیا۔ جہاں تک ہمیں علم ہے سماجی طریق میں تبدیلی، نئی ٹیکنالوجی، نئے مقامات پر آبادکاری ان سب کے پیچھے جینیاتی تبدیلی اور ماحولیاتی دباؤ کارفرما تھا، سماجی تحاریک نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انسانوں کو یہ اقدامات کرنے میں لاکھوں برس لگے۔ بیس لاکھ سال پہلے جینیاتی تبدیلی کی وجہ سے انسانوں کی ایک نئی قسم نے جنم لیا؛ ہوموایریکٹس۔ ان کے نمودار ہونے کے ساتھ ہی پتھریلے اوزاروں کی نئی ٹیکنالوجی بھی سامنے آئی، جسے اس اسپیسی کے لیے اب ایک اہم موڑ سمجھا جاتا ہے۔ جب تک کہ ہومو ایریکٹس کسی نئی جینیاتی تبدیلی سے نہیں گزرے، آئندہ بیس لاکھ سال تک ان کے پتھریلے اوزار ویسے ہی رہے۔ اس کے مقابلے میں ادراکی انقلاب کے بعد، سیپین نے اپنا رویہ تیزی سے تبدیل کیا تھا۔ بغیر کسی جینیاتی یا ماحولیاتی تبدیلی کے وہ اپنا نیا رویہ مستقبل کی نسلوں کو پہنچانے میں کامیاب رہے۔ مثال کے طور پر لاولد اشرافیہ کا تسلسل سے نمودار ہوتا دیکھیے۔ مثلاً کیتھولک پادری، بدھ مت کے راہب اور مخنث چینی بیوروکریسی۔ ایسے چیدہ افراد کی موجودگی نظری چناؤ کے بنیادی قوانین کے خلاف ہے، کیوں کہ معاشرے کے یہ معززین رضاکارانہ طور پر افزائش نسل سے

وست بردار ہو گئے۔ جب کہ بن مانسوں میں الفا نر اپنی طاقت کے بل پر جتنی زیادہ مادائوں سے ممکن ہو جفتی کرتا ہے، اور نتیجے میں اپنی اولادوں کی پوری ایک نئی ٹیم پیدا کرتا ہے۔ لیکن کیتھولک الفا نر جفتی اور اولاد کی پرورش سے مکمل دست برداری اختیار کرتا ہے۔ یہ کنوار پن کسی مخصوص ماحولیاتی حالت کی وجہ سے نہیں، مثلاً غذا کی کمی یا عورتوں کی قلت، اور نہ ہی یہ کسی دلچسپ جینیاتی تبدیلی کا کارنامہ ہے۔ کیتھولک چرچ صدیوں سے قائم ہے، لیکن یہ ایک پوپ سے دوسرے پوپ تک کسی کنوار پن کی جین میں تبدیلی کی وجہ سے نہیں، بلکہ یہ نئی بائبل اور کیتھولک پادریوں کے لیے قانون کی کہانی سنانے کی وجہ سے ممکن ہوا۔

کیتھولک الفا نر جنسی تعلقات اور بچوں کی پرورش سے دور رہتے ہیں۔ حالانکہ انہیں ایسا کرنے کی کوئی ماحولیاتی یا جینیاتی وجہ نہیں

دوسرے الفاظ میں قدیم انسانوں کے رویے تو ہزار ہا سال کے لیے منجمد رہے۔ جب کہ سیپین اپنا سماجی نظام، باہمی تعلقات کی نوعیت، اقتصادی اقدامات اور کئی دوسرے رویے محض دس بیس سالوں میں ہی بدل دینے پر قادر ہیں۔ ایک برلن کا شہری تصور کیجیے جو ۱۹۰۰ میں پیدا ہوا ہو، اور پورے سو برس زندہ رہا۔ اس نے اپنا بچپن تو ولیم ثانی کی سلطنت میں گزارا۔ جب کہ جوانی وائمر ریپبلک، نازی جرمنی اور پھر کمیونسٹ مشرقی جرمنی میں، جب کہ اس کا انتقال جمہوری متحدہ جرمنی میں ہوا۔ گو اس کا ڈی این اے بالکل وہی رہا لیکن وہ پانچ مختلف سماجی ادوار سے گزرا۔

سیپین کی کامیابی کی یہی کلید تھی۔ دو بدو مقابلے میں شاید ایک نینڈرتھال ایک سیپین کو پچھاڑ دے۔ لیکن اگر مقابلہ سینکڑوں کے درمیان ہو تو نینڈرتھال کے بچنے کی کوئی امید نہیں۔ نینڈرتھال شیر کے محل وقوع کے بارے میں معلومات کا تبادلہ تو کر سکتے تھے، لیکن وہ قبائلی ارواح کی کہانیاں نہ گھڑ سکتے تھے اور نہ سنا سکتے تھے۔ فکشن تخلیق کرنے کی اہلیت کے بغیر نینڈرتھال بڑی تعداد میں باہمی تعاون سے عاجز تھے۔ نہ ہی وہ تیزی سے بدلتے حالات

کے مطابق اپنا سماجی رویہ ڈھال سکتے تھے۔

گو ہم نینڈرتھال کے دماغ میں جھانک کر یہ تو معلوم نہیں کر سکتے کہ وہ کیا سوچ رہے ہیں، لیکن اپنے سیپئین عدو کے مقابلے میں ان کی محدود ادراکی اہلیت کے ہمارے پاس بالواسطہ ثبوت موجود ہیں۔ وسطی یورپ سے تیس ہزار سال پرانے سیپئین کے آثار کھودنے والے ماہرین عمرانیات نے کبھی کبھار وہاں بحرِ اوقیانوس اور بحیرہ روم کے ساحلوں سے سیپیوں کے خول بھی دریافت کیے ہیں۔ امکان یہی ہے کہ اندرون براعظم یہ سیپیاں مختلف سیپئین گروہوں کے درمیان لمبے فاصلوں کی تجارت کے ذریعے پہنچے۔ نینڈرتھال کے علاقوں سے تجارت کا کوئی ایسا ثبوت نہیں ملتا۔ یہ گروہ اپنے ہتھیار خود مقامی خام مال سے ہی تیار کرتا۔

ایک اور مثال جنوبی بحرالکاہل سے ملتی ہے۔ نیو گنی کے شمال میں جزائر نیو آئرلینڈ کے باشندے سیپئین ایک آتش فشاں گلاس اوبسیڈین (Obsidian) کو مضبوط اور تیز دھار ہتھیار بنانے کے لیے استعمال کرتے تھے۔ لیکن نیو آئرلینڈ میں تو اوبسیڈین کے کوئی قدرتی ذخائر تھے نہیں۔ لیبارٹری کی جانچ نے ثابت کیا ہے کہ جو اوبسیڈین انہوں نے استعمال کیا، وہ نیو انگلستان سے لائے تھے، ایک جزیرہ جو چار سو کلومیٹر دور تھا۔ ان جزیروں کے آباد کاروں میں سے کچھ یقیناً مشاق راہ نما رہے ہوں گے، جو لمبے فاصلوں کی بین الجزائر تجارت کرتے تھے۔

ممکن ہے کہ تجارت بہت عملی فعل لگے جس میں مفروضوں کا زیادہ دخل نہیں ہو۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ سیپئین کے علاوہ دوسرا کوئی جانور تجارت نہیں کرتا۔ اور سیپئین کے وہ تمام تجارتی سلسلے جن کے متعلق ہمارے پاس ثبوت مہیا ہے، وہ مفروضوں پر ہی قائم تھے۔ بغیر بھروسے کے تجارت ممکن نہیں، اور اجنبیوں پر بھروسہ کرنا بہت دشوار ہوتا ہے۔ موجودہ عالمی تجارتی نظام کی بنیاد بھی ایسے فرضی وجود پر ہے جیسے ڈالر، وفاقی ریزرو بینک اور کارپوریشنوں کے علامتی نشانات۔ جب کسی قبائلی سوسائٹی میں دو اجنبی تجارت کرنا چاہتے تھے، تو وہ عموماً بھروسہ حاصل کرنے کے لیے کسی مشترکہ خدا، روایتی اجداد یا کوئی قدیم علامتی جانور استعمال کرتے۔

اگر قدیم سیپئین ان مفروضوں پر یقین کر کے سیپیوں اور اوبسیڈین کی تجارت کرتے، تو یہ بعید از قیاس نہیں کہ وہ معلومات کا تبادلہ بھی کرتے ہوں گے۔ یوں وہ علوم کا ایک زیادہ گہرا اور وسیع نظام رکھتے تھے جو نینڈرتھال اور دوسرے قدیم انسانوں میں موجود نہیں تھا۔

شکار کے طریقے بھی تفریق کی ایک اور مثال ہیں۔ نینڈرتھال عموماً تنہا یا چھوٹے گروہوں میں شکار کرتے۔ جب کہ سیپئین نے وہ طریقے استعمال کیے جو درجنوں افراد کے تعاون سے ہی ممکن تھے، بلکہ مختلف گروہوں کے درمیان تعاون سے بھی۔ ایک بالخصوص موثر طریقہ یہ تھا کہ جانوروں کے ایک پورے ریوڑ کے گرد گھیرا ڈالا جائے، جیسے جنگلی گھوڑے۔ انہیں کسی پتلی کھائی میں ہانکا جائے، جہاں بڑی تعداد میں ان کا ایک ساتھ شکار آسان ہوتا۔ اگر ہر چیز منصوبے کے مطابق عمل پا جاتی تو گروہوں کو ایک ہی دوپہر کی مشترکہ کوشش سے ٹنوں کے حساب سے گوشت، چربی اور جانوروں کی کھالیں مہیا ہو جاتیں۔ پھر یا تو اس مالِ غنیمت کو ایک بڑی سماجی تقریب میں نوش جاں کیا جاتا، یا انہیں خشک کر کے، دھواں دے کر یا برف میں جما کر آئندہ کے لیے ذخیرہ کر لیا جاتا۔ ماہرین عمرانیات نے ایسی جگہیں دریافت کی ہیں جہاں ایسے مکمل ریوڑ اس طریقے سے سالانہ ذبح کیے جاتے تھے۔ ایسی جگہیں بھی دریافت ہوئی ہیں جہاں باڑ اور رکاوٹیں کھڑی کر کے مصنوعی پھندے اور مقتل سجائے جاتے تھے۔

پھر ہم یہ تصور کر سکتے ہیں کہ نینڈرتھال اپنی روایتی شکارگاہوں کو سیپین کے ماتحت مذبح خانوں میں تبدیل ہونے سے ناخوش ہوتے ہوں گے۔ لیکن اگر ان دو اسپیسی کے درمیان جنگ چھڑی ہوگی تو نینڈرتھال کا حشر جنگلی گھوڑوں سے کچھ زیادہ بہتر نہیں ہوا ہوگا۔ پچاس نینڈرتھال جو روایتی اور متروک انداز معاونت کے عادی ہوں، وہ پانچ سو محرک اور ہوشیار سیپین کے مقابلے میں نہیں ٹھہر پاتے۔ اور اگر سیپین پہلی جھڑپ میں ہار بھی جاتے، تب بھی وہ فوراً نئی حکمت عملی تیار کرتے جو آئندہ جھڑپ میں ان کی فتح کا پیغام لاتی۔

ادراکی انقلاب میں کیا ہوا

نئی اہلیت	دوررس نتائج
ہوموسیپین کے اطراف ماحولیات کے بارے میں بڑی تعداد میں معلومات کی ترسیلی اہلیت	پیچیدہ حکمت عملی کی تیاری اور اس پر عمل مثلاً شیروں سے بچنا بھینسوں کا شکار کرنا
سیپین کے سماجی تعلقات کے بارے میں بڑی تعداد میں معلومات کی ترسیل	بڑے، زیادہ مضبوط گروہوں کی تشکیل جس میں ڈیڑھ سو تک افراد شامل ہوں
مفروضوں کے بارے میں معلومات کی ترسیلی جو اہلیت، مثلاً قبائلی ارواح، ریاستیں، محدود ذمہ داری کی کمپنیاں، انسانی حقوق	بہت بڑی تعداد میں اجنبیوں کے بارے میں اشتراک سماجی رویوں میں سرعت سے تبدیلی کر سکے

تاریخ اور حیاتیات

سیپین نے جتنی متنوع فرضی حقائق اختراع کیں، ان کے نتیجے میں پیدا ہونے والے متنوع رویے سے ہی ثقافت بنی۔ ایک بار "ثقافت" نے جنم لیا تو وہ مستقل تغیر اور نمو پذیر رہی۔ ان ہی نہ روکی جا سکنے والی تبدیلیوں سے "تاریخ" مرتب ہوئی۔

ادراکی انقلاب وہ مقام ہے جہاں تاریخ نے حیاتیات سے اپنی آزادی کا اعلان کیا۔ ادراکی انقلاب تک تمام انسانی اسپیسی کی عملیات کو حیاتیات کے زمرے میں گنا جاتا تھا۔ یا اگر آپ چاہیں تو قبل از تاریخ کہہ لیں (میں ذاتی طور پر یہ اصطلاح، قبل از تاریخ، اس لیے پسند نہیں کرتا کہ اس سے یہ غلط فہمی پیدا ہوتی ہے کہ جیسے ادراکی انقلاب سے پہلے بھی انسانوں کا کوئی علیحدہ وجود تھا)۔ ادراکی انقلاب کے بعد سے ہوموسیپین کی ترقی کے لیے حیاتیاتی نظریوں کی جگہ تاریخ کے بیانیے نے لے لی ہے۔ عیسائیت کے فروغ یا انقلاب فرانس کو سمجھنے کے لیے جینیات، ہارمون (غدودی رطوبت)، جرثوموں کے روابط کو جاننا ہی ضروری نہیں بلکہ خیالات، تصورات اور شبیہات کے مابین تعلق کو جاننا بھی لازم ہے۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہوموسیپین اور انسانی ثقافت حیاتیاتی قوانین سے بالاتر ہوگئے۔ ہم اب بھی جانور

ہی ہیں۔ ہماری طبعی، جذباتی اور ادراکی اہلیت ہمارے ڈی این اے سے ہی وضع ہوتی ہے۔ ہمارے معاشرے بھی ان ہی تعمیراتی اینٹوں سے بنتے ہیں جن سے نینڈرتھال یا بن مانسوں کے معاشرے۔ ہم جتنا زیادہ ان تعمیراتی اینٹوں کا جائزہ لیں: حسیات، جذبات، خاندانی روابط ۔۔ اتنا ہی ہمیں اپنے اور بن مانسوں کے درمیان فرق کم محسوس ہوتا ہے۔

لیکن تضادات کا فرد یا خاندان کی سطح پر جائزہ لینا غلط ہے۔ ایک کے مقابل ایک یا دس کے مقابل دس بھی ہم شرمندگی کی حد تک بن مانسوں سے مشابہہ ہیں ۔ اہم تضادات اس وقت نمودار ہوتے ہیں جب ہم ڈیڑھ سو نفوس کی حد عبور کرتے ہیں۔ جب یہ تعداد ہزار دو ہزار کو پہنچتی ہے تو یہ فرق حیرت انگیز ہے۔ اگر آپ ہزاروں بن مانسوں کو تیانامن اسکوائر، وال اسٹریٹ، ویٹیکن یا اقوام متحدہ کے صدر دفتر میں جمع کر دیں تو انجام افراتفری ہی نکلے گا۔ اس کے مقابلے میں سیپین روزانہ ہی ان مقامات پر ہزاروں کی تعداد میں جمع ہوتے ہیں۔ یہ باہم مل کر منظم رویے اختیار کرتے ہیں مثلاً تجارتی نیٹ ورک، عوامی میلے اور سیاسی ادارے جو وہ کبھی تنہا نہیں بنا پاتے۔ بن مانسوں اور ہمارے درمیان اصل فرق وہ فرضی بندھن ہیں جو بڑی تعداد میں افراد، خاندانوں اور گروہوں کو باندھ دیتے ہیں۔ ان ہی بندھنوں سے ہم اشرف التخلیقات ہو گئے ہیں۔

ظاہر ہے کہ ہمیں دوسرے ہنر بھی درکار تھے، مثلاً اوزار بنانا اور انہیں استعمال کرنا۔ لیکن اوزار بنانا اتنا مفید نہیں ہوتا اگر اس کے ساتھ دوسروں سے تعاون کرنے کی اہلیت شامل نہ ہوتی۔ یہ کیسے ہوا کہ آج ہمارے پاس بین البراعظمی میزائل موجود ہیں جن پر جوہری ہتھیار نصب ہیں، جب کہ صرف تیس ہزار سال قبل تک ہمارے پاس محض چھڑیاں تھیں جن پر چقماق کی انی لگی تھی؟ عضویاتی لحاظ سے گزشتہ تیس ہزار برسوں میں ہماری ہتھیار بنانے کی اہلیت میں کوئی خاص بہتری نہیں ہوئی ہے۔ البرٹ آئن اسٹائن اپنے ہاتھوں کے استعمال میں قدیم شکاری/متلاشی (Hunter gatherer) سے بہت کمزور تھے۔ لیکن بڑی تعداد میں اجنبیوں سے اشتراک کی ہماری اہلیت میں ڈرامائی اضافہ ہوا ہے۔ قدیم چقماقی پتھر کی انی ایک اکیلا فرد چند منٹ میں اپنے چند دوستوں کی مدد اور مشورے سے تیار کر لیتا تھا۔ جب کہ کسی جدید جوہری ہتھیار کی تیاری کے لیے دنیا بھر سے لاکھوں اجنبی افراد کا اشتراک درکار ہے۔ زمین کی گہرائیوں میں یورینیم کی کان کنی کرنے والے کارکنوں سے لے کر نظریاتی طبیعات دانوں تک جو زیر جوہر ذرات کے مابین تعلق کو بیان کرنے کے لیے ریاضی کے لمبے فارمولے درکار ہیں۔

تو ادراکی انقلاب کے بعد سے حیاتیات اور تاریخ کے مابین تعلق کو یوں سمیٹا جا سکتا ہے:

(۱) حیاتیات ہوموسیپین کے رویوں اور اہلیت کی بنیادی حدود طے کرتی ہے۔ تمام تاریخ اسی حیاتیاتی میدان کی حدود کے اندر مرتب ہوتی ہے۔

(۲) لیکن یہ میدان بہت وسیع ہے، اس میں سیپین بہت ہی حیرت انگیز شعبدے دکھانے پر قادر ہیں۔ مفروضے ایجاد کرنے کی اہلیت کی بنا پر سیپین زیادہ سے زیادہ پیچیدہ کھیل وضع کر رہے ہیں، ہر نئی نسل انہیں مزید نکھار رہی ہے۔

(۳) لہذا سیپین کے رویے کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم ان کی فعلیات کا تاریخی ارتقا بیان کریں۔ محض ان کے حیاتیاتی حدود کا بیان تو ایسا ہی ہوگا جیسے کوئی ریڈیو پر کھیلوں کا مبصر فٹ بال کا عالمی کپ بیان کرتے

ہوئے، اپنے سامعین کو محض کھیل کے میدان کی تفصیل بتائے، بجائے اس کے کہ کھلاڑی کیا کر رہے ہیں تاریخ کے میدان میں ہمارے پتھر کے زمانے کے اجداد نے کیا کھیل کھیلے؟ جہاں تک ہمیں معلوم ہے جن افراد نے تیس ہزار سال قبل اسٹاڈیل میں شیر نما انسان کا مجسمہ تراشا تھا، وہ جسمانی، جذباتی اور عقلی طور پر ہمارے ہم پلہ تھے۔ صبح بیدار ہونے کے بعد وہ کیا کرتے تھے؟ وہ ناشتے اور ظہرانے میں کیا کھاتے تھے؟ ان کے معاشرے کیسے تھے؟ کیا وہ ایک ہی عورت سے تعلق رکھتے تھے، کیا ان میں بھی مرکزی خاندان کا تصور تھا؟ کیا ان میں تقریبات، اخلاقی پابندیاں، کھیلوں کے مقابلے اور مذہبی رسومات ہوتی تھیں؟ کیا ان میں جنگیں ہوئیں؟ آئندہ باب تاریخ کے پردے کے پیچھے جھانکتا ہے، یہ دیکھتا ہے کہ ادراکی انقلاب اور زرعی انقلاب کے درمیانی ہزاروں سالوں میں زندگی کی کیا شکل تھی؟

آدم اور حوا کے ساتھ ایک دن

اپنی فطرت، تاریخ اور نفسیات سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم اپنے شکاری/متلاشی اجداد کے ذہنوں میں جھانک سکیں۔ ہماری اسپیسی کی پوری تاریخ میں سیپین نے تاخت سے ہی پیٹ بھرا ہے۔ گزشتہ دو سو سال میں سیپین کی ایک بڑھتی تعداد روزانہ اپنی خوراک شہری مزدوری یا دفتری کام سے کماتی ہے۔ یا اس سے پہلے کے دس ہزار سال جن میں سیپین نے زراعت، گلہ بانی اپنائی دو لاکھوں برس کے اس دور کے مقابلے میں محض ایک پلک جھپکنے کا پل ہے کہ جس میں ہمارے اجداد نے جنگلی نباتات وحیوانات پر گزارا کیا۔

ارتقائی نفسیات کا نمو پذیر میدان ہمیں بتاتا ہے کہ ہمارے موجودہ دور کے بہت سے سماجی اور نفسیاتی اوصاف اس طویل زرعی دور سے پہلے ہی مرتب ہو چکے تھے۔ اس شعبے کے ماہرین کا کہنا ہے کہ آج بھی ہمارے ذہن اسی شکار و نباتات کی تاخت کی روش رکھتے ہیں۔ ہمارے عادات خورد ونوش، ہمارے اختلافات، ہماری جنسیت سب اس باہمی ربط پر منحصر ہیں جو ہمارے شکاری/ متلاشی دماغ اور ہمارے موجودہ بعد از صنعتی ماحول بشمول بڑے شہر، طیارے، ٹیلیفون اور کمپیوٹر کے مابین ہے۔ پرانی نسلوں کے مقابلے میں یہ ماحول ہمیں مزید مادی وسائل اور لمبی زندگیاں فراہم کرتا ہے، لیکن ساتھ ہی یہ احساس تنہائی، ذہنی پراگندگی اور دباؤ سے بھی آلودہ ہے۔ ارتقائی ماہرین نفسیات کہتے ہیں کہ اس کی وجہ جاننے کے لیے ضروری ہے کہ ہم اس شکاری/ متلاشی ذہن میں جھانکیں جس نے ہمیں وضع کیا، ان کی دنیا جس میں ہم لاشعوری طور پر اب بھی مقیم ہیں۔

مثلاً آخر لوگ اتنا زیادہ کیلوری والا کھانا کیوں کھاتے ہیں جو ان کے جسموں کے لیے اچھا نہیں۔ آج کے متمول معاشرے مٹاپے کے طاعون کے شکار ہیں جو اب تیزی سے ترقی پذیر معاشروں میں بھی قدم جما رہا ہے۔ یہ سمجھنے کے لیے کہ ہم کیوں سب سے زیادہ مٹھاس اور چکنائی والی غذا منتخب کرتے ہیں، ہمیں اجداد کی غذائی عادات سے رجوع کرنا پڑے گا۔ تیس ہزار سال پہلے غذا کے متلاشیوں کو صرف ایک ہی قسم کی مٹھاس مہیا تھی، پکا ہوا پھل۔ اگر پتھر کے زمانے کی کوئی عورت کسی ایسے درخت تک پہنچتی جو پکی کھجوروں سے لدا ہوتا تو اس کے پاس یہی حل تھا کہ وہ اسی وقت جتنی بھی کھجوریں ممکن ہو کھا لیتی، اس سے پہلے کہ بندروں کا مقامی گروہ اس درخت کا صفایا کر دے۔ زیادہ کیلوری والی غذا سے شکم پری ہماری جینیات میں درج ہے۔ آج یقیناً ہم اونچی عمارتوں میں مقیم ہیں، جن کے فرج بھرے ہوئے ہیں، لیکن اپنے ڈی این اے کے خیال میں ہم وہیں چراگاہ میں موجود ہیں۔ یہی وجہ ہمیں فرج میں موجود آئس کریم کے پورے ڈبے کو نگل لینے پر راغب کرتی ہے، اور پھر کوک کی ایک بڑی بوتل سے

اسے نیچے اتار کر ڈکار لیتے ہیں۔

ٹھونس لینے کا یہ جینیاتی نظریہ بہت مقبول ہے۔ دوسرے نظریات زیادہ قابل بحث ہیں۔ مثلاً چند ارتقائی نفسیات دانوں کے مطابق، غذا کی تلاش میں نکلے قدیم گروہ اکیلی عورت سے نباہ کرنے والے مرکزی خاندان کے افراد پر مشتمل نہیں تھے۔ بلکہ یہ افراد ایسے معاشروں میں رہتے تھے جہاں ذاتی ملکیت، ایک عورت سے نباہ اور ولدیت کا تصور نہیں تھا۔ ایسے گروہوں میں عورت بہت سے مردوں (اور عورتوں) سے ایک ہی وقت میں ہم بستری اور قریبی تعلقات رکھ سکتی تھی۔ اس گروہ کے تمام بالغ افراد بچے کی نگہداشت میں مدد کرتے۔ کیوں کہ یقینی طور پر یہ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ کون سا طفل کس کا کارنامہ ہے تو مرد حضرات تمام اطفال کے لیے یکساں جذبات رکھتے۔ منطقی اعتبار سے ایسا سماجی نظام فرضی نہیں ہے، حیوانات میں تو یہ بہت عام ہے، بالخصوص ہمارے قریبی اعزا بن مانس اور بوزنوں میں۔ آج بھی ایسے انسانی معاشرے موجود ہیں جہاں ولدیت ایک مشترکہ ورثہ ہے۔ مثلاً وینیز ویلا کے باری انڈین: ان معاشروں کے اعتقاد کے مطابق بچہ کسی ایک مرد کے مادہ منویہ سے پیدا نہیں ہوتا بلکہ عورت کے رحم میں مختلف مردوں کے مادہ منویہ کے اشتراک سے۔ ایک اچھی ماں یہ بات یقینی بنائے گی کہ وہ بہت سے مردوں کے ساتھ ہم بستری کرے، بالخصوص حمل کے وقت تاکہ اس کی اولاد کو بہترین اوصاف (اور ولدیت کی نگرانی) مہیا ہوں۔ نہ صرف بہترین شکاری، بلکہ بہترین داستان گو، سب سے طاقتور جنگجو، اور سب سے نرم خو محبت کے داعی۔ اگر یہ بات احمقانہ لگے تو یاد رکھیے کہ جنین پر جدید تحقیق سے پہلے لوگوں کے پاس اس بات کا کوئی محکم ثبوت موجود نہیں تھا کہ نطفہ ایک ہی باپ سے ٹھہرتا ہے، یا بہت سے افراد کی مدد سے۔

اس قدیم کمیون (قبیلہ) معاشرتی نظریے کے داعی یہ دلیل دیتے ہیں کہ جدید شادیوں میں بیوفائی کا تناسب، طلاق کا بڑھتا ہوا رجحان، بچوں اور بالغوں میں نفسیاتی مسائل کی بھرمار، یہ سب اس وجہ سے ہے کہ اب انسانوں کو مرکزی خاندان اور ایک عورت کے ساتھ نباہ کرنے پر مجبور کیا گیا ہے، جو ہمارے حیاتیاتی نسخے سے میل نہیں کھاتا۔

بہت سے مفکر اس نظریے کی شدومد سے تردید کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ایک ہی جیون ساتھی اور مرکزی خاندان بنیادی انسانی رویے ہیں۔ گو قدیم شکاری/متلاشی معاشرے ہمارے موجودہ معاشروں سے زیادہ کمیون اور مساوات پر مبنی تھے، پھر بھی یہ محقق مصر ہیں کہ وہ معاشرے بھی جداگانہ یونٹ رکھتے تھے، جن میں ایک حاسد جوڑا اور چند مشترک بچے ہوتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آج بیشتر معاشروں میں ایک جیون ساتھی اور مرکزی خاندان کا رواج عام ہے۔ مرد اور عورت اپنے ساتھی اور بچوں کے بارے میں بہت مالکانہ جذبات رکھتے ہیں، اور جدید ریاستوں مثلاً شمالی کوریا اور شام میں سیاسی اجارہ باپ سے بیٹے کو منتقل ہوتا ہے۔

اس تنازع کو سلجھانے اور ہماری جنسیت، معاشرت اور سیاست کو سمجھنے کے لیے، ہمیں اپنے اجداد کے رہن سہن کا جائزہ لینا ہوگا۔ یہ دیکھنا ہوگا کہ ستر ہزار سال کے ادراکی انقلاب سے تقریباً بارہ ہزار سال پہلے ہونے والے زرعی انقلاب کے درمیانی دور میں وہ کیسے رہتے تھے۔

بدقسمتی سے ہمارے متلاشی آبا کی زندگیوں کے بارے میں بہت کم باتیں یقینی ہیں۔ قدیم کمیون اور ہمیشہ ایک جیون ساتھی کے نظریات بہت کمزور دلائل پر قائم ہیں۔ ظاہر ہے کہ کوئی تحریری ریکارڈ تو دستیاب ہے نہیں، اور

بیشتر ثبوت فوسل ہڈیوں اور پتھر کے اوزاروں پر مشتمل ہیں۔ زیادہ نازک خام مادے سے بنی اشیا مثلاً لکڑی، چھپر یا چمڑا، بہت مخصوص حالات میں باقی رہ پاتی ہیں۔ عمرانیات کے اس تعصب نے اس غلط فہمی کو جنم دیا ہے کہ زرعی زمانے سے پہلے کے انسان پتھر کے زمانے میں رہتے تھے۔ پتھر کے زمانے کو اصل میں لکڑی کا زمانہ کہنا چاہیے کیوں کہ قدیم شکاری/متلاشیوں کے بیشتر اوزار لکڑی کے ہوتے تھے۔

قدیم شکاری/متلاشیوں کی باقیات سے ان کی زندگی متعین کرنا خاصا دشوار ہے۔ ان قدیم متلاشیوں اور ان کی زرعی و صنعتی اولادوں کے درمیان سب سے واضح فرق یہ ہے کہ متلاشیوں کے پاس بہت کم مصنوعات تھیں، اور زندگی میں ان کا کردار بھی محدود تھا۔ جدید متمول معاشرے کا ایک فرد اپنی زندگی کے دوران میں کئی لاکھ مصنوعات حاصل کرتا ہے۔ کاروں سے لے کر گھر تک، اور نہالچوں سے دودھ کے ڈبوں تک ہمارا شاید ہی کوئی عمل، یقین یا جذبہ ہو جو خود ہماری اپنی بنائی کسی چیز سے متاثر نہ ہو۔ ہماری ایجاد کردہ مصنوعات کا ہماری غذائی عادات پر اثر متاثر کن ہے: چمچے، گلاس، جینیاتی لیبارٹری سے عظیم سمندری جہازوں تک۔ کھیل کے دوران ہم کھلونوں کی ایک وسیع تعداد استعمال کرتے ہیں: پلاسٹک کے تاش سے لے کر لاکھوں تماشائیوں کی گنجائش والے اسٹیڈیم تک۔ ہمارے روحانی اور جنسی تعلقات کی نسبت انگوٹھی، بستر، عمدہ کپڑے، ترغیبی زیر جامہ، کنڈوم (مانع حمل غبارہ)، فیشن ایبل ریسٹورانٹ، سستے سرائے، ایرپورٹ لاونج، شادی ہال اور کیٹرنگ (تقریبات کا انعقاد کرنی والے ادارے) کمپنیوں سے وابستہ ہیں۔ مذاہب ہماری زندگی کو مقدس اشیا سے وابستہ کرتے ہیں، مثلاً گوتھک گرجا، مسلمانوں کی مساجد، ہندوؤں کے آشرم، توریت کے پارچے، تبت میں عبادت کے پہیے، راہبانہ لباس، قندیلیں، اگربتی، کرسمس درخت، یہودی تہوار کی گیندیں، کتبے اور تشبیہات۔

جب تک ہمیں کسی نئی رہائش گاہ میں منتقل نہ ہونا پڑے ہمیں یہ خیال بھی نہیں آتا کہ ہم نے کتنا کباڑ اکٹھا کر لیا ہے۔ تلاشیے تو اپنا کل سرمایہ اپنی پشت پر لاد کر اپنی رہائش ہر ماہ بدلتے تھے، ہر ہفتے اور بعضے تو روزانہ۔ اس وقت کوئی سامان لے جانے والی کمپنیاں تھیں نہ ویگنیں، مال برداری کے جانور تک نہیں تھے کہ ہمارا بوجھ اٹھاتے۔ اس لیے وہ بہت ناگزیر مصنوعات ہی رکھ سکتے تھے۔ لہٰذا یہ بعید از قیاس نہیں کہ وہ اپنی ذہنی، مذہبی اور جذباتی زندگی کا بیشتر حصہ مصنوعات کے بغیر گزارتے تھے۔ آج سے ایک لاکھ سال بعد کام کرنے والا کوئی ماہر عمرانیات، کسی مسجد کی باقیات سے مسلمان اعتقاد اور عملیات کی بہت صحیح تصویر کشی کرنے میں کامیاب رہے گا۔ لیکن ہم قدیم شکاری/متلاشیوں کی باقیات سے ان کے عقائد اور عملیات کی تصویر کشی میں بہت کمزور ہیں۔ یہ ایسا ہی معمہ ہے جیسے کوئی مستقبل کا مورخ اکیسویں صدی کے نوجوانوں کی سماجی زندگی ان کی ڈاک سے اخذ کرنے کی کوشش کرے۔ کیوں کہ ان کی فون پر گفتگو، ای میل، بلاگ اور ٹیکسٹ پیغامات کا تو کوئی حساب موجود نہیں ہوگا۔

یوں صنعتی باقیات کی مدد سے شکاری/متلاشیوں کی زندگی کا تعاون متعصبانہ ہوگا۔ اس سے بچاؤ کا ایک طریقہ یہ ہے کہ ہم جدید متلاشیوں کی زندگی کا مطالعہ کریں۔ علم عمرانیات کے مشاہدات سے انہیں براہ راست دیکھا جاسکتا ہے۔ لیکن ان جدید متلاشیوں سے حاصل نتائج کو قدیم متلاشیوں پر لاگو کرنے میں بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔

اول تو یہ کہ تمام متلاشی معاشرے جو اس جدید دور تک برقرار رہ گئے ہیں، ان سب پر ہمسایہ زرعی اور صنعتی معاشروں کا اثر ہے۔ لہٰذا یہ اخذ کرنا خطرے سے خالی نہیں کہ جو آج ان کے بارے میں سچ ہے وہی ہزاروں سال پہلے بھی درست رہا ہوگا۔

دوسرے یہ کہ جدید متلاشی معاشرے زیادہ تر ان جگہوں پر برقرار رہے ہیں جہاں ناموافق موسم اور زراعت کے لیے غیر موزوں بنجر زمین ہے۔ وہ معاشرے جو انتہائی غیر موافق جگہوں پر آباد ہیں، مثلاً جنوبی افریقہ کا کالاہاری صحرا وہ ایسے قدیم معاشروں کو سمجھنے کے لیے ایک گمراہ کن مثال ہیں جو زرخیز علاقوں میں رہے ہوں، مثلاً دریائے یانگزی (Yangtze) کی وادی۔ بالخصوص کالاہاری صحرا جیسے علاقے میں آبادی کی کثافت قدیم یانگزی سے بہت کم ہے۔ جب ہم انسانی گروہوں کے حجم اور ان کے مابین تعلقات کے نظام کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں تو اس فرق کے بہت دوررس اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

تیسرے یہ کہ شکاری/متلاشی معاشروں کا ایک دوسرے سے نمایاں فرق ایک اہم وصف ہے۔ وہ نہ صرف دنیاوی خطوں میں فرق رکھتے تھے، بلکہ ایک ہی خطے میں بھی وہ مختلف تھے۔ ایک آسان مثال وہ نمایاں فرق ہے جو پہلے یورپی آبادکاروں نے آسٹریلیا کے اصلی باشندوں کے درمیان پایا۔ برطانوی فتح سے ذرا پہلے تقریباً تین سے سات لاکھ شکاری/متلاشی باشندے اس براعظم پر دو سے چھ سو قبیلوں میں منقسم تھے۔ ان میں سے ہر قبیلے کی مزید گروہ بندی تھی۔ ہر قبیلے کی اپنی زبان، مذہب اور رسوم و رواج تھے۔ مثلاً جنوبی آسٹریلیا میں جہاں آج ایڈیلیڈ ہے، اس کے اطراف بہت سے پدری شجرے سے وابستہ قبائل تھے جو اپنی وراثت باپ کی جانب سے شناخت کرتے تھے۔ یہ گروہ سخت علاقائی حد بندیوں کے قبیلوں میں بندھے ہوئے تھے۔ اس کے متضاد شمالی آسٹریلیا کے کچھ قبائل فرد کی مادری شناخت کو زیادہ اہمیت دیتے، اور کسی فرد کی شناخت قبائلی علاقے کے بجائے معاشرتی وابستگی سے تھی۔

تو یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ قدیم شکاری/متلاشیوں کے درمیان نسلی اور ثقافتی تنوع بہت واضح تھا۔ زرعی انقلاب کے وقت جو پانچ سے آٹھ لاکھ افراد دنیا میں آباد تھے وہ ہزار مختلف قبائل میں تقسیم تھے، جن کی ہزاروں مختلف زبانیں اور ثقافتیں تھیں۔ ادراکی انقلاب کی آخر یہی تو اہم باقیات تھیں۔ فکشن کا شکریہ کہ وہ لوگ جن کی جینیاتی کیمیا ایک ہی جیسی تھی اور جو ایک ہی جیسے ، حول کے پروردہ تھے، وہ پھر بھی بہت مختلف اقسام کی تصوراتی سچائیاں پیش کرنے میں کامیاب تھے، جو مختلف اقسام کی رسوم و اصولوں کے ذریعہ بیان ہوتی ہیں۔ مثلاً اس بات کا کافی ثبوت مہیا ہے کہ تیس ہزار سال پہلے متلاشیوں کا جو گروہ اس مقام پر مقیم تھا، جہاں آج جامعہ آکسفورڈ واقع ہے، اس گروہ سے مختلف زبان بولتا تھا جو اس جگہ مقیم تھا جہاں آج جامعہ کیمبرج واقع ہے۔ ہوسکتا ہے ان میں سے ایک گروہ جنگجو ہو اور دوسرا امن پسند۔ شاید کیمبرج کا گروہ قبیلے پر مشتمل ہو، جب کہ آکسفورڈ کا گروہ مرکزی خاندان پر۔ ممکن ہے کہ کیمبرج والے اپنی نگراں ارواح کے چوبی مجسمے تراشنے پر گھنٹوں صرف کرتے ہوں، جب کہ آکسفورڈ والے عبادات کے لیے رقص کرتے ہوں۔ ہوسکتا ہے کہ اول الذکر آواگون پر یقین رکھتے ہوں جب کہ آخر الذکر اسے بکواس سمجھتے ہوں۔ ممکن ہے کہ ایک معاشرے میں ہم جنس پرستی قابل قبول ہو، جب کہ دوسرے میں یہ ممنوع رہی ہو۔

دوسرے الفاظ میں، گو ماہرین عمرانیات کا جدید متلاشیوں کا مطالعہ، قدیم متلاشیوں کو سمجھنے میں کچھ مدد ضرور کرسکتا ہے، لیکن امکانات کا قدیم افق* بہت وسیع تھا، اور اس میں سے بیشتر ہماری نظروں سے اوجھل ہے۔ ہوموسیپین کی 'فطری طرز حیات' کی بحث اس مرکزی نکتے کو فراموش کردیتی ہے۔ ادراکی انقلاب کے بعد سے سیپین

---

*' امکانات کے افق ' کا مطلب ہے وہ سارے اعتقادات، رسومات اور تجربات جو کسی خاص معاشرے کو اس کے ماحولیاتی، تکنیکی اور ثقافتی پابندیوں کے ساتھ مہیا ہوں۔ ہر فرد اور ہر معاشرہ اپنے امکانات کے افق میں سے صرف چند ہی سے استفادہ کرتا ہے۔

اپنی ثقافت کے اعتبار سے ... کا کوئی ایک فطری طرز حیات نہیں رہا۔ امکانات کی ایک حیران کن تعداد سے اپنی ثقافت کے اعتبار سے چن لی جاتی ہے۔

پہلا متمول معاشرہ

قبل از زرعی انقلاب کی دنیا سے ہم زندگی کے بارے میں کیا عمومی سبق سیکھ سکتے ہیں؟ یہ خاصے یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ بیشتر لوگ چھوٹے گروہوں میں رہتے تھے، جن کی تعداد کئی درجن ہوتی یا زیادہ سے زیادہ کئی سو نفوس، اور یہ سارے نفوس انسان تھے۔ یہ آخری نکتہ بہت اہم ہے، کیوں کہ یہ بات بالکل سادہ نہیں ہے۔ زرعی اور صنعتی معاشروں کے بیشتر اراکین پالتو جانور ہیں۔ ظاہر ہے کہ وہ اپنے مالکان کی برابری تو نہیں کرتے لیکن بہر حال رکن تو ہیں۔ آج جو معاشرہ نیوزی لینڈ کہلاتا ہے وہاں پینتالیس لاکھ سیپین اور پانچ کروڑ بھیڑ پائے جاتے ہیں۔

صرف ایک چیز اس عمومی قانون سے باہر تھی اور وہ تھی: کتا۔ کتا زرعی انقلاب سے بھی پہلے ہوموسیپین کا پہلا پالتو جانور تھا۔ ماہرین میں درست تاریخ پر تو اتفاق نہیں، لیکن اس بات کا مکمل ثبوت موجود ہے کہ کتا پندرہ ہزار سال پہلے بھی پالتو جانور تھا۔ ممکن ہے کہ وہ انسانوں کے ریوڑ میں اس سے بھی ہزاروں سال پہلے شامل ہوئے ہوں۔
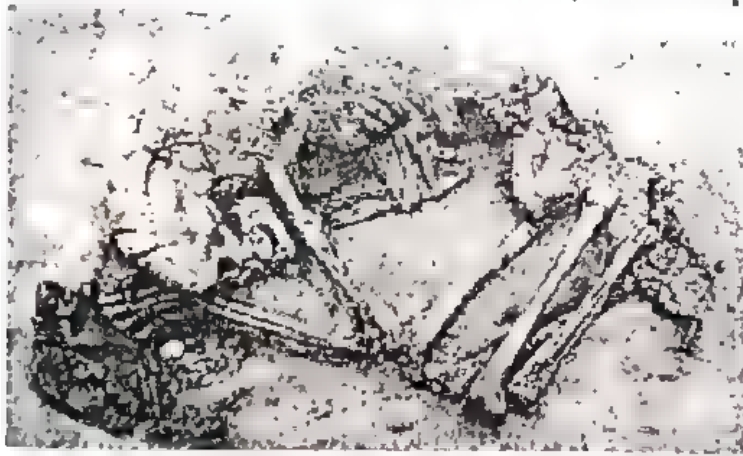
پہلا پالتو جانور؟ شمالی اسرائیل سے دریافت ہونے والا بارہ ہزار سال پرانا مقبرہ۔ اس میں ایک پچاس برس کی عورت کا ڈھانچہ ایک کتے کے پلے کے ساتھ دفن ہے (تصویر میں نیچے بائیں جانب)۔ یہ پلا عورت کے سرہانے دفن تھا۔ اس کا بایاں ہاتھ پلے پر ایسے رکھا تھا جس سے جذباتی ربط کا اظہار ممکن ہے۔ ظاہر اس کی دوسری وجوہات بھی ہوسکتی ہیں۔ یہ پلا شاید اگلی دنیا کے داخلی دروازے کے دربان کے لیے ایک تحفہ تھا۔

کتوں کو شکار اور لڑائی کے لیے استعمال کیا جاتا، جنگلی جانوروں اور بن بلائے انسانی مہمانوں سے خبردار کرنے کے لیے۔ نسلوں کے گزرنے کے ساتھ یہ دونوں آپس میں ایک دوسرے سے رابطہ کرنا سیکھ گئے ہیں۔ وہ کتے جو اپنے انسانی ہمراہیوں کی ضروریات اور حسیات کی جانب زیادہ متوجہ تھے، انہیں مزید دیکھ بھال اور غذا ملی، اور ان کے زندہ رہنے کا امکان بھی زیادہ ہوتا۔ ساتھ ہی انھوں نے اپنی ضروریات کے لیے انسانوں کو استعمال کرنا بھی سیکھ لیا۔ اس پندرہ ہزار سال کی رفاقت نے انسانوں اور کتوں کے درمیان کسی اور جانور کے مقابلے میں ایک بہت گہرا اور محبت کا تعلق قائم کردیا ہے۔ کہیں کہیں تو کتوں کو بھی انسانوں کی مانند بہت اعزاز کے ساتھ دفنایا جاتا۔

ایک ہی گروہ کے افراد ایک دوسرے کو بہت قریب سے جانتے تھے، اور اپنی ساری زندگی دوستوں اور عزیزوں کی معیت میں گزارتے۔ تنہائی اور تخلیہ نایاب تھا۔ پڑوسی گروہ شاید وسائل کے لیے مقابلہ کرتے، اور لڑائی بھی ہوتی، لیکن ان میں دوستانہ روابط بھی تھے۔ وہ اراکین کا تبادلہ کرتے، مل کر شکار کھیلتے، نایاب تعیشات کی لین دین کرتے، سیاسی اتحاد مضبوط کرتے اور مذہبی تہوار مناتے تھے۔ ایسا تعاون ہوموسیپین کا طرہ امتیاز تھا اور اسی وجہ سے انہیں دوسرے انواع انسانی پر برتری حاصل تھی۔ کبھی پڑوسی گروہوں سے تعلقات اتنے قریبی ہوتے کہ وہ مل ایک قبیلہ بنا لیتے، ان کی زبان روایات، رسوم اور قوانین مشترکہ ہوتے۔

پھر بھی ہمیں ایسے بیرونی تعلقات کے اثر کو ضرورت سے زیادہ اہمیت نہیں دینی چاہیے۔ اگرچہ بحرانی حالات میں یہ ہمسایہ گروہ ایک دوسرے کے قریب آجاتے مل کر شکار کرتے، ضیافت اڑاتے۔ بعد میں وہ اپنا بیشتر وقت مکمل طور پر علیحدہ اور آزاد گزارتے۔ تجارت زیادہ تر اعزازی چیزوں پر مشتمل ہوتی مثلاً عنبر، سیپیاں اور روغن۔ اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ یہ لوگ روزمرہ کی غذا کی تجارت کرتے تھے مثلاً پھل یا گوشت، یا کسی ایک گروہ کی زندگی دوسروں سے درآمد شدہ چیزوں پر منحصر تھی۔ سیاسی معاشرتی تعلقات بھی شاذ و نادر ہی ہوتے تھا۔ قبیلہ کوئی مستقل سیاسی ڈھانچہ نہیں رکھتا تھا۔ اگر ان کی تسلسل سے ہر موسم میں ملاقات کی جگہ تھی بھی تب بھی کوئی مستقل ادارے یا آبادیاں نہیں تھیں۔ ایک اوسط آدمی اپنے گروہ کے علاوہ کسی دوسرے فرد کو دیکھے یا اس کی آواز سنے بغیر کئی ماہ گزار دیتا، اور اپنی ساری زندگی چند سو افراد سے زیادہ کا سامنا نہیں کرتا تھا۔ بہت وسیع رقبوں پر بہت قلیل سیپین آبادی پھیلی ہوئی تھی۔ زرعی انقلاب سے پہلے پورے سیارے کی آبادی آج کے قاہرہ سے کم تھی۔

سیپین کے بیشتر گروہ زیادہ تر وقت رہ نوردی میں گزارتے۔ تلاش خوراک میں جگہ جگہ پھرتے۔ ان کی رہ نوردی بدلتے موسموں، حیوانوں کی سالانہ ہجرت اور پودوں کی نمو کے تسلسل پر منحصر تھی۔ وہ عموماً کئی درجن مربع کلومیٹر سے سیکڑوں مربع کلومیٹر کے اپنے علاقے میں آمد و رفت رکھتے۔

کبھی کبھار گروہ اپنے علاقے سے نکل کر نئے علاقوں کا دورہ کرتے۔ یہ علت بدری قدرتی آفات، جنگ، ماحولیاتی دباؤ یا کسی مقناطیسی شخصیت کے حامل سربراہ کے اکسانے کا نتیجہ ہوتا تھا۔ یہی دورے دنیا بھر میں انسانی پھیلاؤ کا سبب بنے۔ اگر کوئی متلاشی گروہ چالیس سال بعد ٹوٹ جاتا، اور اس کا یہ ٹوٹا حصہ مشرق میں کوئی سو کلومیٹر دور جا بستا، تو مشرقی افریقہ سے چین کا فاصلہ تقریباً دس ہزار سال میں طے ہوتا۔

گو ایسا کم ہی ہوتا تھا، لیکن جب غذائی وسائل وافر مقدار میں ہوتے تھے، تو یہ گروہ تمام موسم کے لیے یا مستقل طور پر بھی آباد ہو جاتے تھے۔ غذا کو سکھانے، دھواں دینے اور برف میں محفوظ کرنے کے طریقوں کی دریافت سے بھی طویل مدت کے قیام میں مدد ملی۔ اہم بات یہ ہے کہ سمندر اور دریا کے ساتھ جہاں آبی غذا اور آبی حیوانات کی بہتات تھی، انسانوں نے مستقل ماہی گیری کی آبادیاں قائم کر لیں، زرعی انقلاب سے بھی بہت پہلے کے اولین انسانی دیہات۔ انڈونیشیا کے جزیروں کے ساحلی علاقوں میں ماہی گیری کے دیہات پینتالیس ہزار سال قبل نمودار ہو چکے تھے۔ شاید اسی مقام سے ہوموسیپین نے اپنا پہلا آسٹریلیا کی جانب بین السمندری سفر شروع کیا۔

زیادہ تر آبادیوں میں سیپین کے گروہوں نے غذا کے معاملے میں لچک اور موقع پرستی اختیار کی۔ وہ دیمک کے متلاشی رہے، بیر چنے، جڑیں کھودیں، خرگوشوں کا تعاقب کیا اور ارنا بھینسوں، ہاتھی نما جانوروں کا شکار

کیا۔ ایک شکاری آدمی کے عام تصور کے مقابلے میں سیپین زیادہ تر وہ نباتات جمع کرتے جو انہیں سب سے زیادہ کیلوری فراہم کرسکتے تھے، ساتھ ہی انہیں خام مادہ بھی دستیاب ہو جاتا جیسے چقماق، لکڑی اور بانس۔

سیپین محض غذا اور اشیا کی تلاش میں ہی نہیں بھٹکے، بلکہ وہ علم کے بھی متلاشی رہے۔ اپنی روزانہ کی خوراک کی تلاش میں بہتری کے لیے انہیں ہر پودے کی نمو کی معلومات اور ہر جانور کی عادات کا علم درکار تھا۔ انہیں یہ بھی معلوم کرنا تھا کہ کون سی غذا زیادہ طاقتور ہے۔ کس سے بیماری ممکن ہے اور کس کو علاج کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے۔ انہیں یہ بھی معلوم کرنا تھا کہ موسم کیسے بدلتے ہیں، کسی طوفان باد و باراں اور خشک سالی کی کیا علامات ہیں۔ انہوں نے ہر چشمے کا مطالعہ کیا، ہر اخروٹ کے درخت کو دیکھا، ریچھ کے ہر بھٹ کو جانچا اور اپنے علاقے میں چقماق کے ہر ذخیرے کی خبر رکھی۔ ہر فرد کے لیے یہ جاننا ضروری تھا کہ پتھر کی چھری کیسے بناتے ہیں، پھٹے جبہ کو کیسے سیا جاتا ہے، خرگوش کے لیے کیسے پھندا بناتے ہیں، اور کس طرح برف یا مٹی کے گرتے تودے، سانپ کے کاٹنے اور بھوکے شیر کا کیسے مقابلہ کریں۔ ان میں سے ہر چیز میں مشاقی حاصل کرنے کے لیے سالوں کی محنت اور مشق درکار تھی۔ ایک اوسط قدیم متلاشی چقماق پتھر کی انی چند منٹوں میں بنا سکتا تھا۔ جب ہم اس کی نقل کرتے ہیں تو بری طرح ناکام رہتے ہیں۔ ہم میں سے زیادہ تر افراد چقماق اور سنگ سیاہ کی تہہ داری سے ناواقف ہیں، اور انہیں صحیح طریقے سے استعمال کرنے کی اہلیت سے محروم۔

دوسرے الفاظ میں ایک متلاشی کو اپنے اطراف کے بارے میں اپنی جدید اولادوں سے بہت زیادہ آگاہی تھی۔ آج کے صنعتی معاشرے میں بیشتر لوگوں کو زندہ رہنے کے لیے قدرتی دنیا کے بارے میں جاننا ضروری نہیں ہے۔ ایک کمپیوٹر انجینیر، ایک بیمہ ایجنٹ، تاریخ کا استاد یا فیکٹری کے کارکن کو کام جاری رکھنے کے لیے کیا جاننا ضروری ہے؟ آپ کو خود اپنے پیشے کے بارے میں بہت سی معلومات درکار ہے، لیکن زندگی کی بہت سی ضروریات کے لیے آپ آنکھیں بند کر کے دوسرے ماہرین کی مدد پر انحصار کرتے ہیں، خود جن کی معلومات بھی ان ہی کے اپنے پیشے تک محدود ہوتی ہے۔ آج کے انسانی گروہ قدیم گروہوں سے بہت زیادہ جانتے ہیں۔ لیکن انفرادی سطح پر قدیم متلاشی تاریخ کے سب سے زیادہ عالم اور ہنرمند لوگ تھے۔

اس بات کا کچھ ثبوت موجود ہے کہ اوسط سیپین کا دماغ متلاشیوں کے دماغ کے مقابلے میں کچھ مختصر ہوا ہے۔ اس زمانے میں زندہ رہنے کے لیے ہر ایک کو بہت ذہنی صلاحیتیں درکار تھیں۔ جب زراعت وصنعت کا اجرا ہوا تو لوگ زندہ رہنے کے لیے دوسروں کی مہارت پر بھروسہ کرنے لگے، ناتواں کے لیے نئی بیساکھیاں نکل آئیں۔ آپ زندہ رہ کر اپنی معمولی جین آئندہ نسل کو منتقل کر سکتے ہیں، کسی مشکیزہ بردار یا اسمبلی لائن کے کارکن کے طور پر بھی۔

متلاشیوں نے نہ صرف اپنے حیوانات، نباتات اور اشیا کے بارے میں مہارت حاصل کی، بلکہ خود اپنے جسم اور حسیات کے بارے میں بھی۔ وہ گھاس میں پیدا ہونے والی سرسراہٹ پر بھی چونک اٹھتے کہ کیا وہاں کوئی سانپ پوشیدہ ہے۔ وہ درختوں پر پتوں کو غور سے دیکھتے کہ کیا کوئی پھل، مکھی کا چھتا یا پرندوں کا گھونسلہ موجود ہے۔ وہ سب سہولت سے بے آواز حرکت کرتے، وہ جانتے تھے کہ بہت مستعد اور موثر انداز میں کیسے بیٹھنا ہے، چلنا ہے یا بھاگنا ہے۔ مستقل اور متنوع استعمال سے ان کے اجسام کسی لمبی دوڑ کے ایتھلیٹ کی مانند مضبوط تھے۔ ان کے جسموں میں وہ لوچ تھا جو آج لوگ سالوں کے یوگا اور تائی چی کے بعد بھی حاصل نہیں کر پاتے۔

شکاری/ متلاشی طریقہ زندگی علاقہ در علاقہ بدل جاتا اور موسم در موسم مختلف ہوتا۔ لیکن عموماً" متلاشی اپنے بعد آنے والے کسانوں، چرواہوں، مزدوروں اور دفتری کلرکوں سے زیادہ آرام دہ اور مطمئن زندگی گزارتے تھے۔

آج کے متمول معاشرے میں لوگ ایک اوسط ہفتے میں چالیس سے پینتالیس گھنٹے کام کرتے ہیں، اور ترقی پذیر دنیا میں تو ساٹھ بلکہ اسی گھنٹے تک کام کرتے ہیں۔ موجودہ ناقابل آباد علاقوں مثلاً افریقہ کے کالاہاری صحرا میں رہنے والے شکاری/ متلاشی اوسطاً ہفتے میں پینتیس سے پینتالیس گھنٹے کام کرتے ہیں۔ وہ صرف ہر تیسرے دن شکار کرتے ہیں، اور روزانہ تین سے چھ گھنٹے تلاش اور اکٹھا کرنے میں گزارتے ہیں۔ عام حالات میں گروہ کو غذا کی فراہمی کے لیے یہ دورانیہ کافی ہے۔ ممکن ہے کہ زمانہ قدیم کے شکاری/ متلاشی، جو کالاہاری سے زیادہ زرخیز علاقوں میں رہتے تھے، وہ غذا اور خام مال کی تلاش میں اس سے بھی کم وقت صرف کرتے تھے۔ مزید یہ کہ ان متلاشیوں کو گھر کا اتنا کام بھی نہیں کرنا پڑتا تھا۔ انہیں کوئی برتن نہیں دھونے پڑتے تھے، کوئی قالین نہیں صاف کرنا پڑتا تھا، زمین پالش کرنی ہوتی، پوتڑے بدلنے ہوتے اور نہ بل ادا کرنے ہوتے تھے۔

آج کی صنعت وزراعت کے مقابلے میں متلاشیوں کی اقتصادیات اپنے افراد کو زیادہ دلچسپ زندگی کی ضمانت دیتی تھی۔ آج ایک چینی فیکٹری کی کارکن صبح سات بجے گھر سے نکلتی ہے، گرد آلود راستوں سے گزرتی وہ بیگار خانے پہنچتی ہے، اور وہاں دماغ کو بے حس کر دینے والے دس گھنٹے روزانہ مشین چلاتی ہے۔ شام سات بجے گھر واپس پہنچتی ہے تاکہ برتن اور کپڑے دھو سکے۔ آج سے تیس ہزار سال پہلے کوئی چینی متلاشی اپنے ساتھیوں کے ساتھ کوئی آٹھ بجے گھر سے نکلتی رہی ہوگی۔ وہ جنگلوں اور چراگاہوں میں گھوم کر کھمبیاں جمع کرتی ہوگی، قابل ہضم جڑیں کھودتی ہوگی، مینڈک پکڑتی ہوگی، اور کبھی کبھار چیتے سے بچ کر بھاگتی ہوگی۔ دوپہر تک وہ اپنی آبادی واپس پہنچ جاتیں، تاکہ کھانا تیار کر سکیں۔ اس سے ان کے پاس افواہیں پھیلانے، کہانیاں سنانے، بچوں سے کھیلنے اور فراغت کے لیے بہت وقت گزر جاتا۔ یقیناً کبھی وہ چیتے کا شکار ہو جاتے، کبھی انہیں کوئی سانپ ڈس لیتا۔ لیکن دوسری جانب انہیں گاڑیوں کے ایکسیڈنٹ اور صنعتی آلودگی سے نہیں بچنا پڑتا۔

اکثر جگہوں پر بیشتر اوقات یہ متلاشی مثالی غذا فراہم کرتے۔ اس میں زیادہ حیرت بھی نہیں، لاکھوں برس سے انسان کی یہی غذا تھی، اور انسانی جسم اس کا عادی تھا۔ فوسل استخواں سے پتہ چلتا ہے کہ قدیم متلاشی قحط یا غذا کی کمی کا شکار نہیں ہوتے تھے، وہ اپنی جدید کسان اولادوں سے زیادہ طویل قامت اور صحت مند ہوتے تھے۔ اوسط عمر تیس یا چالیس سال تھی، مگر اس کی وجہ اموات اطفال کی اونچی شرح تھی۔ وہ بچہ جو ایک برس کی عمر تک زندہ رہ جانے میں کامیاب ہو جاتا، اس بات کا امکان ہوتا کہ وہ ساٹھ یا کبھی کبھار اسی برس تک زندہ رہے گا۔ آج کے زندہ متلاشیوں میں پینتالیس برس کی عورت مزید بیس سال زندہ رہنے کی امید کر سکتی ہے، اور ان کی پانچ سے آٹھ فیصد آبادی ساٹھ سال سے زیادہ عمر کی ہے۔

متلاشیوں کی کامیابی کا راز جو انہیں غذائیت کی کمی اور فاقوں سے بچاتا وہ ان کی غذا کا تنوع تھا۔ کسان اکثر بہت محدود اور غیر متوازن غذا کھاتے ہیں۔ بالخصوص آلو یا چاول جن میں وٹامن، معدنیات اور دیگر انسانی غذائی ضروریات کی کمی ہے۔ چین میں عموماً ایک اوسط کسان ناشتے میں چاول کھاتا ہے، ظہرانے میں چاول اور پھر رات کے کھانے میں بھی چاول۔ اگر وہ خوش قسمت ہوا تو اسے دوسرے روز بھی یہ غذا مہیا ہو جائے گی۔ اس کے

مقابلے میں قدیم متلاشی درجنوں متنوع قسم کی غذا کھاتے تھے۔ کسانوں کے قدیم متلاشی اجداد ممکن ہے کہ ناشتے میں کھمبیاں اور بیر کھاتے ہوں، ظہرانے میں گھونگھے، پھل اور کچھوے اور رات کے کھانے میں جنگلی پیاز کے ساتھ خرگوش کا اسٹیک۔ آئندہ روز کی فہرست طعام غالباً بالکل مختلف ہوگی۔ اس تنوع سے یہ بات تو یقینی ہوگئی کہ قدیم متلاشی تمام ضروری غذائیت حاصل کرنے میں کامیاب رہتے تھے۔

پھر کیوں کہ وہ محض ایک ہی قسم کی غذا پر انحصار نہیں کرتے تھے، تو اس ایک غذائی وسیلے کی ناکامی سے وہ دشواری میں نہیں پڑ جاتے تھے۔ خشک سالی کے زمانے میں زرعی معاشرے قحط کا شکار ہو جاتے ہیں۔ زلزلہ یا آتش زدگی سالانہ چاول یا آلو کی فصل کو تباہ کر سکتا ہے۔ متلاشیوں کے معاشرے بھی قدرتی آفات سے آزاد نہیں تھے۔ وہ بھی کمیابی اور بھوک کے ادوار سے گزرتے، لیکن وہ ان آفات کا زیادہ آسانی سے مقابلہ کر لیتے۔ اگر وہ اپنی عمومی اجناس کھو دیتے تو وہ دوسری سپیسی شکار کرنے لگتے یا کسی کم متاثرہ علاقے میں منتقل ہو جاتے۔

قدیم متلاشی متعدی بیماریوں کا بھی کم شکار ہوتے۔ زیادہ تر متعدی بیماریاں (چیچک، تپ دق، خسرہ وغیرہ) جو صنعتی اور زرعی معاشروں میں عام ہوئیں، ان کی ابتدا پالتو جانوروں سے ہوئی اور وہ زرعی انقلاب کے بعد انسانوں میں منتقل ہوئیں۔ قدیم متلاشی جو صرف کتے پالتے تھے وہ ان آفات سے محفوظ تھے۔ پھر یہ کہ زرعی اور صنعتی معاشروں میں زیادہ تر لوگ گنجان آباد، حفظان صحت کے منافی مستقل مقامات پر رہتے، جو بیماریوں کے لیے بہت مناسب ماحول ہے۔ متلاشی زمین پر چھوٹے گروہوں میں پھرتے جو وباؤں کو برقرار نہیں رکھ سکتا تھا۔

غذائیت سے پر متنوع غذا، ہفتہ وار کام کا مختصر دورانیہ اور وبائی امراض کی نایابی کی وجہ سے بہت سے ماہرین قبل از زراعت متلاشی معاشروں کو ہی اولین متمول معاشرہ کہتے ہیں۔ لیکن ان قدما کے طریق زندگی کو مثالی سمجھنا غلطی ہوگی۔ گو وہ زرعی اور صنعتی معاشروں کے بیشتر افراد سے بہتر زندگی گزارتے تھے، لیکن ان کی دنیا بہت سخت اور بے رحم تھی۔ کمیابی اور سختی کے زمانے عام تھے۔ بچوں میں شرح اموات بہت زیادہ تھی۔ کوئی بھی حادثہ جو آج بہت معمولی ہوتا اس زمانے میں سزائے موت بن سکتا تھا۔ زیادہ تر افراد غالباً قریبی، گروہی تعلقات سے لطف اندوز ہوتے تھے، لیکن وہ بدقسمت افراد جو اپنے گروہ کے دوسرے افراد کی حقارت، دشمنی یا مذاق کا نشان بنتے وہ غالباً بہت دشواری میں پڑ جاتے۔ جدید متلاشی بعض اوقات اپنے بوڑھوں یا معذوروں کو اگر وہ گروہ کا ساتھ دینے کے قابل نہ رہیں تو انہیں بے یار و مددگار چھوڑ دیتے ہیں یا اکثر قتل بھی کر دیتے ہیں۔ بلاضرورت نوزائیدہ یا بچوں کو قتل کر دیا جاتا، اور مذہب کے نام پر قربان کر دینے کا بھی ذکر ملتا ہے۔

پیراگوئے کے جنگلات میں رہنے والے آچی جو ۱۹۶۰ تک باقی تھے، شکاری/متلاشی زندگی کے تاریک پہلوؤں کی ایک اچھی مثال ہیں۔ جب اس گروہ کا کوئی قابل قدر رکن مر جاتا تو وہ ایک چھوٹی بچی کو بھی قتل کر کے اس کے ساتھ دفنا دیتے۔ ماہرین عمرانیات جنہوں نے ان آچی لوگوں کا انٹرویو لیا، انہوں نے ایک ایسے موقع کا پتہ چلایا جب گروہ نے ایک ادھیڑ عمر کے بیمار شخص کو جو دوسروں کا ساتھ نہیں دے پا رہا تھا، پیچھے چھوڑ دیا تھا۔ اسے ایک درخت کے نیچے چھوڑ دیا تھا۔ اس کے اوپر ایک پر شکم غذا کی امید میں گدھ منڈلا رہے تھے۔ لیکن وہ شخص جانبر ہو گیا اور تیز تیز قدم چلتا دوبارہ گروہ سے جا ملا۔ اس کا جسم پرندوں کی بیٹ سے ڈھکا ہوا تھا، اس کے بعد سے اسے گدھ کی بیٹ کے نام سے یاد کیا گیا۔

جب کوئی بوڑھی آچی عورت بقیہ گروہ کے لیے بوجھ بن جاتی تو کوئی نوجوان چپکے سے اس کے عقب میں جا کر کلہاڑی سے اس کا سر قلم کر دیتا۔ ایک آچی مرد نے متجسس ماہرین عمرانیات کو جنگل میں اپنی جوانی کے ایام کی کہانیاں سنائیں: میں اکثر بوڑھی عورتوں کو قتل کیا کرتا تھا۔ میں اپنی عزیزوں کو قتل کر دیا کرتا تھا۔ یہ عورتیں مجھ سے خوفزدہ رہتی تھیں۔ اب ان سفید فاموں کے درمیان میں کمزور پڑ گیا ہوں۔ جو بچے بالوں کے بغیر پیدا ہوتے یا جنہیں کمزور سمجھا جاتا انہیں فوراً قتل کر دیا جاتا تھا۔ ایک عورت نے بتایا کہ اس کی پہلی بیٹی کو اس لیے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا کہ گروہ ایک اور لڑکی کو برداشت کرنے پر آمادہ نہیں تھا۔ ایک اور موقع پر ایک آدمی نے ایک چھوٹے بچے کو اس لیے قتل کر دیا کیوں کہ وہ غصے میں تھا اور وہ بچہ مسلسل رو رہا تھا۔ ایک بچے کو اس لیے زندہ دفنا دیا تھا کیوں کہ وہ دیکھنے میں عجیب سا تھا، اور دوسرے بچے اس پر ہنستے تھے۔

پھر بھی ہمیں آچی کے بارے میں کوئی فوری رائے قائم کرنے سے اجتناب کرنا چاہیے۔ وہ ماہرین عمرانیات جو کئی سالوں تک ان کے ساتھ رہے تھے، ان کے مطابق بالغوں کے درمیان تصادم بہت کم ہوتا تھا۔ مرد و زن، دونوں، اپنی مرضی سے ساتھی بدل سکتے تھے۔ وہ مستقل ہنستے مسکراتے رہتے، ان میں کوئی طبقاتی سربراہ نہیں تھا۔ عموماً وہ تحکم انداز شخصیات کو ناپسند کرتے۔

وہ اپنی محدود ملکیت کے معاملے میں بہت فیاض تھے، وہ اپنی کامیابی یا دولت کے بارے میں خبطی نہیں تھے۔ وہ زندگی میں اچھے سماجی روابط اور اعلیٰ دوستی کو بہت زیادہ اہمیت دیتے تھے۔ وہ بچوں، بیماروں اور بوڑھوں کے قتل کو ایسے ہی دیکھتے تھے جیسے آج کچھ لوگ اسقاط حمل اور رحم دلانہ اختتام زندگی (Euthanasia) کو دیکھتے ہیں۔ یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ پیراگوئے کے کسانوں نے آچی افراد کو چن چن کر بے رحمی سے قتل کیا۔ شاید اپنے دشمنوں سے بچاؤ کے لیے ہی آچی نے ان افراد کے لیے اتنا بے رحم رویہ اپنایا تھا، جو گروہوں کے لیے ذمہ داری بن جاتے۔

سچ یہ ہے کہ دوسرے انسانی معاشروں کی مانند آچی معاشرہ بہت پیچیدہ تھا۔ ہم محض سطحی تعلق کی بنا پر انہیں مثالی یا معتوب نہیں کر سکتے۔ آچی نہ شیطان تھے نہ فرشتے، وہ محض انسان تھے، ایسے ہی قدیم متلاشی بھی انسان تھے۔

بھوت پریت سے گفتگو

قدیم شکاری/متلاشی کی روحانی اور ذہنی زندگی کے بارے میں ہم کیا جانتے ہیں؟ متلاشیوں کی اقتصادیات کی بابت کچھ بنیادی نکات کو اعتماد سے عددی انداز میں بیان کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً ہم یہ حساب کر سکتے ہیں کہ زندہ رہنے کے لیے ایک شخص کو کتنی کیلوری درکار تھیں، ان میں سے کتنی کیلوری ایک اخروٹ سے حاصل ہوتیں، اور ایک مربع کلومیٹر جنگل سے کتنے اخروٹ اکٹھا کیے جا سکتے ہیں۔ اس شمار سے ہم ایک عالمانہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ان کی غذا میں نسبتاً اخروٹ کی کیا اہمیت ہو گی۔

تو کیا وہ اخروٹ کو جنس بے لطف جانتے تھے یا غذائے ذائقہ دار؟ کیا ان کے خطے میں اخروٹ کے درختوں پر بھوت پریت کا بسیرا تھا؟ کیا انہیں اخروٹ کے پتے خوبصورت لگتے تھے؟ اور اگر کوئی متلاشی لڑکا کسی متلاشی لڑکی کو کسی رومانوی مقام پر لے جانا چاہتا، تو کیا اخروٹ کا سایہ دار درخت ایک مناسب مقام تھا؟ سوچ، یقین

اور احساس کی دنیا کو سمجھنا زیادہ دشوار ہے۔

زیادہ تر ماہرین کا خیال ہے کہ قدیم متلاشیوں میں روحانی (animistic) عقائد عام تھے۔ ایی مزم (لاطینی لفظ اینیما بمعنی روح) یہ عقیدہ ہے کہ تقریباً ہر جگہ، ہر جانور، ہر پودا اور ہر قدرتی مظہر آگاہی اور احساس رکھتا ہے، وہ انسانوں سے براہ راست رابطہ رکھ سکتا ہے۔ یعنی ایی مسٹ یہ یقین رکھ سکتے ہیں کہ پہاڑی پر رکھا وہ بڑا پتھر خواہشات اور ضروریات رکھتا ہے۔ وہ پتھر کسی ایسی بات پر غصہ ور ہو سکتا ہے جو لوگوں سے سرزد ہوئی ہو اور کسی دوسری بات پر خوش بھی۔ یہ پتھر لوگوں کو ڈانٹ سکتا ہے اور لوگوں سے امیدیں بھی باندھ سکتا ہے۔ نہ صرف وہ پتھر بلکہ اس پہاڑی کے دامن میں وہ بلوط کا درخت بھی ایک جاندار شے ہے اور اسی طرح پہاڑی کے دامن میں وہ بہتا چشمہ بھی۔ جنگل کے صاف علاقے میں بہتا چشمہ، اس کے اطراف اگتی جھاڑیاں، اس صاف میدان کی سمت جاتی پگڈنڈی، میدانی چوہے، بھیڑیے اور کوے جو اس سے پانی پیتے ہیں۔ ایی مسٹ کی دنیا میں صرف اشیا اور حیات ہی جاندار چیزیں نہیں، یہاں غیر مادی چیزیں بھی ہیں، مردوں کی ارواح، دوستانہ اور مخیر ارواح، وہ چیزیں جنہیں آج ہم پریاں، فرشتے اور آسیب لکھتے ہیں۔

ایی مسٹ کے اعتقاد کے مطابق انسانوں اور دیگر وجود کے درمیان کوئی رکاوٹ نہیں۔ یہ سب گفتگو، رقص، گیت اور تقریب کے ذریعے باہمی رابطہ کر سکتے ہیں۔ ایک شکاری ہرنوں کے کسی ریوڑ سے کہہ سکتا ہے کہ ان میں سے ایک خود کو قربان کر دے۔ اگر یہ شکار کامیاب رہے تو شکاری مردہ جانور سے معافی کا خواستگار ہو سکتا ہے۔ اگر کوئی بیمار پڑ جائے تو شامن (افریقی قبائلی جادوگر) اس بد روح کو بلا کر سمجھا سکتا ہے، اسے ڈرا دھمکا کر بھگا سکتا ہے جو اس بیماری کی ذمہ دار تھی۔ ان تمام روابط کی خاص بات یہ تھی کہ جن ہستیوں سے رابطہ کیا جا رہا ہے وہ سب مقامی ہیں۔ یہ آفاقی پروردگار نہیں بلکہ ایک مخصوص ہرن، ایک مخصوص درخت، ایک مخصوص چشمہ یا ایک مخصوص بھوت ہے۔

بالکل جیسے انسانوں اور دوسری موجودات میں کوئی رکاوٹ حائل نہیں، اسی طرح یہاں کوئی نظام مرتبت بھی نہیں۔ غیر انسانی وجود محض انسانی ضروریات کی تکمیل کے لیے نہیں بنائے گئے، نہ ہی وہ عظیم خداوند ہیں جو دنیا کو جیسے چاہتے ہیں چلاتے ہیں۔ یہ دنیا انسانوں یا کسی اور مخصوص وجودی گروہ کے گرد نہیں گھومتی۔

ایی مزم کوئی مخصوص مذہب نہیں ہے۔ یہ ہزاروں متنوع مذاہب، فرقوں اور اعتقادات کا عمومی نام ہے۔ یہ سب، دنیا اور اس میں بسے انسانوں کی جانب اپنے یکساں رویے کے سبب ایی مسٹ ہیں۔ یہ کہنا کہ قدیم متلاشی شاید ایی مسٹ تھے، ایسا ہی ہے جیسے یہ کہا جائے کہ قبل از جدید کسان زیادہ تر خدا پر یقین رکھتے تھے۔ خدائی تصور کے مطابق کائنات میں انسانوں اور خداؤں کے ایک مختصر سماوی گروہ کے درمیان ایک نظام مرتبت ہے۔ یہ یقیناً درست ہے کہ قبل از جدید انسان خدا پرستی کی جانب مائل تھا، لیکن اس سے ہمیں تفصیلات کا علم نہیں ہوتا۔ خدائی کا یہ عمومی لفظ سب پر حاوی ہے: اٹھارویں صدی کے پولینڈ کے یہودی راہب، سترھویں صدی کے میساچوسٹس میں چڑیلوں کو نذر آتش کرنے والے کٹر عیسائی، پندرھویں صدی کے میکسیکو کے ازٹیک پادری، بارھویں صدی ایران کے صوفی عارف، دسویں صدی کے صلیبی حملہ آور، دوسری صدی کے رومن لشکری اور پہلی صدی کی چینی نوکر شاہی۔ ان میں سے ہر گروہ دوسرے کے اعتقادات کو عجیب اور ملحدانہ سمجھتا۔ ایی مسٹ متلاشیوں کے مختلف گروہوں

کے اعتقادات اور ارکان کی بجا آوری میں بھی غالباً اتنا ہی وسیع فرق تھا۔ ان کے مذہبی تجربات شاید اتنے ہی ہنگامہ خیز، اور تنازعات، اصلاحات اور انقلابات سے پر تھے۔

لیکن ہم ان محتاط اندازوں سے زیادہ آگے نہیں بڑھ سکتے۔ اس قدیم روحانیت کی جزیات کو بیان کرنے کی کوئی بھی کوشش بہت قیاسی ہوگی، کیوں کہ ہمارے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے۔ اور جو کچھ شواہد ہیں بھی، مثلاً مٹھی بھر نوادرات یا غاروں کے نقوش، ان سب کی بہت مختلف تشریحات ہو سکتی ہیں۔ وہ اسکالرز جو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ متلاشیوں کے احساسات پر روشنی ڈال سکتے ہیں، وہ بجائے پتھر کے زمانے کے مذاہب کے نظریات میں خود اپنے تعصبات پر روشنی ڈال رہے ہوتے ہیں۔

بجائے اس کے کہ مقبروں کے چند نوادرات، غاروں کے نقوش اور ہڈیوں کے مجسموں سے نظریات کا پہاڑ قائم کیا جائے، بہتر یہ ہے کہ ہم بے تکلفی سے یہ اقرار کر لیں کہ قدیم متلاشیوں کے بارے میں ہماری معلومات بہت دھندلی ہے۔ ہمارے خیال میں وہ ایٰنی مسٹ تھے، لیکن یہ بات تو زیادہ معلوماتی نہیں۔ ہمیں نہیں معلوم کہ وہ کن ارواح کی پوجا کرتے تھے، کون سے تہوار مناتے تھے، کن چیزوں کو حرام قرار دیتے تھے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ ہم نہیں جانتے وہ کیا کہانیاں سناتے تھے۔ انسانی تاریخ کو سمجھنے میں یہ ہماری سب سے بڑی کمزوری ہے۔

متلاشیوں کے سماجی وسیاسی عوامل کے متعلق بھی ہماری معلومات صفر کے برابر ہیں۔ جیسا کہ اوپر بیان کیا جاچکا ہے ماہرین میں بنیادی امور پر بھی اتفاق نہیں: مثلاً ذاتی ملکیت کا وجود، مرکزی خاندان اور ایک ہی ساتھی سے تعلقات۔ یہ ممکن ہے کہ مختلف گروہوں کے مختلف نظام تھے۔ ان میں سے کچھ اتنے ہی طبقاتی، تناؤ کے شکار اور خونخوار رہے ہوں گے جیسے بن مانس۔ جب کہ دوسرے امن پسند، پرسکون اور شہوت پرست جیسے بوزنوں کا کوئی گروہ۔

سنگیر، روس میں 1955 میں عمرانیات کے ماہرین نے ایک تیس ہزار سال پرانا قبرستان دریافت کیا، جو عظیم الجثہ جانوروں کے شکاریوں کا معاشرہ تھا۔ انہیں ایک قبر میں ایک پچاس سالہ آدمی کا ڈھانچہ دریافت ہوا، جسے ہاتھی دانت کے موتیوں سے ڈھانپا گیا تھا، سب ملا کر کوئی تین ہزار موتی تھے۔ اس مردہ آدمی کے سر پر ٹوپی تھی جسے لومڑی کے دانتوں سے مزین کیا گیا تھا، اور اس کی کلائی کی جگہ پر پچیس ہاتھی دانت کے کنگن تھے۔ اس جگہ کی دوسری قبروں سے بہت کم اشیا برآمد ہوئیں۔ ماہرین نے اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ سنگیر میں ہاتھی نما جانوروں کے شکاری ایک طبقاتی معاشرے کے شہری تھے۔ وہ ڈھانچہ غالباً کسی گروہ یا بہت سے گروہوں پر مشتمل سارے قبیلے کا سربراہ تھا۔ یہ ممکن نہیں کہ ایک ہی گروہ کے چند درجن اراکین نے قبر کے لیے اتنی اشیا تنہا تیار کی ہوں گی۔

لاسکا(Lascaux) کے غار سے پندرہ بیس ہزار سال قدیم نقش۔ ہم اس میں کیا دیکھ سکتے ہیں، ور یہ تصویر ہمیں کیا بتاتی ہے؟ کچھ کہتے ہیں کہ ہم ایک آدمی کی شبیہ دیکھ رہے ہیں، جس کا سر کسی پرندے کا ہے، جس کا عضو تناسل تخت ہے اور جسے ایک بھینسا شکار کر رہا ہے۔ اس آدمی کے نیچے ایک اور پرندے کی شبیہ ہے جو ممکن ہے اس کی روح کا عکس ہو، جو اس کی موت کے لمحے اس کے جسم سے آزاد ہو رہی ہے۔ اگر یہ درست ہے تو یہ تصویر کسی افسوسناک شکاری حادثے کی شبیہ نہیں، بلکہ ایک دنیا سے دوسری دنیا کی جانب سفر کی کہانی ہے۔ لیکن ہمیں ہمارے پاس یہ جاننے کا کوئی طریقہ نہیں کہ ان میں سے کوئی بھی کہانی ٹھیک بھی ہے۔ یہ تو ایک روشاچہ (Rorschach) امتحان ہے، جس سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ پرانے متلاشیوں کے اعتقاد کے مطابق تو نہیں بتاتا، بلکہ جدید اسکالروں کے تعصب کی کہانی ہے۔

ماہرین عمرانیات نے ایک اس سے بھی زیادہ دلچسپ قبر دریافت کی ہے۔ اس میں دو ڈھانچے ایک ساتھ دفن ہیں۔ ایک ڈھانچہ بارہ، تیرہ برس کے لڑکے کا ہے، دوسرا تقریباً نو، دس برس کی لڑکی کا۔ یہ لڑکا پانچ ہزار ہاتھی دانت کے موتیوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ اس نے لومڑی کے دانتوں کی ٹوپی اوڑھ رکھی تھی، اور ایک بیلٹ جس میں ڈھائی سو لومڑی کے دانت جڑے تھے (اتنے دانتوں کے لئے کم از کم ساٹھ لومڑیوں کے دانت نکالے گئے ہوں گے)۔ لڑکی نے پانچ ہزار دو سو پچاس ہاتھی دانت کے موتی پہن رکھے تھے۔ دونوں بچوں کے ڈھانچوں کے اطراف بہت سے بت اور چھوٹی ہاتھی دانت کی اشیا بکھری تھیں۔ ایک ماہر دستکار مرد (یا عورت) کو ایک اکلوتا ہاتھی دانت کا موتی تراشنے میں تقریباً پینتالیس منٹ لگتے۔ دوسرے الفاظ میں وہ دس ہزار ہاتھی دانت کے موتی جن سے ان بچوں کے ڈھانچے ڈھکے ہوئے تھے، انہیں تراشنے میں تقریباً سات ہزار پانچ سو گھنٹوں کی مشقت لگی ہوگی۔ دوسری اشیا کا تو ذکر ہی کیا، یعنی ایک تجربہ کار دستکار کی عمر میں تین سال کی محنت۔

شکاری/متلاشیوں نے ہاتھ کے یہ نقوش نو ہزار سال پہلے ارجینٹینیا کے "ہاتھوں والے غار میں" چھوڑے تھے۔ ایسا لگتا ہے کہ جیسے صدیوں سے مردہ یہ ہاتھ چٹان کے اندر سے ہماری جانب بلند ہو رہے ہیں۔ یہ قدیم متلاشیوں کا سب سے جذباتی تبرک ہے، لیکن کوئی نہیں جانتا اس کے کیا معنی ہیں۔

یہ بات غیر ممکن ہے کہ اتنی کم عمری میں ان سنگیر کے بچوں نے خود کو سربراہ یا ہاتھی نما جانوروں کا شکاری ثابت کیا ہوگا۔ صرف اعتقادات کی رو سے ہی یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ ان کی اتنی شاندار تدفین کی وجہ کیا تھی۔ ایک نظریہ یہ ہے کہ انہیں یہ رتبہ اپنے والدین کی وجہ سے حاصل ہوا تھا۔ شاید وہ کسی سربراہ کی اولاد تھے، کسی ایسے معاشرے میں جو خاندانی بالادستی یا موروثیت کی سخت روایات پر یقین رکھتا تھا۔

ایک اور نظریے کے مطابق، یہ بچے پیدائش کے وقت ہی کسی قدیم مردہ روح کی آواگان سمجھے گئے تھے۔

تیسرا نظریہ یہ ہے کہ ان بچوں کی تدفین، ان کی زندگی کے بجائے، ان کے مرنے کے طریقے کی جانب اشارہ ہے۔ وہ غالباً رسومات کی قربان گاہ پر چڑھائے گئے تھے۔ غالباً سربراہ کی تدفین کی رسومات کا ایک حصہ اور پھر انہیں بھی شان و شوکت سے دفنا دیا گیا تھا۔

صحیح جواب جو بھی ہو، یہ اس بات کا اہم ثبوت ہے کہ تیس ہزار سال پہلے سیپین وہ سیاسی و سماجی نظام وضع کر سکتے تھے، جو ہمارے ڈی این اے کی ترتیب سے بالاتر تھے، اور دوسرے انسانی وحیوانی رویوں سے ماورا۔

جنگ یا امن

اور آخری بات یہ کہ ان متلاشی معاشروں میں جنگ نے کیا کردار ادا کیا تھا۔ کچھ ماہرین کے خیال میں یہ قدیم شکاری/متلاشی معاشرے پُرامن جنت کی مثال تھے۔ وہ یہ بحث کرتے ہیں کہ جنگ اور تشدد زرعی انقلاب کے بعد سے شروع ہوئے، جب لوگوں نے ذاتی ملکیت اکٹھی کرنی شروع کی۔ دوسرے ماہرین کے خیال میں قدیم متلاشیوں کی دنیا بہت پرتشدد اور بے رحم تھی۔ یہ دونوں نظریات ہی خیالی قلعے ہیں، جن کا سچائی سے تعلق محض وہ چند آثار قدیمہ کی باقیات ہیں، اور موجودہ دور کے ماہرین عمرانیات کا متلاشیوں کا مطالعہ۔

عمرانی ثبوت بہت دلچسپ لیکن مسائل سے دوچار ہے۔ آج کے متلاشی زیادہ تر دور دراز، انتہائی نامہربان علاقوں میں رہتے ہیں، مثلاً قطب شمالی یا کالاہاری۔ جہاں آبادی کم ہے اور دوسروں سے لڑنے کے مواقع محدود۔ پھر یہ کہ متلاشیوں کی موجودہ نسلیں، کسی نہ کسی ریاست کے قوانین کی زیادہ سے زیادہ تابع ہوتی جا رہی ہیں، جو بڑے پیمانے پر جنگ سے روکتی ہیں۔ یورپی ماہرین کو آزاد متلاشیوں کی کثیف آبادیوں کے مطالعے کے محض دو ہی مواقع ملے ہیں: انیسویں صدی کے شمال مغربی امریکہ میں، اور انیسویں صدی سے بیسویں کے اوائل میں شمالی آسٹریلیا۔

دونوں امریکی انڈین اور اصلی آسٹریلیائی معاشروں میں اکثر مسلح جنگیں دیکھی گئیں۔ یہ بہرحال قابل بحث ہے کہ آیا ایسا ہمیشہ سے ہوتا رہا تھا یا یہ یورپی توسیع پسندی کا اثر ہے۔

آثار قدیمہ کی باقیات کمیاب اور مبہم ہیں۔ کوئی جنگ جو ہزار سال پہلے ہوئی ہو، اس کی کیا شہادتیں ممکن ہیں؟ اس زمانے میں فصیلیں اور قلعے تو ہوتے نہیں تھے، نہ ہی آرٹلری کے شیل، بلکہ تلواریں اور ڈھال تک نہیں۔ ممکن

ہے ایک قدیم نیزے کی انی جنگ میں استعمال ہوئی ہو، لیکن یہ تو شکار میں بھی کام آسکتی تھی۔ اسی طرح ٹوٹی ہوئی انسانی ہڈیوں کو سمجھنا بھی آسان نہیں۔ ٹوٹی ہڈی کسی جنگ کا نتیجہ ہو سکتی ہے، یا کسی حادثے کا۔ نہ ہی ہڈی کے ٹوٹنے یا پرانے ڈھانچوں پر گھاؤ کی غیر موجودگی اس بات کا ثبوت ہے کہ اس ڈھانچے کا مالک شخص ایک پرتشدد جنگ کے ہاتھوں ہلاک نہیں ہوا۔ موت تو جسم پر لگے گھاؤ سے بھی واقع ہو سکتی ہے جو ہڈیوں پر کوئی نشان نہ چھوڑیں۔ زیادہ اہم بات یہ ہے کہ قبل از صنعتی جنگوں میں نوے فیصد سے زیادہ جنگی اموات کی وجہ قحط، سرد موسم یا بیماری تھی، ہتھیار نہیں۔ تصور کیجیے کہ تیس ہزار سال قبل ایک قبیلے نے اپنے ہمسائے کو شکست دے کر انہیں زرخیز علاقوں سے بے دخل کر دیا۔ فیصلہ کن جنگ میں مفتوح قبیلے کے دس افراد مارے گئے۔ آئندہ سال اس مفتوح قبیلے کے مزید سو افراد قحط، سردی اور بیماری کے ہاتھوں ہلاک ہوئے۔ آثارِ قدیمہ کے ماہرین جب ان ایک سو دس ڈھانچوں کے آثار پائیں گے تو یہی نتیجہ اخذ کریں گے کہ ان میں سے بیشتر قدرتی آفت سے مارے گئے۔ ہم یہ نتیجہ کیسے اخذ کر سکیں گے کہ یہ سب دراصل ایک بے رحم جنگ کے ہاتھوں ہلاک ہوئے۔

ان وضاحتوں کے بعد اب ہم آثارِ قدیمہ کی جانب متوجہ ہوتے ہیں۔ پرتگال میں زرعی انقلاب سے ذرا پہلے کے چار سو ڈھانچوں کا مطالعہ کیا گیا۔ صرف دو ڈھانچے ایسے تھے جن پر تشدد کے واضح نشانات تھے۔ اسرائیل سے ملنے والے چار سو دیگر ڈھانچوں کے اسی قسم کے مطالعے میں صرف ایک کھوپڑی ایسی ملی جس کی دراڑ کسی انسانی تشدد کا نتیجہ ہو سکتی تھی۔ زرعی انقلاب سے قبل کے چار سو ڈھانچوں کا ایک تیسرا مطالعہ وادی ڈینوب کے قرب و جوار میں کیا گیا، جس میں اٹھارہ ڈھانچوں پر تشدد کی علامت تھیں۔ چار سو میں سے اٹھارہ بہت زیادہ تناسب تو نہیں، لیکن یہ ایک بڑی فیصد ہے۔ اگر یہ اٹھارہ واقعی تشدد کے ہاتھوں ہلاک ہوتے تو قدیم وادی ڈینوب میں ساڑھے چار فیصد افراد تشدد سے ہلاک ہوئے۔ آج کا عالمی تناسب، تمام جنگوں اور جرائم کو ملا کر بھی ڈیڑھ فیصد ہے۔

بیسویں صدی میں صرف پانچ فیصد اموات انسانی تشدد کا نتیجہ تھیں، اور یہ وہ صدی ہے کہ جس نے سب سے زیادہ ہولناک جنگیں اور تاریخ کی سب سے بڑے پیمانے پر نسل کشی دیکھی۔ اگر یہ انکشافات درست ہیں تو قدیم وادی ڈینوب اتنی ہی پرتشدد تھی جتنی بیسویں صدی*۔

وادی ڈینوب کی مایوس کن دریافتوں کو کچھ دوسرے علاقوں کی مایوس کن دریافتوں سے تقویت ملتی ہے۔ سوڈان کے جبل الصحابہ میں انسٹھ قبروں پر مشتمل بارہ ہزار سال قدیم قبرستان دریافت ہوا۔ چوبیس ڈھانچوں میں تیر کی انی پیوست تھی یا ان کی ہڈیوں کے پاس پڑی تھی، اس دریافت کا چالیس فیصد۔ ایک عورت کے ڈھانچے پر بارہ زخموں کے نشانات تھے۔ بویریا کے آفنیٹ غار میں ماہرین آثارِ قدیمہ کو اڑتیس متلاشیوں کے ڈھانچے ملے، جو زیادہ تر عورتوں اور بچوں کے تھے، جنہیں دو اجتماعی قبروں میں دفن کیا گیا تھا۔ ان میں سے نصف ڈھانچے جن میں بچے اور نوزائیدہ بھی شامل تھے، تشدد کے واضح نشانات رکھتے تھے، جن میں چھریاں اور کلہاڑیاں شامل تھیں۔ چند مردوں کے جو ڈھانچے ملے ان پر ہولناک تشدد کے نشانات تھے۔ غالباً آفنیٹ میں ایک پورے متلاشی گروہ کو نیست و نابود کر دیا گیا تھا۔

---

* یہ کہا جا سکتا ہے کہ قدیم وادی ڈینوب سے ملنے والے تمام اٹھارہ ڈھانچے جن پر نشانات تھے، وہ تشدد کے ہاتھوں ہلاک نہیں ہوئے۔ ان میں سے کچھ محض زخمی ہوئے تھے۔ پھر اس کے مقابلے میں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ یہ اموات جسمانی گھاؤ یا جنگ سے وابستہ محرومیوں کا نتیجہ ہیں۔

کون سی تصویر قدیم متلاشیوں کی دنیا کی صحیح نمائندگی کرتی ہے: اسرائیل اور پرتگال سے ملنے والے پر امن ڈھانچے، یا جبل الصحابہ اور تھنیٹ کے متقل؟ شاید یہ دونوں ہی نہیں۔ بالکل جیسے متلاشی مذاہب اور معاشرتی نظام میں بہت تنوع کے حامل تھے، اسی طرح وہ غالب تشدد کے تناسب میں بھی تنوع رکھتے تھے۔ ایک جانب تو کچھ علاقے اور کچھ ادوار امن و امان کے ادوار تھے، تو دوسرے ہولناک جنگوں سے دولخت تھے۔

خاموشی کا پردہ

اگر قدیم متلاشیوں کی زندگی کی ایک واضح تصویر بنانا اس قدر دشوار ہے تو مخصوص واقعات تک رسائی تو ناممکن ہے۔ جب کوئی سیپین گروہ کسی ایسی وادی میں داخل ہوا ہوگا، جہاں نینڈرتھال آباد تھے تو آئندہ چند سالوں نے غالباً حیرت انگیز تاریخی ڈرامہ دیکھا ہوگا۔ بدقسمتی سے اس تصادم میں کچھ نہ بچا ہوگا سوائے چند نوسل ہوئی ہڈیوں، مٹھی بھر پتھر کے اوزار، جو ماہرین کے باریک بیں مطالعے کے باوجود خاموش گواہ ہی بنے رہتے ہیں۔ ہم ان سے انسانی ساخت، انسانی ٹیکنالوجی، انسانی غذا اور شاید انسانی سماجی نظام کا ڈھانچہ اخذ کر سکتے ہیں۔ لیکن ان سے ہمسایہ سیپین گروہوں میں سیاسی معاہدوں پر روشنی نہیں پڑتی، نہ ہی ان کے مردوں کی وہ ارواح ملتی ہیں جنہوں نے ان معاہدوں کی توثیق کی ہوگی، یا وہ ہاتھی دانت کے موتی جو مقامی شامن کو رشوت دیے گئے ہوں گے تاکہ وہ ان ارواح کی نیک خواہشات حاصل کر سکے۔

خاموشی کی یہ دیوار ہزاروں سالوں کی تاریخ پر پردہ ڈالے ہے۔ ان ادوار نے ممکن ہے کہ جنگیں اور انقلابات دیکھے ہوں، پر مسرت مذہبی تحاریک، چونکا دینے والے فلسفیانہ نظریات، آرٹ کے نایاب نمونے، ان متلاشیوں میں بھی نپولین جیسے فاتح عالم رہے ہوں گے، وٹگمبرگ کے نصف رقبے کے برابر علاقوں پر حاکم رہے ہوں۔ خداداد صلاحیتوں کے مالک بیتھووین جن کے ساتھ سمفنی آرکسٹرا تو نہیں رہا ہوگا لیکن وہ اپنی بانسری سے لوگوں کی آنکھوں میں آنسو لے آتے ہوں گے۔ یا وہ متناطیسی پیغمبر جو کائنات کے تخلیق کار خدا کے بجائے کسی مقامی بلوط کے درخت کے پیغامات پہنچانے کے دعویدار ہوں گے۔ لیکن یہ محض قیاسات ہیں۔ خاموشی کا یہ پردہ اتنا دبیز ہے کہ ہم یہ بھی یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ یہ سب ہوا ہوگا، ان کی تفصیل کی بات تو رہنے ہی دیجیے۔

ماہرین صرف وہی سوالات اٹھاتے ہیں جن کے جوابات ملنے کی انہیں امید ہو۔ کسی ہنوز غیر دریافت شدہ تحقیقی اوزار کے بغیر ہم کبھی معلوم نہیں کر سکیں گے کہ قدیم متلاشیوں کے عقائد کیا تھے، یا وہ کن سیاسی بحرانوں سے گزرے۔ پھر بھی یہ اہم ہے کہ وہ سوالات کیے جائیں جن کے جوابات مہیا نہیں۔ ورنہ ممکن ہے کہ ہم ساٹھ، ستر ہزار سال قبل کی انسانی تاریخ یہ کہہ کر مسترد کر دیں کہ جو لوگ اس دور میں زندہ تھے، انہوں نے کوئی اہم کام انجام نہیں دیا۔

حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے بہت سے اہم کام کیے۔ خاص طور پر ہماری سوچ سے زیادہ ہماری دنیا کو شکل دی۔ سربیا کے میدان (ٹنڈرا)، وسطی آسٹریلیا کے صحرا اور امیزون کے برساتی جنگلات میں جانے والے کھوجی یہ یقین رکھتے ہیں کہ وہ ایک ان چھوئے علاقے میں داخل ہوئے ہیں، جہاں پہلے انسانی قدم نہیں پہنچے تھے۔ لیکن یہ محض خام خیالی ہے۔ متلاشی ہم سے پہلے وہاں پہنچ چکے تھے۔ اور انہوں نے گھنے ترین جنگلات اور دور دراز بیابانوں میں ڈرامائی تبدیلیاں پیدا کیں۔ اگلے باب میں یہ بتایا گیا ہے کہ اولین زرعی دیہات کے قیام سے بھی پہلے کس طرح متلاشیوں نے ہمارے سیارے کے ماحول کو مکمل طور پر تبدیل کر دیا تھا۔ داستان گو سیپین کے پھرتے گروہ وہ بہ ترین اور تباہ کن قوت تھی جو کبھی حیوانی دنیا میں پیدا ہوئی۔

○

طوفان

ادراکی انقلاب سے پہلے تمام انسانی انواع صرف افروایشیائی زمین تک محدود تھیں۔ یہ درست ہے کہ انہوں نے پانی کے مختصر فاصلے پر تیر کر یا تختے جوڑ کر چند قریبی جزیروں کو بھی آباد کر لیا تھا۔ مثلاً فلورس ساڑھے آٹھ لاکھ سال پہلے ہی آباد ہو چکا تھا۔ پھر بھی وہ کھلے سمندروں میں نکلنے کی اہلیت نہیں رکھتے تھے۔ اور ہنوز دور دراز کے جزائر مثلاً میڈاگاسکر، نیوزی لینڈ، امریکہ، آسٹریلیا یا ہوائی تک نہیں پہنچے تھے۔

اس سمندری رکاوٹ نے نہ صرف انسانوں بلکہ دوسرے افروایشیائی حیوانات و نباتات کو بھی اس "بیرونی دنیا" تک پہنچنے سے باز رکھا تھا۔ اس کے نتیجے میں دور دراز کے خطوں مثلاً آسٹریلیا اور میڈاگاسکر میں حیات لاکھوں سالوں تک تنہا ہی ارتقائی سفر طے کرتی رہی۔ اور اپنے افروایشیائی ہم عصروں کے مقابلے میں بہت مختلف حالت اور فطرت کو بالیدگی دی۔ سیارہ زمین بہت سی مختلف ماحولیات میں منقسم ہو گیا تھا۔ جن میں سے ہر ایک پر اس کے مخصوص حیوانات اور نباتات پرورش پا رہے تھے۔ خود سیپین ہی اس حیاتیاتی افراط کا خاتمہ کرنے کا باعث بننے والے تھے۔

ادراکی انقلاب کے بعد سیپین نے وہ ٹکنالوجی، انتظامی صلاحیت اور شاید وہ دوربینی بھی حاصل کر لی جس سے وہ افروایشیائی حدود کو توڑ کر باہر کی دنیا کو آباد کر سکیں۔ ان کی پہلی کامیابی تقریباً پینتالیس ہزار سال پہلے آسٹریلیا میں آباد ہونا تھا۔ اس کارنامے کو سمجھانے میں ماہرین مشکل کا شکار ہو جاتے ہیں۔ آسٹریلیا تک پہنچنے کے لیے انسانوں کو کئی سمندروں کو عبور کرنا تھا، جن میں سے کچھ تو سو کلومیٹر تک چوڑے تھے۔ اور وہاں پہنچ کر تقریباً راتوں رات انہیں ایک نئے ماحول سے مطابقت پیدا کرنی تھی۔

ان میں سب سے قابل قبول نظریہ یہ ہے کہ پینتالیس ہزار سال پہلے جزائر انڈونیشیا میں مقیم سیپین نے پہلے پہل جو سمندری قافلے تیار کیے۔ انہوں نے سمندر میں اتارے جانے کے قابل جہازوں کی تعمیر اور انہیں کھینا سیکھا۔ یوں وہ لمبے فاصلے کے ماہی گیر، تاجر اور کھوجی بن گئے۔ اس سے انسان کی اہلیت اور انداز زندگی میں ناقابل یقین تبدیلیاں واقع ہوئی ہوں گی۔ ہر وہ پستانیہ جانور جو انسان سے پہلے سمندر میں گیا تھا، مثلاً دریائی بچھڑے، دریائی گائے، ڈولفن ان سب کے جسموں میں طویل المعیاد تبدیلیاں واقع ہوئیں۔ تاکہ ان کے اجسام میں پانی میں حرکت کے موافق مخصوص اعضا پیدا ہو سکیں۔ انڈونیشیا کے سیپین، افریقی جنگلات میں بوزنوں کی اولادیں، وہ بحیرہ او قیانوس میں تیراک بن گئے۔ لیکن اپنے جسموں میں چوڑے، چپٹے ہوئے پاؤں پیدا کیے بغیر، اور اس انتظار کے بغیر کہ وہیل

مچھلی کی مانند ان کی ناکیں بھی ہجرت کر کے ان کے سروں کے اوپر منتقل ہو جائیں۔ اس کے بجائے انہوں نے کشتیاں تعمیر کیں، انہیں کھینا سیکھا اور ان ہنر مندیوں کے سہارے وہ آسٹریلیا پہنچ کر آباد ہو سکے۔

یہ درست ہے کہ ابھی ماہرین آثار قدیمہ کو کشتیاں، چپو، ماہی گیر قبیلے دریافت کرنا باقی ہیں، جو پینتالیس ہزار سال پرانے ہوں (یہ دریافت دشوار ہوگی کیوں کہ بڑھتی سطح سمندر نے قدیم انڈونیشیائی ساحل کے سیکڑوں میٹر زمین کو سمندر تلے دفنا دیا ہے)۔ پھر بھی اس نظریے کی سچائی کے لیے بہت سے واقعاتی شواہد موجود ہیں۔ بالخصوص یہ کہ آسٹریلیا میں آباد کاری کے بعد کے ہزار سال کے دورانیے میں سیپین نے اس کے شمال میں بہت سے چھوٹے اور بیابان جزیروں کو آباد کیا ہے۔

ان میں سے کچھ مثلاً بوکا اور مینس تو قریب ترین زمینی علاقے سے دو سو کلو میٹر کھلے سمندر کے بعد ہیں۔ یہ یقین کرنا دشوار ہے کہ کسی نے بغیر اعلیٰ طرز کی کشتیوں اور جہاز رانی کے ہنر کے مینس پہنچ کر اسے آباد کیا ہوگا۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے ان کے درمیان باقاعدہ سمندری تجارت کے شواہد موجود ہیں، مثلاً نئے آئرلینڈ اور نئے انگلستان کے درمیان۔

آسٹریلیا پہنچنے والے اولین انسانوں کا سفر تاریخ کا ایک اہم سنگ میل ہے۔ کن از کم اتنا ہی اہم جتنا کولمبس کا امریکہ کا سفر یا اپولو گیارہ کا چاند کا سفر۔ یہ پہلی بار تھا کہ کوئی انسان افروایشیائی سرحد سے باہر نکلا تھا۔ بلکہ پہلی بار کوئی بڑا پستانیہ جانور، افروایشیا عبور کر کے آسٹریلیا پہنچا تھا۔ اس سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ ان انسانی سرخیلوں نے اس نئی سرزمین پر پہنچنے کے بعد کیا کیا تھا۔ جس لمحے پہلے شکاری/متلاشی نے آسٹریلیا کے ساحل پر قدم رکھا تھا، وہی لمحہ تھا کہ جب ہوموسیپین غذائی سیڑھی کے سب سے بالائی پائدان پر پہنچ گئے تھے، چنانچہ وہ اس سیارے زمین کا سب سے خطرناک اسپی شی بن گیا تھا۔

اس وقت تک انسانوں نے انوکھے رویوں اور مطابقت کا مظاہرہ تو کیا تھا، لیکن ماحول پر ان کا اثر نہ ہونے کے برابر تھا۔ انہوں نے مختلف مقامات تک جانے اور اس سے مطابقت پیدا کرنے کی قابل ذکر اہلیت دکھائی تھی، لیکن انہوں نے ایسا ان مقامات کے ماحول میں کسی بڑی تبدیلی کے بغیر کیا تھا۔ آسٹریلیا کے آباد کار بلکہ زیادہ درست معنی میں فاتح، انہوں نے صرف نئے ماحول سے مطابقت ہی پیدا نہیں کی، انہوں نے آسٹریلیائی ماحول کو ناقابل شناخت حد تک بدل دیا۔

آسٹریلیا کے ریتیلے ساحل پر پہلے انسانی قدم تو لہروں سے فوراً ہی مٹ گئے ہوں گے۔ لیکن جب یہ حملہ آور اس جزیرے میں اندر گھسے، تو انہوں نے اپنے پیچھے وہ نقش قدم چھوڑے جو انمٹ ہیں۔ اندر جا کر انہوں نے نامعلوم مخلوقات کی اجنبی دنیا دیکھی، جس میں دو سو کلو گرام کا دو میٹر اونچا کینگرو، کسی چیتے کی سی قامت کا ایک تھالی بردار شیر جو اس جزیرے کا سب سے خطرناک شکاری تھا۔ کوالا ریچھ جو اتنے بڑے تھے کہ انہیں پیار سے گلے لگانا ناممکن تھا، درختوں کے درمیان پھر رہے تھے۔ شتر مرغ سے دوگنی قامت کے پرندے جو اڑان سے عاجز تھے میدانوں میں بھاگ رہے تھے۔ اژدھا نما چھپکلیاں اور پندرہ فٹ لمبے سانپ جھاڑیوں تلے سرسرا رہے تھے۔ دیو قامت ڈپروٹوڈون (Diprotodon) اور ڈھائی ٹن کے ومباٹ (ایک آسٹریلیائی پستانیہ Wombat) جنگل میں ٹہل رہے تھے۔ پرندوں اور رینگنے والے جانوروں کے علاوہ ان تمام جانوروں میں کنگرو کی مانند تھیلی لگی ہوئی

تھی۔ وہ اپنے چھوٹے، بے بس بچے جنم دے کر اس تھیلی میں دودھ پلاتے اور پال کر بڑا کرتے۔ تھیلی دار پستانیے جانور ایشیا یا افریقہ میں تو نامعلوم تھے، لیکن آسٹریلیا پر ان ہی کا راج تھا۔

محض چند ہزار سالوں میں ہی تقریباً یہ سارے ہی دیوقامت جانور ختم ہو گئے۔ چوبیس آسٹریلیائی جانوروں کی اسپیسی جن کا وزن پچاس کلو سے زیادہ تھا، ان میں سے تئیس ہمیشہ کے لیے نابود ہو گئے۔ چھوٹی اسپیسی کی بھی بڑی تعداد ختم ہو گئی۔ پورے آسٹریلیا کی غذائی زنجیر ٹوٹ کر آنے والے لاکھوں سالوں کے لیے از سرِ نو مرتب ہوئی۔ یہ آسٹریلیائی ماحول کی سب سے اہم تبدیلی تھی، کیا یہ سب ہوموسیپین کا قصور تھا؟

مجرم گردانے گئے

کچھ ماہرین ہماری اسپیسی کو بری الذمہ قرار دینے کی کوشش کرتے ہیں، سارا الزام موسم کی خودسری پر رکھتے ہیں (ایسے معاملات میں عموماً انہی کو قصوروار ٹھہرایا جاتا ہے)۔ لیکن پھر بھی یہ یقین کرنا دشوار ہے کہ سیپین اس سارے معاملے میں بالکل معصوم تھے، تین ایسے شواہد موجود ہیں جن سے موسم کی بے گناہی ثابت ہوتی ہے، اور آسٹریلیا کی عظیم حیوانی سلطنت کے لاپتہ ہونے میں ہمارے اجداد کو ملوث کرتے ہیں۔

اول تو یہ کہ گو آسٹریلیا کا موسم تقریباً پینتالیس ہزار برس پہلے تبدیل ہوا تھا، لیکن یہ کوئی بہت قابل ذکر تبدیلی نہیں تھی۔ یہ تصور کرنا دشوار ہے کہ موسم کے نئے رویوں سے اتنی بڑی تعداد میں مخلوق مٹ جائے گی۔ آج یہ بہت عام ہے کہ ہر چیز کو موسم کی تبدیلی پر لاد دیا جائے، لیکن سچ یہ ہے کہ زمین کا موسم کبھی ایک سا نہیں رہتا، یہ ہمیشہ سے تغیر پذیر رہا ہے۔ تاریخ میں ہر واقعے کے ساتھ کچھ موسم کی تبدیلی تلاش کی جا سکتی ہے۔

بالخصوص ہمارے سیارے نے سرد اور گرم ہونے کے مختلف ادوار کا سامنا کیا ہے۔ گزشتہ دس لاکھ سالوں کے دوران، ہر ایک لاکھ سال بعد زمین برفانی دور سے گذری ہے۔ گزشتہ دور تقریباً پندرہ سے پچھتر ہزار سال قبل گزرا تھا۔ برفانی ادوار کی تاریخ میں یہ کوئی بہت زیادہ سرد دور نہیں تھا۔ اس عرصے میں بالخصوص دو سخت ادوار آئے۔ ایک ستر ہزار سال پہلے اور دوسرا بیس ہزار سال پہلے۔ دیوقامت ڈپروٹوڈون تقریباً پندرہ لاکھ سال پہلے آسٹریلیا میں نمودار ہوئے تھے۔ انہوں نے بہت کامیابی سے کم از کم دس گزشتہ برفانی ادوار کا مقابلہ کیا تھا۔ پھر یہ پینتالیس ہزار سال پہلے کیوں ختم ہو گئے۔ پھر یہ کہ اگر ڈپروٹوڈون ہی وہ واحد دیوقامت جانور ہو گئے جو مٹ گئے تھے تو اسے اتفاق سے تعبیر کر سکتے تھے۔ لیکن ان کے ساتھ ہی آسٹریلیا کے دیگر نوے فیصد دیوقامت جانور بھی نابود ہو گئے۔ ثبوت محض واقعاتی ہے، لیکن یہ تصور دشوار ہے کہ سیپین اتفاق سے اسی وقت آسٹریلیا پہنچے جب سردی سے وہ تمام جانور مر رہے تھے۔

دوسرے یہ کہ جب موسمیاتی تبدیلی اتنی بڑی تعداد میں جانوروں کا خاتمہ کرتی ہے تو سمندری مخلوق بھی اتنی ہی بری طرح تباہ ہوتی ہے جیسے زمینی۔ لیکن اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ پینتالیس ہزار سال پہلے سمندری حیوانات کسی قابل قدر تعداد میں ختم ہوئے تھے۔ انسان کے ملوث ہونے سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ آسٹریلیا کے زمینی دیوقامت جانور پینتالیس ہزار سال پہلے کیوں مٹ گئے تھے، جب کہ نزدیکی سمندری جانور زندہ رہے۔ اپنی تمام تر جہازرانی اہلیت کے باوجود ہوموسیپین ایک زمینی خطرہ ہی تھا۔

تیسرے یہ کہ آسٹریلیائی تباہی کی مانند، آنے والے ہزاروں سالوں میں یہ غارت گری بارہا بیرونی دنیا میں ہر اس جگہ دیکھی گئی جہاں حضرت انسان آباد ہوا۔ ان مقدمات میں سیپین کا جرم ناقابل تردید ہے۔ مثلاً نیوزی لینڈ کے بڑے حیوانات جنہوں نے پینتالیس ہزار سال پہلے کی موسمیاتی تبدیلی کسی زکام کے بغیر سہہ لی تھی، وہ اس جزیرے پر انسان کے قدم پڑنے کے فوراً بعد انتہائی تباہی کا شکار ہوئے۔ نیوزی لینڈ کے پولی نیسین قبائل، وہ اولین سیپین آبادکار، ان جزیروں پر آٹھ سو سال پہلے اترے تھے۔ چند صدیوں کے اندر ہی ساٹھ فیصد پرندوں سمیت تمام دیوقامت جانور نابود ہو گئے۔

قطب شمالی کے جزیرہ رنگل کے میمتھ (Mammoth) پستانیوں (سائبیریا کے ساحل سے دو سو کلومیٹر شمال میں) کا بھی یہی حشر ہوا۔ اس کرہ کے شمالی نصف میں میمتھ لاکھوں سالوں سے راج کر رہے تھے۔ لیکن جب ہوموسیپین پہلے یوریشیا اور پھر شمالی امریکہ میں پھیلے تو میمتھ پسپا ہو گئے۔ دس ہزار سال پہلے تک دنیا بھر میں کہیں بھی کوئی میمتھ موجود نہیں تھا، سوائے قطب شمالی کے چند جزائر، بالخصوص جزیرہ رنگل میں۔ یہاں کے میمتھ مزید چند ہزار سال زندہ رہے، لیکن پھر اچانک تقریباً چار ہزار سال پہلے اس وقت ختم ہو گئے جب انسان کے قدم پہلی بار وہاں پہنچے۔

اگر آسٹریلیا میں یوں نابود ہو جانا ایک اکلوتا واقعہ ہوتا تو ہم انسانوں کو شبہ کا فائدہ دے کر بری کر دیتے، لیکن تاریخ کے اوراق ہوموسیپین کو ماحولیات کا عادی قاتل ٹھہراتے ہیں۔

آسٹریلیا کے آبادکاروں کے پاس صرف پتھر کے زمانے کی ٹیکنالوجی تھی۔ وہ ایک ماحولیاتی تباہی کیسے کر سکتے تھے؟ تین نظریات ایسے ہیں جو بہت خوبی سے اسے سلجھاتے ہیں:

دیوقامت جانور جو آسٹریلیا میں غارت گری کا سب سے بنیادی نشانہ تھے، وہ آہستہ افزائش نسل کرتے ہیں۔ حمل بہت لمبے دورانیے کا ہوتا ہے، ہر حمل میں بچوں کی تعداد مختصر ہوتی ہے، اور دو حمل کے درمیان وقفہ طویل ہوتا ہے۔ لیکن اگر انسانوں نے ہر چند ماہ میں محض ایک ہی ڈپروٹوڈون مارا ہو، تو ان کی اموات کی شرح پیدائش کی شرح سے تجاوز کر جائے گی۔ چند ہزار سالوں میں ہی آخری ڈپروٹوڈون مر جائے گی، اور اس کے ساتھ ہی اس کی اسپیسی بھی۔

درحقیقت، اپنے حجم کے باوجود ڈپروٹوڈون اور آسٹریلیا کے دوسرے دیوقامت جانوروں کا شکار دشوار نہیں رہا ہوگا، کیوں کہ وہ ان دو پیروں پر کھڑے حملہ آوروں سے ششدر رہ گئے ہوں گے۔ افروایشیا میں تو مختلف انواع کے انسان تقریباً بیس لاکھ سال سے گھوم رہے تھے۔ انہوں نے اپنی شکاری اہلیت کو بتدریج بہتر بنا لیا تھا، اور تقریباً چار لاکھ سال پہلے بڑے حیوانات کا شکار شروع کر دیا تھا۔ افریقہ اور ایشیا کے بڑے جانوروں نے انسانوں سے دور رہنا سیکھ لیا تھا۔ تو جب نیا مہلک ترین قاتل، ہوموسیپین افروایشیا کے منظر نامے میں نمودار ہو تو بڑے جانوروں کو پہلے ہی سے علم تھا کہ اس قسم کی مشابہت رکھنے والوں سے فاصلہ رکھنا زندگی کی ضمانت ہے۔ اس کے مقابلے میں آسٹریلیا کے دیوقامتوں کو وقت ہی نہ ملا کہ وہ بھاگ کھڑے ہوتے۔ انسان بہت خطرناک نہیں لگتے۔ نہ ان کے بہت لمبے، نوکیلے دانت ہیں اور نہ ہی بہت عضلاتی لوچدار جسم۔ لہٰذا جب کسی ڈپروٹوڈون نے، یعنی سطح زمین پر چلنے والا سب سے بڑا تھیلی دار جانور، پہلی بار اس بن مانس نما ہستی پر نظر ڈالی ہو گی تو محض ایک نگہ غلط کے بعد دوبارہ پتے چبانے میں مصروف ہو گیا ہوگا۔ ان جانوروں کو انسان سے خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں تھی، لیکن ایسا کرنے سے پہلے ہی وہ مٹ گئے۔

دوسرے نظریے کے مطابق، جب سیپین آسٹریلیا پہنچے تو وہ اس وقت تک آگ لگانا سیکھ چکے تھے۔ ایک اجنبی، ممکنہ طور پر خطرناک ماحول کو دیکھ کر انہوں نے جان بوجھ کر ہرے جھنڈ اور گھنے جنگلات کو آتش زدکیا ہوگا جو ان کی راہ میں رکاوٹ تھے، تاکہ کھلے میدان بن سکیں۔ جو زیادہ آسانی سے شکار ہونے والے جانوروں کے لیے پرکشش تھا اور ان کی ضروریات کے لیے بہتر علاقہ۔ یوں انہوں نے چند ہزار سالوں میں آسٹریلیا کے ایک بڑے رقبے کا ماحول مکمل طور پر تبدیل کر دیا۔

نباتاتی فوسل کی موجودگی اس نظریے کی تائید کرتی ہے۔ یوکلپٹس کا درخت آسٹریلیا میں پینتالیس ہزار سال پہلے نایاب تھا۔ لیکن ہوموسیپین نے اس درخت کے ایک سنہری دور کا آغاز کیا۔ کیوں کہ یوکلپٹس آگ نہیں پکڑتے تو وہ دور تک پھیل گئے، جب کہ دوسرے درخت اور جھاڑیاں جل گئے۔

نباتات میں اس تبدیلی سے وہ جانور متاثر ہوئے جو گوشت نہیں کھاتے تھے۔ کوالا ریچھ جو صرف یوکلپٹس کے پتوں پر گزارا کرتے ہیں، وہ بخوشی انہیں چباتے نئے علاقوں میں پھیل گئے جب کہ بیشتر دوسرے جانوروں نے بہت نقصان اٹھایا۔ آسٹریلیا میں بہت سی غذائی سیڑھیاں گریں، اور ان کے کمزور روابط نابود ہو گئے۔

ایک تیسرا نظریہ یہ تو تسلیم کرتا ہے کہ شکار اور آتش زدگی نے اس نسلی خاتمے میں بہت اہم کردار ادا کیا، لیکن وہ کہتے ہیں کہ ہمیں موسمی اثرات کو مکمل نظرانداز نہیں کر دینا چاہیے۔ پینتالیس ہزار سال پہلے رونما ہونے والی تبدیلیوں نے ماحول کو بالکل تباہ اور کمزور کر دیا۔ عام حالات میں جیسا کہ پہلے بھی کئی بار ہو چکا تھا، ماحول اپنے آپ کو دوبارہ بحال کر لیتا۔ لیکن اس نازک موڑ پر انسان نے نمودار ہو کر اس کمزور ماحول کو عدم میں دھکیل دیا۔ ماحولیاتی تبدیلی اور انسانی شکار نے مشترکہ طور پر مختلف رخوں سے حملہ کر کے بڑے جانوروں کو مہلک نقصان پہنچایا۔ بچاؤ کی کوئی موثر ترکیب جو ایک ساتھ مختلف قسم کے حملہ آوروں کا مقابلہ کر سکتی بہت دشوار تھی۔

مزید شہادتوں کے بغیر ان تین نظریات میں سے کسی ایک کو دوسرے سے بہتر ماننا دشوار ہے۔ لیکن بہر حال یہ ماننے کے کافی شواہد ہیں کہ اگر انسان کبھی آسٹریلیا نہ گیا ہوتا تو وہاں اب بھی تھیلی دار شیر، ڈپروٹوڈون اور جہازی کنگرو پھر رہے ہوتے

سلوتھ کا خاتمہ

آسٹریلیا کے دیوقامت جانوروں کا نیست و نابود ہو جانا غالباً وہ اولین قابل ذکر نشان ہے جو ہوموسیپین نے ہمارے سیارے پر چھوڑا۔ اس کے بعد ایک اس سے بھی بڑا ماحولیاتی بحران پیدا ہوا، اس بار امریکہ میں۔ ہوموسیپین وہ پہلی اور واحد نوع انسانی تھی جو مغربی کرہ زمین تک پہنچی، تقریباً سولہ ہزار قبل یعنی تقریباً چودہ ہزار قبل از مسیح میں۔ اولین امریکی وہاں پیدل پہنچے۔ اس وقت ایسا کرنا ممکن تھا کیوں کہ سطح سمندر اتنی نیچی تھی کہ شمال مشرقی سائبیریا سے ایک زمینی پل شمال مغربی الاسکا تک بن گیا تھا۔ یہ سفر بہت مبہم تھا، غالباً آسٹریلیا کے سفر سے بھی زیادہ۔ اسے عبور کرنے کے لیے پہلے تو سیپین نے یہ سیکھنا تھا کہ سائبیریا کی قطب شمالی برفیلی سردی میں کیسے زندہ رہیں۔ ایک ایسا علاقہ جہاں سردیوں میں سورج نکلتا ہی نہیں، جہاں درجہ حرارت منفی پچاس ڈگری تک چلا جاتا ہے۔

اس سے پہلے کوئی سابقہ نوع انسانی شمالی سائبیریا تک نہیں پہنچ سکی تھی۔ سردی کا بہتر مقابلہ کرنے والے

نینڈرتھال تک نے اپنے آپ کو نسبتاً گرم جنوبی علاقوں تک محدود کرلیا تھا۔لیکن ہوموسیپین جن کے جسم برفیلی علاقوں کے بجائے ،افریقی میدانوں کے عادی تھے ،انہوں نے انوکھے حل تلاش کیے۔ جب سیپین متلاشیوں کے بھٹکتے گروہ سرد موسموں کے علاقے میں گئے ،تو انہوں نے برف سے بچاؤ کے جوتے اور چغے بنانے سیکھ لیے جو جانوروں کی کھال ورفر سے بنے ہوتے ،جنہیں سوئی کی مدد سے سختی سے سی لیا جاتا ۔انہوں نے نئے ہتھیار اور شکار کے نئے طریقے وضع کیے ،جس سے انہیں شمال میں میمتھ اور دوسرے بڑے جانوروں کو تلاش کر کے شکار کرنے میں مدد ملی۔ سیپین کی ہمت بڑھی تو وہ برف جمے علاقوں میں اور اندر تک چلے گئے ۔جیسے وہ شمال کی جانب بڑھے تو ان کا لباس، شکار کی تکنیک اور زندہ رہنے کی ہنرمندی بہتر ہوتی چلی گئی۔

لیکن انہیں یہ دقت اٹھانے کی ضرورت کیا تھی؟ شعوری طور پر خود کو سائبیریا یا شہر بدر کرنے کی کیا تک تھی؟ شاید جنگ، زمینی حقائق یا قدرتی آفت کی وجہ سے کچھ گروہوں کو شمال کی جانب سفر کرنا پڑا۔دوسروں کو ممکن ہے کہ زیادہ مثبت کشش نے اپنی جانب کھینچا ہو، مثلاً حیواناتی پروٹین۔ قطب شمالی کے علاقے بہت بڑے، لذیذ جانوروں سے پُر تھے، مثلاً بارہ سنگھے اور میمتھ۔ ہر میمتھ، گوشت کی ایک بڑی مقدار کا ذخیرہ تھا (جسے برفیلی ہواؤں کی وجہ سے مستقبل میں استعمال کی خاطر جما کر محفوظ بھی کیا جا سکتا تھا)۔ساتھ میں مزیدار چربی، گرم پوستین اور قیمتی ہاتھی دانت۔جیسا کہ سنگیر کی دریافت شاہد تھی، میمتھ کے شکاری محض برفیلی شمال میں آئے ہی نہیں، وہ وہاں بہت پھلے پھولے بھی۔وقت گزرنے کے ساتھ یہ گروہ میمتھ، میسٹاڈون (Mastadon) گینڈوں اور بارہ سنگھوں کے تعاقب میں دور تک پھیل گئے۔تقریباً چودہ ہزار سال پہلے یہی تعاقب ان میں سے کچھ کو شمال مشرقی سائبیریا سے الاسکا لے گیا۔ظاہر ہے انہیں یہ تو معلوم نہیں تھا کہ وہ ایک نئی دنیا دریافت کر رہے ہیں۔انسانوں اور میمتھ دونوں ہی کے خیال میں الاسکا محض سائبیریا ہی کا کوئی مضافات تھا۔

ابتدا میں برف کے تودوں نے الاسکا سے باقی امریکہ کا راستہ بند کر رکھا تھا، کہ ایک وقت میں محض چند سرخیلوں سے زیادہ زمین کو مزید کھوجنے زیادہ جنوب میں نہ جا سکیں۔لیکن بارہ ہزار قبل مسیح میں زمین کا درجہ حرارت بڑھنے سے برف پگھلی اور راستہ آسان ہو گیا۔اس نئی راہ داری کو استعمال کر کے لوگ بڑی تعداد میں جنوب کی جانب پورے براعظم میں پھیل گئے۔گو شروع میں انہوں نے محض قطب شمال میں شکار کے لیے مطابقت پیدا کی تھی، لیکن جلد ہی انہوں نے اپنے آپ کو بہت متنوع موسموں اور ماحولیات کے لیے موزوں کر لیا۔سائبیریا سے آنے والوں کی نسلیں مشرقی ریاست ہائے متحدہ، مسی سپی ڈیلٹا کے دلدلی علاقوں، میکسیکو کے صحرا اور وسطی امریکہ کے گرم جنگلات میں آباد ہو گئیں۔ان میں سے کچھ نے امیزون کی ترائی میں دنیا آباد کی تو دوسروں نے ارجنٹینا کی کوہ انڈیز کی وادی کے وسیع میدانوں میں پڑاؤ ڈالا۔ اور یہ سب محض ایک دو ہزار سال میں ہو گیا۔دس ہزار سال قبل مسیح کے انسان امریکہ کے جنوبی ترین مقام میں بس چکے تھے۔ٹیرا ڈیل فیوگو (Tierra del Fuego) کا جزیرہ جو اس براعظم کی جنوبی انتہا ہے۔امریکہ پر انسانی یلغار ہوموسیپین کی یکتا حکمت عملی اور ناقابل مقابلہ موزونیت کا ثبوت ہے۔کوئی بھی اور جانور کبھی اتنے متنوع مقامات پر اتنی آسانی سے منتقل نہیں ہوا، ہر مقام پر انہی جین کے ساتھ۔

امریکہ میں آبادکاری پرامن نہیں تھی۔اس سے متاثرین کی ایک کثیر تعداد وابستہ ہے۔آج کے مقابلے میں چودہ ہزار سال قبل امریکہ کی حیوانی دنیا بہت گنجان تھی۔جب اولین امریکیوں نے الاسکا سے جنوب کی سمت،

کینیڈا اور مغربی ریاست ہائے امریکہ کا سفر کیا تو انہیں میمتھ، میسٹوڈون، ریچھ کی جسامت کے چوہے نما جانور، گھوڑوں اور اونٹوں کے ریوڑ، عظیم الجثہ شیر، اور درجنوں ایسی بڑی اسپیسی میں جن کے ہم عصر آج ناپید ہیں۔ ان میں خوفناک تیغ جیسے دانتوں والی بلیاں، اور دیوقامت زمینی سلوتھ (Sloth) شامل تھے جن کا وزن آٹھ ٹن اور اونچائی چھ میٹر ہوتی۔ جنوبی امریکہ تو اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز چڑیا گھر تھا جس میں دیوقامت پستانیے، رینگنے والے جانور اور پرندے شامل تھے۔ امریکہ ارتقائی تجربے کی ایک عظیم لیبارٹری تھا، ایک ایسی جگہ جہاں افریقہ اور ایشیا کے نامعلوم حیوانات و نباتات پرورش پا رہے تھے۔

لیکن زیادہ دن نہیں باقی رہے۔ سیپین کی آمد کے دو ہزار سال کے اندر ہی ان انوکھی اسپیسی میں سے بیشتر مفقود ہو گئیں۔ حالیہ تخمینوں کے مطابق اس مختصر وقفے میں شمالی امریکہ کے بڑے پستانیے جانوروں کی سینتالیس میں سے چونتیس اقسام نیست و نابود ہو گئیں۔ جنوبی امریکہ کی ساٹھ میں سے پچاس ختم ہو گئیں۔ تیغ جیسے دانتوں والی بلیاں تین کروڑ سالوں تک راج کرنے کے بعد غائب ہو گئیں۔ یہی حشر عظیم الجثہ زمینی سلوتھ، قد آور شیروں، مقامی امریکی گھوڑوں، مقامی امریکی اونٹوں، دیوقامت چوہوں اور میمتھ کا ہوا۔ ہزاروں اقسام کے چھوٹے پستانیے جانور، پرندے، حشرات الارض، رینگنے والے جانور اور پیراسائٹس تک ختم ہو گئے۔ (جب میمتھ ختم ہوئے تو ان کے ساتھ ان کی مخصوص ٹک (Tick) بھی لامکاں میں کھو گئیں)۔

کئی دہائیوں سے ماہرین رکازیات (Paleontologist) اور آثار قدیمہ میں ماہرین حیوانیات، امریکہ کے پہاڑوں اور میدانوں میں قدیم اونٹوں کی فوسل ہڈیوں اور دیوقامت زمینی سلوتھ کے پتھرائے فضلے کو تلاش کر رہے ہیں۔ جب انہیں اپنی مطلوبہ چیز مل جاتی ہے تو یہ خزانہ بہت احتیاط سے محفوظ کر کے لیبارٹریوں میں بھیج جاتا ہے، جہاں ہر ہڈی اور منجمد فضلے کا باریک بینی سے مطالعہ کیا جاتا ہے، اور اس کا دور متعین کیا جاتا ہے۔ بار بار ان امتحانوں سے ایک ہی نتیجہ سامنے آیا ہے: تازہ ترین فضلے کے اوپلے، اور سب سے نئی اونٹ کی ہڈیاں اس زمانے کی ہیں جب انسان نے امریکہ پر یلغار کی، یعنی نو سے بارہ ہزار سال قبل مسیح کی۔ صرف ایک ہی جگہ پر سائنس دانوں کو زیادہ نیا منجمد فضلہ ملا: بہت سے جزائر غرب الہند بالخصوص اور کیوبا اور ہسپانیولا میں۔ وہاں سے زمینی سلوتھ کا جو منجمد فضلہ ملا وہ پانچ ہزار سال قبل مسیح کا ہے۔ یہ عین وہی وقت ہے جب اولین انسانوں نے کیریبین سمندر عبور کر کے ان دو بڑے جزائر کو آباد کیا۔

کچھ ماہرین انسانوں کو بری کرنے کی دوبارہ کوشش کرتے ہیں اور الزام موسم کی تبدیلی پر رکھتے ہیں۔ (اس کے لیے انہیں یہ کہنا پڑتا ہے کہ کسی پراسرار وجہ سے جزائر غرب الہند سات ہزار سال تک پرسکون رہے، جب کہ باقی مغربی کرہ گرم ہو رہا تھا)۔ لیکن امریکہ میں فضلے کے اوپلوں سے نہیں بچا جا سکتا۔ اس حقیقت سے مفر نہیں کہ قصور ہمارا ہی ہے۔ اگر موسمیاتی تبدیلیاں مددگار ہوئیں تب بھی بنیادی وجہ انسان تھا۔

دو دیوقامت زمینی سلوتھ (Megatherium) کی خیالی تصویر، اور ان کے عقب میں دو بڑے آرماڈیلو (Glyptodon)۔ اب نابود ہو جانے والے دیوقامت آرماڈیلو تین میٹر سے زیادہ لمبے اور دو ٹن تک وزنی ہوتے تھے۔ جب کہ جسیم زمینی سلوتھ کا قد چھ میٹر اور وزن آٹھ ٹن تک کا ہوتا تھا۔

دو دیوقامت زمینی سلوتھ (Megatherium) کی خیالی تصویر، اور ان کے عقب میں دو بڑے آرماڈیلو (Glyptodon)۔ اب نابود ہو جانے والے دیوقامت آرماڈیلو تین میٹر سے زیادہ لمبے اور دو ٹن تک وزنی ہوتے تھے۔ جب کہ جسیم زمینی سلوتھ کا قد چھ میٹر اور وزن آٹھ ٹن تک کا ہوتا تھا۔

کشتی نوح

اگر ہم آسٹریلیا اور امریکہ کی پرہجوم نابودگی کو جمع کریں، اور اس میں وہ چھوٹے پیمانے کی ناپیدگی شامل
کریں جو ہوموسیپین کے افروایشیا میں پھیلنے سے پیدا ہوئی، مثلاً دوسری تمام انواع انسانی کا خاتمہ، اور وہ ناپیدگی جو
قدیم متلاشیوں کے دور دراز جزائر مثلاً کیوبا میں آباد ہونے سے ہوئیں، تو منطقی نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ سیپین کی آباد
کاری کی پہلی لہر حیوانی سلطنت کا سب سے عظیم ماحولیاتی حادثہ تھا۔ سب سے زیادہ بڑے پوستینی جانور متاثر ہوئے۔
ادراکی انقلاب کے وقت اس زمین پر پچاس کلوگرام سے زیادہ وزنی، بڑے پستانیوں کی تقریباً دو سو اقسام موجود
تھیں۔ زرعی انقلاب کے وقت ان میں سے صرف سو اقسام باقی رہ گئی تھیں۔ ہوموسیپین نے سیارے کے تقریباً
نصف دیوقامت حیوانات کو پہیہ، تحریر یا لوہے کے اوزار کی ایجاد سے پہلے ہی ختم کر دیا تھا۔

زرعی انقلاب میں یہ ماحولیاتی تباہی کئی بار چھوٹے پیمانے پر رونما ہوئی۔۔۔ جزیرہ در جزیرہ ماہرین آثار
قدیمہ نے یہی کہانی دریافت کی ہے۔ ہر سانحے کے ابتدائی منظر میں متنوع بڑے جانوروں کی گنجان آبادی ہے، جس
میں انسان کا کہیں نام و نشان نہیں۔ لیکن منظر بدلتا ہے، اور ایکٹ نمبر دو میں سیپین نمودار ہوتا ہے، جس کا ثبوت کوئی
انسانی ہڈی، نیزے کی انی یا کسی برتن کی ٹھیکری ہے۔ جلد ہی تیسرا منظر نمودار ہوتا ہے، جس میں مرد و عورت مرکزی
حیثیت رکھتے ہیں، اور بیشتر بڑے جانور اور بہت سے چھوٹے جانور نابود ہو چکے ہیں۔

مڈغاسکر کا بڑا جزیرہ، براعظم افریقہ کے مشرق میں کوئی چار سو کلومیٹر دور، ایک معروف مثال ہے۔ لاکھوں
سال کی تنہائی میں وہاں جانوروں کی بہت یکتا اقسام نے پرورش پائی تھی۔ ان میں ہاتھی نما پرندہ ایک بے پرواز تخلیق
جو تین میٹر اونچی اور تقریباً نصف ٹن وزنی تھی، دنیا کا سب سے بڑا پرندہ، اور دیوقامت لیمور (ایک قسم کا
بندر) جو زمین رکھنے والی دنیا کی سب سے بڑی مخلوق تھی۔ ہاتھی پرندے، دیوقامت لیمور، اور مڈغاسکر کے دوسرے

بہت سے جانور تقریباً پندرہ سو سال پہلے اچانک غائب ہو گئے، عین اسی وقت جب انسان نے اس جزیرے پر قدم رکھا۔

بحراوقیانوس میں نابودگی کی لہر تقریباً پندرہ سو سال قبل مسیح میں شروع ہوئی، جب پولی نیسین کسانوں نے سولومن جزائر، فی جی، اور نئے کیلیڈونیا میں قدم جمائے۔ انہوں نے براہ راست یا بالواسطہ سینکڑوں اقسام کے پرندوں، کیڑوں، گھونگھوں اور دیگر مقامی جانوروں کو ہلاک کر دیا۔ وہاں سے ناپیدگی کی یہ لہر بتدریج مشرق کی جانب بڑھی،، جنوب اور شمال کی جانب، بحراوقیانوس کے قلب میں، اپنی راہ میں آنے والے ساموا اور ٹونگا کے مخصوص حیوانات کو ختم کیا (بارہ سو سال قبل مسیح) مارکیس جزیرہ (پہلی صدی عیسوی)، ایسٹر جزیرہ، کک جزیرہ اور ہوائی (پانچویں صدی عیسوی) اور بالآخر نیوزی لینڈ (بارھویں صدی عیسوی) بھی نشانہ بنے۔

اس قسم کی ماحولیاتی تباہی تقریباً ان تمام جزائر میں آئی جو بحرالکاہل، بحیرہ ہند، بحیرہ آرکٹک اور بحیرہ روم میں واقع تھے۔ آثار قدیمہ کے ماہرین نے بہت چھوٹے جزائر پر بھی اولین انسانی کسانوں کی آمد پر وہاں ان گنت نسلوں سے رہنے والے پرندوں، حشرات الارض اور گھونگھوں کا مٹ جانا دریافت کیا ہے۔

دور جدید کے چند انتہائی دور دراز جزائر کے علاوہ کچھ بھی انسانی دسترس سے محفوظ نہیں تھا، اور ان جزائر نے اپنی حیوانی دنیا برقرار رکھی۔ مثال کے طور پر گیلاپی لاگو کے مشہور جزائر، جو انیسویں صدی تک انسانی آبادی سے محفوظ تھے، انہوں نے اپنی مخصوص حیوانی دنیا کو برقرار رکھا تھا۔ ان میں دیو قامت کچھوے شامل تھے جو قدیم ڈیپروٹوڈن کی مانند انسانوں سے خوفزدہ دکھائی نہیں دیتے تھے۔

جانوروں کے مٹ جانے کی پہلی لہر متلاشیوں کے پھیل جانے کے ساتھ آئی، پھر دوسری لہر جب کسان دنیا بھر میں پھیل گئے۔ اس سے ہمیں اس تیسری لہر کا پس منظر ملتا ہے جو آج صنعتی انقلاب کی وجہ سے جاری ہے۔ ان درخت سے لپٹ جانے والوں پر اعتبار مت کیجیے جو کہتے ہیں کہ ہمارے اجداد فطرت کیساتھ امن سے رہتے تھے۔ صنعتی انقلاب سے بہت پہلے ہوموسیپین تمام حیاتیاتی دنیا میں یہ امتیاز رکھتے تھے کہ انہوں نے بیشتر نباتاتی اور حیواناتی دنیا کو مٹا دیا۔ ہم حیاتیات کی کتاب میں سب سے خطرناک اسپیسی کا تمغہ سجائے پھرتے ہیں۔

شاید اگر لوگ پہلی اور دوسری ناپیدگی سے واقف ہوں تو وہ اس تیسری نابودگی کے بارے میں اتنے خاموش نہ رہیں جس میں وہ خود شریک ہیں۔ اگر ہمیں معلوم ہو کہ ہم کتنی اسپیسیز کو مٹا دینے کے ذمہ دار ہیں تو شاید ہم بچ جانے والے حیوانات کے تحفظ میں محرک ہو جائیں۔ یہ بات بڑے سمندری جانوروں کے لیے بالخصوص اہم ہے۔ اپنے زمینی ساتھیوں کے مقابلے میں، بڑے سمندری جانور ادرا کی اور زرعی انقلابات سے قدرے محفوظ رہے۔ لیکن اب صنعتی آلودگی اور انسانوں کے ضرورت سے زیادہ سمندری وسائل کے استعمال سے وہ بھی مٹ جانے کے قریب ہیں۔ اگر چیزیں موجودہ رفتار سے جاری رہیں تو امکان ہے کہ وہیل، شارک، ڈولفن اور ٹیونا مچھلیاں بھی ڈیپروٹوڈن، زمینی سلوتھ اور میمتھ کی مانند لامکاں میں کھو جائیں گی۔ دنیا کی بڑی مخلوقات میں اس انسانی طوفان سے صرف انسان ہی محفوظ رہ جائے گا، یا کھیتی باڑی کے وہ پرانے جانور جو کشتی نوح کے پرانے سوار ہیں۔

حصہ دوئم...... زرعی انقلاب

ساڑھے تین ہزار سال پرانا، ایک مصری مقبرے کی دیوار سے ایک نقش، جس میں عام زرعی مناظر کی تصویر کشی کی گئی ہے۔

تاریخ کا سب سے بڑا فریب

پچیس لاکھ سالوں تک انسانوں نے نباتات اکٹھا کر کے، اور ان جانوروں کو ذبح کر کے اپنے پیٹ کی آگ بجھائی جو بغیر انسانی مداخلت کے زندہ تھے۔ ہومو اریکٹس، ہومو ارگاسٹر اور نینڈرتھال جنگلی کھجوریں توڑتے تھے، اور جنگلی بھیڑ کا شکار کرتے تھے، بغیر یہ سوچے کہ کھجور کا درخت کہاں لگنا چاہیے، کس چراگاہ میں بھیڑوں کو چرنا چاہیے یا کون سا بکرا کس بکری کو حاملہ کرے۔ ہومو سیپین بھی مشرقی افریقہ سے مشرق وسطیٰ، وہاں سے یورپ اور ایشیا، اور پھر آخر میں آسٹریلیا اور امریکہ تک پہنچے۔ لیکن وہ جہاں بھی گئے، سیپین بھی جنگلی نباتات اکٹھا کر کے اور جنگلی جانوروں کے شکار پر ہی زندہ رہے۔ کچھ اور کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے جب آپ کا طریق زندگی آپ کی ضروریات پوری کر رہا ہو، اور سماجی نظام، مذہبی اعتقادات اور سیاسی، تار چڑھاؤ سے بھرپور دنیا کو سہارا دے رہا ہو۔

دس ہزار سال قبل یہ سب بدل گیا، جب سیپین نے اپنا تمام وقت اور تمام کوشش چند جانوروں اور پودوں کی اقسام کو استعمال کرنے میں صرف کیا۔ طلوع آفتاب سے غروب تک وہ بیج بوتے، پودوں کو پانی دیتے، جڑی بوٹیاں زمین سے اکھاڑتے اور بھیڑوں کو چراگاہوں تک لے جانے میں اپنا تمام وقت خرچ کرتے۔ ان کا خیال تھا کہ یہ کام انہیں مزید پھل، اناج اور گوشت فراہم کرے گا۔ نسانی طرز حیات میں یہ انقلابی تبدیلی تھی، زرعی انقلاب۔

زراعت کی جانب ہجرت تقریبا ساڑھے آٹھ سے نو ہزار سال قبل مسیح میں جنوب مشرقی ترکی، مغربی ایران اور لیوانٹ میں شروع ہوئی۔ یہ ایک محدود جغرافیائی علاقے میں سست روی سے شروع ہوئی۔ نو ہزار سال قبل مسیح میں گندم اور بکریاں پالتو ہو گئے۔ مٹر اور دالیں آٹھ ہزار سال قبل، زیتون کے درخت پانچ ہزار سال پہلے، گھوڑے چار ہزار سال قبل مسیح اور انگور کی بیلیں ساڑھے تین ہزار سال قبل مسیح میں گھریلو بن گئے۔ کچھ پودے اور جانور مثلا اونٹ اور کاجو اس کے بھی بعد گھریلو زراعت کا حصہ بنے۔ لیکن تقریبا ساڑھے تین ہزار سال قبل مسیح میں زراعت کو اپنانے کا بیشتر حصہ مکمل ہو چکا تھا۔ آج بھی اپنی تمام ٹیکنالوجی کے باوجود انسانوں کی نوے فیصد سے زیادہ توانائی ان مٹھی بھر نباتات سے حاصل ہوتی ہے جو ہمارے اجداد نے ساڑھے تین سے ساڑھے نو ہزار سال قبل مسیح میں پالے تھے: چاول، گندم، مکئی، آلو، جو اور باجرہ۔ گزشتہ دو ہزار سالوں میں کوئی قابل ذکر نباتات یا حیوانات کا رکن پالتو نہیں کیا گیا۔ اگر ہمارے دماغ ان ہی شکاری / متلاشی جیسے ہیں تو ہمارا طعام بھی ان ہی قدیم کسانوں جیسا ہے۔

ایک زمانے میں ماہرین کا خیال تھا کہ زراعت مشرق وسطیٰ کے ایک مقام سے شروع ہو کر دنیا بھر میں پھیل گئی۔ لیکن آج ماہرین اس بات پر متفق ہیں کہ دنیا کے دوسرے کونوں میں مشرق وسطیٰ کے کسانوں کی برآمد سے

نہیں بلکہ ازخود شروع ہوئی۔ وسطی امریکہ میں لوگوں نے مکئی اور لوبیا اگانا شروع کیا، مشرق وسطیٰ میں گندم اور مٹر کی فصلوں سے کسی آگاہی کے بغیر۔ جنوبی امریکیوں نے آلو اگانے اور لاما پالنے شروع کیے یہ جانے بغیر کہ میکسیکو یا لیوانٹ میں کیا ہو رہا ہے۔ چین کے اولین انقلابیوں نے چاول، باجرہ اور سور کاشت کیے۔ شمالی امریکہ کے اولین باغبان جو زمین پر کھانے کے قابل لوکی کی تلاش سے تھک گئے تھے، انہوں نے کدو کی کاشتکاری کی۔ نیوگنی والوں نے گنا اور کیلے اگائے۔ جب کہ مغربی افریقہ کے اولین کسانوں نے افریقی باجرہ، افریقی چاول، گندم اور جوار اپنی ضروریات کی تکمیل کے لیے اپنالیا۔ ان ابتدائی مقامات سے زراعت دور دراز تک پھیل گئی۔ پہلی صدی عیسوی تک دنیا کی آبادی کا بیشتر حصہ کاشت کار تھا۔

زرعی انقلاب جو مشرق وسطیٰ، چین اور وسطی امریکہ میں پیدا ہوا، وہ آسٹریلیا، الاسکا یا جنوبی افریقہ میں کیوں نمودار نہیں ہوا؟ وجہ بہت سادہ ہے: حیوانات اور نباتات کی زیادہ تر اقسام پالنے کے قابل نہیں۔ سیپین بہت ذائقہ دار کھمبیاں کھود سکتے ہیں اور اونی میمتھ شکار کر سکتے ہیں، لیکن ان دونوں نسلوں کو پالنا خارج از امکان تھا۔ کھمبیاں بہت دشوار تھیں اور دیوقامت جانور بہت جنگجو۔ ان ہزاروں اقسام میں سے جو ہمارے اجداد نے شکار کیں یا اکٹھا کیں، ان میں سے ریوڑ پالنے یا کھیتی باڑی کے لیے صرف چند ہی موزوں تھے۔ یہ چند اقسام مخصوص مقامات پر پائی جاتی تھیں، اور ان ہی مقامات سے زرعی انقلاب کا آغاز ہوا۔

کسی زمانے میں ماہرین کا دعویٰ تھا کہ زرعی انقلاب انسانیت کے لیے ایک بڑا قدم تھا۔ وہ ترقی کے باب میں انسان کی ذہنی قوت کی کارفرمائی کی کہانی سناتے تھے۔ ارتقا نے بتدریج اور زیادہ ذہین افراد کو جنم دیا۔ یہاں تک کہ لوگ اس قابل ہو گئے کہ وہ قدرت کے رازوں کو پڑھ سکیں، جس سے انہیں گندم اگانے اور بھیڑیں پالنے میں مدد ملی۔ جیسے ہی یہ وقوع پذیر ہوا، انہوں نے بخوشی وہ تھکا دینے والی، خطرناک، خانہ بدوشوں کی سی شکاری/متلاشی زندگی ترک کر کے خوشگوار، مطمئن کاشتکاروں کا طرز زندگی اپنالیا۔

یہ کہانی ایک واہمہ ہے۔ اس بات کا کوئی ثبوت نہیں کہ وقت گزرنے کے ساتھ لوگ زیادہ ذہین ہو گئے۔ متلاشی زرعی انقلاب سے بہت پہلے فطرت کے رازوں سے واقف تھے، کیوں کہ ان کی زندگیوں کا انحصار ہی ان جانوروں پر تھا جنہیں وہ شکار کرتے اور ان نباتات پر جنہیں وہ اکٹھا کرتے۔

بجائے اس کے کہ اس سے ایک آسان زندگی کے نئے دور کا آغاز ہوتا، زرعی انقلاب نے کسانوں کو وہ طرز حیات دیا جو متلاشیوں کے مقابلے میں زیادہ دشوار اور غیر اطمینان بخش تھا۔ شکاری/متلاشی اپنی زندگی زیدہ متنوع اور محرک انداز میں گزارتے، قحط و بیماری کا خطرہ بھی کم تھا۔ زرعی انقلاب نے یقیناً نوع انسانی کو خوراک کا زیدہ بڑا ذخیرہ مہیا کر دیا، لیکن اس غذائی بہتات سے ایک بہتر غذا یا زیادہ آرام دہ زندگی پیدا نہیں ہو سکی۔ بلکہ اس سے آبادی میں زبردست اضافہ اور بگڑے نوابین نے جنم لیا۔ ایک عام کسان کسی عام متلاشی سے زیادہ محنت کرتا ہے، اور بدلے میں اسے زیادہ خراب خوراک ملتی ہے۔ زرعی انقلاب تاریخ کا سب سے عظیم فریب تھا۔

اس کا ذمہ دار کون تھا۔ بادشاہ، نہ پادری نہ تاجر۔ اس کی ذمہ داری مٹھی بھر نباتات کی اقسام پر عائد ہوتی ہے، جن میں گندم، چاول اور آلو شامل ہیں۔ ان نباتاتی اقسام نے انسان کو پالتو بنالیا ہے بجائے اس کے متضاد ہونے کے۔

ایک لمحے کے لیے زرعی انقلاب کو گندم کی نظر سے دیکھیے۔ دو ہزار سال قبل تک گندم محض ایک جنگلی گھاس تھی، کئی اقسام میں سے ایک، جو مشرق وسطی کے ایک خطے تک محدود تھی۔ اچانک محض چند ہزار سالوں میں یہ ساری دنیا میں اگائی جا رہی تھی۔

زرعی انقلاب کے مقامات اور تواریخ۔ یہ اعداد و شمار متنازعہ ہیں، اور یہ نقشہ اکثر دہرایا گیا ہے، تا کہ اس میں آثار قدیمہ کی نئی دریافتوں کو شامل کیا جا سکے۔

زندہ رہنے اور افزائش نسل کے بنیادی ارتقائی اصولوں کے حساب سے گندم زمینی تاریخ کا سب سے کامیاب پودا ہے۔ ایسے علاقوں میں، مثلاً شمالی امریکہ کے وسیع میدان، جہاں دس ہزار سال پہلے گندم کی ایک بالی بھی نہیں اگتی تھی، اب آپ سینکڑوں کلومیٹر کا سفر کر لیں اور آپ کو اس کے علاوہ دوسرا کوئی پودا نظر نہیں آئے گا۔ دنیا بھر میں گندم تقریباً بائیس لاکھ پچاس ہزار مربع کلومیٹر پر کاشت ہوتی ہے، برطانیہ کے پورے رقبے سے تقریباً دس گنا زیادہ۔ یہ گھاس غیر اہم سے اتنا عالمی وجود کیسے بن گئی۔ گندم نے ہوموسیپین کو اپنے مفاد کے لیے استعمال کیا۔ دس ہزار سال پہلے تک یہ بن مانس نباتات اکٹھا کرتا اور شکار کھیلتا آرام دہ زندگی گزار رہا تھا۔ لیکن پھر اس نے گندم اگانے میں زیادہ سے زیادہ محنت شروع کر دی۔ چند ہی ہزار سالوں میں دنیا کے کئی حصوں میں انسان طلوع آفتاب سے غروب ہونے تک گندم کی آبیاری کے سوا کچھ نہیں کر رہے تھے۔ یہ آسان نہیں تھا، گندم ان سے بہت محنت طلب کرتی تھی گندم کو پہاڑ و پتھر پسند نہیں، لہذا انسان نے میدانوں کو ہموار کرنے کے لیے اپنی کمر توڑی۔ گندم کو اپنا علاقہ، پانی اور غذائی اجزا میں دوسرے پودوں کی شراکت پسند نہیں، لہذا مرد و عورت آگ برساتے سورج تلے دن کے طویل اوقات جڑی بوٹیاں اکھاڑنے میں مصروف ہو گئے۔ گندم بیمار ہوتا تو انسان کیڑوں اور مضر پھپھوندی کی نگرانی کرتے۔ گندم پر خرگوش اور ٹڈی دل حملہ آور ہوئے، تو انسانوں نے اطراف میں باڑ لگا دی، اور کھیتوں میں چوکیدار بن کر کھڑے ہو گئے۔ گندم پیاسا ہوا تو انسان نے آب پاشی کے لیے نہریں کھودیں اور اس کی پیاس بجھانے کے لیے کنوؤں سے بھاری بالٹیاں بھر کر پانی لائے۔ اس کی بھوک مٹانے کے لیے انسانوں نے جانوروں کا فضلہ تک جمع کر کے اس زمین پر بکھیرا جہاں گندم جنم لیتی ہے۔

ہوموسیپین کا جسم اس مشقت کے لیے موزوں نہیں ہو سکا۔ یہ سیب کے درخت پر چڑھنے اور ہرن کے پیچھے بھاگنے کے لیے مناسب ہوا تھا، پتھر صاف کرنے اور پانی کی بالٹیاں اٹھانے کے لیے نہیں۔۔ انسان کی ریڑھ کی ہڈی، گھٹنوں، گردن اور پاؤں کی محرابوں کو اس کی قیمت چکانی پڑی۔ قدیم ڈھانچوں کے مطالعے سے انکشاف ہوا کہ زرعی معیشت کی جانب منتقلی کے ساتھ ہی بیماریوں کا سلسلہ شروع ہوا مثلاً کمر کا درد، جوڑوں کا درد اور

ہو گیا۔ پھر نئی طرز زراعت اس قدر توجہ طلب ہے کہ لوگوں کو مجبوراً گندم کی فصلوں کے نزدیک ہی مستقل رہائش اختیار کرنی پڑی۔ اس نے ان کی طرز حیات مستقل طور پر بدل دی۔ ہم نے گندم کو نہیں پالا، اس نے ہمیں پالتو بنایا ہے۔ یہ لفظ ڈومیسٹیکیٹڈ (پالتو) لاطینی لفظ ڈومس سے نکلا ہے جس کے معنی ہیں 'گھر'۔ اب گھر میں کون رہ رہا ہے، گندم نہیں، ہم انسان رہ رہے ہیں۔

گندم نے ہوموسیپین کو اس بات پر کیسے راضی کر لیا کہ وہ ایک اچھی طرز زندگی ترک کر کے ایک تکلیف دہ راستہ اپنا لیں۔ بدلے میں انہیں کیا ملا؟ ایک بہتر غذا تو ملی نہیں۔ یاد رہے کہ انسان بن مانس کی نسل سے ہے جو ہر قسم کی خوراک پر پلتا ہے۔ زرعی انقلاب سے پہلے اناج انسانی غذا کا بہت معمولی حصہ تھا۔ زرعی اجناس (سیریل) پر مبنی غذا میں وٹامن اور معدنیات کی کمی ہوتی ہے، اسے ہضم کرنا زیادہ دشوار ہے، اور یہ آپ کے دانتوں اور مسوڑوں کے لیے واقعی خراب ہے۔

گندم سے لوگوں کو معاشی تحفظ نہیں ملا۔ ایک کسان کی زندگی کسی شکاری/متلاشی سے بہت کم محفوظ ہے۔ متلاشی بہت سے متنوع جانوروں پر زندہ رہتے تھے۔ لہٰذا وہ خشک سال کا بھی بغیر غذا محفوظ کیے مقابلہ کر سکتے تھے۔ اگر جانوروں کی کوئی ایک اسپیسی کم ہو جائے تو وہ جمع ہو کر کسی دوسری اسپیسی کا شکار کر سکتے تھے۔ ماضی قریب تک زرعی معاشروں نے اپنی توانائی کا بیشتر حصہ پالتو نباتات کے ایک مختصر گروہ سے حاصل کیا ہے۔۔ بہت سے علاقوں میں تو وہ بس ایک ہی جنس پر بھروسہ کرتے ہیں مثلاً گندم، آلو یا چاول۔ اگر بارشیں روٹھ جائیں، ٹڈی دل حملہ آور ہو، یا ان اجناس کی اقسام کو پھپھوند لگ جائے تو کسان ہزاروں اور لاکھوں کی تعداد میں ہلاک ہو جاتے ہیں۔ نہ ہی گندم انسانی تشدد کے خلاف تحفظ فراہم کرتا ہے۔ ابتدائی انسان اگر زیادہ نہیں تو کم از کم اپنے متلاشی اجداد جتنے ہی پر تشدد تھے۔ کسانوں کی ملکیت میں کافی اشیا تھیں اور انہیں بوائی کے لیے زیادہ زمین درکار تھی۔ حملہ آور پڑوسیوں کا زرعی زمین پر قبضہ، پر شکمی اور قحط کے درمیان فرق بن جاتا، لہٰذا صلح صفائی کا امکان کم تھا۔ جب کسی متلاشی گروہ کو کسی زیادہ طاقت ور عدو کا سامنا ہوتا تو وہ عموماً ہجرت کر جاتے۔ یہ دشوار اور خطرناک ضرور تھا، لیکن یہی بہتر تھا۔ جب ایک مضبوط دشمن کسی زرعی دیہات کے لیے خطرہ بنے تو پسپائی کا مطلب تھا کہ زمین، گھر اور اناج کے ذخیرے سے ہاتھ دھونا پڑے۔ اکثر اس کے نتیجے میں پسپا ہونے والوں کو قحط کا سامنا کرنا پڑتا۔ لہٰذا کسان عموماً ٹھہر کر ایک خونی اختتام تک جنگ کرتے۔

آثار قدیمہ اور عمرانیات کی کئی تحقیقات نے ہمیں یہ بتایا ہے کہ سادہ زرعی معاشروں میں، جہاں دیہات اور قبیلے سے زیادہ کوئی سیاسی ڈھانچہ نہ ہو، سیاسی تشدد تقریباً پندرہ فیصد اموات کا ذمہ دار ہے، جب کہ مردوں کی شرح اموات تقریباً پچیس فیصد ہے۔ موجودہ نیو گنی کے ایک زرعی قبائلی معاشرے "دانی" میں تشدد سے مردوں کی شرح اموات تیس فیصد ہے، جب کہ ایک اور قبیلے "انگا" میں پینتیس فیصد۔ ایکواڈور میں تقریباً پچاس فیصد بالغ واؤرانی کسی اور انسان کے ہاتھوں قتل ہو کر مرتے ہیں۔ وقت کے ساتھ انسانی تشدد بڑے سماجی نظام مثلاً شہر، ریاست اور مملکت کی تشکیل سے کم ہو گیا ہے، لیکن اتنے وسیع و موثر سیاسی نظام کو مرتب کرنے میں ہزاروں سال لگے تھے۔

نیوگنی کے دو زرعی معاشروں کے درمیان ۱۹۶۰ میں جنگ۔ زرعی انقلاب کے بعد آنے والے سالوں میں ایسے مناظر غالباً عام تھے۔

دیہاتی زندگی سے اولین انسانوں کو کچھ فوری فوائد ضرور حاصل ہوئے، مثلاً وحشی جانوروں، بارشوں اور سردیوں سے بہتر تحفظ۔ لیکن اوسط آدمی کے لیے غالباً نقصانات فوائد سے زیادہ تھے۔ آج کے متموں معاشروں میں رہنے والوں کے لیے یہ سمجھنا مشکل ہے کیوں کہ ہمیں امارت اور تحفظ میسر ہے۔ اور کیوں کہ ہمارے تحفظ ور امارت کی عمارت زرعی انقلاب کی بنیادوں پر کھڑی ہے، تو ہم یہ سمجھتے ہیں کہ زرعی انقلاب بہت زبردست بہتری تھی۔ لیکن ہزاروں سال کی تاریخ کو آج کی عینک سے دیکھنا ٹھیک نہیں۔ ایک زیادہ بہتر مثال اس تین سالہ بچی کی ہے جو پہلی صدی عیسوی کے چین میں غذائی کمی سے مر رہی ہے، جس کے باپ کی فصل ناکام ہوگئی تھی۔ کیا ان حالات میں وہ یہ کہے گی کہ اگرچہ میں غذائی کمی سے مر رہی ہوں، لیکن دو ہزار سالوں میں لوگوں کے پاس غذا کی فراوانی ہوگی، وہ بڑے ایرکنڈیشنڈ مکانات میں رہیں گے، لہذا میری تکلیف ایک قابل قدر قربانی ہے۔

تو پھر گندم نے کاشتکاروں، بشمول اس غذائی کمی کی شکار چینی لڑکی کو کیا دیا؟ اس نے شخص کو انفرادی سطح پر کچھ نہ دیا۔ لیکن اس نے ہوموسیپین پر ایک اسپیسی کے طور پر ضرور کرم کیا۔ گندم کی کاشت سے کسی بھی رقبے میں زیادہ غذا پیدا ہوئی، جس سے ہوموسیپین کو تیزی سے آبادی بڑھانے کا موقع فراہم کیا۔ تیرہ ہزار سال قبل مسیح میں جب لوگ زیادہ تر جنگلی جانوروں کے شکار اور جنگلی نباتات پر زندہ تھے، تو فلسطین میں اریحی کے نخلستان کا علاقہ زیادہ سے زیادہ کوئی ایک سو کھاتے پیتے اور صحت مند لوگوں کے لیے کافی ہوگیا۔ تقریباً ساڑھے آٹھ ہزار سال قبل مسیح میں جب جنگلی پودوں کی جگہ گندم کے دس کھیتوں نے لے لی، تو اسی نخلستان میں ایک بڑے لیکن گنجان آباد ہزار افراد کا دیہات سما گیا، جو پہلے سے بہت زیادہ بیماری اور غذا کی قلت کا شکار تھے۔

ارتقا کی نقدی نہ بھوک ہے نہ تکلیف، بلکہ یہ محض ڈی این اے مارپیچ کی نقلوں سے وابستہ ہے۔ بالکل جیسے کسی کمپنی کی اقتصادی کامیابی کو اس کے بینک اکاؤنٹ میں موجود ڈالروں سے تولا جاسکتا ہے، اس کے ملازمین کی مسرت سے نہیں۔ اسی طرح کسی اسپیسی کی ارتقائی ترقی کو اس کی ڈی این اے کی نقول کی تعداد سے ناپا جاتا ہے۔ اگر مزید کوئی ڈی این اے نقل باقی نہ رہ جائے تو وہ اسپیسی مٹ جاتی ہے، بالکل جیسے بغیر پیسے کے کوئی کمپنی دیوالیہ ہوجائے۔ اگر کسی اسپیسی کی بہت سی ڈی این اے نقول ہوں، تو وہ کامیاب ہے اور اسپیسی پھل پھول رہی

ہے۔اس نکتہ نظر سے ہزار نقول ہمیشہ سو نقول سے بہتر ہیں۔زرعی انقلاب کا یہی نچوڑ ہے: بدتر حالات میں زیادہ
افراد کو زندہ رکھنا۔

پھر بھی افراد کو اپنے ارتقائی جمع تفریق پر کیوں نظر رکھنی چاہیے؟ کوئی بھی ذہین شخص اپنا معیار زندگی صرف
ہوموسیپین کے جینیاتی ذخیرے کی نقول کی تعداد میں اضافے کے لیے کیوں گھٹانے لگا۔کسی نے بھی یہ معاہدہ نہیں کیا
تھا،زرعی انقلاب ایک جال تھا۔

تمول کا جال

زراعت کا پھیلاؤ صدیوں ہزاروں سال کا ایک بتدریج عمل تھا۔ہوموسیپین کا ایک گروہ جو کھمبیاں اور
خشک میوہ جمع کر رہا ہو، ہرن اور خرگوش کو شکار کر رہا ہو،، وہ اچانک کسی مستقل دیہات میں بس کر ہل چلانے، گندم
بونے اور دریا سے پانی لانے کا کام تو شروع نہیں کر دے گا۔یہ تبدیلی مرحلہ وار آئی، اور ہر مرحلے زندگی کے
معمولات میں معمولی سا ہی فرق پیدا ہوا۔

ہوموسیپین تقریباً ستر ہزار سال پہلے شرق اوسط پہنچے تھے۔اس کے بعد تقریباً پچاس ہزار سال تک
ہمارے آباؤ وہاں بغیر زراعت کے پھلے پھولے۔اس خطے کے قدرتی وسائل انسانی آبادی کو قائم رکھنے کے لیے کافی
تھے۔افراط کے زمانے میں لوگوں کے یہاں کچھ اضافی اولاد ہو جاتی اور کمیابی کے زمانے میں کچھ کم۔پستانیے
جانوروں کی مانند انسانوں میں بھی ہارمون اور جینیاتی نظام ہوتے ہیں جو افزائش نسل کے نگراں ہیں۔اچھے زمانوں
میں عورتیں جلد بلوغت کو پہنچتی ہیں اور ان کے حاملہ ہونے کے امکانات بھی بڑھ جاتے ہیں۔کمیابی کے زمانے میں
بلوغت دیر سے آتی ہے اور ان کی زرخیزی کم ہو جاتی ہے۔

افزائش کے ان قدرتی نگرانوں میں معاشرتی نظام کا بھی اضافہ ہوگیا۔اطفال و نونہال جو سست رفتار
ہوں، توجہ طلب ہوں، وہ خانہ بدوش متلاشیوں کے لیے ایک بار ہوتے۔لوگ بچوں کی پیدائش میں تین سے چار
سال وقفے کی کوشش کرتے تھے۔عورتیں اس مقصد کے لیے بچوں کو مستقل ایک بڑی عمر تک دودھ پلاتی رہتی تھیں
(مسلسل چوسنے کے عمل سے حمل ٹھہرنے کا امکان بہت کم رہ جاتا ہے)۔دوسرا طریقہ جنسی ملاپ سے مکمل یا جزوی
اجتناب تھا (جس میں غالباً معاشرتی دباؤ بھی شامل تھا)، پھر اسقاط حمل اور کبھی نوزائدہ کا قتل۔

ان ہزاروں سالوں میں لوگ کبھی کبھار ہی گندم کھاتے، یہ ان کی غذا کا معمولی حصہ تھا۔تقریباً اٹھارہ ہزار
سال قبل برفانی دور کی جگہ عالمی حرارت نے لے لی۔درجہ حرارت بڑھنے سے بارش بھی زیادہ ہونے لگی، یہ نیا موسم
مشرقِ وسطی میں گندم اور دوسرے اناج کے لیے نہایت مناسب تھا۔ان میں اضافہ ہوا یہ پھیل بھی گئے۔لوگوں نے
زیادہ گندم کھانا شروع کر دیا یہ بھی غیر ارادی طور پر ان کی پیداوار میں اضافے کا باعث بنے۔قدرتی اجناس کو
پچھوڑے، پیسے اور پکائے بغیر انہیں کھانا ممکن نہیں تھا۔تو جو لوگ یہ اجناس جمع کرتے وہ انہیں واپس اپنی آبادیوں
تک لے جاتے جہاں ان پر پچھوڑنے، پیسنے وغیرہ کی عملیات ہوتیں۔گندم کا دانہ چھوٹا اور تعداد میں بہت زیادہ ہوتا
ہے، تو انہیں قیام گاہ تک لے جاتے ہوئے غیر ارادی طور پر کچھ راستے میں بکھر جاتے۔وقت کے ساتھ زیادہ سے
زیادہ گندم انسانی پگڈنڈیوں اور عارضی کیمپوں کے قریب اگنے لگی۔

جب انسانوں نے جھاڑیوں اور جنگلات کو آتش زد کیا تو اس سے گندم کا فائدہ ہوا۔ آگ نے درختوں اور جھاڑیوں کو صاف کر دیا، جس سے گندم اور دوسری اقسام کی گھاس کو سورج کی روشنی، پانی اور غذا پر مکمل دسترس ہو گئی۔ جہاں گندم افراط میں ہوتا اور شکار و دیگر وسائل کی بھی فراوانی ہوتی، تو انسانی گروہ بتدریج اپنا معمول کا طرز حیات ترک کر کے موسمی یا مستقل آبادیوں میں بس جاتے۔

ابتدا میں شاید وہ فصل اترنے کے وقت چار ہفتے ٹھہرتے ہوں گے۔ ایک نسل بعد جب گندم کے پودے تعداد میں بڑھتے اور پھیلتے تو شاید فصل اترنے کا دورانیہ پانچ ہفتے ہو جاتا، پھر چھ، اور بالآخر یہ ایک مستقل دیہات بن جاتا۔ اس قسم کی آبادیوں کا سارے مشرق وسطیٰ میں سراغ ملتا ہے۔ خصوصاً لیوانٹ میں جہاں نتوفین (Natufian) معاشرہ ساڑھے نو سے ساڑھے بارہ ہزار سال قبل مسیح میں پھل پھول رہا تھا۔ نتوفین شکاری/متلاشی تھے جو کئی اقسام کے جنگلی شکار پر گزارا کرتے، لیکن وہ مستقل آبادیوں میں رہتے اور اپنا بیشتر وقت اجناس کو جمع کرنے پچھوڑنے اور کوٹنے میں گزارتے۔ انہوں نے پتھر کے مکان اور اجناس کے ذخائر قائم کیے۔ وہ برے وقتوں کے لیے اجناس ذخیرہ رکھتے۔ انہوں نے نئے اوزار دریافت کیے مثلاً گندم کی فصل اتارنے کے لیے پتھر کی درانتی اور انہیں کوٹنے کے لیے پتھر کا ہاون دستہ۔

ساڑھے نو ہزار سال کے بعد سے نتوفین کی اولادوں نے اجناس کو اکٹھا کرنا اور اسے قابل خوردنی بنانا جاری رکھا، لیکن انہوں نے اسے زیادہ صراحت کے ساتھ اگانا شروع کر دیا۔ قدرتی اجناس جمع کرتے وقت، وہ احتیاط سے فصل کا کچھ حصہ علیحدہ کر دیتے، تاکہ اگلے بوائی کے موسم میں کام آسکے۔ جب انہوں نے دریافت کیا کہ دانوں کو زمین پر ادھر ادھر بکھیرنے کے بجائے، زمین میں گہرائی پر بو دینے سے زیادہ بہتر فصل ملتی ہے، تو انہوں نے کدال اور ہل کا استعمال شروع کر دیا۔ رفتہ رفتہ انہوں نے کھیتوں سے جڑیلی گھاس کو اکھاڑنے، انہیں جراثیم سے بچانے، پانی دینے اور کھاد ڈالنے کا عمل شروع کر دیا۔ جب اجناس کی فصلوں پر زیادہ وقت صرف ہونے لگا، تو قدرتی نباتات کو جمع کرنے اور شکار کرنے کا وقت کم ہو گیا۔ اب متلاشی کاشتکار بن گئے۔

کوئی ایک لمحہ واحد نہیں تھا جو قدرتی گندم جمع کرتی عورت کو پالتو گندم اگاتی عورت سے الگ کرتا۔ لہذا یہ کہنا دشوار ہے کہ وہ کون سی فیصلہ کن گھڑی تھی جب زراعت کی جانب منتقلی عمل میں آئی۔ لیکن ساڑھے آٹھ ہزار سال پہلے مشرق وسطیٰ مستقل دیہاتوں سے پُر تھا، جیسے اریحا، جس کے باشندے اپنا زیادہ تر وقت چند پالتو اجناس اگانے میں خرچ کرتے۔

مستقل دیہاتوں کے قیام اور غذا کی فراہمی میں افراط سے آبادی میں اضافہ ہونے لگا۔ خانہ بدوش طرز زندگی چھوڑنے سے عورتیں ہر سال بچہ پیدا کرنے کے قابل ہو گئیں۔ اب بچوں سے جلدی دودھ چھڑا دیا جاتا، وہ دلیہ اور کھیر پر پلنے لگے۔ کھیتوں میں اضافی مدد کی سخت ضرورت تھی۔ لیکن اس اضافی آبادی نے جلد ہی غذائی افراط کا خاتمہ کر دیا تو مزید کھیت اگانے پڑے۔ جب یہ لوگ مستقل قیام گاہوں میں رہنے لگے جہاں بیماری عام تھی، بچے زیادہ اجناس پر اور ماں کے دودھ پر کم پلنے لگے، اور جب ہر بچہ اپنے دلیہ کے لیے زیادہ مادرزادوں سے مقابلہ کرنے لگا تو بچوں کی شرح اموات بڑھ گئی۔ زیادہ تر زرعی معاشروں میں ہر تین میں سے ایک بچہ بیس برس کی عمر تک پہنچنے سے پہلے مر جاتا۔ پھر بھی شرح پیدائش نے شرح اموات کو پیچھے چھوڑ دیا، اور انسان بڑی تعداد میں افزائش نسل

کرتا رہا۔
وقت کے ساتھ گندم کا یہ سودا زیادہ سے زیادہ گراں گزرنے لگا۔ بچے بڑی تعداد میں مرنے لگے اور بالغ
بھی اپنے پسینے کی کمائی کھاتے۔ ساڑھے آٹھ ہزار سال پہلے جریکو کا ایک اوسط آدمی، ساڑھے نو سے تیرہ ہزار سال
پہلے کے اوسط آدمی سے زیادہ مشکل زندگی گزار رہا تھا، لیکن کسی کو یہ احساس نہیں ہوا کہ کیا ہو رہا ہے۔ ہر نسل پچھلی نسل
کی مانند جیتی رہی، روزمرہ کے کاموں میں محض ذرا سی بہتری کے ساتھ۔ بلکہ اس کا الٹا اثر یہ ہوا کہ بہتری کا ہر سلسلہ
جس کا مقصد زندگی آسان بنانا تھا، وہ ان کسانوں کی گردنوں میں چکی کا ایک پاٹ ثابت ہوتا۔

لوگوں نے اتنا اہم اندازہ کیسے غلط قائم کرلیا؟ اسی طرح جیسے تمام تاریخ میں لوگ غلط اندازے قائم کرتے
رہے ہیں۔ لوگ اپنے فیصلوں کے حتمی نتائج اخذ کرنے میں ناکام رہے۔ جب بھی انہوں نے کچھ اضافی کام کرنے
کا بیڑا اٹھایا، مثلاً زمین پر بیج بکھیرنے کے بجائے نہیں بونے کا تو لوگوں نے سوچا ہاں یقیناً ہمیں زیادہ محنت کرنی
پڑے گی لیکن فصل کتنی شاندار اترے گی۔ ہمیں برے وقت کی فکر نہیں رہے گی، ہمارے بچے کبھی بھوکے نہیں سوئیں
گے۔ بات فہمیدہ تھی۔ اگر آپ زیادہ محنت کریں گے تو آپ کی زندگی بہتر ہوگی۔ منصوبہ تو بہر حال یہی تھا۔

منصوبے کا پہلا حصہ تو روانی سے ہوگیا۔ لوگوں نے واقعی زیادہ محنت کی۔ لیکن لوگوں نے یہ نہیں سوچا کہ
بچوں کی تعداد بڑھ جائے گی۔ لہٰذا اضافی گندم کو مزید بچوں کے درمیان تقسیم کرنا ہوگا۔ نہ ہی ابتدائی کسان یہ سمجھ سکے
کہ بچوں کو زیادہ دلیہ اور کم ماں کا دودھ دینے سے ان کا دفاعی نظام کم ہوگا، اور یہ مستقل آبادیاں متعدی بیماریوں کی
آماج گاہ بن جائے گی۔ ان میں یہ دور بینی نہیں تھی کہ غذا کے محض ایک ہی وسیلے پر انحصار کرکے وہ اپنے آپ کو قحط
کے عذاب کے لیے زیادہ موزوں کررہے تھے۔ نہ ہی کسانوں نے یہ پیش بینی کی کہ اچھے سالوں میں ان کے ابلتے
ذخائر چوروں اور دشمنوں کو ابھاریں گے، لہٰذا انہوں نے دیواریں بنائیں اور چوکیداری کے فرائض انجام دینے
شروع کردیے۔

تو جب یہ منصوبہ ناکام ہوگیا تو انسانوں نے زراعت کو ترک کیوں نہیں کردیا؟ کیوں کہ ان معمولی
تبدیلیوں کو اکٹھا ہوکر معاشرتی تبدیلیاں پیدا کرنے میں کئی نسلیں لگیں۔ تک کسی کو یہ یاد نہیں تھا کہ وہ پہلے کیسے رہتے
تھے۔ پھر یہ کہ آبادی میں اضافے نے انسانوں کی کشتیاں جلادی تھیں۔ اگر ہل چلانا شروع کرنے سے کسی دیہات
کی آبادی سو سے بڑھ کر ایک سو دس ہوگئی تھی تو ان میں سے کون سے دس لوگ رضاکارانہ طور پر بھوکے رہتے، تاکہ
باقی لوگ اچھے پرانے وقتوں کی جانب لوٹ جائیں۔ واپسی کا کوئی راستہ نہیں تھا، وہ چوہے دان میں پھنس چکے تھے۔
ایک آسان زندگی کی تلاش سے بہت سخت زندگی شروع ہوگئی، اور یہ کوئی آخری بار ایسا نہیں ہوا تھا۔ یہی
آج بھی ہوتا ہے۔ کتنے کالج گریجوٹ بڑی کمپنیوں میں محنت طلب نوکریاں کرلیتے ہیں، اس امید کے ساتھ کہ وہ
سخت محنت کرکے پیسے کمالیں گے تاکہ وہ پینتیس برس کی عمر میں ریٹائر ہوکر وہ کام کرسکیں جس میں انہیں واقعی دلچسپی
ہو۔ لیکن جب وہ اس عمر کو پہنچتے ہیں تو ان پر مکان کا قرضہ ہوتا ہے، بچوں کو اسکول بھیجنا ہے، مضافات میں مکان
جس کے لیے ہر خاندان کو کم از کم دو کاریں درکار ہیں۔ پھر یہ احساس کہ اچھی شراب اور بیرونی ممالک کی مہنگی
سیاحت کے بغیر زندگی بیکار ہے۔ تو پھر وہ کیا کریں؟ دوبارہ جڑیں کھودنے کی طرف لوٹ جائیں؟ نہیں وہ اپنی محنت
دوگنی کردیتے ہیں تاکہ اس غلامی کو دور رکھیں۔

تاریخ کا ایک آہنی اصول یہ ہے کہ سہولیات ضرورت بن جاتی ہیں، اور اس سے نئی ذمہ داریاں پھیلتی ہیں۔ ایک بار لوگ کسی مخصوص سہولت کے عادی ہو جاتے ہیں تو وہ اسے فطری سمجھنے لگتے ہیں، پھر وہ اس پر انحصار کرنے لگتے ہیں، پھر وہ ایک ایسے مقام پر پہنچتے ہیں جہاں اس کے بغیر زندگی غیر ممکن ہو جاتی ہے۔ ہم خود اپنے موجودہ دور سے ایک مانوس مثال لیتے ہیں۔ گزشتہ چند دہائیوں میں ہم نے ان گنت وقت بچانے والے آلات ایجاد کیے ہیں، جن کا مصرف زندگی کو زیادہ آرام دہ بنانا ہے۔ کپڑے دھونے کی مشین، برتن دھونے کی مشین، ویکیوم کلینر، ٹیلی فون، موبائل فون، کمپیوٹر، ای میل۔ پہلے ایک خط لکھنے میں بہت وقت صرف ہوتا تھا۔ لفافے پر پتہ لکھ کر اسٹامپ لگانا، اسے ڈاک خانے تک لے جانا۔ پھر جواب آنے میں کئی دن، ہفتے یا مہینے لگ جاتے۔ اب میں ایک ای میل فوراً لکھ کر دنیا کے دوسرے کونے میں بھیج سکتا ہوں، اور اگر میرا پتہ ویب پر موجود ہے تو فوراً جواب بھی موصول ہو جاتا ہے۔ میں نے وہ ساری محنت اور وقت بچالیا ہے، لیکن کیا ہم اب زیادہ آرام دہ زندگی گزار رہے ہیں؟

افسوس یہ ہے کہ نہیں۔ ڈاک کے زمانے میں لوگ صرف اسی وقت خط لکھتے تھے جب انہیں واقعی کوئی ضروری بات بتانی ہوتی تھی۔ بجائے اس کے کہ جو پہلی چیز دماغ میں آجائے اسے لکھ بھیجیں، وہ بہت غور کرتے کہ کیا لکھنا ہے اور کیسے لکھنا ہے۔ اسی قسم کے سوچے سمجھے جواب ہی کی وہ امید بھی رکھتے۔ زیادہ تر لوگ ایک مہینے میں مٹھی بھر سے زیادہ خطوط نہ لکھتے، اور شاید ہی کوئی فوراً جواب دینے پر مائل ہوتا۔ آج میں روزانہ درجنوں ای میل وصول کرتا ہوں، سب ان لوگوں کی جانب سے جو جواب کی امید رکھتے ہیں۔ ہمارا خیال تھا کہ ہم حیات کی رفتار سست کر رہے ہیں، اس کے بجائے ہم نے حیات کی رفتار کو اس کی سابقہ رفتار سے دس گنا بڑھا دیا ہے، اور اپنے ایام زیادہ مضطرب اور پریشان کر لیے ہیں۔

کبھی کبھار کوئی تخریب کار ای میل اکاؤنٹ کھولنے سے انکار کرتا ہے۔ بالکل جیسے ہزاروں برس پہلے چند انسانی گروہوں نے زراعت اپنانے سے انکار کر کے اس سہولت کے دام میں پھنسنے سے بچ گئے تھے۔ لیکن زرعی انقلاب کے لیے کسی مخصوص علاقے کے ہر گروہ کا شامل ہونا ضروری نہیں تھا۔ صرف ایک ہی کافی تھا۔ ایک بار ایک گروہ جم کر ہل چلانا شروع کر دیتا، چاہے مشرق وسطیٰ میں یا وسطی امریکہ میں، پھر زراعت کو روکنا ممکن نہیں تھا۔ کیوں کہ زراعت سے وہ ماحول پیدا ہو رہا تھا جو انسانی تعداد میں تیزی سے اضافے کا باعث تھا۔ کاشتکار متلاشیوں پر غالبا عددی اعتبار سے ہی غالب آجاتے۔ یہ متلاشی یا تو اپنے شکاری میدانوں کو چراہ گاہوں اور کھیتوں کے لیے چھوڑ کر فرار ہو جاتے یا خود بھی ہل اٹھا لیتے۔ دونوں طرح سے گزشتہ طرز حیات کو ختم ہی ہونا تھا۔

سہولتوں کے جال کی کہانی میں ایک اہم سبق پوشیدہ ہے۔ انسانیت کی ایک آسان زندگی کی تلاش نے، تبدیلی کی ایک ایسی اہم قوت پیدا کی جس نے دنیا کو ایسے تبدیل کر دیا جس کی توقع تھی نہ خواہش۔ کسی نے زرعی انقلاب کی منصوبہ بندی کی تھی اور نہ ہی اجناس کی بوائی پر انسانی انحصار کی تمنا۔ معمولی اقدامات کا ایک سلسلہ جس کا مقصد محض چند معدوں کی آگ بجھانا تھا، ذرا سا تحفظ حاصل کرنا تھا، ان کے اجتماعی اثر نے قدیم متلاشیوں کو آگ برساتے سورج تلے اپنی زندگی کے باقی ایام پانی کی بالٹیاں اٹھانے پر مجبور کر دیا۔

خدائی مداخلت

مندرجہ بالا تحریر سے زرعی انقلاب ایک غلطی ثابت ہوتا ہے، یہ ممکن ہے۔ تاریخ اس سے بہت زیادہ غلطیوں سے پر ہے۔ لیکن ایک اور امکان بھی ہے۔ ممکن ہے کہ یہ تبدیلی آسان زندگی کی تلاش کا شاخسانہ ہو۔ ممکن ہے کہ سیپین کی دوسری تمنائیں رہی ہوں، اور ان کی تکمیل کے لیے انہوں نے شعوری طور پر یہ سخت زندگی اپنائی ہو۔

سائنس دان عموماً اہم تاریخی تبدیلیوں کو اقتصادیات یا آبادی کے نکات سے منسلک کرنے کی سعی کرتے ہیں۔ یہ ان کے منطقی اور ریاضی طریقوں کے لیے زیادہ موزوں ہے۔ جدید تاریخ کے مطالعے میں ماہرین غیر مادی چیزوں کو شامل کیے بغیر نہیں رہ سکتے، بالخصوص ثقافتی اور نظریاتی۔ تحریری شواہد انہیں مجبور کرتے ہیں۔ ہمارے پاس اتنے خطوط، کاغذات اور شواہد موجود ہیں جن کی وجہ سے یہ ثابت ہو کہ دوسری جنگ عظیم قحط یا آبادی کے دباؤ کی وجہ سے نہیں ہوئی تھی۔ لیکن نتوفین ثقافت سے ہمارے پاس کوئی کاغذات موجود نہیں۔ لہٰذا قدیم تاریخ کا مطالعہ کرتے ہوئے مادی مکتبہ فکر غالب آجاتا ہے۔ یہ ثابت کرنا دشوار ہے کہ تعلیم یافتہ آبادی سے پہلے لوگ اقتصادی عوامل کے بجائے اعتقادات سے محرک ہوتے تھے۔

لیکن اکا دکا معاملات میں خوش قسمتی سے ہمیں واضح شواہد مل جاتے ہیں۔ ۱۹۹۵ میں ماہرین آثار قدیمہ نے جنوب مشرقی ترکی میں گوبیکلی ٹیپی (Gobekli Tepe) کی کھدائی شروع کی۔ سب سے قدیم دریافت میں انہیں دیہات، مکانات یا روزمرہ زندگی کی کوئی باقیات نہیں ملیں۔ لیکن انہوں نے بہت دیوہیکل ستون دریافت کیے، جن کی خوبصورت کھدے نقوش سے تزئین کی گئی تھی۔ پتھروں سے بنا ہر ستون سات ٹن وزنی تھا اور پانچ میٹر اونچا۔ ایک اور گہرائی میں انہیں ایک پچاس ٹن کا ستون ملا۔ کل ملا کر انہیں دس دیوہیکل تعمیرات ملیں، جن میں سب سے بڑی تیس میٹر پر محیط تھی۔

پانچ میٹر اونچے ستون پر نقش و نگار

آثار قدیمہ کے ماہرین ایسی دیو ہیکل تعمیرات سے دنیا کے مختلف علاقوں سے مانوس ہیں۔ سب سے آسان مثال غالباً برطانیہ میں اسٹون ہنج (Stonehenge) ہے۔ پھر بھی جب انہوں نے گوبیکلی ٹیپی پر غور کیا تو ایک عجیب حقیقت سامنے آئی۔ اسٹون ہنج ڈھائی ہزار سال قبل مسیح کا ہے اور ایک ترقی یافتہ زرعی معاشرے کی تعمیر تھا۔ گوبیکلی ٹیپی کی تعمیرات ساڑھے نو ہزار سال قدیم تھیں، اور تمام موجود شواہد یہ بتا رہے تھے کہ یہ شکاری/متلاشیوں کے بنائے تھے۔ ابتدا میں آثار قدیمہ کے ماہرین کو ان شواہد کو قبول کرنے میں تامل تھا۔ لیکن متعدد امتحانات نے یہی ثابت کیا کہ ان تعمیرات کے وقت کا تخمینہ درست تھا، اور ان کے معمار قبل از زراعت معاشرے سے تعلق رکھتے تھے۔ قدیم متلاشیوں کی اہلیت اور اور ان کی ثقافت کی پیچیدگی ہماری گزشتہ توقعات سے کہیں زیادہ تھی۔

ایک متلاشی معاشرہ اس قسم کی تعمیرات کیوں کرے گا؟ ان کا کوئی مصرف تو سمجھ نہیں آتا۔ یہ نہ تو میمتھ کے مذبحہ خانے تھے، نہ بارش سے بچنے یا شیر سے چھپنے کی پناہ گاہیں۔ اس سے یہی نظریہ باقی بچتا ہے کہ ان کا کوئی انوکھا ثقافتی مصرف تھا جسے سمجھنے میں ماہرین آثار قدیمہ ناکام رہے ہیں۔ جو بھی مقصد تھا، یقیناً اتنا اہم ضروری تھا کہ اس کے لیے متلاشیوں نے اتنا وقت اور محنت کا اصراف کیا۔ گوبیکلی ٹیپی کو بنانے کا واحد طریقہ یہی تھا کہ مختلف گروہوں اور قبیلوں کے متلاشی ایک لمبے دورانیے کے لیے باہم تعاون کریں۔ صرف ایک معیاری مذہبی یا اعتقادی نظام ہی اس طرح کی کوشش کی بنیاد ہو سکتا ہے۔
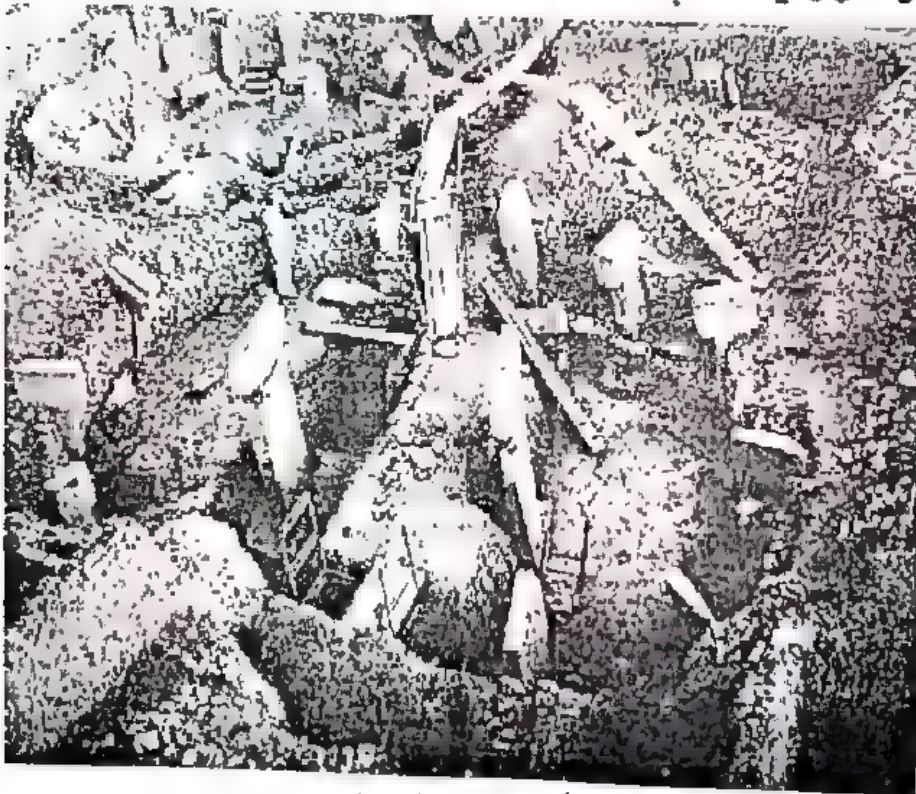
گوبیکلی ٹے پی سے ملنے والے آثار

گوبیکلی ٹے پی میں ایک اور بھی دھماکہ خیز اسرار پوشیدہ تھا۔ بہت سالوں سے جینیات دان اگائی گندم کی ابتدا کا سراغ لگانے کی کوشش کر رہے تھے۔ جدید دریافتوں سے یہ اشارے مل رہے تھے کہ کم از کم ایک قسم کی اگائی گندم آئن کورن (Einkorn) کا آغاز کاراکاڈاگ (Karacadag) کی پہاڑیوں سے ہوا تھا جو گوبیکلی

میل سے تیس کلومیٹر کے فاصلے پر ہیں۔
یہ محض اتفاق تو نہیں ہوسکتا۔ یہ ممکن ہے کہ گوبیکلی ٹے پی کا ثقافتی مرکز کسی طرح انسانوں کو گندم غلام بنانے اور گندم کا انسانوں کو غلام بنانے سے متعلق تھا۔
ان عظیم الشان عمارتوں کی تعمیر میں مصروف لوگوں کو غذا فراہم کرنے کے لیے بڑی تعداد میں غذا درکار تھی۔ ممکن ہے کہ متلاشیوں نے قدرتی گیہوں اکٹھی کرنے کے بجائے بڑی تعداد میں گیہوں کی بوائی شروع کردی ہو۔ اپنی عمومی غذائی فراہمی میں اضافے کے لیے نہیں بلکہ ان عمارتوں اور معابد کی تعمیر میں مدد دینے کے لیے۔ ایک عمومی منظر نامے میں قدما پہلے ایک دیہات قائم کرتے تھے، جب وہ خوب پھیل جاتا تو اس کے وسط میں معبد تعمیر کرتے۔ لیکن گوبکلی ٹے پی سے لگتا ہے کہ معبد پہلے تعمیر ہوا تھا اور دیہات بعد میں اس کے اطراف میں بنایا گیا۔

انقلاب سے متاثرین

انسان اور اناج کے دوران یہ فاؤسٹ جیسا سودا (ایک جرمن ماہر فلکیات جس نے اپنی روح شیطان کو فروخت کردی تھی) ہماری اسپیسی کا واحد سودا نہیں تھا۔ ایک اور تجارت جانوروں مثلاً بھیڑ، بکری، سور اور مرغیوں کی ہوئی۔ متلاشی گروہ جو جنگلی بھیڑوں کا تعاقب کرتے تھے انہوں نے رفتہ رفتہ اپنے ریوڑ میں تبدیلی پیدا کی۔ یہ شاید منتخب شکار کا نتیجہ تھا۔ انسانوں نے یہ جان لیا کہ یہ ان کے مفاد میں تھا کہ وہ صرف بالغ دنبہ اور بوڑھی یا بیمار بھیڑ کو شکار کریں۔ انہوں نے زرخیز مادائیں اور جوان نر دنبوں کو چھوڑ دیا تا کہ ان کے مقامی ریوڑ کی تعداد دیرپا مدت تک برقرار رہ سکے۔ دوسرا اقدام شاید یہ رہا ہو کہ اپنے ریوڑ کو حملہ آوروں سے محفوظ رکھیں۔ شیروں، بھیڑیوں اور دشمن انسانی گروہوں کو مار بھگائیں۔ اس کے بعد گروہ نے شاید اس ریوڑ کو ایک تنگنائی میں ہنکایا ہوگا تا کہ اس پر قابو رکھ سکیں اور اس کی حفاظت کرسکیں۔ آخر میں انسانوں نے یقیناً بہتر بھیڑوں کا انتخاب شروع کیا ہوگا تا کہ وہ انسانی ضروریات کے لیے مفید ہوسکیں۔ وہ غصہ ور دنبے جنہوں نے انسانی قبضے کی سب سے زیادہ مزاحمت کی شاید سب سے پہلے ذبح ہوئے۔ یہی حشر دبلی اور متجسس بھیڑوں کا ہوا (چرواہے ان بھیڑوں کو پسند نہیں کرتے جو ریوڑ سے دور نکل جائیں)۔ ہر گزرتی نسل کے ساتھ بھیڑ مزید فربہ، تابعدار اور کم متجسس ہوگئے۔ بہت خوب، اب میری کے پاس ایک بھیڑ تھی، جہاں میری جاتی، بھیڑ بھی جاتی (معروف نظم Mary had a little lamb)۔
یا پھر یہ کہ شکاریوں نے ایک دنبے کو پکڑ کر اسے پالا ہوگا، افراط کے زمانے میں خوب پال پوس کے فربہ کیا، اور پھر کمیابی کے دور میں ذبح کیا۔ کسی زمانے میں وہ ایسے بھیڑوں کی ایک بڑی تعداد پالنے لگے۔ ان میں سے کچھ بالغ ہوکر افزائش کرنے لگے۔ زیادہ غصہ ور اور بے قابو بھیڑ پہلے ذبح ہوتے زیادہ تابعدار اور دل کو لبھانے والی بھیڑوں کو زندہ رہ کر افزائش کی اجازت دی جاتی۔ نتیجے میں پالتو اور تابعدار بھیڑوں کا ایک ریوڑ تیار ہو جاتا۔
ایسے پالتو جانور۔۔ بھیڑ، مرغی، گدھے اور دوسرے، خوراک فراہم کرتے تھے (گوشت، دودھ، انڈے)، خام مال (کھال، اون) اور عضلاتی قوت بھی۔۔ باربرداری، ہل چلانا، پیسنا اور دوسرے کام جو اب تک انسانی پٹھے انجام دے رہے تھے، اب زیادہ سے زیادہ جانور کررہے تھے۔ زیادہ تر زرعی معاشروں میں افراد نباتات اگانے پر توجہ دیتے، جانور پالنا ثانوی کام تھا۔ لیکن کچھ مقامات پر ایک نئے قسم کے معاشرے نے جنم لیا، جو بنیادی

طور پر جانوروں کے استعمال پر منحصر تھے، چرواہوں کے قبیلے۔

انسان کے دنیا بھر میں پھیلنے کے ساتھ ہی ان کے پالتو جانور بھی پھیلے۔ دس ہزار سال قبل چند ملین بھیڑ، بکریاں، سور، مرغیاں اور مویشی افرو ایشیا کے محدود علاقوں میں مقیم تھے۔ آج دنیا میں تقریباً ایک ارب بھیڑ، ایک ارب سور، ایک ارب سے زیادہ مویشی اور پچیس ارب مرغیاں ہیں جو ساری دنیا میں پھیلی ہوئی ہیں۔ دیسی مرغی کسی بھی زمانے میں سب سے زیادہ پایا جانے والا پرندہ ہے۔ ہوموسیپین کے بعد دنیا میں سب سے زیادہ تعداد پالتو مویشی، سور اور بھیڑ دوسرے، تیسرے اور چوتھے نمبر پر آتے ہیں۔ ایک تنگ نظر ارتقائی نکتہ نظر سے جو کامیابی ڈی این اے کی نقول کی تعداد سے متعین کرتا ہے، زرعی انقلاب مرغیوں، مویشی، سور اور بھیڑوں کے لیے زبردست عطیہ تھا۔ بدقسمتی سے ارتقائی نکتہ نظر کامیابی کا نامکمل پیمانہ ہے۔ یہ ہر چیز کو بقائے حیات اور افزائش نسل سے ناپتا ہے، جس میں انفرادی خوشی یا غم کا کوئی حصہ نہیں۔ پالتو مرغیاں اور مویشی ممکن ہے کہ ارتقائی کامیابی کی کہانی ہوں، لیکن یہ سب سے زیادہ قابل رحم مخلوق ہے جو کبھی بھی زندہ رہی ہو۔ جانوروں کا پالنا چند ظالمانہ معمولات پر مشتمل تھا، جو صدیوں کے سفر میں مزید ظالمانہ ہوتے گئے۔

ایک جنگلی مرغی کی قدرتی زندگی سات سے بارہ سال ہوتی ہے، اور مویشیوں کی بیس سے پچیس۔ جنگل میں بیشتر مویشی اور مرغیاں، عمر سے پہلے ہی مرجاتے، پھر بھی انہیں باعزت زندگی کے چند سال گزارنے کا خاصہ امکان تھا۔ اس کے مقابلے میں پالتو مرغوں اور مویشیوں کی بیشتر تعداد چند ہفتوں سے چند مہینوں کے درمیان ذبح کر دی جاتی ہے۔ کیوں کہ اقتصادی اعتبار سے یہ عمر ہی ذبح کرنے کے لیے سب سے مفید رہی ہے۔ (ایک مرغے کو تین سال زندہ رکھنے کا کیا فائدہ ہے، جب کہ وہ اپنا مکمل وزن تین ماہ بعد ہی حاصل کر چکا ہو)۔

بارہ سو قبل مسیح کے مصری غار سے ایک تصویر میں بیلوں کی ایک جوڑی کھیتوں میں ہل چلا رہی ہے۔ جنگل میں مویشی ایک پیچیدہ سماجی نظام کے تحت آزادی سے ریوڑ کی طرح بھاگتے پھرتے تھے۔ پالتو، خصی ہوئے بیل اپنی زندگی ایک چابک تلے، ایک مختصر سے قید خانے میں گزارتے، تنہا یا جوڑی بنا کر وہ بیگار کرتے جو نہ ان کے جسم کے لیے مناسب تھی، نہ اس کے سماجی، جذباتی وضروریات سے میل کھاتی۔ جب کوئی بیل ہل چلانے کے قابل نہ رہ جاتا تو اسے ذبح کر دیا جاتا۔ (اس مصری کسان کی خمیدہ کمر پر غور کیجیے، جو خود بھی بیل کی مانند ساری زندگی سخت مشقت میں گزارتا جو اس کے جسم، دماغ اور سماجی روابط کو زندہ رکھتی۔

انڈے دینے والی مرغیاں، دودھ دینے والی گائیں اور باربرداری کے جانور اکثر زندہ رہنے دیے جاتے ہیں۔ لیکن انہیں اس کی قیمت اپنی ضروریات اور خواہشات کے مکمل متضاد زندگی گزار کے ادا کرنی پڑتی ہے۔ مثلاً یہ فرض کر لینا درست ہے کہ بیل اپنے ایام دوسرے گائے بیلوں کی معیت میں کھلی چراہ گاہوں میں گزارنا زیادہ پسند کریں گے، بجائے اس کے کہ وہ ایک کوڑے برساتے بن مانس کے زیر اطاعت گاڑیاں کھینچیں اور ہل چلائیں۔

بیلوں، گدھوں، گھوڑوں اور اونٹوں کو باربرداری کے تابعدار جانور بنانے کے لیے ان کی فطری حیات اور سماجی رشتوں کو توڑنا پڑتا ہے۔ ان کی خونخواری اور جنسیت کو محدود کرنا پڑتا ہے، اور ان کی آزادی وحرکت کو سلب کرنا پڑتا ہے۔ کسان وہ طریقہ ایجاد کرتے ہیں مثلاً جانوروں کو پنجروں اور باڑوں میں قید کرنا، انہیں ساز ولگام ڈالنا، انہیں چابک اور مویشی ہانکوں سے ترتیب دینا اور ان کے اعضا تراشنا۔ تابعدار بنانے کے عمل میں تقریباً ہمیشہ

ہی نر جانور کو خصی کر دیا جاتا ہے۔ اس سے مردانہ جارحیت قابو میں آجاتی ہے، اور انسان اس قابل ہو جاتا ہے کہ وہ ریوڑ میں منتخب نسل کی افزائش کر سکے۔

بارہ سو قبل مسیح کے مصری غار سے ایک تصویر بیلوں کی ایک جوڑی کھیتوں میں ہل چلا رہی ہے۔ جنگل میں مویشی ایک پیچیدہ سماجی نظام کے تحت آزادی سے ریوڑ کی طرح بھاگتے پھرتے تھے۔ پالتو، خصی ہوئے بیل اپنی زندگی ایک چابک تلے، ایک مختصر سے قید خانے میں گزارتے، تنہا یا جوڑی بنا کر وہ بیگار کرتے جو نہ ان کے جسم کے لیے مناسب تھی، نہ اس کے سماجی، جذباتی ضروریات سے میل کھاتی۔ جب کوئی بیل ہل چلانے کے قابل نہ رہ جاتا تو اسے ذبح کر دیا جاتا۔ (اس مصری کسان کی خیدہ کمر پر غور کیجیے، جو خود بھی بیل کی مانند ساری زندگی سخت مشقت میں گزارتا جو اس کے جسم، دماغ اور سماجی روابط کو زندہ رکھتی۔

نیوگنی کے کئی علاقوں میں کسی فرد کی دولت اس کی ملکیت میں سوروں کی تعداد سے متعین کی جاتی ہے۔ یہ یقینی بنانے کے لیے کہ سور فرار نہ ہو جائیں، شمالی نیوگنی کے کسان ان کی ناک کا ایک حصہ کاٹ دیتے ہیں۔ جب بھی سور قوت شامہ استعمال کرتا ہے تو شدید تکلیف میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ کیوں کہ سور بغیر سونگھے اپنا راستہ یا غذا تلاش نہیں کر سکتا، تو یہ کتر بیونت ان کو کامل طور پر اپنے انسانی، لکوں کا تابعدار بنا دیتا ہے۔ نیوگنی کے ایک اور علاقے میں سور کی آنکھیں نکال دینا ایک عام روایت ہے، تا کہ وہ یہ دیکھ بھی نہ سکے کہ وہاں کہاں جا رہا ہے۔

دودھ کی صنعت جانوروں سے اپنی مرضی کا کام لینے کی اپنی حکمت عملی رکھتی ہے۔ گائے، بکری اور بھیڑ صرف بچھڑے اور میمنے کو جنم دینے کے بعد ہی دودھ دیتی ہے، اور وہ بھی جب تک کہ یہ نونہال چوسنے کا عمل جاری رکھیں۔ جانوروں سے دودھ کی مسلسل فراہمی کے لیے کسانوں کو اس بات کی ضرورت ہے کہ یہ بچھڑے، بکری کے بچے اور میمنے چوستے رہیں، لیکن دودھ پر کامل قبضہ بھی نہ رکھیں۔ تمام تاریخ میں ایک عام رواج تو یہ تھا کہ بکری کے بچوں اور بچھڑوں کو پیدائش کے کچھ عرصے بعد ذبح کر دیا جاتا، جتنا دودھ ممکن ہوتا اسے حاصل کر کے جانور کو دوبارہ حاملہ کر دیتے۔ یہ اب بھی ایک عام طریقہ ہے۔ بہت سے جدید ڈیری فارم میں دودھ دیتی گائے عموماً پانچ سال زندہ رہتی ہے، پھر اسے ذبح کر دیا جاتا ہے۔ ان پانچ سالوں میں وہ تقریباً مستقل ہی حاملہ رہتی ہے۔ بچھڑے کو جنم دینے کے دو سے چار ماہ بعد اسے فوراً دوبارہ حاملہ کرا دیتے ہیں، تا کہ زیادہ سے زیادہ دودھ کی مسلسل فراہمی جاری رہے۔ پیدائش کے فوراً بعد اسے بچھڑے سے چھڑا دیا جاتا ہے۔ مادہ بچھڑوں کو پال کر دودھ دینے والی گائے کی نئی نسل تیار کی

جاتی ہے۔ جب کہ نر بچھڑوں کو گوشت کے بیوپاریوں کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔

ایک اور حکمت عملی کے تحت بچھڑوں اور بکری کے بچوں کو ان کی ماؤں کے نزدیک ہی رہنے دیتے ہیں، لیکن مختلف طریقوں سے انہیں زیادہ دودھ چوسنے سے باز رکھا جاتا ہے۔ ایک آسان طریقہ تو یہ ہے کہ بچھڑے یا بکری کے بچے کو چوسنا شروع کرا کر فوراً چھڑا دیں، تا کہ دودھ کا بہاؤ جاری رہے۔ اس حکمت عملی کو عموماً بچھڑے اور ماں دونوں سے ہی مزاحمت کا سامنا ہوتا ہے۔ کچھ چرواہے بچھڑے کو ذبح کر کے اس کا گوشت استعمال کر لیتے، پھر اس کی کھال میں بھس بھر دیتے۔ یہ بھس بھرا بچھڑا پھر ماں کے قریب رکھ دیا جاتا ہے تا کہ اس کے دودھ کی پیداوار کو اکسایا جا سکے۔ سوڈان کا نیور قبیلہ تو اس حد تک جاتا ہے کہ اس بھس بھرے بچھڑے پر گائے کا قارورہ مل دیتے تا کہ ان بھس بھرے بچھڑوں سے مانوسیت کی بو آئے۔ نیور کا ایک اور طریقہ یہ تھا کہ بچھڑے کے دہانے سے کانٹوں کا ایک دائرہ باندھ دیتے، جب وہ گائے کے تھن پر چبھتا تو وہ چوسنے سے مزاحمت کرتی۔ صحارا کے توارگ اونٹ پالنے والے، اونٹ کے بچے کے اوپری ہونٹ اور ناک کو چھید دیتے، یا اس کا ایک ٹکڑا کاٹ دیتے تا کہ چوسنے میں تکلیف ہو، اور یوں زیادہ دودھ چوس لینے کی حوصلہ شکنی ہو۔
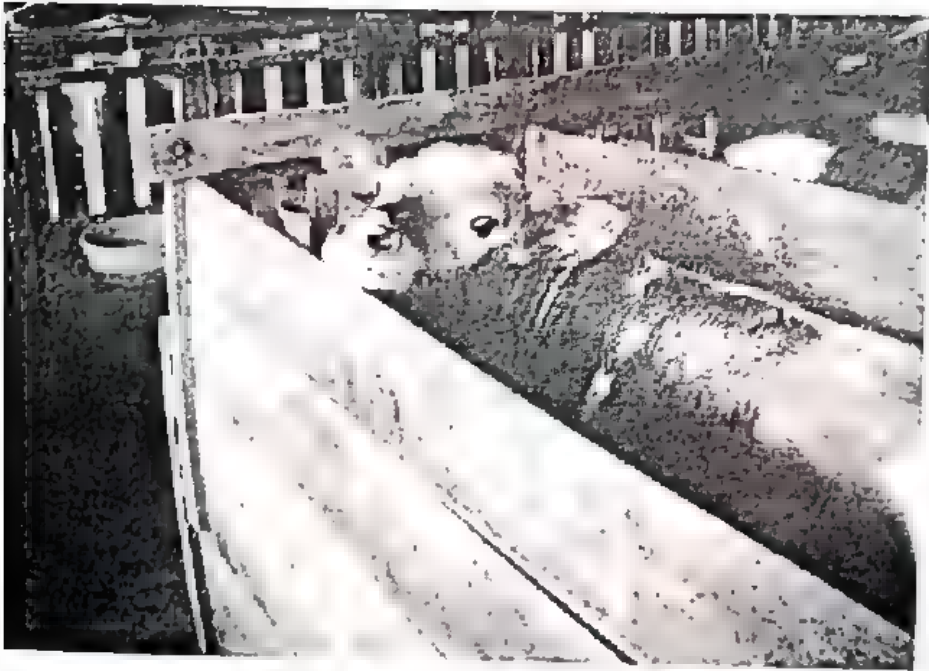
ایک جدید بچھڑا گوشت کی ایک صنعت ہے۔ پیدائش کے فوراً بعد بچھڑے کو ماں سے جدا کر کے ایک باڑ میں بند کر دیا جاتا ہے جو خود اس کے جسم سے زیادہ بڑا نہیں ہوتا۔ وہیں یہ بچھڑا اپنی اوسط چار ماہ کی عمر بسر کرتا ہے۔ یہ کبھی اپنی جگہ نہیں چھوڑتا، نہ اسے دوسرے بچھڑوں کے ساتھ کھیلنے یا بھاگ دوڑ کی اجازت ہوتی ہے، تا کہ اس کے عضلات زیادہ سخت نہ ہونے پائیں۔ نرم عضلات کا مطلب ہے ایک نرم، رس بھرا اسٹیک، پہلی بار جب بچھڑے کو چلنے کا موقع ملتا ہے، اپنے عضلات پھیلا سکے، اور دوسرے بچھڑوں سے مس ہو سکے تو وہ مذبحہ خانے کی جانب پیش قدمی کا وقت ہے۔ ارتقائی معنوں میں مویشی کسی بھی زمانے میں تخلیق ہونے والی سب سے کامیاب اسپیسی ہے۔ اسی کے ساتھ وہ اس سیارے کے مظلوم ترین جانور ہیں۔

تمام زرعی معاشرے اپنے مویشیوں سے ایسا وحشیانہ سلوک روا نہیں رکھتے۔ کچھ پالتو جانوروں کی زندگیاں بہت آرام دہ بھی ہوتیں۔ اون کے لیے پالے جانے والے بھیڑ، پالتو کتے اور بلیاں، گھڑ دوڑ اور جنگلوں

میں سواری کے گھوڑے خاصے آرام دہ ماحول میں رہتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ رومن بادشاہ کیلی گیولا تو اپنے پسندیدہ گھوڑے "انسی ٹیٹس" کو سفارتی منصب دینا چاہتا تھا۔ تاریخ کے تمام ادوار میں چرواہوں اور کسانوں نے اپنے جانوروں سے محبت کا سلوک روا رکھا اور ان کی اچھی طرح دیکھ بھال کرتے، بالکل جیسے کئی غلام رکھنے والے اپنے غلام کے لیے تشویش اور محبت کے جذبات رکھتے تھے۔ یہ کوئی اتفاق نہیں تھا کہ بادشاہ اور پیغمبر اکثر اپنے آپ کو چرواہوں سے تشبیہ دیتے، وہ اور ان کے رب اپنے ماننے والوں کی ریوڑ کی مانند نگہبانی کرتے۔

پھر بھی کسی چرواہے کے بجائے، ایک ریوڑ کے نکتہ نظر سے بچھڑوں کی تکلیف دہ زندگی سے یہ تاثر قائم نہ کرنا دشوار ہے کہ زیادہ تر پالتو جانوروں کے لیے زرعی انقلاب ایک ہولناک عذاب تھا۔ ان کی ارتقائی کامیابی بے معنی ہے۔ ایک نایاب جنگلی گینڈا جس کی نسل مٹ جانے کے قریب ہو، غالباً ایک ایسے بچھڑے سے زیادہ خوش و خرم ہے جس نے اپنی مختصر زندگی ایک مختصر پنجرے میں گزاری، اور پھر ایک رس بھرے اسٹیک میں اختتام ہوا۔ مطمئن گینڈا اس امر سے لاپرواہ ہے کہ وہ اپنی نسل کا آخری نمائندہ ہے۔ بچھڑوں کی اسپیسی کی عددی کامیابی انفرادی بچھڑوں کی تکلیف دہ زندگی کا مرہم نہیں بن سکتی۔

ارتقائی کامیابی اور انفرادی تکلیف کے درمیان یہ تضاد ہی غالباً زرعی انقلاب کا سب سے اہم سبق ہے۔ جب ہم نباتات مثلاً گندم اور مکئی کا بیان پڑھتے ہیں تو غالباً ارتقائی پس منظر ہی منطقی لگتا ہے۔ لیکن حیوانات کے معاملے میں مثلاً مویشی، بھیڑ اور انسان، ہر ایک اپنی پیچیدہ احساسات و جذبات کی دنیا کے ساتھ ہمیں سوچنا پڑتا ہے کہ ارتقائی کامیابی انفرادی تجربے میں کیسے ڈھلی۔ آئندہ ابواب میں ہم بار ہا یہ دیکھیں گے کہ کیسے ہماری اسپیسی کی اجتماعی طاقت اور ظاہری کامیابی، انفرادی اذیت کے شانہ بہ شانہ رہی ہے۔

○

اہرام کی تعمیر

زرعی انقلاب تاریخ کے سب سے متنازعہ واقعات میں سے ایک ہے۔ اس کے طرف دار کہتے ہیں کہ اس نے انسانیت کو ترقی و تمول کی راہ پر گامزن کر دیا ہے، دوسرے کہتے ہیں کہ یہ باعث بربادی بنا۔ ان کے خیال میں یہ وہ موڑ تھا جہاں انسان نے قدرت سے اپنا ناطہ توڑ لیا، اور لالچ و تنہائی کی جانب عازم سفر ہوا۔ یہ راستہ اسے کہیں بھی لے جاتا، واپسی کا کوئی امکان نہیں تھا۔ زراعت سے آبادی اس سرعت سے بڑھی کہ اب کوئی پیچیدہ زرعی معاشرہ دوبارہ شکاری/متلاشی بن کر نہیں رہ سکتا۔ تقریباً دس ہزار سال قبل مسیح میں زراعت کی جانب منتقلی سے پہلے زمین پر تقریباً اٹھارہ لاکھ خانہ بدوش متلاشی آباد تھے۔ پہلی صدی عیسوی تک صرف دس سے بیس لاکھ متلاشی باقی رہ گئے تھے (زیادہ تر آسٹریلیا، امریکہ اور افریقہ میں)۔ لیکن دنیا کے پچیس کروڑ انسانوں کے مقابلے میں ان کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر تھی۔

زیادہ تر انسان مستقل آبادیوں میں رہے، صرف چند ہی خانہ بدوش تھے۔ مستقل قیام سے ان کا میدان عمل بہت سکڑ جاتا۔ قدیم شکاری/متلاشی عموماً درجنوں بلکہ سینکڑوں مربع کلومیٹر تک کا میدان طے کرتے تھے۔ ان کے لیے 'گھر' اپنے پہاڑوں، چشموں، جنگلات اور کھلے آسمان سمیت وہ سارا علاقہ تھا۔ اس کے مقابلے میں ہاری اپنے بیشتر ایام ایک چھوٹے کھیت یا باغ میں کام کر کے گزارتے۔ ان کی گھریلو زندگی ایک لکڑی، پتھر یا مٹی کی بنی تنگ عمارت تھی جو زیادہ سے زیادہ چند میٹر کی ہوتی۔ ایک عام ہاری اس عمارت سے بہت وابستگی پیدا کر لیتا تھا۔ یہ بہت دوررس نتائج کا حامل انقلاب تھا، جس کے اثرات نفسیات اور تعمیرات پر ثبت ہوئے۔ اس کے بعد سے 'اپنے گھر" سے وابستگی اور پڑوسیوں سے جدائی ایک خود غرضانہ وجود کا حصہ بن گئی۔

قدیم متلاشیوں کے مقابلے میں نئے زرعی علاقے نہ صرف بہت چھوٹے تھے بلکہ بہت مصنوعی بھی۔ شکاری/متلاشی جن زمینوں پر گھومتے وہاں انہوں نے آتش زدگی کے علاوہ کوئی خاص شعوری تبدیلی پیدا نہیں کی۔ اس کے مقابلے میں کسان ایسے مصنوعی انسانی جزیروں میں رہتے جو انہوں نے اطراف کے جنگلات صاف کر کے بنائے تھے۔ انہوں نے جنگلات کاٹے، نہریں کھودیں، میدان صاف کیے، گھر بنائے، کیاریاں کھودیں اور نفیس قطاروں میں پھلوں کے درخت اگائے۔ اس کے نتیجے میں تعمیر ہونے والی مصنوعی قیام گاہیں صرف انسانوں اور 'ان کے' پودوں اور جانوروں کے لیے مخصوص تھیں۔ جن کے اطراف اکثر باڑ کھینچ دی جاتی یا دیوار کھڑی کر دی جاتی۔ کسان خاندان جنگلی خودرو پودوں اور جانوروں کو باہر رکھنے کی مقدور بھر کوشش کرتے۔ اگر ایسے دخل

انداز گھس بھی آتے، تو انہیں باہر نکال دیا جاتا۔ اگر وہ برقرار رہنے پر مصر ہوتے تو ان کے انسانی دشمن انہیں نابود کر دینے پر کمر کس لیتے۔ گھر کے اطراف بالخصوص بہت مضبوط دفاع تعمیر کیا جاتا تھا۔ زراعت کا سورج طلوع ہونے سے آج تک اربوں انسان چھڑیوں، ڈنڈوں، جوتوں اور زہریلے چھڑکاؤ سے سرگراں مویشیوں، مکھی کاک روچوں، ہم جو مکڑیوں اور بھٹکے بھونروں کے خلاف مسلسل جنگ جاری رکھے ہیں، جو انسانی گھروں میں گھس آئے۔

تاریخ کے بیشتر دورانیے میں یہ انسانی تعمیرات بہت چھوٹی تھیں اور ان کے اطراف غیر مفتوح قدرت کے وسیع علاقے بکھرے تھے۔ زمین کی سطح تقریباً اکیاون کروڑ مربع کلومیٹر ہے، جس میں سے تقریباً پندرہ کروڑ خشکی ہے۔ ابھی چودھویں صدی عیسوی تک زیادہ تر کسان اپنے حیوانات و نباتات سمیت محض ایک کروڑ دس لاکھ کلومیٹر تک محدود تھے، اس سیارے کی سطح کا محض دو فیصد۔ باقی تمام جگہیں بہت سرد، بہت گرم، بہت تر، بہت خشک یا کسی اور وجہ سے زراعت کے لیے ناموزوں تھیں۔ زمین کا یہ مختصر دو فیصد ہی وہ اسٹیج تھا جس پر تاریخ کا یہ ڈرامہ کھیلا جا رہا تھا۔

لوگ اپنے یہ مصنوعی جزیرے چھوڑنے پر تیار نہیں تھے۔ وہ بہت نقصان کے اندیشے بغیر اپنے گھر، کھیت اور اناج کے ذخائر نہیں چھوڑ سکتے تھے۔ پھر وقت گزرنے کے ساتھ وہ اور زیادہ اشیا اکٹھی کر لیتے، اشیا جو آسانی سے منتقل نہیں کی جا سکتی تھیں، وہ انسانوں کو باندھے رکھتیں۔ ہمیں قدیم کسان شاید بہت مفلس لگتے ہوں گے، لیکن ایک عام خاندان کی ملکیت ایک پورے متلاشی قبیلے سے زیادہ ہوتی تھی۔

مستقبل کی آمد

اگرچہ کاشت کے لیے زمین کم ہوتی گئی، لیکن زراعت میں مصروف وقت بڑھتا گیا۔ متلاشی عموماً آئندہ ہفتہ یا آئندہ گرمیوں کے بارے میں سوچنے میں زیادہ وقت ضائع نہیں کرتے تھے، جب کہ کسان اپنے تصور میں آنے والے برسوں بلکہ دہائیوں کا سفر کرتا۔

متلاشی مستقبل کی فکر سے آزاد تھے، کیوں کہ وہ تنگدست رہتے، غذا اکٹھا کرنا اور اسے محفوظ کرنا دشوار تھا۔ وہ مستقبل کی کچھ منصوبہ بندی ضرور کرتے۔ شاوے (Chauvet)، لیسکاؤ (Lescaux) اور التامیرا (Altamira) کے غاروں کے نقاش یقیناً اپنی تخلیقات آنے والی نسلوں تک برقرار رکھنا چاہتے تھے۔ سماجی تعلقات اور سیاسی دشمنیاں ان کے طویل المدت مشاغل تھے۔ کسی عنایت کا بدلہ اتارنے یا زیادتی کا بدلہ لینے میں کئی برس لگ جاتے۔ پھر بھی شکاری/متلاشی کی محدود اقتصادیات میں کسی طویل المدت منصوبہ بندی کی گنجائش کم ہی تھی۔ لیکن اس نے متلاشیوں کے فکرمندی سے بھی محفوظ رکھا۔ ایسی چیزوں کے بارے میں فکرمند ہونا محال تھا جو ان کے زیر اثر نہ ہوں۔

زرعی انقلاب نے مستقبل کو بہت زیادہ اہم بنا دیا تھا، جتنا وہ پہلے کبھی نہیں رہا تھا۔ کسانوں کے لیے مستقبل کو ذہن میں رکھنا اور اس کے لیے مشقت کرنا لازم تھا۔ زرعی معیشت پیداوار کے موسمی سلسلوں پر منحصر تھی۔ یہ آبیاری کے طویل مہینوں کے بعد کٹائی کی مختصر مدت پر محیط ہوتی۔ ایک شاندار فصل اترنے کے بعد والی شب کسان چاہے کتنا بھی جشن منا لیتے، لیکن پھر ایک ہفتے میں ہی وہ صبح نور کے تڑکے اٹھ کر کھیت میں ایک طویل دن گزارنے کے لیے تیار ہو جاتے۔ گو اس روز، ہفتے، بلکہ آئندہ مہینے کے لیے بھی ضروری اناج مہیا تھا، لیکن انہیں آئندہ سال اور اس کے بعد آنے والے موسموں کی فکر کرنی تھی۔

مستقبل کی فکر مندی کی وجہ نہ صرف پیداوار کے موسمی سلسلے تھے، بلکہ زراعت کی بنیادی بے یقینی بھی۔ کیوں کہ بیشتر دیہات بہت قلیل اقسام کے پالتو جانور پالتے اور فصل اگاتے، لہذا وہ قحط، سیلاب اور موذی امراض کے رحم و کرم پر تھے۔ کسانوں پر لازم تھا کہ وہ جتنا کھاتے اس سے زیادہ پیدا کرتے تاکہ آئندہ کے لیے ذخیرہ اندوزی کر سکیں۔ گوداموں میں اناج، تہہ خانوں میں زیتون کے تیل کے ڈبوں، الماری میں پنیر، اور شہتیروں سے لٹکتے ساسیج (Sausage) کے بغیر، وہ خشک سالی میں بھوکے رہ جاتے۔ اور خراب سال تو جلد یا بدیر تو آنے ہی تھے۔ کوئی کسان جو یہ سمجھتا کہ خراب سال کبھی نہیں آئیں گے لمبی عمر نہیں پاتا۔

لہذا زراعت کی ابتدا سے ہی مستقبل کی فکر انسانی سوچ کے تھیٹر میں نمایاں کردار ادا کرتی رہی۔ جہاں کسان آبیاری کے لیے بارشوں پر انحصار کرتے، وہاں بارش کا موسم آتے ہی کسان روز صبح افق کی جانب دیکھتے، فضا کو سونگھتے اور آنکھیں میچ کر دیکھتے۔ کیا وہ بادل ہے؟ کیا وقت پر بارش ہو جائے گی؟ کیا طوفانی ہوائیں کھیت سے بیج اڑا لے جائیں گی اور کونپلوں کو تباہ کر دیں گی؟ دوسری جانب، فرات، سندھ اور یلو (Yellow) دریاؤں کے ساحلوں پر بھی کسان پانی کی بڑھتی سطح سے کچھ کم خوفزدہ نہیں رہتے تھے۔ انہیں دریا کا پانی چڑھنے کا انتظار رہتا، تاکہ اونچائیوں سے زرخیز مٹی بہہ کر کھیتوں میں پھیل جائے، اور ان کی آبیاری کی نہریں بھر جائیں۔ لیکن سیلاب جب بہت اونچے جائیں یا غلط وقت پر آئیں، تو وہ ان کی فصلوں کو خشک سالی کی مانند ہی تباہ کر دیتے۔

یہ ہاری مستقبل کے بارے میں صرف اسی وجہ سے پریشان نہیں رہتے تھے کہ اب ان کے پاس پریشان ہونے کے لیے کچھ مہیا تھا، بلکہ اس لیے بھی کہ وہ اس میں مداخلت کر سکتے تھے۔ وہ ایک اور میدان صاف کر سکتے تھے، آبیاری کے لیے ایک اور نہر کھود سکتے تھے، مزید فصل اگا سکتے تھے۔ فکر مند ہاری گرمیوں میں ذخیرہ کرنے والی کسی چیونٹی کی مانند، ان تھک محنت کرتا۔ زیتون کا درخت لگانے میں پسینہ بہاتا جس کا تیل اس کی اولاد یا ان کی بھی اولاد نکالتی۔ جو غذا کھانے کے لیے اس کا دل آج للچاتا، اسے سردی کے موسم یا آئندہ برس کے لیے موخر کر دیتا۔

اس زراعتی تناؤ کے بہت دور رس نتائج تھے۔ یہی بڑے پیمانے پر سیاسی اور سماجی نظام کی بنیاد تھا۔ بدقسمتی سے اپنے موجود میں اتنی سخت محنت کے باوجود اس جانفشاں ہاری کو مستقبل کا وہ تحفظ نہ ملتا جس کی اسے تمنا تھی۔ ہر جگہ حکمراں اور خواص نمودار ہو جاتے جو ہاریوں کی اضافی پیداوار پر پلتے اور انہیں تنگدست چھوڑ دیتے۔

اس چھینی جانے والی غذائی افراط نے ہی سیاست، جنگ، آرٹ اور فلسفے کو ہوا دی۔ انہوں نے محل، قلعے، یادگاریں اور معبد تعمیر کیے۔ حالیہ جدید دور تک نوے فیصد سے زیادہ انسان ہاری تھے جو روز صبح اٹھ کر اپنے ماتھے کے پسینے سے ہل چلاتے۔ ان کی اضافی پیداوار سے خواص کی ایک معمولی اقلیت کا پیٹ بھرتا۔ بادشاہ، سرکاری افسران، فوجی، راہب، فنکار اور مفکر جو تاریخی کتب کی زینت بنے۔ بہت کم لوگ تاریخ رقم کر رہے تھے، جب کہ باقی سب ہل چلا رہے تھے اور پانی کی بالٹیاں اٹھا کر لا رہے تھے۔

ایک فرضی قاعدہ

ہاریوں کے پیدا کیے اناج میں افراط اور ذرائع نقل و حمل میں بہتری سے زیادہ سے زیادہ افراد پہلے تو بڑے دیہاتوں، پھر قصبوں اور بالآخر شہروں میں بس گئے۔ یہ سب آپس میں نئی مملکتوں اور اقتصادی تار پود سے

بندھے ہوئے تھے۔

پھر بھی ان نئے امکانات سے فائدہ اٹھانے کے لیے غذائی افراط اور نقل وحمل میں بہتری ہی کافی نہیں تھی۔ محض یہ حقیقت کہ ایک ہی قصبے میں ہزار افراد کو کھانا کھلایا جا سکتا ہے، یا ایک ہی مملکت کے دس لاکھ افراد کے معدے میں خوراک پہنچائی جا سکتی ہے، اس بات کی ضمانت نہیں تھی کہ وہ زمین اور پانی کی تقسیم کے طریقے پر بھی متفق ہوں، یا جھگڑوں کو نمٹانے کا قابل قبول طریقہ اپنا لیں، یا قحط د جنگ کے زمانے میں باہم ہو کر مقابلہ کریں۔ چاہے ذخائر ابل ہی رہے ہوں، اگر اتفاق نہیں ہوتا تو تضاد جنم لیتا ہے۔ تاریخ کی زیادہ تر جنگیں اور انقلاب غذائی قلت کی وجہ سے پیدا نہیں ہوئی تھیں۔ انقلاب فرانس کے سرکردہ متمول وکلا تھے بھوکے کسان نہیں۔ رومن سلطنت پہلی صدی قبل مسیح میں بام عروج پر اس وقت پہنچی جب بحیرہ روم سے اس کے جہازی بیڑے ان کے اجداد کے خوابوں سے بھی زیادہ دولت لاد کر واپس لوٹے۔ لیکن یہ اسی زمانہ عروج کی بات ہے کہ جب رومن سیاسی نظام ہولناک خانہ جنگیوں میں خاکستر ہو گیا تھا۔ 1991 میں یوگوسلاویہ کے پاس اپنے تمام شہریوں کے لیے ضرورت سے زیادہ اناج موجود تھا، لیکن وہ بھی ایک خوفناک قتل عام کے بعد منتشر ہو گیا۔

ان تمام آفات کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ لاکھوں سال تک انسان چند درجن نفوس پر مشتمل مختصر گروہوں میں رہتے تھے۔ زرعی انقلاب سے شہر، مملکت اور سلطنت نمودار ہونے کے درمیانی چند ہزار سال اتنے کافی نہیں تھے کہ وہ بڑے پیمانے پر باہمی تعاون کا رویہ پیدا کر سکیں۔

اپنی حیاتیاتی حس کے باوجود متلاشی زمانے میں، سینکڑوں اجنبی اپنے مشترکہ مفروضوں کی بنا پر تعاون کر لیتے تھے۔ لیکن یہ تعاون محدود اور نازک تھا۔ سیپین کا ہر گروہ اپنی زندگی خودمختاری سے گزارتا رہا، اور اپنی ضروریات پوری کرتا رہا۔ بیس ہزار سال پہلے کا کوئی قدیم ماہر سماجیات ایسے زرعی انقلاب کے بعد کے واقعات کا علم نہ رکھتے ہوئے یہی سمجھتا کہ اظرافیات (Mythology) کا امکان بہت محدود ہے۔ آبائی ارواح کی کہانیاں اور قبائلی مظاہر نطرت اتنے طاقتور ضرور تھے کہ پانچ سو افراد آپس میں سیپیوں کی تجارت کرتے، کبھی کبھار تہوار منا لیتے یا کسی نینڈرتھال گروہ کا مل کر صفایا کر دیتے، لیکن بس اسی حد تک۔ قدیم ماہر سماجیات تو یہی سمجھتا کہ اظرافیات بھی لاکھوں اجنبیوں کو روزانہ ایک دوسرے سے تعاون کرنے پر آمادہ نہیں کر سکتی۔

لیکن یہ بات غلط ثابت ہوئی۔ معلوم ہوا کہ مفروضے کسی کی بھی توقع سے بہت زیادہ اہم تھے۔ جب زرعی انقلاب نے بہت گنجان شہروں اور طاقتور سلطنتوں کے قیام کا موقع فراہم کیا تو لوگوں نے عظیم خداؤں، مادر وطن اور مشترکہ حصص کمپنیوں کی کہانیاں تراش لیں تاکہ سماجی روابط کی ضرورت کو پورا کیا جا سکے۔ جب کہ انسانی ارتقا اپنی عمومی کچھوے کی چال سے آگے بڑھ رہا تھا تو انسانی فکر بڑے پیمانے پر معاونت کے حیرت انگیز جال بن رہی تھی جو زمین پر اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھی گئی تھی۔

تقریباً ساڑھے آٹھ ہزار سال قبل مسیح میں دنیا کی بڑی بستیاں دیہاتوں میں تھیں، مثلاً اریحا جہاں چند سو افراد رہتے تھے۔ پھر تقریباً سات ہزار سال قبل مسیح میں اناطولیہ کے شہر چاتال ہوئیک (Catalhoyuk) میں پانچ سے دس ہزار افراد مقیم تھے۔ اس دور میں یہ شاید دنیا کی سب سے بڑی بستی رہی ہوگی۔ چھٹی اور پانچویں صدی قبل مسیح میں اس ہلالی شکل کے زرخیز علاقے میں جسے انسانیت کا پنگوڑا کہا گیا (عراق سے مصر تک) لاکھوں افراد پر مشتمل

آبادیاں دیہاتوں پر چھا گئیں سن ۳۱۰۰ ق م میں دریائے نیل کی پوری زیریں وادی پہلی مصری مملکت میں یکجا ہوگئی۔ اس کے فرعون ہزاروں مربع میل اور لاکھوں افراد پر حکمران تھے۔ تقریباً ۲۲۵۰ ق م میں عظیم سرگون (Sargon) نے پہلی سلطنت اکاڈین (Akkadian) قائم کی، یہ دس لاکھ کی رعایا اور پانچ ہزار چار سو سپاہیوں کی فوج پر مشتمل تھی۔ پانچ سو سے ایک ہزار سال قبل مسیح میں مشرق وسطیٰ کی پہلی وسیع سلطنتیں نمودار ہوئیں: اسیری، بابل وننیوا اور فارس۔ یہ لاکھوں کی رعایا اور ہزارہا سپاہیوں پر مشتمل تھیں۔

۲۲۱ ق م میں چن خاندان کی بادشاہت نے چین کو متحد کیا، اور اس کے کچھ ہی عرصے بعد روم نے بحیرہ روم کے ساحلی ممالک کو۔ چن سلطنت کے چار کروڑ عوام سے موصول ہونے والا محصول لاکھوں سپاہیوں اور ایک لاکھ سے زیادہ افراد کی پیچیدہ نوکر شاہی کا خرچ اٹھایا جاتا۔ رومن سلطنت اپنے عروج کے زمانے میں دس کروڑ افراد سے محصول وصول کرتی تھی۔ اس آمدنی سے ڈھائی سے پانچ لاکھ سپاہیوں اور سڑکوں کا نظام برقرار رہتا، جو آج پندرہ سو سال بعد بھی استعمال ہوتی ہیں۔ تھیٹر اور تماش گاہیں جن میں آج بھی حیرت انگیز ناٹک دکھائے جاتے ہیں۔

یہ یقیناً متاثر کن ہے، لیکن ہمیں فرعون مصر یا سلطنت روم میں بڑے پیمانے پر تعاون کے سلسلوں کے بارے میں کسی خوشگوار فریب میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے۔ یہ تعاون جو بہت بے لوث لگتا ہے یہ عموماً نہ تو رضاکارانہ ہوتا ہے اور شاید ہی کبھی مساوات پر مبنی ہوتا ہے۔ باہمی انسانی تعاون کے یہ سلسلے اکثر جبر واستحصال سے جا ملتے ہیں۔ ہاریوں کے بڑھتے تعاون کو قیمتی اناج کے فاضل ذخیروں سے اجرت دی جاتی، لیکن وہ ہمیشہ اس فکر میں رہتے کہ کب محصول وصول کرنے والے ایک جنبش قلم شاہی کی تعمیل میں سارے سال کی سخت محنت کو لوٹ لیں۔ مشہور رومن تماش گاہیں اکثر غلاموں سے بنوائی گئی تھیں، تاکہ متمول کاہل رومن دوسرے غلاموں کو خوفناک بقا کی جنگ (Gladiatorial) میں دیکھ سکیں۔ زنداں وعقوبت خانے بھی تعاون کے سلسلے ہیں، جو صرف اسی وقت کارگر ہو سکتے ہیں کہ اگر ہزاروں اجنبی کسی طرح اپنی سرگرمیوں کو ہم آہنگ کر سکیں۔

تعاون کے یہ تمام سلسلے قدیم میسوپوٹیما سے چن اور رومن سلطنتوں تک تصوراتی ہی تھے۔ وہ سماجی قواعد جو انہیں برقرار رکھتے، وہ نہ تو ذاتی واقفیت نہ ہی وجدانی جبلت پر مبنی تھے، بلکہ ان کی بنیاد مشترکہ اعتقادات اور مفروضوں پر تھی۔ مفروضے کیسے پوری سلطنتوں کو برقرار رکھ سکتے ہیں، ایک ایسی مثال ہم پہلے پیوجو میں دیکھ چکے ہیں۔ اب تاریخ کے دو معروف مفروضوں کا جائزہ لیتے ہیں:

۱۷۷۶ ق م کا حمورابی کا ضابطہ اخلاق جس نے قدیم بابل کے لاکھوں باشندوں کے لیے آئین تعاون کا کام کیا، اور دوسرا ۱۷۷۶ عیسوی کا امریکی اعلان آزادی جو آج بھی کروڑوں شمالی امریکیوں کے لیے آئین تعاون کا کام کرتا ہے۔

۱۷۷۶ ق م میں بابل دنیا کا سب سے بڑا شہر تھا، ایک لاکھ رعایا کے ساتھ بابل وننیوا کی سلطنت غالباً دنیا کی سب سے بڑی سلطنت تھی۔ اس کی حکمرانی پورے میسوپوٹیما پر تھی جس میں موجودہ عراق کا بیشتر حصہ، اور موجودہ شام وایران کے بیشتر حصے شامل تھے۔ سلطنت بابل کا سب سے مشہور بادشاہ جو آج بھی مشہور ہے حمورابی تھا۔ اس کی وجہ شہرت وہ ضابطہ اخلاق ہے جو اس کے نام سے معنون ہے، حمورابی کا ضابطہ اخلاق۔ یہ قوانین اور عدالتی فیصلوں پر مشتمل تھا جس کا مقصد حمورابی کو ایک منصف بادشاہ کے طور پر پیش کرنا تھا۔ اس کا مقصد پوری

سلطنت بابل میں یکساں نظام قانون لاگو کرنا، آنے والی نسلوں کو انصاف کی تعلیم دینا اور آنے والے بادشاہوں کے لیے ایک مثالی طرز عمل فراہم کرنا تھا۔

پتھر کا ایک کتبہ جس پر حمورابی کا ضابطہ کندہ ہے

آئندہ نسلوں نے ان ضابطوں کا اعادہ کیا۔ قدیم میسوپوٹیما کے عمائدین، عمال اور مفکروں نے اس تحریر کو مقدس بنا دیا۔ حمورابی کی موت اور اس کی سلطنت کھنڈر بن جانے کے بعد بھی نو آموز کاتب اسے نقل کرتے رہے۔ قدیم میسوپوٹیما کے تصوراتی سماجی نظام کو سمجھنے کے لیے حمورابی کا ضابطۂ اخلاق ایک اچھا وسیلہ ہے۔

اس عبارت کا آغاز یوں ہوتا ہے کہ خدائے انو (Anu)، انلیل (Enlil) اور مردوق (Marduk)، میسوپوٹیما کے معبد کے سرکردہ خداوندوں نے حمورابی کو مقرر کیا ہے کہ وہ علاقے میں انصاف کی فراہمی کو یقینی بنائے، برائی اور بدکاری کا خاتمہ کرے، طاقتور کو کمزوروں پر ظلم کرنے سے روکے۔ پھر ایک مقررہ ترتیب میں یہ ضابطہ تین سو فیصلے صادر کرتا ہے: "اگر مقدمہ ایسا ہو تو اس کا فیصلہ یوں ہونا چاہیے"۔ مثلاً فیصلہ ۹۔۱۹۶ اور ۱۴۔۲۰۹ یوں بیان ہوتا ہے:

۱۹۶: اگر کوئی ممتاز شخص کسی دوسرے ممتاز شخص کی آنکھ پھوڑ دے، تو اس کی آنکھ بھی نابینا کر دی جائے۔

۱۹۷: اگر وہ کسی اور ممتاز فرد کی ہڈی توڑ دے تو اس کی ہڈی توڑ دی جائے۔

۱۹۸: اگر وہ کسی عام فرد کی کمر یا ہڈی توڑ دے تو وہ چاندی کے ساٹھ سکوں کا جرمانہ ادا کرے۔

۱۹۹: اگر وہ کسی اور ممتاز فرد کے غلام کی آنکھ پھوڑ دے، یا اس کی ہڈی توڑ دے، تو وہ غلام کی قیمت کا نصف چاندی کی شکل میں ادا کرے۔

۲۰۹: اگر کوئی ممتاز فرد، کسی ممتاز طبقے کی عورت کو ضرب لگا کر اس کا حمل ضائع کر دے، تو وہ چاندی کے دس سکوں کا جرمانہ ادا کرے۔

۲۱۰: اگر وہ عورت مرجائے تو اس قاتل کی بیٹی کو قتل کر دیا جائے۔

۲۱۱: اگر اس ممتاز فرد کی زدو کوب سے کسی عام عورت کا حمل ضائع ہو جائے تو وہ چاندی کے پانچ سکوں کا جرمانہ ادا کرے۔

۲۱۲: اگر وہ عورت مرجائے تو وہ شخص چاندی کے تیس سکے ادا کرے۔

۲۱۳: اگر وہ کسی ممتاز فرد کی کنیز کو ضرب لگا کر اس کا حمل ضائع کر دے، تو وہ چاندی کے دو سکے ادا کرے۔

۲۱۴: اگر وہ کنیز مرجائے تو وہ شخص چاندی کے بیس سکے تول کر ادا کرے۔

اپنے فیصلے مرتب کرنے کے بعد حمورابی نے مزید اعلان کیا کہ "یہ وہ منصفانہ فیصلے ہیں جو عادل بادشاہ حمورابی نے صادر کیے ہیں۔ یوں اپنی مملکت کو سچائی اور زندگی کے راست رویوں کی راہ دکھائی ہے۔ میں حمورابی ہوں، معزز بادشاہ۔ میں انسانیت کی جانب سے غافل یا لاپرواہ نہیں ہوں جو خدائے انلیل نے میری رعیت میں دیے اور خدائے مرڈوق نے جن کی نگہبانی کا مجھے حکم دیا۔

حمورابی کا قانون اس بات پر زور دیتا ہے کہ بابل کا معاشرہ خدا کے بنائے ابدی اور عالمگیر انصاف کے اصولوں پر مبنی ہے۔ طبقات کا اصول بہت اہم ہے۔ ضابطے کے مطابق افراد کو دو اصناف اور تین طبقوں میں تقسیم کیا گیا ہے: ممتاز، عوام اور غلام۔ ہر صنف اور طبقے کے افراد کی اقدار مختلف ہیں۔ ایک عام عورت کی زندگی کی قیمت چاندی کے تیس سکے ہیں، ایک غلام عورت کی چاندی کے بیس سکے، جب کہ ایک عام مرد کی آنکھ کا عوض چاندی کے ساٹھ سکے ہیں۔

یہ خاندان کے اندر بھی طبقے قائم کرتا ہے، جس کے مطابق بچے آزاد افراد نہیں ہیں بلکہ اپنے والدین کی ملکیت ہیں۔ لہذا اگر ایک معزز فرد کسی اور معزز فرد کی بیٹی کو قتل کر دے، تو سزا میں قاتل کی بیٹی کو مار دیا جاتا ہے۔ ہمیں یہ بات حیرت انگیز لگے گی کہ قاتل کو تو کوئی سزا نہیں ملی، جب کہ اس کی بے گناہ بیٹی ماری گئی۔ لیکن حمورابی اور بابل والوں کو یہ عین انصاف لگتا تھا۔ حمورابی کے ضابطے کی بنیاد یہ یقین تھا کہ اگر بادشاہ کی تمام رعایا اپنے مقام کو پہچان کر، اسی مناسبت سے کام کرے، تو مملکت کے دس لاکھ شہری موثر انداز میں تعاون کرنے کے قابل ہو جائیں گے۔ پھر ان کا معاشرہ اپنے افراد کے لیے غذا پیدا کر سکے گا، اسے موثر انداز میں تقسیم کر سکے گا، اپنے آپ کو دشمنوں سے محفوظ رکھے گا، اور اپنی مملکت کی سرحدیں بڑھا کر مزید دولت اور بہتر تحفظ حاصل کر سکے گا۔

حمورابی کی موت کے ساڑھے تین ہزار سال بعد شمالی امریکہ میں تیرہ برطانوی کالونیوں کے باشندوں کو یہ احساس ہوا کہ انگلستان کا بادشاہ ان سے انصاف نہیں کر رہا۔ ان کے نمائندے فلاڈیلفیا شہر میں جمع ہوئے اور چار جولائی ۱۷۷۶ء کو کالونیوں نے اعلان کر دیا کہ ان کے باشندے اب تاج برطانیہ کی رعایا نہیں تھے۔ ان کے اعلان آزادی نے بھی عالمگیر اور ابدی اصولوں کو بنیاد بنایا، جو حمورابی کی طرح کسی خدائی طاقت نے مرتب کیے تھے۔ لیکن

امریکی خدا کا بنایا سب سے اہم قانون، بابل کے خداؤں کے اہم ترین قوانین سے مختلف تھا۔

IN CONGRESS, July 4, 1776.

The unanimous Declaration of the thirteen united States of America.
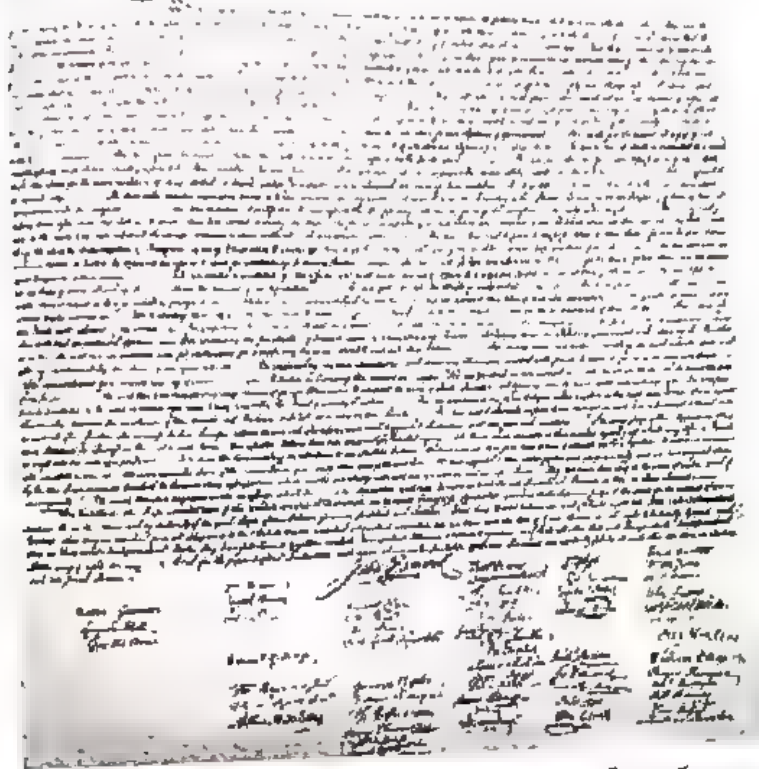
امریکہ کا اعلان آزادی ہمیں یہ بتاتا ہے کہ:

"ہمارے خیال میں یہ سچائی اظہر من الشمس ہے کہ تمام انسان برابر پیدا ہوتے ہیں۔ انہیں اپنے خالق کی جانب سے کچھ بنیادی حقوق عطا ہوئے ہیں، جن میں زندگی، آزادی اور مسرت کی تلاش شامل ہیں۔"

حمورائی کے ضابطے کی مانند، امریکہ کے قیام کی دستاویز بھی یہی وعدہ کرتی ہے کہ اگر افراد اس کے مقدس قوانین کی پابندی کریں، تو لاکھوں افراد موثر انداز میں ایک دوسرے سے تعاون کر سکیں گے، اور ایک منصفانہ اور متمول معاشرے میں تحفظ اور امن سے زندگی گزار سکیں گے۔ حمورابی کے ضابطے کی مانند امریکی اعلان آزادی بھی صرف اسی وقت و مقام کے لیے نہیں تھا، بلکہ یہ مستقبل کی نسلوں کے لیے قابل قبول تھا۔ دو سو سال بعد بھی امریکی طلبہ اس کی نقول بنا رہے ہیں اور اسے زبانی یاد کر رہے ہیں۔

یہ دونوں فرامین ہمیں دشواری میں ڈال رہے ہیں۔ حمورابی کا ضابطہ اخلاق اور امریکی اعلان آزادی، دونوں ہی ابدی و عالمگیر اصول انصاف پر مبنی ہیں۔ لیکن امریکیوں کے مطابق تمام انسان برابر ہوتے ہیں۔ جب کہ بابل کے عوام تو واضح طور پر غیر یکساں تھے۔ ظاہر ہے امریکی تو یہی کہیں گے کہ وہ درست ہیں اور حمورابی غلط۔ حمورابی ظاہر ہے جواب میں یہی کہے گا کہ وہ درست ہے اور امریکی غلط۔ اصل میں یہ دونوں ہی غلط ہیں۔ حمورابی اور بانیان امریکہ دونوں نے ایک سچائی تصور کی تھی جو انصاف کے غیر متنازعہ اصولوں پر قائم ہو۔ مثلاً برابری یا طبقات۔ لیکن وہ

واحد جگہ جہاں عالمگیر اصول پائے جاتے ہیں وہ ہے سیپین کا زرخیز دماغ، اور وہ مفروضے جو وہ گھڑتے ہیں اور ایک دوسرے کو سناتے ہیں۔

یہ ماننا ہمارے لیے آسان ہے کہ لوگوں کو عوام اور ممتاز طبقات میں تقسیم کرنا ہمارے ذہن کی اختراع ہے۔ لیکن یہ تصور کہ تمام افراد برابر ہیں یہ بھی ایک مفروضہ ہے۔ تمام انسان کس اعتبار سے برابر ہیں؟ کیا واقعی انسانی دماغ کے باہر کوئی وجودی سچائی ہے، جہاں ہم سب واقعی برابر ہوں۔ کیا تمام انسان حیاتیاتی اعتبار سے برابر ہیں۔

آیئے امریکی اعلان آزادی کے سب سے معروف فقرے کو حیاتیاتی زبان میں ترجمہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں:

"ہم ان سچائیوں کو اظہر من الشمس سمجھتے ہیں کہ تمام افراد برابر پیدا کیے گئے، کہ ان کے خالق نے ان کو زندگی، آزادی اور مسرت کی تلاش کے ناقابل تبدیلی حقوق سے نوازا۔"

حیاتیاتی سائنس کے اعتبار سے افراد 'تخلیق' نہیں کیے گئے تھے، ان کا ارتقا ہوا تھا۔ اور وہ یقیناً ارتقا میں 'برابر' نہیں رہے تھے۔ برابری کا نظریہ تخلیق کے نظریے سے علیحدہ کرنا دشوار ہے۔ امریکیوں کو برابری کا تصور عیسائیت سے ملا، جس کے مطابق ہر شخص کی روح تخلیق الٰہی ہے اور تمام ارواح خدا کی نظر میں برابر ہیں۔ لیکن اگر ہم خدائی تخلیق اور ارواح کے عیسائی مفروضے پر یقین نہ رکھتے ہوں تو پھر انسانوں کی برابری کے کیا معنی ہیں؟ ارتقا تفریق کی وجہ سے ہوا، یکسانیت کی وجہ سے نہیں۔ ہر فرد ایک مختلف جینیاتی کوڈ رکھتا ہے، اور وہ پیدائش سے ہی مختلف ماحولیاتی اثرات کا سامنا کرتا ہے۔ اس سے مختلف صفات پیدا ہوتی ہیں جو اپنے اندر بقائے حیات کے مختلف امکانات رکھتی ہیں۔ تو برابر پیدا کیا کا دراصل ترجمہ ہونا چاہیے 'مختلف ارتقا' ہوا۔

جس طرح حیاتیاتی اعتبار سے انسان تخلیق نہیں کیے گئے، اسی طرح حیاتیاتی سائنس کے نکتہ نظر سے نہ کوئی 'خالق' ہے جو انہیں کچھ بھی بخشتا ہے۔ صرف ایک اندھا ارتقائی عمل ہے، کسی مقصد سے عاری، جو مختلف افراد کی 'پیدائش' کا باعث ہے۔ تو 'خالق نے پیدا کیے' کا ترجمہ محض 'پیدا ہوئے' ہونا چاہیے۔

اسی طرح حیاتیات میں حقوق نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔ محض عضلات، صفات اور اہلیات ہیں۔ پرندے اس لیے پرواز نہیں کرتے کہ انہیں پرواز کا حق حاصل ہے، بلکہ اس لیے کہ ان کے پر ہیں۔ اور یہ بھی درست نہیں کہ یہ عضلات، صفات اور اہلیات 'چھینی نہیں جا سکتیں'۔ یہ مستقل تغیر پذیر (mutation) ہیں۔ اور وقت کے ساتھ ممکن ہے ختم بھی ہو جائیں۔ شتر مرغ ایک پرندہ ہے جو اپنی صلاحیت پرواز کھو چکا ہے تو 'ناقابل تبدیلی' کا ترجمہ ہونا چاہیے 'تغیر پذیر صفات'۔

اور وہ کیا صفات ہیں جو انسانوں میں پائی گئیں۔ "حیات"، یقیناً۔ لیکن "آزادی"؟ حیاتیات میں اس نام کی کوئی چیز موجود نہیں۔ بلکہ برابری، حقوق اور محدود ذمہ داری کی کمپنیوں کی طرح آزادی بھی لوگوں کی ذہنی اختراع ہے، جو ان کے تصور میں رہتی ہے۔ حیاتیاتی نکتہ نظر سے یہ بات بے معنی ہے کہ لوگ جمہوری معاشروں میں آزاد ہیں لیکن آمریت میں مقید۔ اور وہ "مسرت" کا کیا تذکرہ ہے؟ فی الوقت حیاتیاتی تحقیق مسرت کی واضح تعریف متعین کرنے یا اسے ناپنے کا آلہ ایجاد کرنے میں ناکام رہی ہے۔ بیشتر حیاتیاتی تحقیق محض خوشی کی موجودگی سے اتفاق کرتی ہے، جو نسبتاً زیادہ آسانی سے بیان اور ناپی جا سکتی ہے۔ لہذا 'زندگی، آزادی اور مسرت کی تلاش" کا ترجمہ ہونا چاہیے 'زندگی اور خوش رہنے کی کوشش'۔

تو وہ امریکی اعلان آزادی حیاتیاتی زبان میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے:

"ہم ان سچائیوں کو اظہر من الشمس سمجھتے ہیں کہ تمام انسان غیر یکساں پیدا ہوئے۔ وہ کچھ تغیر پذیر صفات کے ساتھ پیدا ہوئے، جن میں زندگی اور خوش رہنے کی کوشش شامل ہے۔"

مباحثے کے اس رخ سے مساوات اور انسانی حقوق کے داعی شاید بہت غصہ میں آئیں۔ ان کا جواب کچھ اس طرح کا ہوگا کہ "ہمیں معلوم ہے کہ لوگ حیاتیاتی طور پر برابر نہیں! لیکن اگر ہم سب یہ یقین رکھیں کہ ہم سب اصلاً برابر ہیں تو اس سے ایک متمول اور مستحکم معاشرے کی تشکیل میں مدد ملے گی۔" مجھے اس سے کوئی انکار نہیں ہے۔ تصوراتی قاعدے سے میرا مطلب یہی تھا۔ ہم کسی خاص قاعدے پر اس کی وجودی سچائی کی وجہ سے یقین نہیں رکھتے، بلکہ اس لیے کہ اس یقین سے ہمیں ایک بہتر اور موثر معاشرے کی تعمیر میں مدد ملتی ہے۔ تصوراتی قواعد نہ شیطانی منصوبہ بندی ہیں اور نہ بے کار سراب۔ بلکہ صرف بڑی تعداد میں انسانوں کے باہمی تعاون کا واحد ذریعہ ہیں۔ یہ بات ذہن میں رکھیے کہ حمورابی نے اپنے طبقاتی فلسفے کی بنیاد بھی اسی منطق پر رکھی تھی: "مجھے معلوم ہے کہ ممتاز، عام اور غلام، بنیادی طور پر انسانوں کی مختلف انواع نہیں ہیں، لیکن اگر ہم یہ یقین کرلیں کہ وہ مختلف ہیں تو ہمیں ایک مستحکم اور متمول معاشرے کی تشکیل میں مدد ملے گی۔"

سچے پیروکار

ممکن ہے کہ پچھلا پیراگراف پڑھتے ہوئے کچھ قارئین نے بے چینی سے کرسی میں پہلو بدلا ہو۔ آج ہم میں سے بیشتر اتنے پڑھے لکھے ہیں کہ اس ردعمل کا اظہار کریں۔ یہ مان لینا آسان ہے کہ حمورابی کا ضابطہ اخلاق فرضی تھا۔ لیکن یہ ہم نہیں ماننا چاہتے کہ انسانی حقوق بھی مفروضہ ہیں۔ اگر لوگ یہ ماننے لگیں کہ انسانی حقوق بھی محض ایک مفروضہ ہیں تو اس میں پورے معاشرے کے انہدام کا خطرہ نہیں؟ والٹیر نے خدا کے بارے میں کہا تھا کہ "خدا کا کوئی وجود نہیں، مگر یہ بات میرے نوکر کو مت بتا دینا کہیں وہ مجھے سوتے میں قتل ہی نہ کر دے۔" حمورابی یہی بات اپنے قاعدہ طبقات کے بارے میں کہہ سکتا ہے، اور تھامس جیفرسن انسانی حقوق کے بارے میں۔ ہوموسیپین کے کوئی فطری حقوق نہیں ہیں، بالکل جیسے مکڑی، لکڑ بھگے، اور بن مانس کے کوئی فطری حقوق نہیں ہیں۔ لیکن یہ بات ہمارے ملازمین کو نہ بتا دینا کہ کہیں وہ ہمیں سوتے میں قتل ہی نہ کر دیں۔

یہ خوف برحق ہے۔ فطری قوانین مستحکم قوائد ہیں۔ اس بات کا کوئی امکان نہیں کہ کشش ثقل کل کام کرنا بند کر دے گی، چاہے لوگ اس پر یقین کرنا ختم ہی کر دیں۔ اس کے مقابلے میں ایک فرضی قاعدے کو ہمیشہ انہدام کا خطرہ رہتا ہے، کیوں کہ اس کا دار و مدار مفروضوں پر ہے اور ایک بار لوگ ان پر یقین کرنا بند کر دیں، تو مفروضے غائب ہو جاتے ہیں۔ کسی تصوراتی قاعدے کے دوام کے لیے مسلسل اور سخت محنت ضروری ہے، اس میں سے کچھ محنت تشدد اور دھمکانے پر بھی مبنی ہو سکتی ہے۔ افواج، پولیس، عدالتیں اور زنداں اس انتھک کام میں مصروف ہیں کہ لوگ ایک فرضی قاعدے پر عمل کریں۔ اگر قدیم بابل کا کوئی شخص اپنے پڑوسی کی آنکھ پھوڑ دیتا تو آنکھ کے بدلے آنکھ والے قانون پر عمل کے لیے تشدد تو ضرور ہوگا۔ جب ۱۸۶۰ء میں امریکی آبادی کی اکثریت نے یہ فیصلہ کیا کہ افریقی غلام بھی انسان ہیں، اور انہیں بھی آزادی کا حق حاصل ہے تو جنوبی ریاستوں سے یہ منوانے کے لیے خانہ جنگی کرنی پڑی۔

لیکن ایک فرضی قاعدہ صرف تشدد سے ہی قائم نہیں رہ سکتا۔ اس کے لیے کچھ سچے پیرو کار بھی ضروری ہیں۔ شہزادہ ٹیلی رانڈ (Talleyrand) جس نے اپنا گرگٹ جیسا سفر لوئیس سولہ کے ماتحت شروع کیا، پھر انقلابی اور نپولین جیسی حکومتوں کی خدمت کی، اور بروقت اپنی وفاداریاں تبدیل کر کے بحال ہوتی بادشاہت میں پھر کام کرنے لگا۔ اس نے کئی دہائیوں کے تجربے کو نچوڑ کر یوں بیان کیا تھا" آپ سنگینوں کی مدد سے بہت سے کام لے سکتے ہیں لیکن ان پر بیٹھنا بہت تکلیف دہ ہے۔ "اکلوتا راہب اکثر ایک سو سپاہیوں سے کم خرچ میں زیادہ موثر کام کرسکتا ہے۔ پھر یہ کہ سنگین خواہ کتنی ہی موثر کیوں نہ ہو، کسی نہ کسی کو اسے استعمال بھی کرنا ہوتا ہے۔ سپاہی، تھانے دار، منصف اور پولیس ایک ایسا فرضی قاعدہ کیوں برقرار رکھیں جس پر خود انہیں بھی ایمان نہ ہو۔ تمام انسانی حرکات میں تشدد سب سے زیادہ دشوار اجتماعی حرکت ہے۔ یہ کہنا کہ سماجی ربط فوجی قوت سے برقرار رہتا ہے فوراً یہ سوال اٹھاتا ہے کہ: فوجی قاعدہ کس چیز سے برقرار رہتا ہے؟ ایک پوری فوج کو زبردستی تو جمع نہیں کیا جاسکتا۔ کم از کم کچھ فوجیوں اور کمانداروں کو تو کسی چیز پر یقین کرنا پڑے گا، چاہے خدا پر، عزت، مادرِ ملت مردانگی یا دولت پر۔

ایک اور زیادہ دلچسپ سوال ان کے متعلق ہے جو سماجی مثلث کی نوک پر کھڑے ہیں۔ اگر وہ خود اس پر یقین نہیں رکھتے تو وہ کسی فرضی قاعدے کو کیوں لاگو کرنا چاہتے ہیں؟ عموماً یہی کہہ دیا جاتا ہے کہ وہ ایک کلبی لالچ کی بنا پر ایسا کرتے ہیں۔ لیکن تارک الذات جو کسی چیز پر یقین نہ رکھتا ہو اس کا لالچی ہونا بھی غیر ممکن ہے۔ ہوموسیپین کی حیاتیاتی وجودی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے تو کچھ زیادہ درکار نہیں۔ یہ ضروریات پوری کرنے کے بعد بقایا رقم اہرام مصر کی تعمیر، دنیا بھر کی سیاحت، چناؤ کی مہم میں سرمایہ کاری، اپنی پسندیدہ دہشت گرد تنظیم کو چندہ دینے یا حصص کے مارکیٹ میں لگا کر مزید رقم پیدا کرنے میں صرف کی جاسکتی ہے۔ یہ تمام ایسی کاروائیاں ہیں جنہیں ایک حقیقی تارک الذات مکمل طور پر بے معنی پائے گا۔ تارک الذات کی دنیا کا بانی یونانی فلسفی ڈایوجینیز (Diogenes) ایک ڈرم میں رہتا تھا۔ ایک بار جب سکندر اعظم ڈایوجینیز سے اس وقت ملنے آیا جب وہ دھوپ سینک رہا تھا، تو سکندر نے پوچھا کہ وہ اس کے لیے کیا کرسکتا ہے؟ تو ڈایوجینیز نے اس فاتح عالم کو جواب دیا: "ایک کام تو آپ میرے لیے ضرور کرسکتے ہیں، ذرا سا ایک طرف سمٹ جائیے، آپ دھوپ کا راستہ روک رہے ہیں"۔

یہی وجہ ہے کہ تارک الذات سلطنتیں کھڑی نہیں کرتے۔ اسی وجہ سے کوئی فرضی قاعدہ صرف اسی وقت برقرار رہ سکتا ہے جب آبادی کا بڑا حصہ، بالخصوص محافظ دستوں اور امرا کے بڑے حصے واقعی اس پر یقین رکھتے ہوں۔ اگر بڑی تعداد میں پادری اور بشپ یسوع مسیح پر یقین نہیں رکھتے تو عیسائیت دو ہزار سالوں تک برقرار نہیں رہ سکتی تھی۔ امریکی جمہوریت ڈھائی سو سال باقی نہیں رہتی اگر امریکی صدور اور کانگریس کے اراکین کی اکثریت انسانی حقوق پر یقین نہیں رکھتی۔ اگر سرمایہ کاروں اور بینکروں کی اکثریت سرمایہ دارانہ نظام پر یقین نہ کرے تو جدید اقتصادی نظام ایک دن بھی باقی نہ رہے۔

زنداں کی دیواریں

آپ لوگوں کو فرضی قاعدوں مثلاً عیسائیت، جمہوریت اور سرمایہ دارانہ نظام پر یقین کرنے پر آمادہ کرسکتے ہیں؟ سب سے پہلے تو آپ کبھی یہ تسلیم نہیں کرتے کہ یہ فرضی قاعدہ ہے۔ آپ ہمیشہ یہ اصرار کرتے ہیں کہ معاشرے

کو برقرار رکھنے والا قاعدہ عظیم خداؤں کی جانب سے ایک مقصدی سچائی ہے، یا یہ قوانین فطرت ہیں۔ لوگ اس لیے غیر یکساں نہیں کہ حمورابی نے ایسا کہا ہے ، بلکہ اس لیے کہ خداوند انلیل اور خداوند مرذوق نے انہیں ایسا بنایا۔ لوگ اس لیے برابر نہیں ہیں کہ تھامس جیفرسن نے ایسا کہہ دیا ہے بلکہ اس لیے کہ خدا نے انہیں برابر تخلیق کیا ہے۔ آزاد تجارت ہی بہترین اقتصادی نظام ہے، اس لیے نہیں کہ ایڈم اسمتھ نے ایسا کہا ہے بلکہ اس لیے کہ یہ نا قابل تنسیخ قانون فطرت ہے۔

پھر آپ لوگوں کی مکمل تربیت کرتے ہیں۔ ان کی پیدائش کے بعد سے آپ انہیں اس فرضی قاعدے کے اصول یاد کراتے رہتے ہیں، جو کسی بھی چیز اور ہر چیز میں شامل ہیں۔ وہ نا قابل یقین کہانیوں، ڈراموں، تصویروں، گیتوں، آداب، سیاسی تشہیر، تعمیر، کھانا پکانے کی ترکیبوں اور فیشن کا حصہ ہیں۔ مثلاً آج لوگ برابری پر یقین رکھتے ہیں تو یہ فیشن ہے کہ امرا کے بچے جینز زیب تن کریں جو اصلاً محنت کش طبقے کا لباس تھا۔ قرون وسطیٰ کے لوگ طبقاتی تفریق میں یقین رکھتے تھے تو کوئی ممتاز نوجوان کسی کسان کا جھبا نہیں پہن سکتا تھا۔ اس زمانے میں جناب یا محترمہ کسی ممتاز فرد کو مخاطب کرنے کے لیے مخصوص تھا اور اکثر اس حق کی قیمت خون سے چکائی جاتی۔ آج مخاطب کی حیثیت سے مبرا تمام شائستہ خط وکتابت جناب یا محترمہ سے شروع ہوتی ہے۔

عمرانیات اور سماجیات اپنی بیشتر توانائی یہ سمجھانے میں خرچ کرتے ہیں کہ کیسے یہ فرضی قاعدے زندگی کی رلی میں سلے ہوتے ہیں۔ اس مختصر سی جگہ میں ہم اس کا محض عمومی جائزہ ہی لے سکتے ہیں۔ تین اہم نکات لوگوں کو یہ تسلیم کرنے سے روکتے ہیں کہ ان کی زندگیوں کو مرتب کرنے والے یہ قواعد محض تصوراتی ہیں:

(ا) یہ فرضی قاعدہ مادی دنیا میں پیوست ہے: گرچہ یہ فرضی قاعدہ ہمارے ذہنوں کی ہی پیداوار ہے، لیکن یہ ہمارے اطراف کی مادی دنیا میں پتھر پہ کھنچی لکیر کی مانند ثبت ہوسکتا ہے۔ آج زیادہ تر مغربی باشندے انفرادیت پر یقین رکھتے ہیں۔ وہ یقین رکھتے ہیں کہ انسان ایک منفرد شخص ہے۔ اس کی قدر و قیمت کا انحصار اس بات پر نہیں کہ اس کے معاصر اس کے بارے میں کیا سوچتے ہیں۔ ہم میں سے ہر ایک اپنے اندر روشنی کی ایک کرن رکھتا ہے جو ہماری زندگی کو حیثیت و معنی دیتی ہے۔ جدید مغربی مدارس میں والدین اور اساتذہ بچوں کو یہی سبق دیتے ہیں کہ اگر ان کے ہم جماعت ان کا مذاق اڑائیں تو انہیں نظر انداز کر دیں۔ دوسرے نہیں، بلکہ صرف وہ خود ہی اپنی اصل قدر و قیمت سے واقف ہیں۔

جدید تعمیر میں یہ مفروضہ تصور سے نکل کر پتھر و گارے میں نظر آتا ہے۔ ایک مثالی جدید گھر کئی چھوٹے کمروں پر مشتمل ہوتا ہے تا کہ دوسروں کی نگاہوں سے اوجھل، بکمل آزادی کے لیے، ہر بچہ اپنی ذاتی جگہ حاصل کر سکے۔ اس ذاتی کمرے میں ایک دروازہ ہوتا ہے۔ اور اکثر گھرانوں میں یہ قابل قبول ہوتا ہے کہ بچہ اس دروازے کو بند رکھے، یا مقفل بھی کر لے۔ والدین تک کو یہ ممانعت ہوسکتی ہے کہ وہ بنا دستک دیے یا اجازت مانگے اندر داخل ہوسکیں۔ کمرے کی آرائش بچے کی مرضی سے ہوتی ہے۔ دیواروں پر مقبول فنکاروں کی تصاویر اور فرش پر گندے موزے۔ ایسے ماحول میں پرورش پانے والا اپنے آپ کو ایک منفرد شخص تصور کیے بغیر نہیں رہ سکتا، اور اس کی اصل قدر اس کے اندرون پر منحصر ہے اس کے خارجی عوامل پر نہیں۔

قدیم ممتاز افراد اس انفرادیت پر یقین نہیں رکھتے تھے۔ کسی کی قدر معاشرے میں اس کے مقام سے

متعین ہوتی تھی، اور اس بات سے کہ دوسرے اس کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں؟ مذاق اڑایا جانا ایک ہولناک بے عزتی تھی۔ ممتاز افراد اپنے بچوں کو اپنے نام کی ہر قیمت پر حفاظت کی تاکید کرتے تھے۔ جدید انفرادیت کی مانند، قدیم نظام قدر بھی تصورات سے نکل کر قدیم قلعوں کی اینٹ اور گارے میں اتر آیا تھا۔ ان قلعوں میں بچوں کے لیے (بلکہ اکثر کسی کے لیے بھی) انفرادی کمرے نہیں ہوتے تھے۔ ایک قدیم سردار کے نوعمر لڑکے کا قلعے کی دوسری منزل پر کوئی ذاتی کمرہ نہیں ہوتا تھا جس میں رچرڈ شیردل اور شاہ آرتھر کی تصاویر دیواروں پر آویزاں ہوں، اور ایک دروازہ جسے اس کے والدین کو بھی کھولنے کی ممانعت ہو۔ وہ ایک بڑے ہال میں دوسرے نوعمر بچوں کے ساتھ سوتا تھا۔ وہ ہمیشہ نظروں کے سامنے رہتا اور اسے یہ خیال رکھنا پڑتا تھا کہ دوسرے کیا دیکھ اور کہہ رہے ہوں گے۔ ایسے ماحول میں پلنے والا فرد لامحالہ یہی سمجھے گا کہ کسی فرد کی قدر معاشرے میں اس کے مقام سے متعین ہوتی ہے، اور اس بات سے کہ دوسرے اس کے بارے میں کیا سوچتے ہیں۔

(۲) تصوراتی قاعدہ ہماری خواہشات متعین کرتا ہے۔: زیادہ تر افراد یہ بات تسلیم نہیں کرنا چاہتے کہ ان کی زندگی متعین کرنے والا قاعدہ فرضی ہے۔ بلکہ حقیقت میں تو ہر شخص ایک پہلے سے موجود فرضی قاعدے میں ہی پیدا ہوا، اور پیدائش کے وقت سے ہی اس کی خواہشات سب سے برتر مفروضے سے متعین ہوتی ہیں۔ تو ہماری ذاتی تمنائیں اس فرضی قاعدے کا سب سے اہم دفاع بن جاتی ہیں۔

مثلاً موجودہ مغربیوں کی سب سے عزیز تمناؤں کا تعین رومان، قوم پرستی، سرمایہ داری اور انسانیت کے مفروضوں سے ہوتا ہے جو صدیوں سے موجود ہیں۔ دوست اکثر یہ مشورہ دیتے ہیں کہ 'اپنے دل سے پوچھو'۔ لیکن یہ دل تو ایک دہرا جاسوس ہے جو اکثر اپنے احکامات اس زمانے کے اہم مفروضوں سے لیتا ہے۔ یہ دل سے پوچھو کا مشورہ دراصل ہمارے ذہنوں میں انیسویں صدی کے رومانوی مفروضوں اور بیسویں صدی کے مصارفانہ مفروضوں کا جوڑ توڑ ہے۔ مثلاً کوکا کولا کمپنی ساری دنیا میں اپنی صنعت کو یوں مشتہر کرتی ہے: ڈائٹ کوک، وہ کرو جو اچھا لگے۔

اکثر لوگ جسے اپنی بہت ذاتی تمنا سمجھتے ہیں وہ بھی ان کے فرضی قواعد سے متعین ہوتی ہے۔ مثلاً اس عام خواہش کی مثال لیجیے کہ بیرونی ممالک کی سیر کی جائے۔ اس میں کوئی بات بھی فطری یا ضروری نہیں ہے۔ ایک الفا نر بن مانس کبھی یہ نہیں سوچے گا کہ اپنی طاقت استعمال کر کے ہمسائے بن مانسوں کے علاقے میں تعطیل منانے چلا جائے۔ قدیم مصر کے ممتاز افراد نے اپنی ساری دولت اہرام تعمیر کرنے اور اپنی لاشوں کو حنوط کرانے میں صرف کی۔ لیکن ان میں سے کسی نے بھی خریداری کے لیے بابل یا اسکیئنگ (skiing) کے لیے فونیشیا (Phoenicia) جانے کا ارادہ نہیں کیا۔ آج لوگ بیرون ملک سیاحت پر بہت خرچ کرتے ہیں کیوں کہ وہ رومانوی اسراف کے مفروضے کے قائل ہیں۔

رومانوی فکر ہمیں یہ بتاتی ہے کہ انسانی اہلیت کے بھرپور استعمال کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم جتنے زیادہ متنوع تجربات سے گزر سکیں بہتر ہے۔ ہمیں متنوع جذبات کا سامنا کرنا چاہیے؛ ہمیں مختلف تعلقات کا تجربہ ہونا چاہیے؛ ہمیں کام و دہن کی مختلف لذتوں سے آشنا ہونا چاہیے؛ ہمیں یہ سیکھنا چاہیے کہ مختلف اقسام کی موسیقی سے کیسے لطف اندوز ہو سکیں۔ یہ سب سیکھنے کا سب سے بہترین طریقہ تو یہ ہے کہ ہم اپنے روزمرہ کے معمولات کو ترک کریں،

اپنے مانوس ماحول سے باہر نکلیں، اور دور دراز کے علاقوں کی سیر کو جائیں، جہاں ہم مختلف معاشرت، ذائقہ، شامہ اور دوسرے افراد کے معمولات کا جائزہ لے سکیں۔ ہم بارہا یہ رومانوی مفروضہ سنتے ہیں کہ کیسے 'ایک نئے تجربے نے میری آنکھیں کھول دیں اور میری زندگی بدل دی۔'

صارفیت ہمیں یہ سبق دیتی ہے کہ خوش رہنے کے لیے ہم جتنی زیادہ مصنوعات اور سہولیات کو استعمال کر سکیں اتنا ہی بہتر ہے۔ اگر ہم کسی چیز کی کمی محسوس کریں، یا اس میں کسی خرابی کا اندیشہ ہو تو ہمیں شاید کسی صنعت کی خریداری کی ضرورت ہوگی (ایک کار، نئے کپڑے، خاص غذا) یا کوئی سہولت (گھریلو ملازم، نفسیاتی علاج، یوگا کے سبق)۔ ٹی وی کا اشتہار ایک جھوٹی کہانی ہے کہ کیسے زیادہ مصنوعات یا سہولیات کے استعمال سے زندگی زیادہ بہتر ہو سکتی ہے۔ رومانویت جو تنوع پر زور دیتی ہے، صارفیت سے خوب میل کھاتی ہے۔ ان کے گٹھ جوڑ نے ایک کبھی نہ ختم ہونے والی "تجربات کی مارکیٹ" کو جنم دیا ہے، جس کی بنیادوں پر جدید سیاحت کی عمارت کھڑی ہے۔ سیاحت کی صنعت پرواز کے ٹکٹ یا ہوٹل کے کمرے فروخت نہیں کرتی، یہ تجربات فروخت کرتی ہے۔ پیرس کوئی شہر نہیں، نہ ہی انڈیا کوئی ملک۔۔۔ یہ دونوں تجربات ہیں، جن کا تصرف ہمیں امید دلاتا ہے کہ ہمارے افق کو وسیع تر کریں گے، ہماری انسانی اہلیت کو کامل کریں گے اور ہمیں مزید مسرت بخشیں گے۔ لہٰذا جب کسی لکھ پتی کے اپنی بیوی سے تعلقات اتار چڑھاؤ کا شکار ہوں تو وہ اسے پیرس کے مہنگے دورے پر لے جاتا ہے۔ یہ دورہ کسی انفرادی امنگ کا عکس نہیں بلکہ رومانوی صارفیت کے مفروضے پر مکمل یقین ہے۔ قدیم مصر کا کوئی متمول شخص خانگی تعلقات میں بحران کو حل کرنے کے لیے اپنی منکوحہ کو تعطیلات پر بابل لے جانے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ بلکہ وہ شاید اس کے لیے وہ شاندار مقبرہ تعمیر کروا دیتا جس کی اسے ہمیشہ سے خواہش تھی۔

غزہ کا عظیم اہرم۔ قدیم مصر کے امرا اپنی دولت اس قسم کی چیزوں پر خرچ کرتے تھے

قدیم مصر کے ممتاز افراد کی مانند زیادہ تر معاشروں میں بیشتر لوگ اپنی زندگیاں اہرام کی تعمیر میں خرچ کر دیتے۔ ایک معاشرے سے دوسرے میں صرف اہرام کا نام، ہیئت اور حجم بدل جاتا۔ مثلاً یہ کسی مضافاتی بنگلے، ایک سوئمنگ پول یا ہرے بھرے باغ کی صورت اختیار کر سکتے ہیں، یا ایک شاندار بالائی کمرہ (Pent house) جہاں سے بہت خوبصورت منظر دکھائی دے رہا ہو۔ اس مفروضے پر چند ہی سوال اٹھاتے ہیں جس کی وجہ سے اہرام

کی خواہش پیدا ہوئی۔

(۳) فرضی قاعدہ بین الافرادی ہے: اگر کسی ماورائے انسان کوشش سے میں اپنی ذاتی خواہشات کو فرضی قواعد کے شکنجے سے آزاد کرا بھی لوں، تب بھی میں محض فرد واحد ہوں۔ کیوں کہ فرضی قاعدہ انفرادی طور پر صرف میرے تصور میں ہی موجود نہیں، لہذا کسی فرضی قاعدے کو بدلنے کے لیے لاکھوں افراد کو اپنے ساتھ تعاون پر آمادہ کرنا ہوگا۔ فرضی قواعد بین الافرادی ہیں، ہزاروں، لاکھوں افراد کے مشترکہ تصور میں موجود۔ اس بات کو سمجھنے کے لیے ہمیں معروضی، انفرادی اور بین الانفرادی کے درمیان فرق کو سمجھنا ہوگا۔

کوئی معروضی مظہر انسانی شعور اور انسانی یقین سے ماورا ہوتا ہے۔ مثلاً تابکاری شعاع مفروضہ نہیں ہے۔ تابکاری شعائیں لوگوں کی دریافت سے پہلے بھی موجود تھیں۔ جب لوگ ان پر یقین نہ کریں وہ تب بھی خطرناک ہیں۔ تابکاری دریافت کرنے والوں میں سے ایک میری کیوری، تابکار مادے کے ساتھ سالوں کام کرنے کے دوران اس بات سے واقف نہیں تھی کہ وہ اس کے لیے ضرر رساں ہے۔ گو اسے یہ یقین نہیں تھا کہ تابکاری اسے ہلاک کردے گی پھر بھی وہ اپلاسٹک انیمیا (Aplastin anemia) سے ہلاک ہوئی، ایک بیماری جو تابکار مادے کا مسلسل سامنا کرنے سے پیدا ہوتی ہے۔

ایک انفرادی مظہر کسی فرد واحد کے شعور اور یقین پر مبنی ہے۔ اگر وہ مخصوص شخص اپنا یقین بدل لے تو یہ مظہر بدل سکتا ہے یا غائب ہوسکتا ہے۔ بہت سے بچے ایک خیالی دوست کے وجود پر یقین رکھتے ہیں جو باقی دنیا کو دکھائی نہ سنائی دیتا ہے۔ یہ خیالی دوست صرف اس بچے کے انفرادی شعور میں بستا ہے۔ جب وہ بچہ بڑا ہوکر اس پر یقین کرنا ختم کردیتا ہے تو وہ خیالی دوست بھی غائب ہوجاتا ہے۔

بین الافرادی ایسا مظہر ہے جو بہت سے افراد کے انفرادی شعور کے مابین روابط میں بستا ہے۔ اگر ایک فرد واحد اپنا یقین بدل لے، یا وہ ہلاک بھی ہوجائے تب بھی اس سے زیادہ فرق نہیں پڑتا۔ لیکن اگر بیشتر افراد اپنا یقین بدل لیں یا ہلاک ہوجائیں، تو بین الافرادی مظہر بدل جائے گا یا غائب ہوجائے گا۔ یہ بین الافرادی مظاہر نہ تو بداندیشی پر مبنی فریب ہیں اور نہ غیر اہم ڈرامہ۔ یہ طبعی مظاہر (جیسے تابکاری) سے مختلف ہوتے ہیں، لیکن پھر دنیا پر ان کا اثر بہت گہرا ہوسکتا ہے۔ تاریخ کے اہم ترین مظاہر بین الافرادی ہیں: قوانین، دولت، خداوند، قومیں۔

مثلاً پیوجو اپنے افسر اعلیٰ کی خیالی دوست نہیں ہے۔ یہ کمپنی لاکھوں افراد کے مشترکہ تصور میں زندہ ہے۔ افسر اعلیٰ اس کمپنی کے وجود پر اس لیے یقین رکھتا ہے کیوں کہ ڈائرکٹرز کا بورڈ بھی اس پر یقین رکھتا ہے، کمپنی کے وکلا بھی، قریبی دفتر کے نائبین بھی، بینک کے ملازم بھی، اسٹاک ایکسچینج میں حصص کے دلال اور فرانس سے آسٹریلیا تک کے کارفروش بھی۔ اگر وہ افسر اعلیٰ اچانک پیوجو کے وجود پر یقین کرنا بند کردے، تو وہ قریبی ذہنی امراض کے ہسپتال میں نظر آئے گا، اور اس کی جگہ اس دفتر میں کوئی اور آ جائے گا۔ اسی طرح ڈالر، انسانی حقوق اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ اربوں لوگوں کے مشترکہ تصور میں رہتے ہیں، اور کوئی فرد واحد ان کے وجود کے لیے خطرہ نہیں بن سکتا۔ اگر میں تنہا ڈالر، انسانی حقوق یا ریاست ہائے امریکہ کے وجود پر یقین کرنا بند کردوں تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ یہ فرضی قاعدے بین الافرادی ہیں تو انہیں تبدیل کرنے کے لیے ہمیں ایک ساتھ اربوں افراد کی سوچ بدلنی ہوگی جو آسان نہیں ہوگی۔ اتنی بڑی تبدیلی کے لیے ایک پیچیدہ تنظیم کی ضرورت ہوگی مثلاً ایک سیاسی جماعت،

ایک نظریاتی تحریک یا ایک مذہبی مسلک۔ لیکن ایسی پیچیدہ تنظیم کے قیام کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم بہت سے لوگوں کو ایک دوسرے سے تعاون پر آمادہ کریں اور یہ اسی وقت ممکن ہے کہ جب یہ اجنبی کسی مشترکہ مفروضے پر یقین رکھتے ہوں۔ تو معلوم ہوا کہ کسی موجودہ فرضی قاعدے کو بدلنے کے لیے پہلے ہمیں کسی متبادل فرضی قاعدے پر یقین کرنا پڑے گا۔

مثلاً پیو جو کو منہدم کرنے کے لیے ہمیں کوئی زیادہ طاقتور چیز تصور کرنی ہوگی جیسے فرانسیسی نظام قانون۔ اور فرانسیسی نظام قانون کے انہدام کے لیے کسی اس سے بھی زیادہ طاقتور مفروضے پر یقین کرنا ہوگا مثلاً مملکت فرانس، اور اگر ہم اسے بھی منہدم کرنا چاہیں تو ہمیں اور بھی زیادہ کسی طاقتور چیز پر یقین کرنا پڑے گا۔

فرضی قاعدے سے فرار ممکن نہیں۔ جب ہم اپنے زنداں کی دیواریں گرا کر آزادی کی جانب فرار ہوتے ہیں تو ایک اور بھی بڑے زنداں کے میدان مشقت میں داخل ہو جاتے ہیں۔

یادوں کی بھرمار

ارتقا نے انسانوں میں یہ صلاحیت پیدا نہیں کی کہ وہ باسکٹ بال سیکھ سکیں۔ یہ صحیح ہے کہ اس میں دوڑنے کے لیے پاؤں بن گئے، ٹپہ کھلانے کے لیے ہاتھ اور دھکہ دینے کے لیے شانے، لیکن اس سے صرف یہ اہمیت پیدا ہوتی ہے کہ ہم خود گیند کو باسکٹ میں ڈال سکیں۔ لیکن کسی دوپہر اسکول کے پچھواڑے میں اجنبیوں کے ساتھ کھیلنے کے لیے ہمیں نہ صرف چار دوسرے اجنبیوں کے ساتھ روانی پیدا کرنی ہوگی جن سے ہم کبھی شناسا نہیں تھے، ہمیں یہ بھی جاننا ہوگا کہ مدمقابل پانچ کھلاڑی بھی ان ہی اصولوں کے تحت کھیل رہے ہیں۔ دوسرے جانور محض حسیات کی بنا پر اجنبی جانوروں کے ساتھ مل کر کے عادتاً حملہ آور ہوتے ہیں۔ مثلاً دنیا بھر کے کتے کے پلوں کی جین میں یہ رقم ہے کہ وہ آپس میں دھینگا مشتی کریں۔ لیکن امریکی نوعمروں کی جین میں تو باسکٹ بال کھیلنے کی کوئی جین نہیں ہے۔ پھر بھی مکمل اجنبیوں کے ساتھ وہ یہ کھیل سکتے ہیں، کیوں کہ ان سب نے باسکٹ بال کے متعلق ایک جیسا خیال اپنا لیا ہے۔ یہ خیالات مکمل طور پر فرضی ہیں، لیکن اگر سب اس میں اشتراک کریں تو ہم سب کھیل سکتے ہیں۔

یہی اصول ایک بڑے پیمانے پر مملکتوں، گرجاؤں اور تجارتی سلسلوں میں ایک اہم فرق کے ساتھ لاگو ہے۔ باسکٹ بال کے اصول نسبتاً سادہ اور دوٹوک ہیں، بالکل جیسے کسی متلاشی گروہ یا چھوٹے دیہات میں تعاون کے لیے ضروری اصول۔ ہر کھلاڑی انہیں اپنے دماغ میں بٹھا سکتا ہے، لیکن پھر بھی گیت، تصاویر اور فہرست خریداری کے لیے جگہ باقی رہ جاتی ہے۔ لیکن بڑے پیمانے پر تعاون جس میں ہزاروں بلکہ لاکھوں انسان شریک ہوں، اس میں بہت زیادہ معلومات کو ذخیرہ کرنے اور استعمال کرنے کی ضرورت ہوگی، کسی ایک انسانی ذہن کی گنجائش سے بہت زیادہ۔

دوسری اسپیسی کے بڑے معاشرے مثلاً چیونٹیاں اور مکھیاں اس لیے ثبات اور استحکام رکھتے ہیں کہ انہیں برقرار رکھنے کی زیادہ تر معلومات ان کی جین میں تحریر ہوتی ہے۔ مثلاً ایک مادہ شہد کی مکھی کا لاروا اپنی غذائی فراہمی کی بنیاد پر کارکن یا ملکہ مکھی بن سکتی ہے۔ زندگی میں اسے کردار ادا کرنا ہے، اس کا ڈی این اے وہ مرتب کر دیتا ہے۔ چھتے بہت پیچیدہ سماجی مرکز ہو سکتے ہیں جن میں مختلف اقسام کے کارکن ہوں، مثلاً جمع کرنے والے، نرسیں اور صفائی پر معمور مہتر مکھیاں۔ لیکن ابھی تک محققین کسی قانون دان مکھی کی دریافت میں ناکام رہے ہیں۔ مکھیوں میں وکلا کی ضرورت نہیں ہوتی، کیوں کہ اس بات کا کوئی خطرہ نہیں کہ وہ چھتے کے آئین کو بھول جائیں یا اسے توڑ دیں۔ ملکہ مکھی کبھی صفائی پر معمور مکھیوں کی غذا پر شب خون نہیں مارتی، اور وہ بھی کبھی تنخواہ میں اضافے کے لیے ہڑتال نہیں کرتیں۔

لیکن انسان ہر وقت یہ سب کرتے ہیں۔ کیوں کہ انسانوں کا سماجی نظام فرضی ہے تو انسان انتہائی ضروری معلومات ذخیرہ نہیں کر سکتا کہ جسے ان کا ڈی این اے نقول تیار کر کے اپنے بچوں میں تقسیم کر دے۔ قوانین، رواج، طریقے اور آداب برقرار رکھنے کی شعوری کوشش کرنی پڑے گی ورنہ سارا سماجی قاعدہ جلد ہی منہدم ہو جائے گا۔ مثلاً بادشاہ حمورابی نے حکم دیا تھا کہ افراد کو ممتاز، عام اور غلام طبقوں میں تقسیم کیا جائے۔ شہد کی مکھیوں کے اراکین کے طبقوں کے مقابلے میں یہ ایک فطری تقسیم نہیں ہے۔ انسانی جینوم میں اس کا کوئی نشان نہیں ملتا۔ اگر بابل کے باشندے اس "سچائی" پر یقین نہیں رکھتے تو ان کا معاشرہ فعال نہیں رہتا۔ اسی طرح جب حمورابی نے اپنا ڈی این اے اپنی اولاد کو منتقل کیا تو اس میں یہ فیصلہ درج نہیں تھا کہ جب کوئی ممتاز فرد کسی عام عورت کو قتل کرے تو اس پر لازم ہے کہ چاندی کے تیس سکے ادا کرے۔ حمورابی کو جان بوجھ کر اپنی اولاد کو مملکت کے طریقے سکھانے پڑے تھے، اور پھر اس کی اولادوں اور ان کی اولادوں کو بھی یہی کرنا پڑا تھا۔

سلطنتیں بڑی تعداد میں کوائف پیدا کرتی ہیں۔ قوانین کے علاوہ سلطنتوں کو رقوم کی منتقلی کا حساب رکھنا ہوتا ہے، مالیہ فوجی سامان کی فہرست، تجارتی جہاز، تہواروں کا کیلنڈر اور فتوحات بھی۔ لاکھوں سالوں تک انسان یہ کوائف ایک اکلوتی جگہ ذخیرہ کرتے رہے، اپنے دماغ میں۔ بدقسمتی سے انسانی دماغ تین اہم وجوہات کی بنا پر سلطنت کی ساری معلومات ذخیرہ کرنے کے لیے کافی بڑا نہیں:

اول تو یہ کہ جگہ کم ہے۔ یہ سچ ہے کہ کچھ لوگوں کی یادداشت حیرت انگیز ہوتی ہے، زمانہ قدیم میں یادداشت کے ماہرین ہوتے تھے جو اپنے ذہنوں میں پورے صوبے کا نقشہ ریاست کے تمام قوانین کے ساتھ رکھ لیتے تھے۔ پھر بھی یادداشت کے ایک ماہر کے لیے بھی ایک حد مقرر ہے کہ جس سے زیادہ وہ ذخیرہ نہیں کر سکتا۔ ممکن ہے کہ ایک وکیل ریاست میساچوسٹس کا سارا قانونی کوڈ جانتا ہو لیکن سالم (Salem) میں چڑیلوں کے مقدمات کے بعد سے ہونے والے ہر مقدمے کی تفصیل تو نہیں یاد رکھ سکتا۔

دوسرے یہ کہ انسان فانی ہیں اور ان کے ساتھ ان کے دماغ بھی فنا ہو جاتے ہیں۔ کوئی بھی معلومات جو صرف ذہنوں میں ذخیرہ ہو، ایک صدی سے بھی کم مدت میں ختم ہو جائے گی۔ یہ یقیناً ممکن ہے کہ یادداشت ایک ذہن سے دوسرے میں منتقل کی جاسکے، لیکن چند منتقلیوں کے بعد یہ معلومات غلط یا ختم ہو جائے گی۔

تیسری اور سب سے اہم وجہ یہ ہے کہ انسانی ذہن کو خاص قسم کی معلومات سے استفادے اور ذخیرے کی اہلیت ہے۔ قدیم/شکاری متلاشی کو بقائے حیات کے لیے ہزاروں اقسام کے حیوانات و نباتات کی صورت، صفات اور رویے یاد رکھنے کی ضرورت تھی۔ انہیں یہ یاد رکھنا تھا کہ ایک جھریوں بھرا پیلا مشروم جو بہار میں ایلم (Elm) کے درخت کے نیچے اگتا ہے وہ زہریلا ہوتا ہے۔ جب کہ اس سے ملتا جلتا مشروم جو سردیوں میں بلوط کے نیچے پیدا ہوتا ہے وہ پیٹ کے درد میں مفید ہے۔ شکاری/متلاشی کو کوئی درجن اراکین گروہ کی رائے اور تعلقات کو بھی ذہن میں رکھنے کی ضرورت تھی۔ اگر لوسی کو گروہ کے کسی رکن کی مدد درکار تھی جو جان سے کہہ سکے کہ اسے ہراساں کرنا چھوڑ دے تو اسے یہ یاد رکھنا ضروری تھا کہ جان گزشتہ ہفتے میری سے علیحدہ ہوا تھا، یوں میری اس سلسلے میں بہت رضامند اور پرجوش حامی ہوگی۔ لہٰذا ارتقائی دباؤ نے انسانی ذہن کو بڑی تعداد میں نباتاتی، حیواناتی، جغرافیائی اور سماجی معلومات اکٹھی کرنے کے لیے موزوں کر دیا تھا۔

لیکن جب زرعی انقلاب کے دامن میں بہت پیچیدہ معاشرے نمودار ہونے لگے، تو ایک بالکل نئی قسم کی معلومات اہم ہوگئی، یعنی عددی۔ متلاشیوں کو کبھی بھی بڑی تعداد میں ریاضی کے اعداد وشمار یاد رکھنے کی ضرورت نہیں پڑی تھی، مثلاً کسی متلاشی کو بھی جنگل میں ہر درخت پر پھلوں کی کل تعداد یاد رکھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ لہذا انسانی دماغ اعداد کو سمجھنے اور ذخیرہ کرنے کے لیے تیار نہیں ہوا تھا۔ پھر بھی ایک بڑی سلطنت چلانے کے لیے ریاضی اعداد ضروری تھے، صرف قانون سازی اور نگہبان خداؤں کی کہانیاں کافی نہیں تھیں۔ انہیں مالیہ اکٹھا کرنا بھی لازم تھا۔ لاکھوں لوگوں پر مالیہ لاگو کرنے کے لیے یہ لازم تھا کہ ان کی آمدنی اور ملکیت علوم ہو، ادائیگی کے اعداد رکھے جائیں، بقایا جات، قرضوں اور جرمانوں کے اعداد وشمار، رعایتوں اور معافیوں کا حساب ہو۔ یہ سب مل کر کروڑوں عددی نقطے بن گئے جنہیں سمجھنا اور ذخیرہ کرنا تھا۔ اس کے بغیر ریاست کو کبھی یہ معلوم نہ ہوتا کہ اس کے پاس کیا دسائل ہیں، اور کن وسائل سے ابھی وصولی کی جاسکتی ہے۔ جب انسانی دماغ کو یہ سب اعداد یاد رکھنے، سمجھنے اور دہرانے کی ذمہ داری دی گئی تو اسے بدہضمی ہوگئی یا وہ سو گیا۔

اس ذہنی تنگی نے انسانی معاشروں کے حجم اور پیچیدگی کو محدود کر دیا۔ جب کسی معاشرے میں آبادی اور جائیداد کی تعداد ایک خاص حد سے بڑھ جاتی تو یہ ضروری ہو جاتا کہ بڑی تعداد میں ریاضی اعداد وشمار کو سمجھا اور ذخیرہ کیا جائے۔ کیوں کہ انسانی ذہن ایسا کرنے سے عاجز تھ تو یہ نظام منہدم ہوگیا۔ زرعی انقلاب کے ہزاروں سال بعد بھی سماجی نظام سادہ اور مختصر رہا۔

اس مسئلے پر سب سے پہلے جنوبی میسوپوٹیما کے قدیم سمیریوں (Sumerian) نے قابو پایا۔ وہاں زرخیز زمین پر تیز دھوپ نے اعلی فصل اور متموں قصبے پیدا کیے۔ جیسے آبادی کی تعداد بڑھی تو ساتھ ہی ان کے معاملات سلجھانے کی ضرورت بھی۔ سن ۳۰۰۰ سے ۳۵۰۰ ق م میں کچھ ذہین سمیریوں نے معلومات کو اپنے دماغ سے باہر ذخیرہ کرنے کا طریقہ ایجاد کیا۔ یہ طریقہ بالخصوص ریاضی اعداد کو بڑی تعداد میں ذخیرہ کرنے کے لیے موزوں تھا۔ یوں سمیریوں نے اپنے سماجی نظام کو انسانی ذہن کی حدود سے آزاد کر کے شہروں، مملکتوں اور سلطنتوں کے قیام کی راہ ہموار کر دی۔ سمیریوں کے اس اعداد وشمار کے سمجھنے اور ذخیرہ کرنے کے طریقے کو 'لکھائی' کا نام دیا گیا۔

کشم (Kushim) نے دستخط کیے

لکھائی مادی علامات کے ذریعے معلومات ذخیرہ کرنے کا ایک طریقہ ہے۔ سمیریوں کی لکھائی کا طریقہ دو طرح کی علامات پر مبنی تھا، جسے مٹی کی تختیوں پر نقش کیا جاتا۔۔ ایک قسم کے نشان اعداد کو ظاہر کرتے۔ عدد ایک، دس، ساٹھ، چھ سو، چھتیس سو اور چھتیس ہزار کے لیے نشانات مخصوص تھے۔ (سمیری ہندسہ چھ اور ضرب دس کے عددی نظام کو استعمال کرتے۔ اس عدد چھ پر مبنی نظام نے ہمارے لیے بہت اہم میراث چھوڑی، مثلاً دن کو چوبیس گھنٹوں میں تقسیم کرنا یا دائرے کو تین سو ساٹھ ڈگری میں)۔ علامتوں کی دوسری قسم سے افراد، حیوانات، اجناس، علاقے، تواریخ وغیرہ کو ظاہر کیا جاتا۔ ان دو اقسام کی علامات کے استعمال سے سمیری انسانی دماغ یا ڈی این اے زنجیر کے مقابلے میں بہت زیادہ تعداد ذخیرہ کرنے میں کامیاب رہے۔
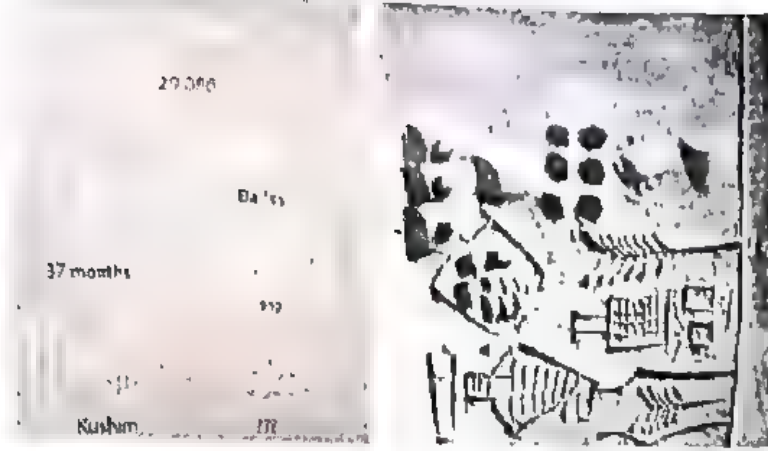
۳۰۰۰ سے ۳۴۰۰ سال قبل مسیح کی، شہر اُراک سے ایک مٹی کی انتظامی تختی اپنی تحریر کے ساتھ۔ ممکن ہے کہ کُشم کسی سرکاری عہدیدار کا نام ہو یا کسی مخصوص شخص کا نام۔ اگر کُشم واقعی کوئی شخص تھا تو وہ غالباً تاریخ کا پہلا انسان ہے جس کے نام سے ہم واقف ہیں! انسانی تاریخ کے سارے پرانے نام نینڈرتھال، نتوفین، شاوے کا غار، گوبیکلی ٹے پی، یہ سب ہم نے بعد میں رکھے ہیں۔ ہمیں نہیں معلوم کہ گوبیکلی ٹے پی کے معمار اسے کس نام سے پکارتے تھے۔ لکھائی شروع ہونے کے بعد سے ہم تاریخ کی آواز اس کے کرداروں کے کانوں سے سن رہے ہیں۔ جب کُشم کے ہمسائے اسے مخاطب کرتے ہوں گے تو وہ شاید اسے 'کُشم' کہہ کر ہی پکارتے ہوں گے۔ یہ بات قابل غور ہے کہ تاریخ کا پہلا لکھا نام کسی اکاؤنٹنٹ کا ہے، کسی پیغمبر، شاعر یا عظیم فاتح کا نہیں۔

اس ابتدائی دور میں لکھائی صرف حقائق اور اعداد تک ہی محدود تھی۔ کوئی عظیم سمیری ناول اگر لکھا بھی گیا تو وہ مٹی کی تختی پر موجود نہیں۔ لکھنے میں بہت وقت صرف ہوتا تھا اور پڑھنے والوں کی تعداد بہت قلیل تھی۔ لہذا کسی نے بھی اسے محض حساب رکھنے کے علاوہ کسی چیز کے لیے استعمال کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ اگر ہم پانچ ہزار سال پہلے اپنے آبا سے ملنے والے اولین حرفِ دانائی کو دیکھیں تو ہمیں بہت مایوسی ہوگی۔ مثلاً اولین تحریر حکمت جو ہمارے آبا نے چھوڑی ہے کچھ یوں ہے: "۲۹۰۸۶ تول کا جو، ۳۷ مہینے، کُشم"۔ اس جملے کا غالب مفہوم یہ ہے کہ سینتیس ماہ کے عرصے میں کل انتیس ہزار چھیاسی ناپ جو موصول ہوا، دستخط کُشم۔

افسوس کہ تاریخ کی اولین تحریر میں کوئی فلسفیانہ نکتہ، کوئی شاعری، داستان، قوانین یا شاہی فتوحات تک کا تذکرہ نہیں ہے۔ یہ تو بے لطف اقتصادی دستاویزات ہیں، جن میں مالیے کی ادائیگی، قرض کی وصولی اور جائیداد کی ملکیت کا اندراج ہے۔

اس قدیم دور سے صرف ایک اور تحریر ملی ہے۔ اور یہ اس سے بھی کم دلچسپ ہے۔ الفاظ کی فہرست جو کسی نوآموز لکھنے والے نے مشق کے طور پر بار بار دہرائے ہیں۔ اگر کوئی بوریت کا شکار طالب علم، فروخت کی رسید کے بجائے اپنی شاعری لکھنا بھی چاہتا تو نہیں لکھ سکتا تھا۔

ابتدائی سمیرین تحریر خطِ نامکمل تھا۔ ایک مکمل خط مادی نشانات کا ایک سلسلہ ہوتا ہے جو گفتنی زبان کو تقریباً مکمل طور پر بیان کرسکتا ہے۔ لہذا شاعری سمیت وہ سب احاطہ تحریر میں آسکتا ہے جو لوگ کہہ رہے ہوں۔ جب کہ نامکمل خط مادی علامات کا ایک سلسلہ ہے جو کسی خاص مضمون تک محدود، محض مخصوص قسم کی معلومات فراہم کرسکتا ہے۔ خط لاطینی، قدیم مصری تصویری تحریر (Heiroglyphics) اور بریل (Braille) مکمل خط ہیں۔ ان کے استعمال سے آپ محصولات کا رجسٹر، عشقیہ نظمیں، تاریخ کی کتب، کھانوں کی تراکیب اور قوانین تجارت لکھ سکتے ہیں۔ اس

کے مقابلے میں اولین سمیرائی خط ریاضی کی جدید علامات اور موسیقی کے سروں کی علامات کی مانند خط نامکمل ہے۔آپ خط ریاضی استعمال کر کے حساب تو کر سکتے ہیں،لیکن اس کے استعمال سے عشقیہ نظم نہیں لکھ سکتے۔
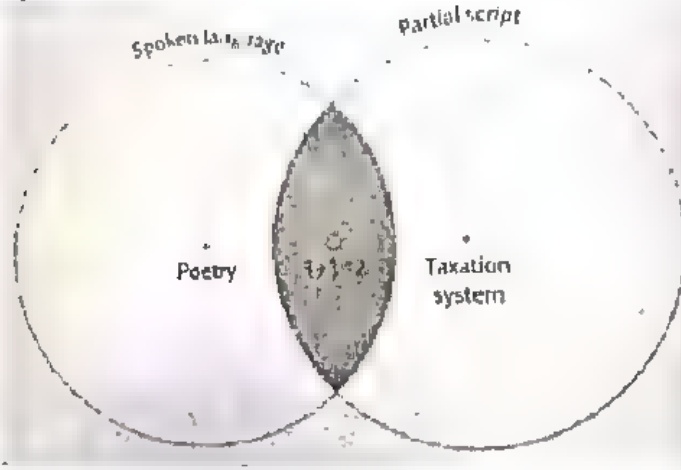
کوئی خط نامکمل کسی گفتنی زبان کی طرح کہانی کا مکمل احاطہ نہیں کر سکتا۔لیکن کم از کم یہ گفتنی زبان کے دائرے سے باہر چیزوں کو ضرور ظاہر کر سکتا ہے۔نامکمل خط مثلاً سمیری اور خط ریاضی،شاعری کے لیے تو استعمال نہیں ہو سکتے مگر وہ مالیہ کا ضرور حساب رکھ سکتے ہیں۔

سمیریوں کو اس سے کوئی دکھ نہیں ہوا کہ ان کا خط شاعری تحریر کرنے کے قابل نہیں۔انہوں نے اسے گفتنی زبان نقل کرنے کے لیے ایجاد نہیں کیا تھا، بلکہ ان چیزوں کے لیے جہاں گفتنی زبان ناکام ہو گئی تھی۔کچھ معاشرے ایسے تھے،مثلاً کولمبیا میں انڈی سے پہلے کا معاشرہ جنھوں نے اپنی پوری تاریخ نامکمل خط سے ہی تحریر کی۔وہ اپنے خط کی محدود اہلیت سے ہراساں نہیں ہوئے،اور انہیں ایک مکمل خط ایجاد کرنے کی کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔انڈی خط سمیرائی خط سے بہت مختلف تھا۔بلکہ یہ اتنا مختلف ہے کہ کچھ لوگ تو اسے خط تسلیم کرنے سے ہی انکار کر دیں گے۔ یہ مٹی کی تختی پر تحریر تھا نہ ہی کاغذ پر۔بلکہ یہ رنگین رسیوں میں گرہ باندھ کر لکھا جاتا تھا،جسے کوئپس (Quipus) کہتے تھے۔ہر کوئپس میں مختلف رنگوں کی بہت سی رسیاں ہوتی تھیں،جو اون یا دھاگے کی بنی ہوتیں۔ہر رسی میں مختلف جگہوں پر بہت سی گرہیں بندھی ہوتی تھیں۔ایک واحد کوئپس میں سینکڑوں رسیاں اور ہزاروں گرہیں ہوتی تھیں۔ مختلف رسیوں میں مختلف رنگوں کی مختلف گرہیں باندھنے سے ایک بڑی تعداد میں ریاضی کے اعداد و شمار مثلاً مالیہ کی وصولی یا جائیداد کی ملکیت تحریر کی جا سکتی تھی۔

سینکڑوں بلکہ شاید ہزاروں سالوں تک شہروں،مملکتوں اور سلطنتوں کے کاروبار کے لیے کوئپس ناگزیر تھا۔انکا سلطنت کے دوران یہ اپنے بام عروج پر پہنچا۔یہ سلطنت دس سے بارہ ملین رعایا پر حاکم تھی اور اس کے رقبے میں موجودہ پیرو،ایکواڈور،بولیویا اور کچھ علاقے چلی،ارجنٹینا اور کولمبیا کے بھی شامل ہیں۔کوئپس کی بدولت یہ بڑی تعداد میں اعداد و شمار کا حساب رکھ سکتے اور انہیں محفوظ بھی کر سکتے تھے۔اس کے بغیر اتنی بڑی سلطنت کا نظم و نسق چلانا دشوار ہوتا۔

سلطنت انکا کے بعد ملنے والا ایک ہسپانوی مسودہ جس میں ایک شخص گرہوں سے لکھا حساب، کوئپو، لیے کھڑا ہے۔

کوئپس اتنے موثر اور درست تھے کہ جنوبی امریکہ فتح کرنے کے بعد ہسپانیوں نے خود بھی ایک نئی سلطنت کے انتظام کے لیے کوئپس کا سہارا لیا۔ مسئلہ یہ تھا کہ ہسپانوی خود تو کوئپس لکھنا اور پڑھنا جانتے نہیں تھے، تو مقامی پیشہ وروں پر انحصار کرنا پڑتا۔ براعظم کے نئے حکمران جانتے تھے کہ یہ ان کے لیے ایک نازک صورت حال تھی۔ مقامی کوئپس ماہرین باآسانی اپنے آقاؤں کو فریب دے سکتے تھے۔ لہذا ایک بار اسپین کی نوآبادیات زیادہ مستحکم ہوگئی تو کوئپس کو ترک کر کے سارا حساب لاطینی خط اور اعداد میں لکھا جاتا۔ ہسپانوی قبضے سے بہت کم ہی کوئپس بچ سکے، اور ان میں سے زیادہ تر پڑھے بھی نہیں جا سکے کیوں کہ بدقسمتی سے کوئپس پڑھنے کا فن نابود ہو چکا تھا۔

نوکر شاہی کے کارنامے

یہ میسوپوٹیما والے تھے جنہیں سب سے پہلے ریاضی اعداد کے علاوہ بھی کچھ لکھنے کا شوق ہوا۔ ڈھائی سے تین ہزار سال قبل مسیح کے دوران سمیرائی خط میں زیادہ سے زیادہ نشان شامل کیے گئے، جنہوں نے بالآخر اسے ایک مکمل خط میں تبدیل کر دیا، جسے آج ہم کیونی فارم (Cuneiform) خط کہتے ہیں۔ ڈھائی ہزار سال قبل مسیح میں بادشاہ کیونی فارم سے فرمان جاری کر رہے تھے، پادری اس سے غیب کی آوازیں درج کرتے، اور کم ممتاز افراد اسے ذاتی خطوط کی تحریر کے لیے استعمال کرتے۔ عین اسی زمانے میں مصریوں نے ایک اور خط ایجاد کیا جسے ہیروگلائفکس کہا گیا۔ بارہ سو سال قبل مسیح میں چین میں دوسرے رسم الخط ایجاد ہوئے، جب کہ وسطی امریکہ میں تقریباً پانچ سو سے

ایک ہزار سال قبل مسیح میں۔

ان ابتدائی مراکز سے مکمل رسم الخط دور دراز تک پھیل گئے، اور ساتھ ہی ان کی نئی صورتیں اور انوکھے استعمال بھی۔ لوگوں نے شاعری، تاریخی کتب، رومان، ڈرامہ، پیش گوئیاں اور کھانے کی تراکیب لکھنی شروع کر دیں۔ پھر بھی لکھائی کا سب سے اہم مصرف ریاضی اعداد و شمار کا اندراج ہی رہا۔ اور یہ کام نامکمل خط کے زیر اثر ہی رہا۔

عبرانی بائبل، یونانی الیاڈ (Iliad)، ہندو مہابھارتا اور بدھ مت ٹپی ٹیکا (Tipitika) سے زبانی کام کے طور پر شروع ہوئے۔ کئی نسلوں تک وہ زبانی ہی منتقل ہوئے، اور اگر لکھائی ایجاد نہ ہوتی تو سینہ بہ سینہ ہی چلتے۔ لیکن مالیہ کے رجسٹر اور پیچیدہ نوکر شاہی دونوں ساتھ پیدا ہوئے، نامکمل خط سے لکھے گئے اور یہ دونوں آج بھی سیامی جڑواں کی مانند ایک دوسرے سے پیوست ہیں، ذرا کمپیوٹر کے عددی شمار اور حساب کے خانوں (spreadsheet) میں مخفی تحریر یاد کیجیے۔

جب زیادہ سے زیادہ چیزیں لکھی جانے لگیں، بالخصوص جیسے انتظامی روزنامچے بہت ضخیم ہو گئے تو نئے مسائل پیدا ہوئے۔ افراد اپنے دماغ میں ذخیرہ کی ہوئی معلومات سے تو فوراً استفادہ کر سکتے ہیں۔ میرے دماغ میں اربوں بٹ (bit) کے شمار جمع ہیں، لیکن پھر بھی میں پلک جھپکتے میں اٹلی کے دارالخلافے کا نام یاد کر سکتا ہوں، پھر اس کے بعد یہ بھی یاد کر سکتا ہوں کہ گیارہ ستمبر ۲۰۰۱ کو میں کیا کر رہا تھا اور اپنے گھر سے یروشلم کی عبرانی جامعہ کا راستہ دہرا سکتا ہوں۔ یہ ایک اسرار ہی ہے کہ دماغ یہ کیسے کرتا ہے۔ لیکن یہ ہم جانتے ہیں کہ دماغ کا یادداشت کا نظام بہت موثر ہے۔ سوائے اس کے کہ جب آپ یہ یاد کرنے کی کوشش کریں کہ گاڑی کی چابیاں کہاں رکھی ہوئی تھیں۔

لیکن پھر بھی آپ کو پیپرس یا مٹی کی تختیوں پر مندرج تحریر کیسے پڑھیں۔ اگر آپ کے پاس محض دس یا ایک سو تختیاں ہوں تو کوئی بات نہیں۔ لیکن اگر آپ نے بھی حمورابی کے ایک ہمعصر شاہ زمریلم آف ماری (King Zimrilim of Mari) کی طرح سے ہزاروں تختیاں جمع کر لیں ہوں تو پھر؟

ایک لمحے کے لیے فرض کیجیے کہ یہ ۱۷۷۶ ق م ہے۔ دو ماریں (Marians) گندم کے ایک کھیت کی ملکیت پر لڑ رہے ہیں۔ جیکب کا اصرار ہے کہ اس نے ایساؤ سے یہ کھیت تیس سال پہلے خریدا تھا۔ ایساؤ جواب دیتا ہے کہ اس نے تو تیس سال پہلے یہ کھیت جیکب کو پٹے پر دیا تھا، اور اب یہ مدت پوری ہو جانے پر وہ یہ کھیت واپس مانگ رہا ہے۔ چیختے، چلاتے وہ ایک دوسرے کو دھکے دینے لگتے ہیں جب انہیں خیال آتا ہے کہ وہ شاہی لائبریری میں جا کر یہ جھگڑا نبٹا سکتے ہیں، جہاں مملکت کی جائیداد کی خرید و فروخت کے کاغذات اور رسیدیں محفوظ کی جاتی ہیں۔

لائبریری پہنچنے کے بعد وہ ایک افسر سے دوسرے کے درمیان بھٹکائے جاتے ہیں۔ سبز چائے کے کئی ادوار کے ساتھ وہ انتظار کرتے ہیں، پھر انہیں دوسرے دن لوٹنے کی ہدایت کی جاتی ہے۔ پھر بالآخر ایک جھکی کلرک بڑبڑاتا انہیں مٹی کی تختیوں کی جانب لے جاتا ہے۔ کلرک دروازہ کھول کر انہیں ایک بڑے کمرے میں لے جاتا ہے جہاں زمین سے چھت تک مٹی کی ہزاروں تختیاں جمع ہیں۔ کلرک کا نالاں ہونا بالکل بجا تھا اس گندم کے کھیت کا متنازعہ اندراج کیسے تلاش کیا جائے جو تیس سال پہلے لکھا گیا تھا۔ اگر اس نے تلاش کر بھی لیا تو وہ یہ کیسے یقینی بنائے گا کہ اس کھیت کا سب سے آخری دستاویزی تبادلہ یہی ہے۔ اگر وہ نہ ڈھونڈ سکا تو کیا یہ اس بات کا ثبوت ہوگا کہ ایساؤ نے کبھی یہ زمین فروخت کی تھی یا پٹے پر دی تھی۔ یا یہ کہ وہ دستاویز کھو گئی یا اس لائبریری میں بارش سے خراب ہو گئی۔

صاف ظاہر ہے کہ کسی دستاویز کو مٹی پر نقش کر لینا ہی موثر، درست اور اعداد و شمار حاصل کرنے کا کافی طریقہ نہیں۔ اس کے لیے زیادہ منظم طریقے درکار ہیں۔ مثلاً کیٹلاگ، نقل بنانے کی مشین جیسے فوٹو کاپی فوری اور درست دستیابی کے طریقے ہیں، یا جیسے کمپیوٹر کے الگوردم (algorithms)، اور ایک ہنس مکھ، فارغ نوجوان لائبریرین جوان اوزار کو استعمال کرنے کا ہنر جانتا ہو۔

ان طریقوں کو ایجاد کرنا لکھائی ایجاد کرنے سے بہت زیادہ دشوار ثابت ہوا۔ لکھائی کے کئی طریقے مختلف معاشروں میں ایک دوسرے سے بالکل آزادانہ پیدا ہوئے، جو مقام اور دور کے اعتبار سے ایک دوسرے سے بعد رکھتے تھے۔ ہر دہائی میں ماہرین آثار قدیمہ مزید چند تحریریں دریافت کرتے رہے ہیں۔ ان میں سے کچھ ممکن ہے کہ تختی پر لکھی سمیری تحریر سے بھی زیادہ قدیم ہو۔ لیکن یہ ابھی اسرار ہی ہے کیوں کہ جس نے بھی انہیں ایجاد کیا وہ انہیں مرتب کرنے اور تحریری ریکارڈ کی فوری دستیابی کے طریقے ایجاد کرنے میں ناکام رہا۔ سمیری، فرعون مصر، قدیم چین اور انکا کی سلطنتوں کی خاص بات یہی ہے کہ ان معاشروں نے منظم کرنے، کیٹلاگ بنانے اور تحریری ریکارڈ کی فوری دستیابی کے طریقے ایجاد کیے۔ ظاہر ہے کہ ان کے پاس کمپیوٹر یا کوئی فوٹو کاپی کی مشین تو تھی نہیں، لیکن ان کے پاس کیٹلاگ ضرور تھے۔ اور اس سے زیادہ اہم یہ کہ انہوں نے خصوصی مدارس قائم کیے جہاں پیشہ ور لکھاری، کلرک، لائبریرین اور اکاؤنٹنٹ کو اعداد و شمار کا مخفی حساب رکھنے کی تربیت دی جاتی۔

قدیم میسوپوٹیما کے ایک اسکول کی تحریری مشق جو جدید ماہرین آثار قدیمہ نے دریافت کی، وہ تقریباً چار ہزار سال پہلے طلبہ کی زندگی میں جھانکنے کا موقع فراہم کرتی ہے:

میں جا کر بیٹھ گیا، اور میرے استاد نے میری تختی پڑھی۔ وہ فوراً بولا "اس میں کچھ کمی ہے!"
پھر اس نے مجھے قمچیاں ماریں
با اختیار لوگوں میں سے ایک نے کہا کہ "تم نے میری مرضی کے خلاف منہ کیوں کھولا؟"
پھر اس نے چھڑی سے میری پٹائی کی
قوانین کے نگہبان ایک شخص نے کہا کہ "تم میری اجازت کے بغیر کیوں اٹھے؟"
پھر اس نے چھڑی سے مجھے زدوکوب کیا
دربان نے کہا کہ "تم میری مرضی کے بغیر کیوں جا رہے تھے؟"
پھر اس نے چھڑی سے مجھے مارا۔
شراب کے جگ کے رکھوالے نے پوچھا کہ "تم نے میری مرضی کے بغیر کیوں تھوڑی سی پی لی؟"
پھر اس نے مجھے چھڑی سے پیٹا۔
سمیری استاد بولا کہ "تم نے اکاڈین* زبان کیوں بولی؟"
اور اس نے چھڑی سے میری پٹائی کی
میرا استاد بولا "تمہاری لکھائی بہت خراب ہے۔"

* اکاڈین گفتنی زبان بن جانے کے بعد بھی سمیری انتظامیہ کی زبان رہی اور تحریر کے لیے استعمال ہوئی، تو متوقع لکھاریوں کو سمیری بولنی پڑتی تھی۔

پھر اس نے چھڑی سے میری پٹائی کی۔

قدیم لکھاری نہ صرف لکھتے اور پڑھتے تھے بلکہ وہ کیٹلاگ، جنتری، فارم اور میزان بھی دیکھتے۔ پڑھائی کے ساتھ وہ کیٹلاگ بنانے، استفادہ کرنے اور معلومات کے استعمال کا طریقہ بھی یاد کرتے جو ان طریقوں سے بہت مختلف تھا جو دماغ استعمال کرتا تھا۔ دماغ میں تمام اعداد وشمار ایک دوسرے سے آزادانہ نسبت رکھتے ہیں۔ جب میں اپنی بیوی کے ساتھ اپنے نئے گھر کے لیے ایک قرض نامے پر دستخط کرنے جاتا ہوں، تو مجھے وہ پہلا گھر یاد آ جاتا ہے جہاں اکٹھے رہتے تھے، اس سے مجھے نیو آرلین میں اپنا ہنی مون یاد آتا ہے، یہ مجھے مگر مچھ کی یاد دلاتا ہے، یہاں سے میرا خیال اژدھے کی جانب پرواز کرتا ہے، اور میرے ذہن کے پردے پر رنگ آف دی نیبلنگن (Nibelungen Ring of the) نامی فلم چلنے لگتی ہے۔ اور یوں اچانک بے دھیانی میں، اس حیران و پریشان کلرک کے سامنے میں سیگفرائیڈ لوموٹیف (Siegfried Leitmotif) کا گیت گنگنا رہا ہوں۔ نوکر شاہی میں چیزوں کو علیحدہ رکھنا ہوتا ہے۔ ایک دراز جائیداد پر قرضوں کے لیے مختص ہے، ایک نکاح ناموں کے لیے، ایک تیسری دراز میں مالیہ کی تفصیلات رکھی جاتی ہیں تو چوتھی میں مقدمات کی تفصیل۔ ورنہ آپ کوئی چیز کیسے تلاش کر سکیں گے؟ دو چیزیں ایک سے زیادہ درازوں سے وابستہ ہوں، مثلاً ویگنیرین گیت ڈرامہ (Wagnerian music drama) تو میں، نہیں کہاں رکھوں: موسیقی یا تھیٹر کی دراز میں؟ یا شاید مجھے اس کے لیے ایک بالکل نئی قسم ایجاد کرنی پڑے۔ یہ چیزیں سر کا درد ہیں۔ تو ان درازوں میں ہمیشہ کی بیشی اور دوبارہ مرتب کرنے میں مصروف رہنا پڑتا ہے۔

جو لوگ ان درازوں پر کام کرتے ہیں انہیں فعال ہونے کے لیے دوبارہ تشکیل دینا ہوگا تاکہ وہ کسی انسان کے بجائے کلرک یا اکاؤنٹنٹ کے طور پر سوچنا شروع کردیں۔ جیسا کہ زمانہ قدیم سے ہی سب واقف ہیں کلرک اور اکاؤنٹنٹ غیر انسانی انداز میں سوچتے ہیں۔ اس میں ان کا قصور بھی نہیں۔ اگر وہ اس طرح نہ سوچیں تو ان کی درازیں سب الٹ پلٹ جائیں گی، اور وہ خدمت انجام نہیں دے سکیں گے جس کی ان کی حکومت، ادارہ یا کمپنی ان سے امیدوار ہو۔ انسانی تاریخ پر خط کا سب سے اہم اثر یہی ہے: اس نے انسانوں کی فکر اور دنیا کو دیکھنے کا انداز بدل دیا ہے۔ آزادانہ انسلاک اور مکمل وجود کو دیکھنے کی جگہ نوکر شاہی اور تفریق نے لے لی ہے۔

اعداد کی زبان

وقت گزرنے کے ساتھ اعداد وشمار کے دفتری طریقے فطری انسانی سوچ سے اور زیادہ دور ہو گئے، لیکن اور زیادہ اہم بھی۔ ایک اہم موڑ اس وقت آیا جب نویں صدی عیسوی سے ذرا پہلے ایک نیا خط ایجاد ہوا جو ریاضی اعداد کا حساب کرنے اور انہیں محفوظ رکھنے میں کمال کی حد تک موثر تھا۔ یہ نامکمل خط دس علامات پر مشتمل تھا، صفر سے نو کے اعداد۔ ان علامات کو عربی اعداد غلط کہا جاتا ہے کیوں کہ یہ سب سے پہلے ہندوؤں نے ایجاد کیے تھے (مزید ابہام یہ کہ جدید عرب جو اعداد استعمال کرتے ہیں وہ مغربی اعداد سے بہت مختلف ہیں)۔ لیکن اس کا سہرا عربوں کے سر اس لیے بندھتا ہے کہ جب عربوں نے ہندوستان پر حملہ کیا اور انہیں عددی خط نظر آیا تو انہوں نے اس کی افادیت کو فوراً پہچان لیا۔ انہوں نے اس میں مزید بہتری پیدا کر کے اسے پورے مشرق وسطیٰ اور یورپ میں پھیلا دیا۔ بعد میں

جب کئی نئے نشانات ان عربی اعداد میں شامل کیے گئے (مثلاً جمع، تفریق اور ضرب کے نشانات) تو جدید ریاضی خط کی بنیاد پڑ گئی۔

$$\ddot{r} = \sum_{j\neq i} \frac{\mu_j(r_j-r_i)}{r_{ij}^3}\Bigg\{1-\frac{2(\beta-\gamma)}{c^2}\sum_{l\neq i}\frac{\mu_l}{r_{il}} - \frac{2\beta-1}{c^2}\sum_{k\neq j}\frac{\mu_k}{r_{jk}}+\gamma\left(\frac{s_i}{c}\right)^2$$

$$+ (1-\gamma)\left(\frac{s_j}{c}\right)^2 - \frac{2(1+\gamma)}{c^2}\dot{r}_i\cdot\dot{r}_j - \frac{3}{2c^2}\left[\frac{(r_i-r_j)\,\dot{r}_j}{r_{ij}}\right]^2$$

$$+ \frac{1}{2c^2}(r_j-r_i)\cdot\ddot{r}_j\Bigg\}$$

$$+ \frac{1}{c^2}\sum_{j\neq i}\frac{\mu_j}{r_{ij}^3}\{[r_i-r_j]\cdot[(2+2\gamma)\dot{r}_i-(1+2\gamma)\dot{r}_j]\}(\dot{r}_i-\dot{r}_j)$$

$$+ \frac{3+4\gamma}{2c^2}\sum_{j\neq i}\frac{\mu_j\ddot{r}_j}{r_{ij}}$$

نظریہ اضافت کے مطابق کسی کیت کی کشش ثقل کی موجودگی میں رفتار معلوم کرنے کی مساوات۔ جب عام افراد ایسی مساوات دیکھتے ہی گھبرا جاتے ہیں جیسے کسی گاڑی کی روشنیوں میں گرفتار ہرن۔ یہ ردعمل بہت فطری ہے اور اس سے کند ذہنی یا غیر متجسس ذہنیت ظاہر نہیں ہوتی۔ ماسوائے چند لوگوں کے، انسانی دماغ اس قسم کے نظریات مثلاً نظریہ اضافت اور کوانٹم میکانکس کو سمجھنے سے قاصر ہے۔ لیکن ماہرین طبیعات کسی نہ کسی طرح یہ کرتے ہی ہیں۔ کیوں کہ وہ انسانی سوچ کا روایتی طریقہ ترک کر کے، خارجی اعداد و شمار کا حساب کرنے والے طریقے اپنا لیتے ہیں۔ ان کی فکر کے اہم نکات ان کے ذہن میں نہیں بلکہ کمپیوٹر یا تختہ سیاہ پر حل ہوتے ہیں۔

گو لکھائی کا یہ طریقہ خط نامکمل ہی رہا، مگر یہ دنیا کی غالب زبان بن گئی۔ تقریباً تمام ممالک، کمپنیاں، ادارے اور تنظیمیں چاہے وہ عربی بولتے ہوں، ہندی انگریزی یا ناروِیجین اعداد و شمار کے حساب کے لیے وہ سب خط ریاضی ہی استعمال کرتے ہیں۔ علم کا ہر ذرہ جسے خط ریاضی میں ترجمہ کیا جا سکے وہ ایک تحیر خیز رفتار سے حل ہو کر ذخیرہ ہو جاتا ہے۔

تو اگر کوئی شخص حکومتی فیصلوں، کمپنیوں اور اداروں پر اثر انداز ہونا چاہے تو اس کے لیے اعداد کی زبان میں گفتگو لازم ہے۔ ماہرین اس قسم کے تصورات مثلاً غربت، مسرت اور ایمانداری کا بھی اعداد میں ترجمہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں (غربت کا معیار، ذاتی بہتری کا پیمانہ، مالی حیثیت وغیرہ)۔ علم کی کئی اصناف مثلاً طبیعات اور انجینیرنگ گفتنی انسانی زبان سے رابطہ مکمل طور پر توڑ چکی ہیں، اور فقط خط ریاضی میں ہی زندہ رہتی ہیں۔

حال ہی میں خط ریاضی نے ایک اور بھی زیادہ انقلابی لکھائی کو جنم دیا ہے۔ کمپیوٹر کا جوڑے دار یا بائنری خط جس میں صرف دو ہی اعداد صفر اور ایک استعمال ہوتے ہیں۔ یہ الفاظ جو اس وقت میں اپنے کمپیوٹر میں ٹائپ کر رہا ہوں وہ صفر اور ایک کی مختلف جوڑیوں میں محفوظ ہو رہے ہیں۔

لکھائی انسانی شعور کی خادمہ کے طور پر پیدا ہوئی تھی، لیکن اب وہ انسان کی حاکم بنتی جا رہی ہے۔ ہمارے کمپیوٹر کو یہ سمجھنے میں دشواری ہوتی ہے کہ ہوموسیپین کیسے گفتگو کرتے ہیں، محسوس کرتے ہیں یا خواب دیکھتے ہیں۔ تاہم ہوموسیپین کو اعداد کی زبان میں گفتگو کرنا، محسوس کرنا اور خواب دیکھنا سکھا رہے ہیں جو کمپیوٹر سمجھ سکے۔

کہانی یہیں ختم نہیں ہوئی۔ مصنوعی ذہنیت (Artificial Intelligence) کا شعبہ ایک نئے قسم کا

ذہن ایجاد کرنے میں مصروف ہے جس کی بنیاد خالصتاً کمپیوٹر کے بائنری خط پر ہو۔ سائنس فکشن کا سینما مثلاً میٹرکس (Matrix) یا ٹرمینیٹر (Terminator) ایک ایسے دن کی پیشن گوئی کرتے ہیں جب بائنری خط انسانیت کا جوا اتار پھینکے گا۔ جب انسان اس باغی خط کو دوبارہ قابو کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو وہ جواب میں تمام نسل انسانی کو مٹانے کی کوشش کرتا ہے۔

○

تاریخ میں کوئی انصاف نہیں

زرعی انقلاب کے بعد کے ایک ہزار سالوں میں انسانی تاریخ سمجھنے کے لیے ایک سو ل کا جواب لازم
ہے: انسان نے اپنے آپ کو کثیر تعد د میں تعاون کے لیے کیسے راضی کر لیا، جب کہ اس قسم کے تعاون کے سے ان
میں حیاتیاتی حس موجود نہیں ہے۔ مختصر جواب یہ ہے کہ انسانوں نے فرضی قاعدے تخلیق کیے اور تحریر کو جنم دیا۔ ان دو
ایجادات نے ہماری حیاتیاتی وراثت میں موجود خلا کو پر کیا۔

لیکن بہت سے لوگوں کے لیے. س نظام کی پیدائش مشکوک رحمت تھی۔ اس نظام کو برقرار رکھنے والے
فرضی قاعدے نہ تو غیر جانبدار تھے اور نہ ہی منصفانہ۔ انہوں نے افراد کو یقین کی بنیاد پر تقسیم کر کے طبقات پیدا
کیے۔ بالائی طبقے کو طاقت اور مراعات دستیاب تھیں، جب کہ نچلے طبقے کو تعصب اور جبر کا سامنا تھا۔ مثلاً حمورابی کا
ضابطہ ایک عوام اور غلاموں کا طبقاتی نظام پیدا کرتا ہے۔ اس میں ممتاز افراد کو زندگی کی تمام آسائشیں مہیا ہوئیں۔
عام فراد کو بچا کچا حاصل ہوا اور غلاموں کے حصے میں احتجاج پر تشدد آیا۔

تمام انسانوں کی برابری کے دعوے کے باوجود امریکہ کا ۱۷۷۶ کا اعلان آزادی بھی طبقات قائم کرتا
ہے۔ اس نے ایک مردوں کا مراعات یافتہ طبقہ قائم کیا جب کہ عورتوں کو بے اختیار چھوڑ دیا۔ اس نے ایک سفید فام
طبقہ پیدا کیا جسے آزادی نصیب تھی، جب کہ دوسرا سیاہ فام اور امریکی انڈین کا طبقہ جنہیں نچلی نسل کا انسان سمجھا گیا،
لہذا انہیں برابر کے حقوق نہیں ملے۔ اعلان آزادی کے دستخط کنندگان میں سے بہت سے خود غلام رکھتے تھے۔ اس
اعلان پر دستخط کے بعد انہوں نے اپنے غلام آزاد نہیں کر دیے، اور نہ ہی انہوں نے خود کو منافق سمجھا۔ ان کے خیال
میں "افراد" کے حقوق کا نیگروں سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

امریکی قاعدے نے امیر اور غریب کے درمیان بھی طبقاتی تفریق پیدا کی۔ اس وقت بیشتر امریکیوں کو
اس معاشی ناہمواری سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کہ امیر والدین اپنی دولت اور کاروبار اپنی اولاد کو منتقل کریں۔ ان کی
لغت میں امیر و غریب میں برابری کا مقصد یہ تھا کہ دونوں پر ایک ہی قانون لاگو ہو۔ اس کا بیروزگاری الاؤنس، بلا
امتیاز رنگ داخلوں یا صحت کے بیمہ سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

آج کے مقابلے میں اس زمانے میں آزادی بھی بہت مختلف معنی رکھتی تھی۔ ۱۷۷۶ میں اس کا ہرگز یہ
مطلب نہیں تھا کہ کمزور فائدہ اٹھائیں اور طاقت حاصل کریں (کالے یا انڈین تو بالکل نہیں، اور خدا نہ کرے کہ
عورتیں)۔ اس کا مقصد محض یہ تھا کہ سوائے غیر معمولی حالات کے ریاست کسی شہری کی ذاتی ملکیت پر قبضہ نہیں

کر سکتی، اور نہ اس سے یہ مطالبہ کرتی کہ اسے کس طرح استعمال کیا جائے۔ یوں امریکی ضابطے دولت مند طبقے کی بقا کے ضامن تھے، جسے کچھ تو من جانب اللہ سمجھتے اور باقی نا قابل تغیر قوانین فطرت کے احکامات۔ کہا گیا کہ فطرت قابلیت کو دولت سے نوازتی ہے جب کہ کاہلی کو سزاوار کرتی ہے۔

اوپر بیان کی گئی یہ تمام تفریق 'آزاد و غلام کے مابین، کالے اور سفید کے درمیان، امیر و غریب میں سب کی جڑیں مفروضوں پر مبنی ہیں (مرد و زن کے طبقے کا ذکر بعد میں آئے گا)۔ لیکن یہ تاریخ کا آہنی اصول ہے کہ ہر فرضی طبقاتی نظام خود اپنی فرضی بنیادوں سے انکار کر کے خود کو فطری اور لازمی قرار دیتا ہے۔۔ مثلاً بہت سے افراد جو اب آزادی اور غلامی کو فطری قرار دیتے ہیں ان کی دلیل ہے کہ غلامی انسانوں کی پیدا کردہ نہیں۔ حمورابی کے خیال میں یہ احکامات الٰہی تھے۔ ارسطو کی دلیل تھی کہ غلام ایک 'غلامانہ فطرت' رکھتے ہیں، جب کہ آزاد افراد ایک 'آزاد فطرت'۔ معاشرے میں ان کا مقام محض ان کی اندرونی فطرت کا عکس ہے۔

کسی متعصب سفید فام سے نسلی تفریق کے متعلق پوچھیے تو آپ کو دونوں نسلوں کے درمیان حیاتیاتی تفریق کے بارے میں جھوٹی سائنس پر مبنی ایک لیکچر سننے کو ملے گا۔ آپ سے شاید یہ کہا جائے کہ سفید فاموں کے خون یا ان کی جین میں 'کچھ' ہے، جو سفید فاموں کو زیادہ ذہین، محنتی اور ایماندار بناتی ہے۔ کسی راسخ سرمایہ دار سے تمول کے طبقات کے بارے میں دریافت کیجیے تو آپ کو یہ سننے کو ملے گا کہ یہ اہلیت کی تفریق کا لازمی نتیجہ ہے۔ اس دلیل کے حساب سے دولت مندوں کے پاس زیادہ دولت اس لیے ہے کہ وہ زیادہ قابل اور محنتی ہیں، لہٰذا اگر دولت مندوں کو بہتر علاج کی سہولیات، تعلیم اور غذا میسر ہو تو اس میں کسی کو تردد نہیں ہونا چاہیے۔ امرا کو یہ بہت امیرانہ حق ہے کہ وہ ہر سہولت سے استفادہ کریں۔

جنوبی افریقہ میں نسلی تعصب کے دور کا ایک بورڈ، جس میں اسے صرف سفید فاموں کے استعمال کے لیے محدود کیا گیا ہے۔ ہلکے رنگ کی جلد والے افراد کا دھوپ میں جلنے کا سیاہ فام افراد سے زیادہ امکان ہوتا ہے۔ پھر بھی جنوبی افریقہ کے ساحلوں پر اسی تفریق کی کوئی حیاتیاتی وجہ نہیں تھی۔ وہ ساحل جو ہلکے رنگ کی جلد والے افراد کے لیے مخصوص تھے، وہاں زیر بنفشی شعاعوں کی سطح کم تو نہیں تھی۔

ہندو جو ذات پات پر یقین رکھتے ہیں، وہ یہ سمجھتے ہیں کہ آفاقی قوتوں نے ایک ذات کو دوسرے سے ممتاز بنایا ہے۔ ایک معروف ہندو تخلیقی داستان کے مطابق، خداؤں نے دو جہاں کو ایک ابتدائی آدم، پروسا سے بنایا تھا۔ سورج پروسا کی آنکھ سے، ماہتاب اس کے ذہن سے، برہمن (مذہبی پیشوا) اس کے دہن سے، کشتوریا (فوجی) اس کے بازوؤں سے، ویشیا (کسان اور تاجر) اس کی ران سے اور شودر (نوکر) اس کے پیروں سے۔ اگر آپ اس بیان

کو تسلیم کرلیں تو پھر برہمن اور شودر کے درمیان سماجی وسیاسی فرق اتنا ہی فطری اور لازوال ہے جتنا چاند اور سورج کے درمیان۔ قدیم چینیوں کا خیال تھا کہ جب دیوی نووا نے انسانوں کو زمین سے پیدا کیا تو انہوں نے اشرافیہ کو مہین پیلی مٹی سے گوندھا، جب کہ عوام الناس بھورے کیچڑ سے پیدا کیے گئے۔

پھر بھی ہماری بہترین سمجھ کے مطابق طبقاتی تفریق سب انسانی ذہن کے مفروضے ہیں۔ برہمن اور شودر واقعی خداوند نے کسی ابتدائی انسان کے جسم کے مختلف حصوں سے پیدا نہیں کیے تھے۔ بلکہ یہ تفریق تقریباً تین ہزار سال قبل شمالی ہندوستان کے انسانوں نے قوانین اور روایات کے ذریعے پیدا کی۔ ارسطو کی فکر کے برخلاف غلاموں اور آزاد افراد میں کوئی حیاتیاتی فرق نہیں ہے۔ انسانی روایات اور قوانین نے کچھ افراد کو غلام اور کچھ کو آقا بنا دیا ہے۔ سفید اور سیاہ فام کے درمیان کچھ موضوعاتی، حیاتیاتی فرق ضرور ہیں، مثلاً جلد کا رنگ اور بالوں کی نوعیت، لیکن اس بات کا کوئی ثبوت نہیں کہ یہ فرق ذہانت یا اخلاقی اقدار میں بھی موجود ہے۔

اکثر افراد یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ان کا سماجی طبقاتی نظام منصفانہ اور فطری ہے، جب کہ دوسرے معاشروں کا جھوٹا اور مضحکہ خیز بنیادوں پر قائم ہے۔ جدید مغربیوں کو نسلی طبقات پر اظہار مذمت کی تعلیم دی جاتی ہے۔ وہ ان قوانین سے حیرت زدہ رہ جاتے ہیں جن کے تحت کالوں کو گوروں کے محلوں میں رہنے کی ممانعت ہو، یا سفید فاموں کے اسکول میں داخلے کی یا ان کے ہسپتال میں علاج کرانے کی۔ لیکن دولت کی بنیاد پر اگر امرا مختلف زیادہ آرام دہ محلوں میں رہیں، بڑے اور مشہور اسکولوں میں تعلیم حاصل کریں، اور جداگانہ زیادہ جدید سہولتوں سے آراستہ ہسپتالوں میں علاج کرائیں تو یہ امریکیوں اور یورپین کے نزدیک عین مناسب ہے۔ لیکن یہ بھی ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ بیشتر امیر افراد اس لیے امیر ہوتے ہیں کہ وہ امیر خاندان میں پیدا ہوئے، جب کہ غربا اس لیے ساری زندگی مفلسی میں گزارتے ہیں کہ وہ ایک غریب گھرانے میں پیدا ہوئے تھے۔

بدقسمتی سے معلوم یہ ہوتا ہے کہ پیچیدہ انسانی معاشروں کے لیے فرضی طبقاتی اور غیر منصفانہ تعصب ضروری ہیں۔ یقیناً تمام طبقاتی درجہ بندی اخلاقی طور پر ایک جیسی نہیں، اور کچھ معاشروں میں تعصب دوسرے معاشروں سے زیادہ انتہا پسند ہے، لیکن اسکالروں کو کوئی ایسا بڑا معاشرہ نہیں ملا جو مکمل طور پر تعصب سے پاک ہو۔ بارہا لوگوں نے اپنے معاشروں میں باقاعدگی پیدا کرنے کے لیے آبادی کو فرضی طبقات میں تقسیم کیا ہے۔ مثلاً ممتاز، عوام اور غلام؛ کالے اور گورے؛ اشرافیہ اور کمتر؛ برہمن اور شودر؛ امیر اور غریب۔ ان طبقات نے کچھ لوگوں کو قانونی، سیاسی یا سماجی اعتبار سے دوسروں پر ممتاز کرکے، کروڑوں افراد کے درمیان تعلق کو مربوط بنایا ہے۔

طبقات نے ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس سے مکمل اجنبی ایک دوسرے سے ذاتی طور پر واقفیت حاصل کرنے میں وقت اور توانائی صرف کیے بغیر یہ سمجھ جاتے ہیں کہ دوسرے سے کیسا رویہ رکھنا ہے۔ جارج برنارڈ شا کے کھیل پگ میلین (Pygmalion) میں ہنری ہگنس کو علیزہ ڈولٹل سے یہ معلوم کرنے کے لیے کہ اس سے کیسے رابطہ رکھا جا سکتا ہے، قریبی نسبت قائم کرنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ محض اس کی گفتگو سے اسے اندازہ ہو گیا کہ وہ نچلے طبقے کی ایک فرد ہے، جس سے وہ جیسا چاہے سلوک کر سکتا ہے۔ مثلاً اپنی یہ شرط جیتنے کے لیے کہ وہ ایک پھولوں والی شہزادی کا بہروپ بدل سکتی ہے، وہ اسے مہرے کے طور پر استعمال کر سکتا ہے۔ ایک جدید تراش کی علیزہ کو کسی پھولوں کی دکان میں کام کرنے کے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ درجنوں افراد جو روزانہ دکان میں داخل ہوتے ہیں

انہیں گلاب اور سوسن فروخت کرنے کے لیے کتنی محنت کرنی پڑے گی۔ وہ ہر گاہک کی جیب اور ذوق کے احوال کے بارے میں تفصیل تو نہیں بوجھ سکتی، لیکن وہ سماجی استعارے استعمال کرتی ہے۔ ان کا انداز التباس، ان کی عمر اور اگر ان کا سیاسی رجحان واضح نہ ہو تو ان کی جلد کا رنگ۔ اس طرح وہ ایک اکاؤنٹنگ فرم کے پارٹنر کو جو یقیناً مہنگے گلابوں کا ایک بڑا آرڈر دے گا فوراً ایک پیغام رساں لڑکے سے علیحدہ پہچان لیتی ہے جو شاید ڈیزی پھولوں کا ایک گچھا ہی خرید سکتا ہے۔

قدرتی اہلیت میں فرق بھی یقیناً سماجی شناخت میں ایک اہم کردار ادا کرتی ہے۔ لیکن کردار اور صلاحیت کا یہ تنوع عموماً فرضی درجہ بندی سے ہی ظاہر ہوتا ہے۔ ایسا دو اہم طریقوں سے ممکن ہے۔ سب سے پہلا اور اہم ترین یہ کہ اہلیت کو عموماً آبیاری اور نشو و نما کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر کوئی فطری وصف کے ساتھ پیدا ہو تب بھی وہ وصف پوشیدہ ہی رہے گا تا آنکہ اسے پال پوس کر تراشا اور استعمال کیا جائے۔ تمام لوگوں کو اپنی صلاحیتیں ابھارنے اور بہتر بنانے کا برابری سے موقع نہیں ملتا۔ انہیں یہ موقع ملتا ہے یا نہیں اس کا دار و مدار ان کے معاشرے کی درجہ بندی میں ان کا مقام ہے۔ ہیری پوٹر ایک اچھی مثال ہے۔ اپنے ممتاز جادوگر گھرانے سے بچھڑ کر وہ ناواقف جہلا کے گھر میں پروان چڑھتا ہے، یوں جب وہ ہوگوارٹس (Hogwarts) پہنچتا ہے تو اسے جادو کا کوئی تجربہ نہیں۔ اپنی قوتوں اور اپنی انوکھی صلاحیتوں پر عبور حاصل کرنے کے لیے اسے سات کتابوں سے استفادہ کرنا پڑتا ہے۔

دوسرے یہ کہ مختلف درجات کے لوگ اگر اپنی صلاحیتوں کو بالکل یکساں ابھار بھی لیں، تب بھی انہیں یکساں کامیابی نصیب نہیں ہوتی، کیوں کہ انہیں زندگی کا کھیل مختلف اصولوں کے تحت کھیلنا ہوگا۔ مثلاً اگر برطانوی راج کے ہندوستان میں ایک اچھوت، ایک برہمن، ایک کیتھولک آئرش اور ایک پروٹسٹنٹ انگریز کسی طرح سے یکساں کاروباری سوجھ بوجھ حاصل کر لیں، تب بھی ان کے امیر ہونے کے امکانات مختلف ہوں گے۔ اس اقتصادی کھیل میں قانونی پابندیوں اور غیر سرکاری حد بندی سے بے ایمانی کی گئی تھی۔

برائی کا تسلسلی دائرہ (Vicious Circle)

تمام معاشرے فرضی درجات پر قائم ہیں، لیکن یہ درجات ایک جیسے نہیں۔ اس فرق کی وجہ کیا ہے؟ کیا وجہ ہے کہ روایتی ہندوستانی معاشرہ لوگوں کی درجہ بندی ذات کی بنیاد پر کرتا تھا، سلطنت عثمانیہ کا معاشرہ مذہب اور امریکی معاشرہ نسلی بنیادوں پر؟ زیادہ تر معاشروں میں یہ درجہ بندی حادثاتی حالات سے پیدا ہوئی پھر نسل در نسل اسے تراش کر پروان چڑھایا گیا کیوں کہ ان سے مختلف طبقات کے مفادات وابستہ ہوتے گئے۔

مثلاً بہت سے اسکالروں کا خیال ہے کہ ہندو ذات پات کے طبقے تین ہزار سال قبل اس وقت پیدا ہوئے جب انڈو آریائی لوگوں نے ہندوستان پر حملہ کر کے مقامی افراد کو مفتوح کر لیا۔ حملہ آوروں نے ایک طبقاتی معاشرہ قائم کیا جس میں ظاہر ہے کہ وہ خود سربراہانہ حیثیت کے مالک تھے (راہب اور فوجی)، جب کہ مقامیوں کو نوکروں اور غلاموں کے طور پر رہنے دیا۔ حملہ آور جو تعداد میں چند تھے اپنی امتیازی حیثیت اور انوکھی شناخت کھو جانے کے خوف میں مبتلا تھے۔ اس خطرے سے نپٹنے کے لیے انہوں نے آبادی کو طبقات میں تقسیم کر دیا، جس میں ہر طبقے کو معاشرے میں ایک مخصوص پیشہ اپنانا اور کردار ادا کرنا تھا۔ ہر ایک کی مراعات، ذمہ داریاں اور قانونی حیثیت

الگ تھی۔ مختلف ذاتوں کا ملاپ، سماجی روابط، ازدواج یہاں تک کہ غذا میں اشتراک بھی منع تھا۔ اور یہ تفریق محض قانونی ہی نہیں تھی، یہ ان کی مذہبی روایت اور آداب کا فطری جز بن گئی۔

حکمرانوں کی دلیل یہ تھی کہ ذاتیات کی تفریق ایک ہمیشہ کی آفاقی سچائی ہے، کوئی اتفاقی، تاریخی حادثہ نہیں۔۔۔ ہندو مذہب میں پاک اور ناپاک کا تصور اہم تھا، اور اسے توڑ مروڑ کر اس سماجی مثلث کو مستحکم کرنے میں استعمال کیا گیا۔ دیں دار ہندوؤں کو یہ سبق دیا گیا کہ کسی مختلف ذات کے فرد سے تعلق نہ صرف انہیں ذاتی طور پر ناپاک کردے گا بلکہ پورے معاشرے کو بھی مجموعی طور پر، لہذا یہ قابل نفریں ہے۔ یہ فکر صرف ہندوؤں تک ہی محدود نہیں۔ تاریخ کے ہر دور میں اور تقریبا ہر معاشرے میں پاک اور ناپاک کی سماجی تفریق استعمال کی گئی، اور مختلف حکمران طبقوں نے اسے اپنی مراعات برقرار رکھنے کے لیے استعمال کیا۔ لیکن ناپاک ہوجانے کا یہ خوف صرف مذہبی پیشواؤں یا شہزادوں تک ہی مخصوص نہیں تھا۔ اس کی بنیادیں حیاتیاتی بقا کے نظام میں بھی ممکن ہیں کہ جس میں انسان ممکنہ بیماریوں کے منبہ مثلا بیمار افراد یا لاش سے فطری کھنچاؤ محسوس کریں۔ اگر آپ کسی انسانی قبیلے کو تنہا کردینا چاہتے ہیں مثلا خواتین، یہودی، خانہ بدوش، اغلام پرست یا سیاہ فام تو سب سے بہترین طریقہ یہ ہے کہ آپ لوگوں کو یہ یقین دلادیں کہ یہ گروہ نجاست کا ذریعہ ہے۔

ہندو ذات کا نظام اور اس سے وابستہ پاکیزگی کے قوانین ہندوستانی ثقافت میں بہت گہرے بس گئے ہیں۔ انڈو آریائی حملہ فراموش کردینے کے بہت بعد بھی ہندوستانی ذات پات پر یقین کرتے رہے، اور ذاتوں کے ملاپ سے پیدا ہونے والی نجاست سے نفرت کرتے رہے۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ بڑی ذاتوں کو مزید ذیلی ذاتوں میں تقسیم کردیا گیا۔ یہاں تک کہ ابتدائی چار ذاتوں کو تین ہزار ذیلی ذاتوں میں تقسیم کردیا گیا، جنھیں جاتی (پیدائش) کہتے ہیں۔ لیکن ذاتوں کے اس پھیلاؤ سے بھی اس نظام کے بنیادی اصول نہیں بدلے۔ جس کے مطابق ہر شخص ایک خاص مرتبے کے ساتھ پیدا ہوتا ہے، اور ان قوانین کی روگردانی سے وہ فرد اور پورا معاشرہ ناپاک ہوجاتا ہے۔ کسی فرد کی جاتی سے اس شخص کا شعبہ، اس کی غذا، اسکی سکونت کا علاقہ اور اس کے لائق ازدواجی ساتھی انتخاب ہوتا ہے۔ کوئی شخص عموما اپنی ذات میں ہی شادی کرسکتا ہے، اور ان کی اولاد کو وراثت میں وہی ذات ملتی ہے۔

جب کوئی نیا پیشہ جنم لیتا ہے، یا لوگوں کا کوئی نیا گروہ منظر عام پر آتا ہے تو انہیں ہندو معاشرے میں ایک جائز مقام دینے کے لیے کسی ذات سے انسلاک ضروری ہے۔ وہ گروہ جو کسی ذات کے طور پر شناخت بنانے میں ناکام ہوئے تو وہ واقعتاً بے دخل کردیے گئے، اس طبقاتی معاشرے میں وہ سب سے نیچے بھی جگہ نہ بناسکے، وہ اچھوت کہلائے جانے لگے۔ انہیں دیگر تمام افراد سے علیحدہ رہنا پڑتا اور انہیں اپنا روزگار ذلت آمیز اور شرمناک طریقوں سے کمانا پڑتا، مثلا کوڑے کے ڈھیر سے ردی تلاش کرکے۔ نیچی ذات کے لوگ بھی ان سے ملنے سے کتراتے، ان کے ساتھ کھانے، انہیں چھونے یا شادی کرنے کا تو سوال ہی نہیں تھا۔ جدید انڈیا میں شادی اور نوکری کے مسائل پر اب بھی ذات بہت اثر انداز ہوتی ہے۔ ہندوستان کی جمہوری حکومت کی تمام کوششوں کے باوجود کہ ان تعصبات کی دیوار کو گرادیا جائے اور ہندوؤں کو یہ یقین دلایا جائے کہ ذاتوں کے ملاپ میں کوئی ناپاکی نہیں ہے۔

امریکہ میں پاکیزگی

اسی قسم کی برائی کا تسلسل امریکہ میں نسلی تعصب کو فروغ دیتا رہا۔ سولھویں سے اٹھارویں صدی تک یورپی فاتحین لاکھوں افریقی غلاموں کو کھیتوں اور کانوں میں کام کرنے کے لیے لاتے رہے۔ انہوں نے یورپ یا مشرقی ایشیا کے بجائے تین وجوہات سے افریقہ سے غلام درآمد کرنے کو ترجیح دی۔ پہلا تو یہ کہ افریقہ قریب تھا لہٰذا سینیگال سے غلام لانا ویتنام سے لانے کے مقابلے میں سستا تھا۔

دوسرے یہ کہ افریقہ میں غلاموں کا کاروبار پہلے ہی مستحکم تھا (زیادہ تر غلام مشرق وسطیٰ کو برآمد کیے جاتے)، جب کہ یورپ میں غلامی نایاب تھی۔ ظاہر ہے کہ بجائے ایک نیا بازار کھولنے کے ایک موجود بازار سے غلام خریدنا زیادہ آسان تھا۔

تیسری اور زیادہ اہم بات یہ کہ امریکہ میں کھیتی باڑی کے مقامات پر مثلاً ورجینیا، ہیٹی اور برازیل میں ملیریا اور پیلے بخار کی بیماریاں عام تھیں جو افریقہ سے شروع ہوئیں۔ نسلوں کے بعد افریقیوں نے ان بیماریوں کے خلاف کچھ مدافعت پیدا کر لی تھی، جب کہ یورپین بالکل بے بس تھے، اور بڑی تعداد میں ہلاک ہو جاتے۔ لہٰذا کسی زمیندار کے لیے یہ عقلمندی تھی کہ کسی یورپی غلام یا عارضی مدد پر پیسہ خرچ کرنے کے بجائے افریقی غلام خریدے۔ لیکن وائے حیرت کہ یہ مدافعتی جینیاتی برتری سماجی کمزوری ثابت ہوئی، کیوں کہ گرم خطوں میں افریقی، یورپین کے مقابلے میں زیادہ صحت مند رہتے تو وہ یورپی آقاؤں کے غلام بن گئے! ان واقعاتی عوامل کی وجہ سے تیزی سے پھیلتا امریکی معاشرہ سفید یورپین حکمرانوں اور محکوم کالے افریقیوں کے طبقوں میں بٹ گیا۔

لیکن لوگ یہ اقرار کرنا پسند نہیں کرتے کہ وہ کسی خاص نسل یا جگہ کے غلام محض اقتصادیات کی وجہ سے خریدنا پسند کرتے ہیں۔ ہندوستان کے آریائی فاتحین کی مانند امریکہ میں سفید فام یورپین بھی نہ صرف اقتصادی طور پر کامیاب رہے بلکہ منصف اور با مقصد نظر آنا چاہتے تھے۔ اس فرق کو ثابت کرنے کے لیے مذہبی اور سائنسی کہانیوں کا سہارا لیا گیا۔ علم المذاہب کے ماہرین نے بتایا کہ افریقی نوح کے بیٹے ہام کی اولاد سے ہیں جس کو اس کے باپ نے بد دعا دی تھی کہ اس کی اولاد غلام رہے گی۔ حیاتیات دان بتانے لگے کہ کالے افراد گوروں کے مقابلے میں کند ذہن ہوتے ہیں، اور ان کی اخلاقی حس بھی اتنی بیدار نہیں ہوتی۔ طبیبوں نے گواہی دی کہ سیاہ فام گندگی میں رہتے ہیں، اور بیماریاں پھیلانے کا باعث ہیں، یا یوں کہیے کہ ناپاکی کا باعث ہیں۔

ان کہانیوں نے امریکی اور یورپی ثقافتوں پر عمومی اثر کیا۔ اس کے اثرات ان حالات کے اختتام کے بعد بھی باقی رہے، جن سے غلامی کی ابتدا ہوئی تھی۔ انیسویں صدی کے اوائل میں برطانوی راج نے غلامی کو غیر قانونی قرار دے کر اس کی اوقیانوسی تجارت بند کر دی تھی، اور اس کے بعد کی دہائیوں میں رفتہ رفتہ غلامی تمام امریکی براعظم میں غیر قانونی قرار پائی۔ یہ بات قابل غور ہے کہ یہ تاریخ میں پہلی اور واحد مرتبہ ہے کہ بڑے پیمانے پر غلام رکھنے والے معاشروں نے رضاکارانہ طور پر غلامی کو ختم کیا۔ گو وہ غلام آزاد ہو گئے لیکن وہ داستانیں جن سے غلامی کو درست ثابت کیا گیا تھا برقرار رہی۔

یوں وجہ اور اثر کا ایک خودکار تسلسلی دائرہ بن گیا۔ جنوبی امریکہ میں خانہ جنگی کے فوراً بعد کا منظر دیکھیے۔

۱۸۶۵ میں مریکی آئین میں تیرھویں ترمیم کے ذریعے غلامی کو غیر قانونی قرار دیا گیا۔ پھر چودھویں ترمیم کے ذریعے شہریت اور دیگر قانونی حقوق کو محض نسلی بنیادوں پر رد نہ کرنے کا قانون بنایا گیا۔ لیکن دو صدیوں کی غلامی کے نتیجے میں بیشتر سیاہ فام خاندان بیشتر سفید فاموں کے مقابلے میں غریب اور بہت کم تعلیم یافتہ تھے۔ ۱۸۶۵ میں ایک سیاہ فام شخص جو ایلابامہ میں پیدا ہوا ہو، اسے اچھی تعلیم اور ایک اچھی تنخواہ والی نوکری ملنے کا اپنے سفید فام ہمسائے کے مقابلے میں بہت کم امکان تھا۔ یوں ۱۸۸۰ اور ۱۸۹۰ میں پیدا ہونے والے بچے بھی اپنی زندگی اس محرومی سے شروع کرتے، وہ بھی ایک غیر تعلیم یافتہ، غریب خاندان میں پیدا ہوئے تھے۔

لیکن محض اقتصادی محرومی ہی مکمل کہانی نہیں تھی۔ الابامہ میں بہت سے ایسے سفید فام خاندان بھی تھے جنہیں وہ سہولیات میسر نہیں تھیں جو ان کے زیادہ متمول نسلی بھائیوں اور بہنوں کو مہیا تھے۔ اسی زمانے میں صنعتی انقلاب اور مہاجرین کی لگاتار آمد سے ریاست ہائے متحدہ امریکہ ایک بہت تغیر پذیر معاشرہ بن گیا تھا، جہاں غربت کو بہت جلد امارت میں تبدیل کیا جاسکتا تھا۔ اگر محض دولت ہی کی بات ہوتی تو نسلوں کے درمیان واضح تفریق بہت جلد مبہم ہو جاتی، اور وہ بھی محض بین النسلی ازدواج کے ذریعے ہی نہیں۔

لیکن ایسا ہوا نہیں۔ ۱۸۶۵ تک سفید فام اور کئی سیاہ فام بھی اسے ایک سادہ حقیقت سمجھتے رہے کہ سیاہ فام کم ذہین، زیادہ پر تشدد، جنسی طور پر بے راہ رو، کاہل اور ذاتی صفائی کے معاملات میں سفید آبادی سے کم تر تھے۔ یعنی وہ تشدد، چوری، زنا اور بیماری کے کارندے تھے، یا دوسرے الفاظ میں ناپاکی کے۔ اگر ۱۸۹۵ میں الابامہ کا کوئی سیاہ فام شہری معجزاتی طور پر اچھی تعلیم حاصل بھی کر لیتا، پھر ایک بینک کلرک کی باعزت نوکری کے لیے درخواست دیتا تو ایک مساوی تعلیمی قابلیت والے سفید فام کے مقابلے میں اسے نوکری ملنے کے امکانات بہت کم تھے۔ سیاہ فاموں پر لگے ناقابل بھروسہ، سست اور کند ذہنی کے داغ سب اس کے خلاف صف آرا تھے۔

آپ شاید یہ سوچیں کہ وقت گزرنے کے ساتھ لوگ یہ پہچان لیں گے کہ یہ داغ محض کہانیاں ہیں، اور وقت کے ساتھ سیاہ فام انہیں مٹا کر خود کو سفید فاموں جتنا ہی اہل، قانون کے پابند اور حفظان صحت کے پابند ثابت کر دیں گے۔ لیکن حقیقت میں اس کے بالکل متضاد ہوا اور وقت کے ساتھ یہ تحفظات اور زیادہ مستحکم ہو گئے۔ کیوں کہ تمام اچھی نوکریوں پر سفید فام ملازم ہیں تو یہ باور کرنا آسان ہو گیا کہ سیاہ فام واقعی کمتر ہی ہوں گے۔ 'دیکھو' ایک سفید فام یہ دلیل دے گا "سیاہ فام کئی نسلوں سے آزاد ہیں، لیکن ان میں تقریباً اب بھی کوئی پروفیسر، وکیل، ڈاکٹر بلکہ بینک کلرک تک موجود نہیں۔ کیا یہ اس بات کا کافی ثبوت نہیں کہ سیاہ فام کند ذہن اور کاہل ہیں؟" برائی کے اس تسلسلی دائرے میں گرفتار، سیاہ فام باعزت نوکریوں پر ملازم نہیں رکھے جاتے کیوں کہ انہیں کند ذہن سمجھا جاتا ہے، اور ان کے کمتر ہونے کا یہ بین ثبوت دیا جاتا ہے کہ عزت دار نوکریوں پر سیاہ فام ملازم نہیں ہیں!

برائی کا یہ تسلسلی دائرہ یہیں ختم نہیں ہو جاتا۔ جیسے کہ سیاہ فاموں پر لگے داغ زیادہ پختہ ہو گئے تو ان کے نتیجے میں جم کرو (Jim Crow) جیسے قوانین اور طریقوں نے جنم لیا، جن کا مقصد جنوب میں تسلسلی دائرے کو برقرار رکھنا تھا۔ سیاہ فاموں پر پابندی تھی کہ وہ چناؤ میں حق رائے دہی استعمال نہیں کر سکتے، سفید فاموں کے اسکولوں میں تعلیم حاصل نہیں کر سکتے، سفید فاموں کی دکانوں سے خریداری نہیں کر سکتے، اور سفید فاموں کے ہوٹلوں میں سو نہیں سکتے۔ ان سب کی وجہ یہ تھی کہ سیاہ فام گندے، سست اور پر تشدد تھے لہٰذا سفید فاموں کو ان سے

محفوظ رکھا جائے۔ بیماری کے خوف سے سفید فام ان ہوٹلوں میں نہیں سونا چاہتے تھے جہاں سیاہ فام ٹھہرتے ہوں، نہ ہی ان ریسٹورانٹ میں کھانا کھاتے جہاں سیاہ فام کھاتے ہوں۔ وہ تشدد اور خراب صحبت کے خوف سے اپنے بچوں کو ان اسکولوں میں تدریس کے لیے نہیں بھیجتے جہاں سیاہ فام بچے تعلیم حاصل کرتے۔ وہ سیاہ فاموں کو حق رائے دہی اس لیے نہیں دینا چاہتے تھے کہ سیاہ فام بدکردار اور جاہل تھے۔ ان تحفظات کو ایسی سائنسی تحقیق کا سہارا دیا گیا جو یہ ثبوت فراہم کرتی کہ سیاہ فام واقعی کم تعلیم یافتہ تھے، بہت سی بیماریاں ان میں زیادہ عام تھیں اور ان میں جراثیم کا تناسب بہت زیادہ تھا (ان تحقیقات نے اس حقیقت کو نظر انداز کیا کہ یہ ثبوت سیاہ فاموں کے خلاف تعصب کا نتیجہ ہیں)۔

انیسویں صدی کے اواخر کے مقابلے میں بیسویں صدی کے وسط تک یہ نسلی علیحدگی جنوبی کنفڈریٹ (انیسویں صدی میں غیر اعلانیہ غلام رکھنے والی جنوبی ریاستوں کا الحاق) میں زیادہ رہ گئی تھی۔ ۱۹۵۸ء میں جامعہ مسی سپی میں داخلے کی درخواست دینے والے ایک سیاہ فام طالب علم کلینن کنگ کو جبری طور پر ذہنی امراض کے ہسپتال میں داخل کر دیا گیا۔ مقدمے کے فیصلے میں جج نے لکھا کہ ایک سیاہ فام جو جامعہ مسی سپی میں داخلے کی امید رکھے یقیناً ذہنی مریض ہے۔

امریکہ کی جنوبی ریاستوں (اور کئی شمالی باشندوں) کے لیے سفید فام عورت اور سیاہ فام مرد کے درمیان جنسی تعلقات یا شادی سے زیادہ قابل نفرت واقعہ کوئی نہیں تھا۔ بین النسلی جنسی تعلق گناہ کبیرہ ٹھہرا۔ کوئی خلاف ورزی یا خلاف ورزی کا شبہ بھی فوری سزا کا باعث بنتا جو اکثر درخت سے لٹکا کر غیر قانونی پھانسی ہوتی۔ کو کلکس کلین (Ku Klux Klan) سفید فام انتہا پسندوں کی ایک خفیہ تنظیم ایسی بہت سی اموات کی ذمہ دار تھی۔ وہ تو ہندو برہموں کو بھی طہارت کا سبق پڑھا سکتے تھے۔

وقت کے ساتھ یہ نسلی تعصب دیگر ثقافتی شعبوں میں بھی پھیل گیا۔ امریکی جمالیاتی ثقافت سفید فاموں کی حسن خوبصورتی پر قائم ہے۔ سفید نسل کے جسمانی اوصاف مثلاً جلد کا ہلکا رنگ، سیدھے اور ہلکے رنگ کے گیسو اور ایک چھوٹی سی ناک خوبصورتی کی علامات قرار پائیں۔ مخصوص سیاہ فام اوصاف مثلاً سیاہ جلد، سیاہ گھنگریلے بال اور پھیلی ناک بدصورت تصور کیے گئے۔ یہ عصبیت انسانی شعور کی گہرائیوں میں فرضی درجہ بندی کے گہرے نقوش چھوڑ گئی۔

ایسے بے رحم تسلسلی دائرے سینکڑوں بلکہ ہزاروں سال برقرار رہ سکتے ہیں، اور فرضی درجہ بندیوں کو استحکام دے سکتے ہیں جو کسی اتفاقی تاریخی واقعے سے شروع ہوئی ہوں۔ وقت کے ساتھ غیر منصفانہ تعصب کم نہیں ہوتا بڑھ جاتا ہے۔ دولت تمول کی جانب آتی ہے، غربت مفلسی کے گھر۔ تعلیم علم کے گھر مہمان ہوتی ہے اور جہالت لاعلمی کے گھر۔ جو ایک بار تاریخ کے ہاتھوں مارے جائیں وہی دوبارہ نشانہ بنتے ہیں۔ جنہیں تاریخ سے مراعات ملیں وہی دوبارہ اس کے مستحق ٹھہرتے ہیں۔

بیشتر سیاسی وسماجی درجہ بندی کسی حیاتیاتی یا منطقی بنیادوں پر قائم نہیں ہوتی، وہ کسی اتفاقی واقعے کی مدد سے حصول دوام کے سوا کچھ نہیں۔

تاریخ کے مطالعے کی یہ ایک اہم وجہ ہے۔ اگر کالے یا سفید، برہمن یا شودر کے درمیان تفریق کسی حیاتیاتی حقیقت پر مبنی ہوتی، مثلاً اگر برہموں کے دماغ واقعی شودر سے بہتر ہوتے تو انسانی معاشرے کو سمجھنے کے لیے حیاتیات کا علم کافی ہوتا۔ کیوں کہ ہوموسیپین کی مختلف نسلوں کے درمیان حیاتیاتی فرق نہ ہونے کے برابر ہے تو

حیاتیات ہندوستانی معاشرے یا امریکی نسلی الجھاؤ کو سلجھانے کے لیے ناکافی ہے۔ان معاملات کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم حالات، واقعات اور طاقت کے درمیان تعلق کو سمجھیں جنہوں نے تصوراتی مفروضوں کو بے رحم اور واقعی سماجی وضع میں ڈھال دیا ہے۔

مرد و زن

مختلف معاشرے مختلف اقسام کی فرضی تفریق روا رکھتے ہیں۔جدید امریکیوں کے لیے نسل بہت اہم ہے لیکن قدیم مسلمانوں کے لیے نسبتاً غیر اہم تھی۔قدیم ہندوستانیوں میں ذات زندگی و موت کا مسئلہ تھی جب کہ جدید یورپ میں اس کا کوئی وجود نہیں۔لیکن تمام انسانی معاشروں میں صنف پر مبنی درجہ بندی اہم ترین رہی ہے۔ہر جگہ افراد نے اپنے آپ کو مرد و عورت میں تقسیم کر لیا ہے۔لیکن ہر جگہ کم از کم زرعی انقلاب کے بعد سے مردوں کو اس تقسیم میں زیادہ فائدہ ہوا ہے۔

بارہ سو سال قبل مسیح کی کچھ چینی تحریریں سروش غیبی ہیں جنہیں مستقبل کی الٰہی رضاؤں کے لیے استعمال کیا جاتا۔ان میں سے ایک پر یہ سوال کندہ تھا: کیا محترمہ ہاؤ کا حمل خوش قسمتی کا باعث ہوگا؟ اس پر یہ جواب تحریر تھا کہ اگر بچہ ڈنگ ایام میں پیدا ہوا تو باعث خوش قسمتی ورنہ یہ اگر گینگ ایام میں ہوا تو سبز قدم۔لیکن محترمہ ہاؤ کے گھر ایک جیین دن بچے کی ولادت ہوئی۔اگلی تحریر سے یہ اداسی جھلکتی ہے کہ "تین ہفتے اور ایک دن بعد ایک جیین بچہ پیدا ہوا، بدقسمتی، یہ ایک لڑکی تھی۔" کوئی تین ہزار سال بعد جب کیمونسٹ چین نے ایک بچے کی پالیسی اختیار کی تو بہت سے چینی خاندان لڑکی کی پیدائش کو بدقسمتی سے تعبیر کرتے۔والدین کبھی تو اس نوزائیدہ بچی کو چھوڑ دیتے، یا اسے قتل کر دیتے، تاکہ انہیں ایک اور اولاد پیدا کرنے کا موقع مل سکے۔بہت سے معاشروں میں خواتین مردوں کی جاگیر قرار پائیں، اپنے والد، شوہر یا بھائی کی۔کئی قانونی سلسلوں میں زنا جائیداد پر حملے کے زمرے میں شمار ہوتا۔دوسرے الفاظ میں وہ عورت مظلوم نہیں جو زنا کا شکار بنی بلکہ وہ مرد ہے جسکی وہ جائیداد ہے۔لہذا اس کی قانونی سزا جائیداد کی منتقلی تھی۔یعنی زانی پر لازم تھا کہ وہ عورت کے بھائی یا باپ کو ایک عورت کی قیمت ادا کرے، جس کے بعد زنا کی شکار عورت اس کی جائیداد بن جاتی۔بائبل میں ارشاد ہے کہ "اگر کوئی مرد شادی کے بغیر کسی عورت سے ملے اور اس سے زبردستی جفتی کرے، اور پکڑا جائے تو وہ مرد جس نے اس سے ہم بستری کی اس پر لازم ہے کہ اس عورت کے باپ کو چاندی کے پچاس سکے ادا کرے، جس کے بعد وہ اسکی بیوی قرار پائے گی"(Duetronomy 22:28-29)۔قدیم عبرانیوں کے نزدیک یہ ایک منصفانہ فیصلہ تھا۔

کسی ایسی عورت سے زنا جس کا کوئی مردانہ وارث نہ ہو جرم نہیں تھا۔جیسے کسی معروف سڑک پر پڑا ہوا سکہ اٹھا لینا جرم تو نہیں ہے۔اور اگر کوئی شوہر اپنی بیوی سے بالجبر زنا کرے تو وہ بھی کسی جرم کا ارتکاب نہیں کرتا۔یہ خیال ہی بالکل احمقانہ ہے کہ کوئی مرد اپنی بیوی سے زنا کا مرتکب ہو سکتا ہے۔شوہر ہونے کا مطلب تھا اپنی بیوی کی جنسیت پر مکمل تصرف۔یہ کہنا کہ ایک شوہر نے اپنی بیوی سے زنا کیا ایسا ہی ہے کہ آپ کہیں کسی شخص نے اپنا ہی بٹوا چرا لیا۔یہ سوچ قدیم مشرق وسطیٰ تک ہی محدود نہیں تھی سنہ ۲۰۰۶ء میں بھی ترپن ممالک ایسے تھے جن میں مرد کو اپنی بیوی سے زنا کا مرتکب قرار نہیں دیا جا سکتا تھا۔جرمنی تک میں زنا کے قانون میں سنہ ۱۹۹۷ء میں ترمیم کر کے ازدواجی زنا کی

شق کا اضافہ کیا گیا۔

کیا مرد و عورت میں تفریق فرضی ہے، جیسے ہندوستان میں ذات پات کی یا امریکہ میں نسلی تفریق؟ یا یہ ایک فطری تفریق ہے جس کی گہری جڑیں حیاتیات میں پیوست ہیں؟ اور اگر یہ واقعی فطری تفریق ہے تو کیا عورتوں پر مردوں کی بالادستی کی حیاتیاتی وجوہات ہیں؟

مرد و عورت کے درمیان کچھ ثقافتی، قانونی اور سیاسی تفریق تو اصناف کے درمیان حیاتیاتی تفریق پر مبنی ہے۔ بچوں کی پیدائش ہمیشہ سے عورت کی ذمہ داری رہی ہے کیوں کہ مرد کا جسم رحم سے عاری ہے۔ لیکن اس واضح آفاقی حقیقت پر ہر معاشرے نے ثقافتی خیالات اور روایات کی تہیں چڑھا دی ہیں جن کا حیاتیات سے کوئی تعلق نہیں۔ معاشرے مردانگی اور زنانے پن سے ایسے اوصاف منسوب کرتے ہیں جن کی کوئی حیاتیاتی بنیاد نہیں۔

مثلاً پانچویں صدی قبل مسیح کے جمہوری ایتھنز میں ایسا فرد جس کا جسم رحم کا حامل ہو کوئی آزاد قانونی حیثیت نہیں رکھتا تھا۔ وہ عوامی اسمبلی میں یا منصف کے طور پر شریک نہیں ہو سکتا تھا۔ چند استثنا کے علاوہ ایسا فرد اچھی تعلیم، کاروبار یا فلسفیانہ مباحثوں میں شریک نہیں ہو سکتا تھا۔ ایتھنز کا کوئی سیاسی رہنما، کوئی عظیم فلسفی، مقرر، آرٹسٹ یا تاجر عضوئے رحم کا مالک نہیں تھا۔ کیا رحم ہونے سے کوئی فرد حیاتیاتی طور پر ایسے پیشوں کے لیے ناموزوں ہو جاتا ہے؟ قدیم یونانیوں کا تو یہی خیال تھا۔ جدید یونانی اس سے اتفاق نہیں کرتے۔ آج ایتھنز میں عورتیں ووٹ ڈالتی ہیں، عوامی نمائندہ بن سکتی ہیں، تقریر کر سکتی ہیں، جواہرات، عمارتیں اور سافٹ ویر تک ڈیزائن کر سکتی ہیں، اور جامعہ بھی جا سکتی ہیں۔ ان شعبوں میں مردوں کے برابر کامیابی کے حصول میں ان کے رحم رکاوٹ نہیں بنتے۔ یہ درست ہے کہ سیاست اور تجارت میں اب بھی ان کی معقول نمائندگی نہیں۔ یونانی پارلیمنٹ کے اراکین میں محض بارہ فیصد عورتیں ہیں۔ لیکن سیاست میں ان کی شرکت پر کوئی قانونی پابندی نہیں ہے۔ جدید یونان کی بیشتر آبادی کے خیال میں یہ بات عین فطری ہے کہ خواتین عوام کی نمائندگی کریں۔

بہت سے جدید یونانیوں کے خیال میں یہ امر مردانگی کا لازمی جز ہے کہ مرد صرف عورتوں کی جانب راغب ہو، اور صرف جنسِ مخالف سے ہی جنسی تعلقات رکھے۔ وہ اسے کوئی ثقافتی تعصب نہیں سمجھتے بلکہ ایک فطری حقیقت گردانتے ہیں۔ صنفِ مخالف کے دو افراد کے درمیان جنسی تعلقات فطری ہیں اور ایک ہی جنس کے دو افراد کے درمیان غیر فطری۔ لیکن حقیقت میں اماں فطرت کو اس بات سے کوئی دکھ نہیں اگر مرد ایک دوسرے کے لیے کشش رکھتے ہوں۔ یہ صرف مخصوص ثقافتوں سے وابستہ انسانی والدین ہیں جو اپنے بیٹے کے عطار کے لونڈے سے تعلقات پر چراغپا ہوتے ہیں۔ حیاتیاتی طور پر ماں کا غصہ غیر ضروری ہے۔ خاصی تعداد میں انسانی ثقافتوں نے ہم جنس پرستی کو نہ صرف جائز قرار دیا ہے بلکہ سماجی تعمیر کے لیے ایک ضرور عنصر بھی، قدیم یونانی اس کی ایک اہم مثال ہیں۔ نظم ایلیاڈ میں کہیں یہ تحریر نہیں کہ تھیٹس کو اپنے بیٹے کے پیٹروکلس سے تعلقات پر کوئی اعتراض ہے۔ قدیم دنیا کی بدمزاج اور طاقتور ترین ملکاؤں میں سے ایک میسی ڈون کی ملکہ اولیمپیاس، جس نے خود اپنے شوہر شاہ فلپ تک کو قتل کرا دیا تھا، لیکن جب اس کا بیٹا اسکندر اعظم اپنے عاشق ہیفیسٹیون کو رات کے کھانے پر گھر لایا تو اس نے کوئی ہنگامہ نہیں کیا۔

ہم یہ کیسے معلوم کر سکتے ہیں کہ کوئی روایت حیاتیاتی بنیادوں پر قائم ہے یا لوگوں نے محض حیاتیاتی کہانیوں کے سہارے اسے اپنا لیا ہے۔ ایک سادہ سا اصول یہ ہے کہ "حیاتیات اجازت دیتی ہے، ثقافت منع کرتی ہے"۔

حیاتیات بہت انسانی تنوع کو برداشت کرتی ہے۔ یہ ثقافت ہے جو افراد کو کچھ امکانات قبول کرنے اور کچھ کو رد کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ حیاتیات عورت کو بچے پیدا کرنے کے قابل بناتی ہے۔ کچھ ثقافتیں انہیں اس امکان کو پورا کرنے پر مجبور کرتی ہیں۔ حیاتیات افراد کو ایک دوسرے سے جنسی تعلقات سے لطف اندوز ہونے کا موقع دیتی ہے، کچھ ثقافتیں اس امکان پر پابندی عائد کرتی ہیں۔

ثقافت کی دلیل یہ ہے کہ وہ تو صرف غیر فطری سے منع کر رہی ہے۔ لیکن حیاتیاتی نکتہ نظر سے تو کچھ بھی غیر فطری نہیں۔ اگر کوئی بھی چیز ممکن ہے تو تعریفی اعتبار سے وہ قدرتی ہے۔ ایک واقعی غیر فطری چیز جو قوانین فطرت کے خلاف ہو اس کا تو وجود ممکن ہی نہیں، لہذا کوئی پابندی بھی ضروری نہیں۔ مثلاً کسی ثقافت نے بھی آدمیوں کو ضیائی تالیف سے منع نہیں کیا، نہ عورتوں پر روشنی کی رفتار سے تیز دوڑنے پر پابندی عائد کی، اور نہ ہی منفی چارج والی الیکٹرون کو ایک دوسرے کی جانب کھنچنے سے منع کیا گیا۔ درحقیقت یہ فطری اور غیر فطری کا ہمارا تصور حیاتیات سے نہیں بلکہ عیسائیت سے مستعار ہے۔ مذہبی اعتبار سے غیر فطری وہ باتیں ہیں جو خالق فطرت کی مرضی کے خلاف ہوں۔ عیسائیت کے مذہبی عالم یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ خالق نے انسانی جسم میں ہر عضو کو ایک مخصوص مقصد کے لیے بنایا ہے۔ اگر ہم اپنے ہاتھ، پاؤں اور اعضا کو ایسے کاموں کے لیے استعمال میں لائیں جو خالق کی منشا تھی تو یہ فطری عمل ہوگا۔ لیکن ان کا اپنے مقصد تخلیق کے علاوہ کوئی اور استعمال غیر فطری ہے۔ لیکن ارتقا میں مقصد نام کی کوئی چیز نہیں۔ اعضا کسی مقصد کے حصول کے لیے نہیں بنے اور ان کا استعمال بدلتا رہتا ہے۔ انسانی جسم میں ایسا کوئی عضو نہیں ہے جو اب بھی وہی کام کر رہا ہو جو کروڑوں سال پہلے اس نے پہلی بار انجام دیا ہو۔ اعضا بنتے تو کسی مخصوص کام کی انجام دہی کے لیے ہیں، لیکن ان کے وجود کو کارِ دیگر کی انجام دہی کے لیے بھی موزوں کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً ابتدائی کثیر الخلیاتی حیات کی غذائی ضرورت پوری کرنے کے لیے دہن کی تشکیل ہوئی۔ تو ہم اب بھی منہ کو کھانے کے لیے تو استعمال کرتے ہیں، لیکن ساتھ ہی بوسہ لینے، بولنے اور اگر ہم ریمبو ہوں تو دستی بم کی پن نکالنے کے لیے بھی استعمال کرتے ہیں۔ تو کیا اب ان میں سے کوئی بھی کام محض اس لیے غیر فطری ہے کہ ہمارے کیچوے نما آبا نے تقریباً ساٹھ کروڑ سال پہلے اپنے دہن سے یہ کام نہیں کیے تھے۔

اسی طرح پر اپنی تمام قوت پرواز کی شان کے ساتھ اچانک نمودار نہیں ہو گئے تھے۔ وہ ایسے اعضا سے نمودار ہوئے جو کوئی اور مقصد براری کرتے تھے۔ ایک نظریے کے مطابق کروڑوں سال پہلے پرواز سے عاری حشرات الارض میں پر ان کے جسم پر ابھار کی صورت نمودار ہوئے۔ ان ابھاروں کی وجہ سے ان کیڑوں کا حجم دوسرے کیڑوں سے زیادہ ہو گیا، یوں وہ زیادہ دھوپ سینک کر جسموں کو گرم رکھتے۔ ایک آہستہ ارتقائی عمل سے یہ آفتابی گرمائش کے چولہے اور بڑے ہو گئے۔ یہ اعضا جو زیادہ آفتابی حرارت جذب کرنے، بڑی سطحی جسامت اور کم وزنی کے لیے بنے تھے وہی اتفاق سے کیڑوں کے اچھلنے کودنے سے قوت پرواز کا باعث بن گئے۔ وہ جن کے ابھار زیادہ بڑے تھے وہ اور زیادہ اونچائی تک کود لیتے۔ چند کیڑوں نے اشیا کے سہارے فضا میں تیرنا شروع کر دیا، وہاں سے پروں کی تشکیل جو کیڑوں کو واقعی ہوا میں اڑنے کی قوت دیتی زیادہ بڑا ارتقائی قدم نہیں تھا۔ اگلی بار جب کوئی مکھی آپ کے کان میں بھنبھنائے تو اس سے غیر فطری عمل کا شکوہ کیجیے گا۔ اگر وہ کوئی نیک پردین ہوتی اور اور خالق کی تخلیق پر صابر رہتی تو وہ اپنے پر محض دھوپ سینکنے کے لیے استعمال کرتی۔

اسی قسم کا کثیر المقصدی استعمال ہمارے اعضائے جنسی اور رویوں پر بھی صادر ہوتا ہے۔ ابتدا میں جنس محض افزائش نسل کے لیے شروع ہوئی، اور عشقیہ چھیڑ چھاڑ ممکنہ جنسی ساتھی کی موزونیت معلوم کرنے کے لیے۔ لیکن اب بہت سے حیوانات ان دونوں افعال کو مختلف النوع سماجی مقاصد کے لیے استعمال کرتے ہیں، جن کا اپنی چھوٹی لقول تیار کرنے سے کوئی تعلق نہیں۔ مثلاً چمپینزی جنس کو سیاسی الحاق مضبوط کرنے، قربت پیدا کرنے، اور کبیدگی ختم کرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں، کیا یہ غیر فطری ہے؟

جنس اور صنف

تو اس مباحثے میں پڑنا ہی حماقت ہے کہ عورتوں کا قدرتی مقصد محض تولید ہے یا یہ کہ ہم جنس پرستی غیر فطری ہے۔ زیادہ تر قوانین، حقوق اور ذمہ داریاں جو مردانگی اور نسوانیت سے وابستہ ہیں، وہ حیاتیاتی حقائق کے بجائے انسانی تصور کا عکس ہیں۔

حیاتیاتی طور پر انسان نر و مادہ میں تقسیم ہیں۔ نر ہوموسیپین وہ ہے جس میں ایک ایکس کروموزوم ہو ایک وائی کروموزوم، جب کہ مادہ کے دونوں جنسی کروموزوم ایکس ہوتے ہیں۔ لیکن مرد اور عورت حیاتیاتی نہیں بلکہ سماجی اقسام کے نام ہیں۔ جب کہ بیشتر انسانی معاشروں کی کثیر اکثریت میں مرد نر ہوتا ہے اور عورت مادہ، ان سماجی ناموں سے بہت سے مسائل وابستہ ہیں، جن کا حیاتیاتی تفریق سے زیادہ تعلق نہیں ہے۔ مرد مخصوص حیاتیاتی خصوصیات کا حامل ہوموسیپین نہیں ہے، مثلاً ایکس وائی کروموزوم، خصیے، یا بہت سا ٹیسٹوسٹیرون (Testosterone) بلکہ وہ اپنے معاشرے کے تصوراتی انسانی قاعدے میں ایک مخصوص مقام رکھتا ہے۔ اس کی ثقافتی روایات اس سے ایک مخصوص مردانہ کردار (مثلاً سیاست میں حصہ لینا)، حقوق (مثلاً رائے شماری) اور فرائض (مثلاً عسکری سروس) کی امید رکھتی ہیں۔ اسی طرح عورت دو ایکس کروموزوم، ایک رحم اور بہت سے ایسٹروجن کی حامل سیپین نہیں ہے، بلکہ وہ تصوراتی انسانی قاعدے کی ایک زنانہ کردار ہے۔ اس کے معاشرے کی روایات اس سے مخصوص زنانے کام (مثلاً پرورش اطفال) اور فرائض (شوہر کی اطاعت) منسوب کرتی ہے۔ کیوں کہ مرد و عورت کے یہ فرائض اور ذمہ داریاں حیاتیات کے بجائے روایت سے طے ہوئی ہیں، تو مردانگی اور نسوانیت کے معنی بھی ایک معاشرے سے دوسرے میں بہت مختلف رہے ہیں۔

بات کو سلجھانے کے لیے ماہرین اکثر جنس جو کہ ایک حیاتیاتی لفظ ہے، اور صنف جو کہ ایک ثقافتی لفظ ہے کے درمیان تفریق رکھتے ہیں۔ جنس نر، وہ میں منقسم ہوتی ہے۔ اس تقسیم کی بنیاد ایسی خصوصیات پر مبنی ہے کہ جو تمام تاریخ میں نہیں بدلی۔ صنف کو مرد و عورت میں تقسیم کیا گیا (کچھ ثقافتیں مزید اصناف کو بھی تسلیم کرتی ہیں)۔ مردانگی اور نسوانیت کی بظاہر خصوصیات شخصیات پر منحصر ہیں اور بدلتی رہتی ہیں۔ مثلاً قدیم یونان میں عورتوں سے امید کیے جانے والے رویے، انکوں لباس اور نشست و برخاست کے انداز میں جدید یونانی عورت سے بہت دور رس اختلافات ہیں۔

اٹھارویں صدی کی مردانگی۔ فرانس کے شاہ لوئیس چہاردہم کی سرکاری تصویر۔ لمبی وگ، کولہوں تک موزے، اونچے ہیل کے جوتے، رقاصہ کا سا انداز اور بڑی تلوار قابل غور ہیں۔ موجودہ یورپ میں تلوار کے سوا یہ تمام خصوصیات نسائیت کی علامت تصور کی جاتی ہیں۔ لیکن اپنے زمانے میں لوئیس یورپی تصور مردانگی وقوت کا کمال نمونہ تھا۔

اکیسویں صدی میں مردانگی، باراک اوباما کی سرکاری تصویر۔ وہ وگ، اونچے موزے، اونچی ہیل اور تلوار کیا ہوئے؟ طاقت ور مرد کبھی اتنے سادہ، اور غیر پرکشش نہیں لگے جتنے آج۔ بیشتر تاریخ میں طاقتور مرد رنگ برنگے اور بھڑکیلے نظر آتے تھے، جیسے امریکی انڈین سردار اپنی ٹوپیوں میں لگے پروں کے ساتھ، یا ہندو مہاراجہ اپنے ریشمی ہیرے جڑے ملبوسات میں۔ تمام حیوانی دنیا میں مرد زیادہ رنگا رنگ اور لوازمات سے آراستہ ہوتے ہیں۔ مور کی دم اور شیر کی گردن پر بال کو ذہن میں رکھیے۔

جنس تو بچوں کا کھیل ہے لیکن صنف دشوار معاملہ ہے۔ جنسِ نر میں شمولیت دنیا کی آسان ترین چیز ہے۔ آپ کو صرف ایک ایکس اور ایک وائی کروموزوم کے ساتھ پیدا ہونا ہے۔ مادہ ہونا بھی اتنا ہی آسان ہے، ایکس کروموزوم کی ایک جوڑی سے یہ کام ہو جاتا ہے۔ لیکن اس کے مقابلے میں عورت یا مرد بننا بہت پیچیدہ اور دشوار عمل ہے۔ کیوں کہ بیشتر مردانہ و زنانہ خصوصیات حیاتیاتی نہیں بلکہ ثقافتی ہیں، تو کوئی معاشرہ خود بخود نر کو مرد اور مادہ کو عورت قرار نہیں دیتا۔ اور نہ ہی ایک بار یہ تمغہ مل جانے کے بعد ہمیشہ برقرار رہتا ہے۔ مردوں کو مستقل ساری زندگی اپنی مردانگی ثابت کرنی پڑتی ہے، گہوارے سے قبر تک، مختلف عملیات و فعلیات سے۔ اسی طرح ایک عورت کا کام بھی کبھی ختم نہیں ہوتا۔ اسے مستقل اپنے آپ کو اور دوسروں کو اپنی نسوانیت کا یقین دلانا ہوتا ہے۔

کامیابی یقینی نہیں ہے۔ مثلاً مرد مستقل اپنی مردانگی کا دعویٰ کھو دینے کے خوف میں مبتلا رہتے ہیں۔ تمام تاریخ مرد اپنی زندگی خطرے میں ڈالنے یا قربان کر دینے پر تیار ملے گا، محض اس لیے کہ لوگ کہہ سکیں: واقعی ایک حقیقی مرد ہے!

مردوں میں ایسی کیا بات ہے؟

کم از کم زرعی انقلاب سے بیشتر انسانی معاشرے پدرانہ معاشرے بن گئے جن میں مرد کو عورت سے زیادہ قدر ملی۔ بلا لحاظ اس کے کہ معاشرے میں مرد یا عورت کی کیا تعریف مقرر کی گئی ہے، مرد ہمیشہ فائدے میں رہے ہیں۔ پدرانہ معاشروں میں مردوں کو مردانگی اور عورتوں کو نسوانی فکر و عمل کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اگر کوئی اس تقسیم کو عبور کرنے کی جرات کرے تو سزاوار ٹھہرتا ہے۔ لیکن جو اپنے کردار صحیح طور سے نبھائیں ان کے انعام برابر نہیں ہیں۔ ان خصوصیات کی زیادہ قدر کی جاتی ہے جو زنانی خصوصیات کے مقابلے مردانہ تصور کی جاتی ہیں۔ عورتوں کی صحت اور تعلیم پر کم وسائل صرف کیے جاتے ہیں، انہیں کم اقتصادی مواقع فراہم ہوتے ہیں، کم سیاسی طاقت اور نقل و حمل کی کم آزادی۔ صنف ایسی دوڑ ہے جس میں بعض شریک صرف کانسی کے تمغے کے لیے ہی مقابلہ کرتے ہیں۔

یہ درست ہے کہ کچھ خواتین نے الفا پوزیشن بھی حاصل کی۔ مثلاً مصر کی قلوپطرہ، سات سو سال مسیحی چین میں ملکہ وو زیتین اور انگلستان کی ایلزبتھ اول۔ لیکن یہ وہ اتفاقات ہیں جن سے اصول ثابت ہوتا ہے۔ الزبتھ کے پینتالیس سالہ دور بادشاہت میں تمام اراکین پارلیمنٹ مرد تھے، شاہی بحریہ اور بری افواج کے تمام افسران مرد تھے، تمام جج اور وکلا مرد تھے، تمام ڈاکٹر اور سرجن مرد تھے، تمام کالجوں اور جامعات میں سارے طلبہ اور پروفیسر مرد تھے، تمام مذہبی علما اور راہب مرد تھے، تمام شیرف اور میئر مرد تھے اور تقریباً تمام لکھاری، نقشہ نویس، شاعر، فلسفی، مصور، موسیقار اور سائنسدان مرد تھے۔

تقریباً تمام زرعی اور صنعتی معاشروں میں پدرانہ پیرایہ غالب رہا ہے۔ اس نے انتہائی مستقل مزاجی سے تمام سیاسی بدحالیوں، سماجی انقلابوں اور اقتصادی تبدیلیوں کا مقابلہ کیا ہے۔ مثلاً ان صدیوں میں مصر کو کئی بار مختلف حکمرانوں نے فتح کیا: جیسے اسیری، ایرانی، بیسی ڈونین، رومن، عرب، مملوک، ترک اور برطانیہ لیکن اس کا معاشرہ پدرانہ ہی رہا۔ مصر پر فرعون، یونان، روم، اسلام، عثمانیہ اور برطانیہ کے قوانین لاگو ہوئے، اور یہ تمام ان لوگوں سے متعصب تھے جو "حقیقی آدمی" نہیں تھے۔

کیوں کہ پدرانہ پیرایہ اتنا عالمگیر ہے تو یہ کسی ایسی برائی کے تسلسلی وائرے کا نتیجہ نہیں ہو سکتا تو اتفاقاً شروع ہو گیا ہو۔۔۔ یہ بات خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ ۱۴۹۲ سے پہلے بھی امریکہ اور ایشیا کے زیادہ تر معاشرے پدرانہ تھے، گو ہزاروں سالوں سے وہ کسی باہمی رابطے میں نہیں تھے۔ اگر افرو ایشیا میں پدرانہ رویہ محض اتفاقی تھا تو ان کا

اوراز ٹیک کے معاشرے پدرانہ کیوں تھے؟ یہ بات زیادہ ممکن ہے کہ گرچہ عورت اور مرد کی تعریف ان معاشروں میں مختلف رہی ہو، لیکن شاید کوئی حیاتیاتی وجہ ہو کہ تقریباً سب معاشرے مردانگی کو نسوانیت پر ترجیح دیتے رہے۔ ہم اس وجہ سے واقف نہیں ہیں، نظریے بہت سے ہیں مگر اطمینان بخش کوئی نہیں۔

عضلاتی طاقت

سب سے عام رویہ عورتوں کے مقابلے میں مردوں کے قوی ہونے کا ہے۔ یہ کہ انہوں نے اپنی عضلاتی قوت سے مردوں کو دبائے رکھا۔ اسی سے وابستہ ایک ذرا مبہم نظریہ ہے کہ اپنی طاقت کی وجہ سے مرد زیادہ محنت طلب کاموں پر چھا گئے، مثلاً ہل چلانا فصل اتارنا، اس سے غذائی پیداواری وسائل ان کے قبضے میں رہے، جس کے نتیجے میں انہیں زیادہ سیاسی اثر رسوخ حاصل رہا۔

اس عضلاتی قوت پر زور دینے میں دو قباحتیں ہیں۔ اول تو یہ بات کہ مرد عورت سے زیادہ طاقتور ہوتا ہے صرف اوسط حد تک درست ہے اور وہ بھی چند مخصوص قوتوں کی بابت۔ عورتیں بھوک، بیماری، اور تھکاوٹ کا عموماً مردوں سے بہتر مقابلہ کرتی ہیں۔ ایسی بہت سی عورتیں ہیں جو بہت سے مردوں سے زیادہ تیز دوڑ سکتی ہیں یا زیادہ وزن اٹھا سکتی ہیں۔ پھر اس نظریہ میں ایک زیادہ اہم جھول یہ بھی ہے کہ تمام تاریخ میں عورتوں کو ایسے کاموں سے بھی باز رکھا گیا ہے جس میں زیادہ جسمانی مشقت درکار نہیں ہوتی (مثلاً پادری، قانون دان اور سیاست)، جب کہ وہ کھیتوں میں، گھر کے کام کاج اور دستکاری میں سخت جسمانی مشقت میں مصروف رہی ہیں اگر سماجی طاقت کو جسمانی قوت یا برداشت کی بنیادوں پر تقسیم کیا گیا تھا تو عورتوں کو اس سے کہیں زیادہ ملنی چاہیے تھی۔

اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ کہ انسانوں میں جسمانی قوت اور سماجی طاقت کے درمیان کوئی براہ راست تعلق نہیں ہے۔ ساٹھ سال کے لوگ عموماً بیس برس کے افراد سے زیادہ سماجی طاقت رکھتے ہیں، گرچہ بیس برس کے نوجوان اپنے بزرگوں سے کہیں زیادہ قوی ہوتے ہیں۔ انیسویں صدی کے وسط میں الباما کا کوئی زمیندار چند سیکنڈوں میں ہی اپنے کپاس کے کھیتوں میں کام کرنے والے غلاموں کے ہاتھوں زمیں بوس ہو سکتا تھا۔ فراعین مصر یا کیتھولک پوپ کے چناؤ کے لیے کوئی باکسنگ کا مقابلہ منعقد نہیں کیا جاتا۔ شکاری/متلاشی معاشروں میں کسی پہلوان کے بجائے عموماً بہترین سماجی تعلقات رکھنے والے کے پاس اقتدار ہوتا تھا۔ جرائم پیشہ گروہوں میں عموماً سب سے مضبوط آدمی ہی سردار نہیں ہوتا، وہ تو ایک عمر رسیدہ شخص ہوتا ہے، جو خود تو شاید ہی کبھی اپنے گھونسوں کا استعمال کرتا ہو۔ ایسی برائیاں وہ عموماً اپنے زیادہ نوجوان اور قوی افراد کے لیے چھوڑ دیتا ہے۔ کوئی شخص جو یہ سوچے کہ گروہ کی سربراہی ہتھیانے کا سب سے آسان طریقہ یہ ہے کہ ڈان کو مارا پیٹا جائے، اپنی غلطی سے سبق سیکھنے کے لیے زیادہ عرصہ زندہ نہیں رہے گا۔ بن مانسوں میں بھی الفا نر اپنا مقام دوسرے نر اور مادہ سے مستحکم تعلقات قائم کر کے حاصل کرتا ہے، بے مقصد تشدد کی بنا پر نہیں۔

بلکہ انسانی تاریخ اکثر شاہد رہی ہے کہ سماجی طاقت اور جسمانی قوت کے درمیان الٹا رشتہ ہے۔ اکثر معاشروں میں یہ نچلے طبقے ہیں جو محنت مزدوری کرتے ہیں۔ شاید یہ غذا کی فراہمی میں ہوموسیپین کی بالادستی کا عکس ہو۔ اگر بات محض جسمانی قوت ہی کی ہوتی تو انسان اس حیوانی دنیا کی غذائی فراہمی کی زنجیر میں کہیں وسط میں ہوتے، لیکن اپنی ذہنی وسماجی اہلیت کی بنا پر وہ سب سے اوپر ہیں۔ لہذا یہ بات فطری ہے کہ انکے اندر بھی طاقت کا سرچشمہ قوت کا اندھا استعمال نہیں بلکہ ذہنی وسماجی اہلیت ہے۔ لہذا یہ بات قابل یقین نہیں کہ تاریخ کی سب سے

اہم سماجی درجہ بندی مردوں کی عورتوں پر جسمانی زبردستی پر مبنی ہے۔

معاشرتی گند

ایک اور نظریہ یہ بتاتا ہے کہ مردانہ بالادستی کی وجہ جسمانی قوت نہیں بلکہ جارحانہ انداز ہے۔ کروڑوں سالوں کے ارتقانے مردوں کو عورتوں کے مقابلے میں زیادہ جارح بنادیا ہے۔ عورتیں نفرت، لالچ اور زیادتی میں مردوں کے شانہ بہ شانہ ہوسکتی ہیں، لیکن اس نظریے کے مطابق جب معاملہ بگڑ جائے تو مرد زیادہ آسانی سے جسمانی تشدد پر آمادہ ہوجاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ساری تاریخ جنگیں ایک مردانہ مسئلہ رہی ہیں۔

زمانہ جنگ میں افواج پر مردوں کے غلبے نے بھی انہیں سویلین معاشروں پر بھی غالب کردیا ہے۔ پھر وہ سویلین معاشروں پر اپنا غلبہ اور زیادہ جنگ و جدل کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ جنگوں کی تعداد جتنی زیادہ ہوگی، معاشرے پر مردوں کی بالادستی بھی اتنی ہی زیادہ ہوگی۔ یہ خود تسلسلی دائرہ جنگوں اور پدرانہ معاشرے کی پوری دنیا میں موجودگی کی وضاحت کرتا ہے۔

ہارمون اور نظام اہلیت پر نئی تحقیق اس مفروضے کو ثابت کرتی ہے کہ یقیناً مرد زیادہ جارح اور پر تشدد رویہ رکھتے ہیں اور اسی وجہ سے وہ عموماً عسکری خدمات کے لیے زیادہ موزوں ہیں۔ گو یہ درست ہے کہ زیادہ تر سپاہی مرد ہیں لیکن کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ جنگوں کا نظم و ضبط چلانے والے اور اس سے فائدہ اٹھانے والے بھی صرف مرد ہی ہیں؟ یہ بات قابل فہم نہیں۔ یہ تو ایسی ہی بات ہوتی کہ کیوں کہ کپاس کاشت کرنے والے سب غلام سیاہ فام تھے لہذا کھیتوں کا مالک بھی سیاہ فام ہونا چاہیے۔ بالکل جیسے صرف سیاہ فاموں پر مشتمل مزدوروں کو سفید فام انتظامیہ چلا سکتی ہے، تو صرف مردوں پر مشتمل فوج کی صرف عورتیں یا کم از کم جزوی طور پر عورتیں نگران ہوسکتی ہیں۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ لاتعداد معاشروں میں ساری تاریخ اعلیٰ فوجی حکام سپاہی سے ترقی کر کے فائز نہیں ہوئے تھے۔ اشرافیہ امرا اور تعلیم یافتہ افراد ایک دن بھی سپاہی کی خدمات انجام دیے بغیر براہ راست اعلیٰ فوجی عہدوں پر فائز ہوئے۔

جب نپولین کا مدمقابل، ڈیوک آف ویلنگٹن اٹھارہ سال کی عمر میں برطانوی فوج میں بھرتی ہوا تو وہ براہ راست ایک افسر کے طور پر متعین ہوا تھا۔ اسے اپنے ماتحت ادنیٰ افراد کے بارے میں زیادہ تردد نہیں ہوا۔ "ہماری فوج عام سپاہی کے طور پر زمین کا گند بھرتی ہے" فرانس کے خلاف جنگ کے دوران اس نے اپنے ایک ہم عصر کو لکھا۔ یہ عام سپاہی عموماً بہت غریب اور نسلی اقلیتوں (مثلاً آئرش کیتھولک) سے بھرتی کیے جاتے تھے۔ ان کے لیے فوجی عہدوں پر ترقی ہ امکان نہ ہونے کے برابر تھا۔ اعلیٰ عہدے عموماً ڈیوک، شاہزادوں اور بادشاہوں کے لیے مقرر تھے۔ لیکن صرف ڈیوک کے لیے ہی کیوں ڈچس کے لیے کیوں نہیں؟

افریقہ میں فرانسیسی سلطنت کا قیام اور وقائع سینیگال، الجیریا اور غریب فرانسیسی افراد کے خون پسینے کا رہین منت تھا۔ فرانسیسی اشرافیہ کا تناسب نہ ہونے کے برابر تھا۔ لیکن پھر بھی ان اشرافیہ کا تناسب سربراہان فوج کے مختصر گروہ میں جو فوج کی سالاری کرتے، سلطنت چلاتے اور اس کے فوائد حاصل کرتے بہت زیادہ تھی۔ لیکن صرف فرانسیسی مرد ہی کیوں خواتین کیوں نہیں؟

چین میں فوج کو سویلین نوکر شاہی کے ماتحت رکھنے کی روایت قدیم تھی، تو وہ مینڈیرین جنہوں نے کبھی تلوار بھی نہ پکڑی ہوا کثر جنگوں کی حکمت عملی کرتے۔ ایک عام چینی کہاوت کے مطابق: اچھے لوہے کو کیلیں بنانے میں ضائع نہیں کرتے، یعنی واقعی صرف اہل لوگ نوکر شاہی کی ملازمت کرتے ہیں، فوج کی نہیں۔ لیکن پھر یہ

سارے مینڈ یرین مرد ہی کیوں تھے؟

کوئی یہ دلیل تو نہیں دے سکتا کہ ان کی جسمانی کمزوری یا ٹیسٹو اسٹیرون کی کمی عورتوں کو کامیاب مینڈ یرین جرنیل اور سیاست دان بننے میں مانع ہوگی۔ جنگ لڑنے کے لیے یقیناً برداشت بہت ضروری ہے لیکن زیادہ جسمانی طاقت یا جارحانہ رویہ نہیں۔ یہ جنگیں مے خانوں کے فساد نہیں بلکہ بہت پیچیدہ پراجیکٹ ہیں جن کے لیے تنظیم، تعاون اور رضامندی درکار ہیں۔ گھر میں امن قائم کرنا، باہر حلیف تیار کرنا اور یہ جاننا کہ دوسروں (بالخصوص آپ کے دشمن) کے ذہن میں کیا ہے، عموماً کامیابی کی کلید ہے۔ لہذا کوئی وحشی، جارح عموماً جنگی حکمت عملی کے لیے سب سے بیکار انتخاب ہے۔ سب سے اچھا ایک معاون شخص ہے جو جانتا ہے کہ کیسے خوش رکھنا ہے، کیسے لوگوں کو استعمال کرنا ہے اور کسی چیز کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لینا ہے۔ قوموں کے معمار ان ہی صلاحیتوں کے حامل ہوتے ہیں۔ ناکام فوجی سربراہ آگسٹس ایک مستحکم شاہانہ سلطنت کے قیام میں کامیاب رہا تھا، اور وہ مقصد حاصل کیا تھا جس کے حصول میں جولیس سیزر اور اسکندر اعظم دونوں ناکام رہے تھے، گو وہ خاصے بہتر فوجی جرنیل تھے۔ اس کے متعارف ہم عصر اور جدید مورخ اکثر اس کامیابی کی وجہ نرم دلی اور رحم دلی بتاتے ہیں۔

عورتیں تو دوسروں سے کام لینے اور خوش رکھنے میں مردوں سے زیادہ بہتر ہیں، اور دوسروں کی نظر سے اشیا کو دیکھنے میں بھی شہرت رکھتی ہیں۔ اگر اس روایت میں سچائی ہوتی تو عورتیں بہترین سیاست دان اور سلطنتوں کی معمار ہوتیں، اور میدان جنگ کی قتل و غارت گری کو ٹیسٹو اسٹیرون سے لبریز لیکن سادہ لوح جنگجوؤں کے لیے چھوڑ دیتیں۔ مقبول روایات کچھ بھی ہوں، دنیا میں ایسا کم ہی ہوا ہے۔ یہ بات واضح نہیں ہے کہ ایسا کیوں نہ ہوسکا۔

پدرانہ جین

ایک تیسرا حیاتیاتی نظریہ جارحیت اور تشدد کو کم کر کے بتاتا ہے۔ اس کے مطابق کروڑوں برسوں کے ارتقا میں مردوں اور عورتوں نے اپنی بقا اور افزائش کے لیے مختلف حکمت عملی اپنائی ہیں۔ جب مرد زرخیز عورتوں میں حمل ٹھہرانے کے لیے آپس میں مقابلہ کرتے تو کسی فرد کی افزائش نسل کا دارومدار سب سے زیادہ دوسروں سے سبقت لے جانے اور شکست دینے میں مضمر تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ مردانگی کی جو جین دوسری نسلوں تک منتقل ہوئی وہ زیادہ جارح، مقابلے کے اہل اور پرعظم مرد تھے۔

لیکن کسی عورت کو کوئی مرد ڈھونڈنے میں دشواری نہیں ہوتی جو اس میں حمل ٹھہرانے میں کامیاب ہو۔ لیکن اگر وہ امید رکھتی کہ اس کی اولادوں کے ہاں بھی اولادیں ہوں تو انہیں نو دس مہینے اپنے رحم میں رکھنے کی ضرورت ہوتی اور بعد میں بھی سالوں پرورش کرے۔ اس دوران اس کے پاس غذا کے حصول کے مواقع کم ہوتے اور اسے بہت مدد کی ضرورت ہوتی۔ اسے ایک مرد کی ضرورت تھی۔ خود اپنے اور اپنے بچوں کی بقا کے لیے اس کے پاس اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں تھا کہ مرد کی ہر بات مان لے، تاکہ وہ اس کے ساتھ رہے اور اس کا بوجھ اٹھانے میں مدد کرے۔ یوں وقت گزرنے کے ساتھ آئندہ نسلوں تک جو نسوانی جین منتقل ہوئیں وہ زیادہ تابعدار ماؤں کی تھیں۔ وہ عورتیں جنہوں نے اپنا بیشتر وقت طاقت کے حصول میں جنگ کرتے گزارا وہ یہ طاقتور جین آئندہ نسلوں تک منتقل نہ کر سکیں۔

اس نظریے کے مطابق بقا کی ان مختلف تدابیر کا نتیجہ یہ نکلا کہ مرد کی ساخت میں مقابلہ بازی، سیاحت اور تجارت میں آگے بڑھنے کی امنگ شامل ہوگئی۔ جب کہ عورتیں راستے سے ہٹ جانے اور اپنی زندگیاں بچوں کی پرورش کے لیے وقف کر دینے کی عادی ہوگئیں۔

لیکن عموی مشاہدات ان دلائل کے حق میں نہیں۔ خاص طور پر یہ دلیل کہ عورتوں کے بیرونی امداد پر انحصار نے انہیں دوسری عورتوں کے مقابلے میں انہیں مردوں کے تابع کر دیا، اور یہ کہ مقابلہ بازی نے مردوں کو سماجی برتری کا موقع فراہم کیا۔ جانوروں کی کئی اسپیسی میں، مثلاً ہاتھی اور بوزنوں میں ضرورت مند مادہ اور مقابلہ پرست نر کے مابین تعلقات کچھ اس ڈھب سے سنورتے ہیں کہ ان میں مادرانہ معاشرہ تشکیل پاتا ہے۔ کیوں کہ ماداؤں کو بیرونی مدد کی ضرورت ہوتی ہے تو وہ سماجی تعلقات، تعاون اور رضامندی کی خصوصیات پیدا کر لیتی ہیں۔ ان میں صرف ماداؤں پر مبنی سماجی نظام جنم لیتے ہیں جو بچوں کی پرورش میں ایک دوسرے کی مدد کریں، جب کہ نر اپنا وقت مقابلہ بازی اور لڑنے میں گزارتے ہیں، ان کی سماجی اہلیت اور سماجی تعلقات پنپ نہیں پاتے۔ ہاتھیوں اور بوزنوں کے معاشروں میں تعاون کرنے والی ماداؤں کی معاشرتی تنظیم مضبوط ہے، جب کہ خودغرض اور تعاون نہ کرنے والے نر محض حاشیائی ہیں۔ گو بوزنی مادائیں اپنے بوزنے مردوں سے جسمانی طور پر کمزور ہوتی ہیں، لیکن اگر کوئی نر اپنی حدود سے تجاوز کر جائے تو مادائیں یکجا ہو کر اسے سبق سکھاتی ہیں۔

اگر بوزنوں اور ہاتھیوں میں یہ ممکن ہے تو ہوموسیپین میں کیوں نہیں؟ سیپین نسبتاً کمزور جانور ہیں، جن کی طاقت ان کی آپس میں بڑے پیمانے پر تعاون کرنے کی صلاحیت میں پوشیدہ ہے۔ اگر ایسا ہے تو ہمیں امید رکھنی چاہیے کہ ضرورتمند عورتیں، گرچہ وہ مردوں پر انحصار بھی کرتی ہوں، وہ اپنے تعاون کی اعلیٰ سماجی قدروں کے استعمال سے جارح، خودمختار اور خودغرض مردوں کو شکست دے سکتی ہیں۔

تو یہ کیسے ممکن ہوا کہ ایک اسپیسی جس کی کامیابی کا دارومدار سب سے زیادہ تعاون پر منحصر تھا، اس میں وہ افراد جو اتنے زیادہ تعاون پر راضی نہیں ہوتے (مرد) ان پر چھا گئے جو زیادہ تعاون پر آمادہ ہوں (عورتیں)؟ فی الوقت ہمارے پاس اس کا کوئی اطمینان بخش جواب نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ یہ عام مفروضہ غلط ہو۔ ممکن ہے کہ اس اسپیسی ہوموسیپین کے مرد کی خصوصیات جسمانی قوت، جارحیت اور مقابلہ بازی نہ ہو بلکہ اعلیٰ سماجی روابط اور تعاون کا بہتر رویہ ہو، کون کہہ سکتا ہے؟

لیکن اتنا ہم ضرور جانتے ہیں کہ پچھلی صدی کے دوران اصناف کے کردار میں بہت تبدیلی آئی ہے۔ آج زیادہ سے زیادہ معاشرے نہ صرف عورتوں اور مردوں کو برابر قانونی حقوق، سیاسی مقام اور اقتصادی مواقع دیتے ہیں بلکہ صنف اور جنس کی بنیادی تعریف ہی تغیر پذیر ہے۔ اگرچہ اصناف کے درمیان تفریق اب بھی بہت واضح ہے لیکن حالات بہت تیزی سے تبدیل ہو رہے ہیں۔ بیسویں صدی کے آغاز میں عورتوں کو رائے شماری کا حق دینے کا خیال بھی امریکہ میں بعید از قیاس تھا، کسی خاتون کا کابینہ میں وزیر بننا یا عدالت عالیہ میں جج مقرر ہونا تو مضحکہ خیز خیال تھا۔ ہم جنس پرستی ایسا شجر ممنوعہ تھا کہ جس پر کھل کر گفتگو بھی نہیں ہو سکتی تھی۔ اکیسویں صدی کے آغاز میں عورتوں کا حق رائے شماری تو سامنے کی بات ہے، کابینہ میں خاتون وزیر ہونا کوئی قابل ذکر بات نہیں، اور ۲۰۱۳ء میں عدالت عالیہ کے پانچ جج، جن میں تین خواتین بھی شامل تھیں، انہوں نے ہم جنس پرستی کو قانونی تحفظ دینے کے حق میں رائے دی (اور چار مرد ججوں کی رائے کو مسترد کر دیا)۔

جیسا کہ آج صاف ظاہر ہے ان ڈرامائی تبدیلیوں سے صنف کی تاریخ بہت حیران کن ہے۔ اگر پدرانہ نظام حیاتیاتی حقائق کے بجائے مفروضوں پر قائم ہے تو اس نظام کی بقا اور عالمگیریت کی کیا وجہ ہے؟

O

حصہ سوئم: انسانیت کا یکجا ہونا
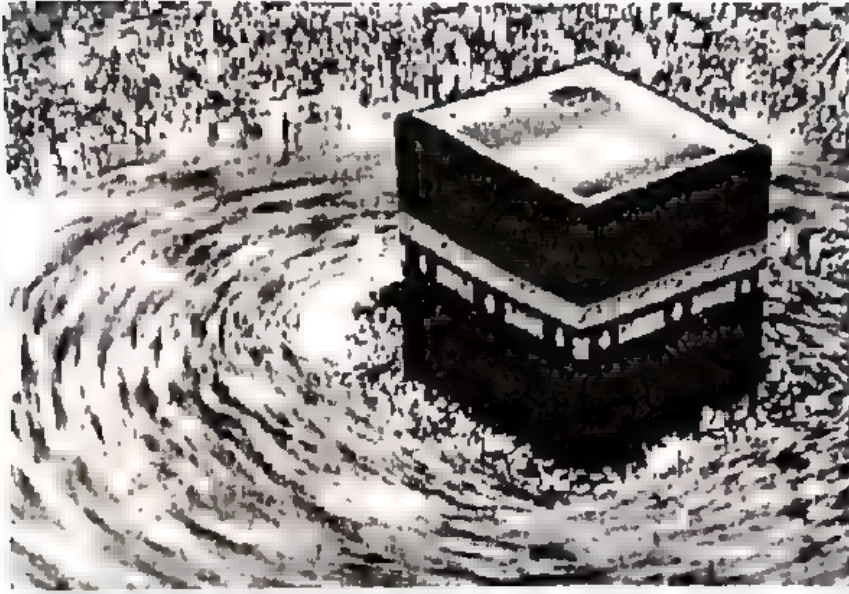
کعبہ کا طواف کرتے حجاج

تاریخ کا تیر

زرعی انقلاب کے بعد سے انسانی معاشرے زیادہ بڑے اور پیچیدہ ہوگئے۔ وہ مفروضی قاعدے جوان سماجی نظاموں کو برقرار رکھتے تھے وہ بھی وسیع تر ہوگئے۔ مفروضوں اور کہانیوں کے سبب افراد پیدائش سے ہی ایک مخصوص اندازِ فکر رکھنے لگے۔ چند مروجہ اصولوں کے تحت زندگی گزرنے لگی، چند ہی خصوصیات کی خواہش ہوتی اور چند مخصوص اصولوں کی پابندی کرتے۔ یوں ایک مصنوعی حسیت پیدا ہوتی جس کی وجہ سے کروڑوں افراد موثر انداز میں ایک دوسرے سے تعاون کرتے۔ مصنوعی حسیت کے اس جال کو ثقافت کا نام دیا گیا۔

بیسویں صدی کے پہلے حصے میں ماہرین ہمیں یہ بتاتے رہے کہ ہر ثقافت مکمل اور متوازن ہوتی ہے اور اس کا اپنا ایک مخصوص عطر ہوتا ہے، جس کی خوشبو اس کی پہچان بنتی ہے۔۔ ہر انسانی گروہ کا دنیا کے بارے میں اپنا ایک مخصوص اندازِ فکر تھا۔ سماجی، سیاسی اور قانونی نظام ایسی سہولت سے چلتے رہتے جیسے سورج کے گرد گھومتے سیارے۔ اس فکر کے مطابق اگر کسی ثقافت کو اس کے اپنے اسلوب پر چھوڑ دیا جائے تو وہ بدلتی نہیں ہے۔ صرف کوئی خارجی طاقت ہی ثقافت کو بدل سکتی ہے۔ لہٰذا ماہرین بشریات، مورخ اور سیاست دان ساموا کی ثقافت اور تسمانیہ کی ثقافت کا حوالہ دینے لگے، جیسے کہ ساموا، تسمانیہ کی ثقافتوں کے معمولات، ایقان اور قوائد ابتدائے آفرینش سے ایک ہی رہے ہوں۔

آج ثقافت کے بیشتر ماہرین کا خیال ہے کہ حقائق اس کے بالکل برعکس ہیں۔ ہر ثقافت کے اپنے مخصوص معمولات، ایقان و قواعد ہوتے ہیں، لیکن یہ مستقل طور پر تغیر پذیر رہتے ہیں۔ کوئی بھی ثقافت اپنے آپ کو ماحولیات کے زیرِ اثر یا کسی ہمسایہ ثقافت کے میل جول سے بدل سکتی ہے۔ لیکن یہ ثقافتیں خود اپنے اندرونی محرکات سے بھی بدل سکتی ہیں۔ اکثر کوئی بہت تنہا ثقافت جو بالکل مستحکم ماحول میں پروان چڑھ رہی ہو وہ بھی تبدیلی سے نہیں بچ سکی۔ طبیعات کے قوانین کے برعکس جو کہ کسی بھی تضاد سے پاک ہوتے ہیں، انسان کے بنائے قوانین اندرونی تضادات سے آلودہ ہوتے ہیں۔ ثقافتیں ہمیشہ ان تضادات کو مٹانے کے درپے رہتی ہیں، اور یہی عمل تبدیلی کو ہوا دیتا ہے۔

مثلاً قدیم یورپ میں اشراف عیسائیت اور مہم جوئی دونوں پر یقین رکھتے۔ اشرافیہ کا ایک عام رکن صبح میں چرچ جاتا اور پادری سے صوفیا کی زندگی کا بیان سنتا۔ سادگی میں سادگی، پادری کہتا، امارت، شہوت اور عزت خطرناک آزمائشیں ہیں ان سے دور رہو اور مسیح کی پیروی کرو۔ اس کی طرح حلیم بنو، تشدد اور دکھاوے سے بچو، اور اگر تم پر حملہ کیا جائے تو اپنا دوسرا رخسار پیش کرو۔ گھر لوٹتے ہوئے سوچ میں گرفتار، حلیم الطباع، یہ شریف آدمی اپنے

بہترین پارچے زیب تن کیے، عشائیے کے وقت اپنے آقا کے قلعے میں تشریف لے جاتے، وہاں شراب پانی کی مانند بہتی، مغنی لینسلوٹ (شاہ آرتھر کا سالار) اور گوئناویر (شاہ آرتھر کی بیٹی) کے گیت گاتے، فحش مذاق کرتے اور جنگوں کی داستانیں سناتے۔ بجائے شرمندگی میں زندگی بسر کرنے کے، توہین اعلان کرتے، اس سے تو بہتر ہے کہ آدمی مر جائے، اگر کوئی آپ کی عزت پر ہاتھ ڈالے تو صرف خون ہی اس بے عزتی کو دھو سکتا ہے۔ اپنے دشمن کو بھاگتے دیکھنے سے بہتر کیا نظارہ ہو سکتا ہے، جب کہ دشمن کی دختران خوب رو آپ کے قدموں میں پڑی کانپ رہی ہوں؟

یہ تضاد کبھی مکمل طور پر حل نہیں ہوا۔ لیکن جب یورپی اشرافیہ، مولوی اور عوام نے اس پر غور کیا تو ان کی ثقافت بدل گئی۔ اسے حل کرنے کا ایک طریقہ تو صلیبی جنگیں تھیں۔ صلیبی جنگوں میں سالار اپنی مذہبی عقیدت اور عسکری قوت کا بیک وقت اظہار کر لیتے۔ ان ہی تضادات کی وجہ سے خود مختلف فوجی گروہوں نے جنم لیا مثلاً ٹمپلرز اور ہاسپٹالرز، جنہوں نے عیسائیت اور مہم جوئی کو مزید سختی سے باہم جوڑ دیا۔ قدیم آرٹ اور ادب نے بھی بڑی تعداد میں اسی سے جنم لیا، مثلاً شاہ آرتھر کے مقدس پیالے (ہولی گریل) کی کہانیاں۔ کیملوٹ (شاہ آرتھر کا دربار اور قلعہ) یہ ثابت کرنے کی کوشش کے سوا اور کیا ہے کہ ایک اچھے سپہ سالار کو ایک اچھا عیسائی بھی بننا چاہیے اور صرف اچھے عیسائی ہی اچھے سپاہی بنتے ہیں؟

ایک اور مثال جدید سیاسی نظام ہے۔ فرانسیسی انقلاب کے بعد سے دنیا بھر کے لوگ بتدریج شخصی آزادی اور برابری کے اصولوں کو بنیادی حقوق تصور کرنے لگے ہیں، حالانکہ یہ دونوں حقوق ایک دوسرے کی نفی کرتے ہیں۔ برابری تو صرف اسی صورت ممکن ہے کہ جب آپ امرا کے حقوق سلب کر لیں۔ یہ ضمانت کہ ہر شخص کو اپنی مرضی سے رہنے کی اجازت ہے بالآخر برابری کی نفی کرتی ہے۔ ۱۷۸۹ء سے دنیا کی مکمل سیاسی تاریخ اسی تضاد کو حل کرنے کی جدوجہد سے رقم ہے۔

جس نے بھی چارلس ڈکنز کا ناول پڑھا وہ اس بات سے واقف ہے کہ انیسویں صدی کا یورپ شخصی آزادی کو زیادہ اہمیت دیتا تھا، چاہے اس کے لیے غریب خاندانوں کو داخل زندان کرنا پڑے، اور یتیموں کے پاس سوائے جیب کتروں کے اسکول جانے کے کوئی چارہ نہ ہو۔ جس نے بھی الیگزینڈر سولژے نتسن کا ناول پڑا ہے وہ جانتا ہے کہ مساواتِ انسانی کے کمیونسٹ خیال کو لاگو کرنے کے لیے کتنا ظالمانہ نظام نافذ کیا گیا تھا، جو زندگی کے ہر رخ پر قابض تھا۔

جدید امریکی سیاست بھی اسی تضاد کے گرد گھومتی ہے۔ ڈیموکریٹ ایک زیادہ برابری کی بنیادوں پر استوار معاشرے کے خواہاں ہیں، جس میں غربا، بزرگ اور ناتواں کی مدد کے لیے وسائل مزید ٹیکس لگا کر ہی حاصل کیے جائیں۔ لیکن اس سے اپنی آزادی سے اپنی دولت خرچ کرنے کی شخصی آزادی پر ضرب لگتی ہے۔ حکومت مجھے کیوں کر صحت کا بیمہ خریدنے پر مجبور کرتی ہے اگر میں اپنا پیسا اپنی اولاد کو کالج بھیجنے پر صرف کرنا چاہتا ہوں۔ جب کہ دوسری جانب رپبلیکن شخصی آزادی کے انتہائی داعی ہیں، چاہے اس سے امیر اور غریب کے درمیان خلیج اور گہری ہو جائے، اور بہت سے امریکی صحت کا بیمہ خریدنے کے قابل ہی نہ رہ جائیں۔

بالکل جیسے قدیم ثقافتیں مہم جوئی کی عیسائیت سے نسبت نہیں رکھ سکتی تھیں، اسی طرح جدید دنیا بھی آزادی اور برابری کا ملاپ نہیں کر سکی ہے۔ لیکن یہ کوئی نقص نہیں ہے۔ ایسے تضادات ہر انسانی ثقافت کا ناگزیر حصہ

ہیں، بلکہ درحقیقت یہی ثقافت کا محرک ہیں۔ ہماری اسپیسی کے تخلیقی اور حرکی احوال کا منبع۔ بلکہ جیسے کبھی موسیقی کے دو متضاد سُر مل کر اسے آگے بڑھاتے ہیں، اسی طرح ہماری فکر، خیال اور قدریں تضاد ہمیں مجبور کرتا ہے کہ ہم دوبارہ سوچیں، پرکھیں اور تنقید کریں۔ یکسانیت تو حماقت کے کھیل کا میدان ہے۔

اگر ہر ثقافت تناؤ، تضادات اور نا قابل حل معموں سے آراستہ ہے تو کسی بھی مخصوص ثقافت کا ہر فرد متضاد اعتقادات کا مالک ہوگا، اور اس کے تیقن کی عمارت متضاد قدروں پر کھڑی ہوگی۔ یہ ہر ثقافت کا ایسا بنیادی جز ہے کہ اسے اہلیت کی ناہمواری کہا گیا ہے۔ اہلیت کی ناہمواری کو اکثر انسانی نفسیات کی ناکامی کہا جاتا ہے۔ اگر افراد متضاد یقین اور اقدار کے مالک نہ ہوتے تو شاید ثقافت مرتب ہو کر قائم نہ رہتی۔

مثلاً فرض کیجیے کہ کوئی عیسائی واقعی کسی مسلمان کے عقائد کے بارے میں جاننا چاہتا ہے جو نکڑ والی مسجد میں جاتا ہے، تو اسے وہ بنیادی عقائد تلاش نہیں کرنے چاہییں جسے ہر مسلمان عزیز رکھتا ہے۔ بلکہ مسلمان ثقافت کے وہ تضادات دریافت کرنے چاہییں جہاں قوانین باہم دست و گریباں ہوں اور اصول مصروف پیکار ہوں۔ آپ مسلمانوں کو صحیح طریقے سے وہاں سمجھ سکیں گے جہاں وہ دو مختلف لازموں میں منقسم ہو رہے ہوں۔

مصنوعی جاسوسی سیارہ

انسانی ثقافتیں مسلسل تغیر پذیر ہیں۔ کیا یہ تغیر بے سمتی ہے، یا اس کا کوئی نظام ہے؟ یا دوسرے الفاظ میں کیا تاریخ کی کوئی سمت ہے؟

اس کا جواب اثبات میں ہے۔ ہزاروں سالوں میں چھوٹی، سادہ ثقافتیں مل کر بڑی اور پیچیدہ ثقافتوں میں ڈھل جاتی ہیں، یوں آہستہ آہستہ دنیا میں کم سے کم ترین صرف بہت بڑی ثقافتیں ہی رہ جاتی ہیں، جو زیادہ بڑی اور پیچیدہ ہوتی ہیں۔ یہ بہت بلندی سے ایک عمومی سا جائزہ ہے۔ اگر بہت نزدیک سے دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ جہاں بہت سی چھوٹی ثقافتیں مل کر بڑی ثقافت بناتی ہیں، وہیں کوئی بڑی ثقافت چھوٹے ٹکڑوں میں ٹوٹ رہی ہوتی ہے۔ منگول سلطنت اتنی پھیلی کہ اس نے ایشیا کا ایک بڑا حصہ اور یورپ کے کچھ حصے بھی محکوم کر لیے، لیکن پھر بکھر گئی۔ عیسائیت نے کروڑوں انسانوں کا عقیدہ تبدیل کیا، لیکن پھر ان گنت فرقوں میں تقسیم ہو گئی۔ لاطینی زبان وسطی اور مغربی یورپ میں پھیلی لیکن پھر مقامی بولیوں میں منقسم ہوئی، جو وقت آنے پر قومی زبانیں بن گئیں۔ لیکن یہ انتشار عارضی ہوتا ہے ورنہ ایک دائمی عمل تو چھوٹی ثقافتوں کا مل کر بڑی ثقافتوں کو جنم دینا ہے۔

تاریخ کی سمت معلوم کرنے کا دار و مدار ناظر کی سکونت پر ہے۔ اگر ہم تاریخ کو بلندی سے، کسی پرندے کی آنکھ سے دیکھیں، جو تاریخ کے تغیرات کو دہائیوں یا صدیوں کے حصوں میں دیکھتی ہو، تو یہ کہنا دشوار ہوگا کہ تاریخ ایک اکائی کی سمت متحرک ہے یا انتشار کی جانب۔ لیکن طویل المدت تبدیلی کو جانچنے کے لیے پرندے کی آنکھ بہت نزدیک ہے! اس کے بجائے ہمیں کسی آسمانی مصنوعی سیارے کی آنکھ سے دیکھنا ہوگا جو صدیوں کے بجائے ہزاروں سالوں کے عرصوں کو دیکھ سکے۔ اس بلندی سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ تاریخ ایک عزم سے اکائی کی جانب رواں دواں ہے۔ عیسائیت کی فرقوں میں تقسیم یا منگول سلطنت کا بکھر جانا تاریخ کے سفر میں محض عارضی پڑاؤ ہیں۔

تاریخ کی عمومی سمت کو دیکھنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ زمین پر کسی بھی زمانے میں موجود جداگانہ انسانی

دنیاؤں کو شمار کیا جائے۔ آج ہم اپنے سیارے کو ایک ہی یونٹ کے طور پر سمجھنے کے عادی ہیں۔ لیکن درحقیقت تمام تاریخ یہ زمین چھوٹی انسانی دنیاؤں کی ایک کہکشاں رہی ہے۔

آسٹریلیا کے جنوب میں ایک درمیانے رقبے کے جزیرے تسمانیہ کی مثال لیجیے۔ برفانی دور کے خاتمے پر برف پگھلنے سے سطح سمندر اتنی بلند ہو گئی تھی کہ یہ دس ہزار سال ق م میں آسٹریلیا سے بالکل الگ ہو گیا تھا۔ اس جزیرے پر فقط چند ہزار شکاری/متلاشی باقی رہ گئے تھے، جن کا انیسویں صدی میں یورپین کی آمد تک دوسرے انسانوں سے کوئی رابطہ نہیں تھا۔ تقریباً بارہ ہزار سال پہلے تک تو کسی معلوم بھی نہیں تھا کہ تسمانین بھی وجود رکھتے ہیں، اور نہ ہی تسمانیہ والوں کو کسی اور انسان کی موجودگی کی آگاہی تھی۔۔ ان کی اپنی جنگیں، سیاسی جدوجہد، سماجی تغیرات تھے، اور ثقافت کی نمو تھی۔ لیکن چین کے شہنشاہ یا میسوپوٹیمیا کے باشندوں کے لیے تو تسمانیہ ایسا ہی تھا جیسے جیوپیٹر کے کسی چاند پر واقع ہو۔ تسمانیہ والوں کی خود اپنی الگ دنیا تھی۔

اپنی بیشتر تاریخ میں امریکہ اور یورپ بھی علیحدہ دنیائیں تھیں۔ ۳۷۸ عیسوی میں رومن شہنشاہ ویلنس کو ایڈریانوپل (Adrianople) کی جنگ میں گوتھوں (Goths) نے شکست دے کر ہلاک کر دیا تھا۔ اسی سال ٹیوٹی واکان (Teotihuacan) کی فوج نے ٹکال (Tikal) کے بادشاہ شیک ٹوک ایشاک (Chak Tok Ichaak) کو شکست دے کر ہلاک کر دیا تھا۔ (ٹکال مایا سلطنت کا ایک اہم شہر تھا جب کہ ٹیوٹی واکن امریکہ کا سب سے اہم شہر تھا، جس کی ڈھائی لاکھ آبادی ہم عصر رومنوں کے ہم پلہ تھی)۔ روم کے زوال اور ٹیوٹی واکن کی فتح میں اتنا ہی ربط تھا، جتنا اگر روم مریخ پر اور ٹیوٹی واکن مشتری پر ہوتے تو ممکن تھا۔

بیک وقت زمین پر کتنی مختلف انسانی دنیائیں موجود تھیں؟ تقریباً دس ہزار سال قبل مسیح میں ہمارے سیارے پر ان کی تعداد ہزاروں میں تھی۔۔ دو ہزار سال قبل مسیح تک یہ تعداد کم ہو کر چند سو یا زیادہ سے زیادہ چند ہزار رہ گئی تھی۔ ۱۴۵۰ میں ان کی تعداد ایک بار پھر بہت کم ہو گئی تھی۔ اس وقت یعنی یورپی مہم جوئی سے پہلے دنیا پھر بھی بہت سی تسمانیہ جیسی مختصر دنیاؤں پر مشتمل تھی۔ لیکن نوے فیصد انسانی آبادی ایک بہت بڑی دنیا، افروایشیا میں مقیم تھی۔ بیشتر یورپ، اور افریقہ (جس میں افریقی صحارا کے بہت بڑے حصے بھی شامل تھے)، اس وقت تک اہم ثقافتی، سیاسی اور اقتصادی روابط رکھتے تھے۔ دنیا کی باقی دس فیصد آبادی چار بڑے رقبوں اور پیچیدہ حصوں میں آباد تھی:

۱۔ میسوامریکی (MesoAmerican) دنیا، جس میں وسطی اور شمالی امریکہ کے حصے شامل تھے

۲۔ انڈیز جس میں جنوب مغربی امریکہ کا بیشتر رقبہ شامل تھا

۳۔ آسٹریلیائی دنیا، جو براعظم آسٹریلیا پر مشتمل تھا

۴۔ سمندری دنیا، جس میں ہوائی سے نیوزی لینڈ تک زیادہ تر جنوب مغربی بحرالکاہل کے جزائر شامل تھے۔

اگلے تین سو سالوں میں افروایشیائی دیوان تمام چھوٹی دنیاؤں کو ہڑپ کر گیا۔۔ میسوامریکی دنیا ۱۵۲۱ میں شامل ہوئی جب اسپین نے ازٹیک سلطنت کو زیر کیا۔۔ اسی زمانے میں وہ پہلی بار سمندری دنیا سے بھی آشنا ہوا جب فرڈیننڈ میگیلن (Ferdinand Magellan) نے دنیا کا بحری سفر کیا اور اس کے کچھ عرصے بعد ہی اپنی فتوحات مکمل کیں۔ جب اسپین کے فاتحین نے ۱۵۳۲ میں انکا سلطنت کو کچل دیا تو انڈیز دنیا بھی مل گئی۔ یورپی قدم پہلی بار آسٹریلیا ۱۶۰۶ میں پہنچے۔ اس شفاف دنیا کا اس وقت خاتمہ ہوا جب ۱۷۸۵ میں برطانوی توسیع پسندی نے

باقاعدہ شکل اختیار کر لی۔۔ پندرہ برس بعد برطانیہ نے تسمانیہ میں اپنی آبادی قائم کر کے آخری آزاد انسانی دنیا کو بھی افروایشیائی تسلط میں لے لیا۔

افروایشیائی دیو کو یہ سب ہضم کرنے میں کئی صدیاں لگیں، لیکن یہ عمل نا قابل واپسی تھا۔ آج تقریباً تمام انسان ایک ہی ارضی سیاسی نظام میں اشتراک کرتے ہیں (پورا سیارہ بین الاقوامی طور پر تسلیم شدہ ریاستوں میں منقسم ہے)۔ ایک ہی اقتصادی نظام (سرمایہ دارانہ نظام دنیا کے دور دراز خطوں پر بھی اثر انداز ہوتا ہے)، ایک ہی قانونی نظام (انسانی حقوق اور بین الاقوامی قوانین کم از کم لفظی طور پر تو لاگو ہیں) اور ایک ہی سائنسی نظام (ایران، اسرائیل، آسٹریلیا اور ارجنٹینا کے ماہرین سب ہی جوہر کی ساخت اور تپ دق کے علاج پر متفق ہیں)۔

یہ واحد انسانی ثقافت ہموار نہیں ہے۔ جیسے کوئی نامیاتی جسم مختلف اقسام کے اعضا اور خلیوں پر مشتمل ہوتا ہے، اسی طرح ہماری ارضی ثقافت بھی نیویارک کے حصص کے دلالوں سے افغانستان کے چرواہوں تک افراد کی متنوع طرز زندگی پر مشتمل ہے۔ پھر بھی وہ ایک دوسرے سے قریبی وابستگی رکھتے ہیں، اور مختلف طریقوں سے ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے رہتے ہیں۔ وہ اب بھی لڑتے اور الجھتے ہیں۔ لیکن وہ ایک ہی جیسے فکری رویوں کو استعمال کر کے بحث کرتے ہیں اور ایک ہی جیسے ہتھیاروں سے لڑتے ہیں۔ کوئی حقیقی تہذیبی جنگ تو محض کسی بہروں کے درمیان گفتگو کی مانند ہے، جس میں کوئی دوسرے کی بات نہیں سن پاتا۔ جب ایران اور امریکہ ایک دوسرے پر تلواریں لہراتے ہیں تو دونوں ہی ریاستی قومیت، سرمایہ دارانہ اقتصادیات، بین الاقوامی حقوق اور جوہری طبیعات کی زبان استعمال کرتے ہیں۔

ہم اب بھی اصلی ثقافت کی بات کرتے ہیں۔ لیکن اگر اصلی سے ہمارا مطلب ہے کہ جو آزادانہ نمو پذیر ہوئی ہو، جو خارجی اثرات سے پاک قدیم روایات پر مبنی ہو، تو ایسی کوئی ثقافت سطح زمین پر باقی نہیں ہے۔ گزشتہ چند صدیوں میں تمام ثقافتیں عالمگیر اثرات کے طوفان کی زد میں نا قابل شناخت حد بدل چکی ہیں۔

اس عالمگیریت کی ایک دلچسپ مثال نسلی لذت کام و دہن ہے۔ کسی اطالوی ریسٹورانٹ میں ہم ٹماٹر کے مصالحے میں بنی اسپگیڈی (Spaghetti) کی امید رکھتے ہیں، پولش اور آئرش ریسٹورانٹ میں آلو پر مبنی غذا کی، ارجنٹینا کے ریسٹورانٹ میں گائے کے اسٹیک کی اقسام دستیاب ہوتی ہیں، ہندوستانی ریسٹورانٹ کی تقریباً ہر ڈش میں مرچیں شامل ہوتی ہیں، تو کسی سوئس ریسٹورانٹ کی خاص بات پھٹی ہوئی کریم کی ایک چھوٹی سی پہاڑی پر گاڑھی گرم چاکلیٹ کا ڈھیر ضروری ہے۔ لیکن ان میں سے کوئی بھی ڈش ان ممالک کی اپنی نہیں ہے۔ ٹماٹر، مرچیں اور چاکلیٹ تو میکسیکو سے شروع ہوئے۔ وہ تو ایشیا اور یورپ اس وقت پہنچے جب اسپین نے میکسیکو کو فتح کر لیا۔ جولیس سیزر یا دانتے الگیری نے کبھی اسپگیڈی کو اپنے کانٹوں پر نہیں پرویا تھا (گو اس وقت تک کانٹے ایجاد بھی نہیں ہوئے تھے)۔ ولیم ٹیل نے کبھی چاکلیٹ کا ذائقہ نہیں چکھا تھا اور گوتم بدھ نے کبھی اپنے کھانے میں مرچیں شامل نہیں کی تھیں۔ پولینڈ اور آئرلینڈ میں آلو بھی کوئی چار سو سال پہلے ہی وارد ہوئے تھے، اور ارجنٹینا میں ۱۴۹۲ء میں صرف لاما کا اسٹیک ہی میسر ہو سکتا تھا۔

ہالی وڈ کی فلموں نے امریکی ریڈ انڈینز کا ایک جری گھڑ سوار کا تصور پیش کیا ہے، جو بہادری سے اولین امریکیوں کی ویگنوں پر اپنے اجداد کی روایات کی حفاظت کے لیے حملہ آور ہوتا ہے۔۔ لیکن یہ مقامی امریکی انڈین کسی

قدیم اصلی ثقافت کے مدافعین نہیں تھے۔ بلکہ وہ ایک بڑے فوجی اور سیاسی انقلاب کی پیداوار تھے جو سترھویں اور اٹھارویں صدیوں میں یورپین گھوڑوں کی آمد سے پیدا ہوا تھا۔ ۱۴۹۲ میں امریکہ میں کوئی گھوڑے نہیں پائے جاتے تھے۔ انیسویں صدی کے سوع (Sioux، ڈکوٹا کے مقامی باشندے) اور اپاچی میں بہت سی دلکش صفات تھیں، لیکن یہ ایک جدید ثقافت تھی، اصلی ہونے کے بجائے عالمگیر اثرات کی پیداوار۔

سوع سردار (۱۹۰۵)۔ سوع اور نہ ہی کھلے میدانوں کے کسی اور قبیلے کے پاس ۱۴۹۲ سے پہلے کوئی گھوڑے ہوتے تھے

عالمگیر بصارت

عملی طور پر دنیا کی یکجائی کا عمل گزشتہ چند صدیوں میں تیزی سے بڑھا، جب سلطنتیں بنیں اور تجارت میں تیزی پیدا ہوئی۔ افرو ایشیا، امریکہ، آسٹریلیا اور سمندری جزیروں کے عوام کے درمیان تعلق فروغ پاتا رہا۔ یوں میکسیکو کی مرچ ہندوستانی کھانوں کی زینت بنی، اور اسپین کے مویشی ارجنٹینیا کی چراہ گاہوں میں جگالی کرنے لگے۔ لیکن نظریاتی طور پر ایک زیادہ اہم تبدیلی ہزار سال ق م میں پیدا ہوئی جب ایک عالمگیر قاعدے کے خیال نے جگہ بنالی۔ اس سے بھی ہزاروں سال پہلے سے تاریخ دنیا کی یکجائی کی سمت بڑھ رہی تھی، لیکن ایک عالمگیر قاعدے کا خیال جو ساری دنیا پر لاگو ہو، زیادہ تر کے لیے اجنبی تھا۔

ہوموسیپین نے اپنی نمو کے دوران افراد کو 'ہم' اور 'وہ' میں منقسم دیکھا۔ 'ہم' افراد کا وہ گروہ تھا جو فوری قرب وجوار میں ہو، چاہے آپ کوئی بھی ہوں، اور ان کے علاوہ موجود ہر نفس 'وہ' کہلایا۔ درحقیقت کوئی بھی سماجی جانور اپنی اسپیسی کے مشترکہ مفاد کی فکر میں نہیں رہتا۔ کوئی بھی چمپینزی اپنی اسپیسی کی فکر میں دبلا نہیں ہو رہا ہوتا۔ کوئی گھونگا عالمی گھونگوں کی آبادی کے لیے بازو بھی نہیں ہلاتا۔ کوئی الفا نر شیر باقی تمام شیروں کی بادشاہت کا دعویدار نہیں ہوتا، اور مکھیوں کے چھتے کے کسی دروازے پر یہ تختی آویزاں نہیں ہوتی کہ 'دنیا بھر کی کارکن مکھیو، متحد ہو جاؤ'!

لیکن اہلیت کے انقلاب کے بعد سے ہوموسیپین اس معاملے میں زیادہ سے زیادہ مختلف نظر آنے لگے۔ لوگ اکثر ان مکمل اجنبیوں سے بڑے پیمانے پر تعاون کرنے لگے، جنہیں وہ اپنا دوست یا بھائی سمجھتے۔ لیکن یہ بھائی

چارہ عالمگیر نہیں تھا۔ آپ کو پہاڑی کی دوسری جانب یا اگلی وادی میں 'ان' کی موجودگی کا احساس رہتا۔ جب تین ہزار سال قبل مسیح میں فرعون اول مینس (Menes) نے مصریوں کو متحد کیا تو مصریوں کو احساس تھا کہ ان کی جغرافیائی سرحدیں ہیں اور سرحدوں کے اس پار وحشی منڈلاتے ہیں۔ وحشی اجنبی تھے، خطرے کا باعث اور ان میں دلچسپی کی واحد وجہ ان کی زمین اور قدرتی وسائل تھے جن کی مصریوں کو ضرورت تھی۔ لوگوں نے جتنے بھی فرضی قاعدے تراشے ان میں انسانیت کے ایک بڑے حصے کو نظر انداز کیا گیا تھا۔

قبل مسیح سے پہلے کے ہزار سالوں میں تین ممکنہ عالمگیر قاعدے نظر آتے ہیں، جن کے پیروکار پہلی بار تمام دنیا اور تمام نسل انسانی کو ایک گروہ کی شکل میں دیکھتے ہیں، جن پر ایک ہی نظام لاگو ہو۔ اب کم از کم امکانی طور پر تمام افراد 'ہم' تھے، اب ' وہ' باقی نہیں رہے تھے۔ سب سے پہلا عالمی قاعدہ اقتصادی تھا، نظام مالیات۔ دوسرا عالمگیر قاعدہ سیاسی تھا، شہنشاہیت۔ تیسرا عالمگیر قاعدہ مذہب تھا، مثلاً بدھ مت، عیسائیت اور اسلام۔

تاجر، فاتح اور پیغمبر وہ اولین افراد تھے جنھوں نے ہم اور وہ کی ارتقائی تقسیم کو مسترد کیا، اور انسانیت کی ممکنہ یکجائی کا تصور کیا۔ تاجروں کے لیے ساری دنیا ایک ہی بازار تھا، جس میں تمام انسان خریدار تھے۔ انہوں نے ایسا انسانی قاعدہ نافذ کرنے کی کوشش کی جو سب پر لاگو ہو۔ فاتحین کے لیے ساری دنیا ایک سلطنت تھی اور تمام انسان اس کی ممکنہ رعایا۔ اور پیغمبروں کے لیے ساری دنیا یکتا سچائی تھی، اور تمام انسان ممکنہ پیروکار۔ انہوں نے بھی ایک قاعدہ لاگو کرنے کی کوشش کی جو سب پر ہر جگہ لاگو ہو سکتا۔

آخری تین ہزار سالوں میں لوگوں نے اس عالمگیر بصارت کو زیادہ سے زیادہ بارآور کرنے کی کوشش کی۔ آئندہ تین ابواب میں ہم دیکھیں گے کہ کیسے اقتصادیات، سلطنتیں اور عالمگیر مذاہب پھیلے اور انہوں نے موجودہ یکجا دنیا کی بنیاد رکھی۔ ہم تاریخ کے عظیم فاتح کی کہانی سے ابتدا کریں گے۔ ایک فاتح جو بہت صابر اور سمجھوتوں پر قادر تھا، اور اپنے سفر میں افراد کو پرجوش پیروکار بناتا گیا۔ یہ فاتح ہے پیسہ۔ افراد جو ایک ہی خدا پر یقین نہیں رکھتے اور ایک ہی بادشاہ کی اطاعت نہیں کرتے، وہ ایک ہی کرنسی کے استعمال پر بخوشی راضی ہوتے ہیں۔ اسامہ بن لادن امریکی ثقافت، مذہب اور سیاست سے اپنی تمام تر نفرت کے باوجود امریکی ڈالر کا بہت شوقین تھا۔ جہاں خدا اور بادشاہ بھی ناکام ہو گئے، وہاں پیسہ کیسے کامیاب ہو گیا؟

پیسے کی خوشبو

1519 میں ہرنن کورٹیس اور دوسرے فاتحین نے میکسیکو پر حملہ کیا، جو اب تک ایک الگ انسانی دنیا تھی۔ وہاں کے ازٹیک باشندوں نے فوراً ہی محسوس کرلیا کہ یہ اجنبی ایک پیلی دھات میں بہت دلچسپی رکھتے ہیں۔ بلکہ اس کے بارے میں گفتگو کرتے ان کی زبان نہیں تھکتی تھی۔ یہ مقامی سونے سے ناواقف نہیں تھے۔ یہ خوبصورت تھا اور اس پر کام کرنا آسان تھا۔ وہ اس کے زیورات اور مجسمے بناتے اور کبھی کبھار سونے کے ذرات کو کرنسی کے لیے بھی استعمال کرتے تھے۔ لیکن جب کوئی ازٹیک کچھ خریدنا چاہتا تو وہ عموماً کوکو کی پھلی یا کپڑوں کے تھان میں ادائگی کرتا۔ لہذا سونے سے اسپین والوں کی محبت ان کی سمجھ سے باہر تھی۔ کسی ایسی دھات میں کیا خاص بات ہوسکتی ہے جسے نہ کھایا جاسکے نہ پیا جاسکے، جو اتنا نرم تھا کہ ہتھیار یا اوزار بنانے کے بھی کام نہیں آسکتا تھا۔ جب مقامیوں نے کورٹیس سے اس کی سونے سے محبت کی وجہ دریافت کی، تو اس فاتح نے جواب دیا کہ "مجھے اور میرے ساتھیوں کو ایک ایسی بیماری قلب لاحق ہے، جس کا صرف نقرئی علاج ہی ممکن ہے!"

اسپین والے جس افروایشیائی دنیا سے آئے تھے وہاں واقعی سونے سے عقیدت وبائی صورت اختیار کرچکی تھی۔ سخت ترین دشمن بھی اسی پیلی دھات پر رال ٹپکاتا۔ میکسیکو کی فتح سے تین صدیوں پہلے، کورٹیس کے اجداد نے آئبیریا اور شمالی افریقہ میں مسلمان بادشاہتوں کے خلاف ایک خونی مذہبی جنگ لڑی تھی۔ یسوع مسیح اور اللہ کے ماننے والوں نے ایک دوسرے کو ہزاروں کی تعداد میں قتل کیا تھا، فصلیں اور باغات اجاڑے تھے اور متمول شہروں کو مسیح یا اللہ کی شان وشوکت میں اضافے کی خاطر کھنڈر بنادیا تھا۔

جب عیسائی غالب آنے لگے تو انہوں نے اپنی فتوحات کی نشانیوں میں صرف مسجدیں گرا کر چرچ کی تعمیر پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ انہوں نے سونے اور چاندی کے نئے سکے جاری کیے جن پر صلیب کا نشان کندہ ہوتا اور کافروں کے خلاف خداؤں کی مدد پر شکرانے کے الفاظ۔ لیکن اس نئی کرنسی کے ساتھ ہی فاتحین نے ایک نئے قسم کا سکہ بھی ڈھالا، جسے ملارس (Millares) کہتے، جس پر ذرا مختلف پیغام درج تھا۔ عیسائی فاتحین کے یہ چوکور سکے عربی میں اس عبارت سے مزین تھے کہ "خدا کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد اللہ کے پیغمبر ہیں"۔ میل گوئیل (Melgueil) اور ایگڈی (Agde) کیتھولک بشپ بھی ان مقبول اسلامی سکوں کی من وعن نقل جاری کرتے اور متقی عیسائی انہیں بخوشی استعمال کرتے۔

پہاڑی کی دوسری جانب بھی برداشت کا مظاہرہ کیا جارہا تھا۔ شمالی افریقہ میں مسلمان تاجر عیسائی سکوں

مثلاً فلورنٹین فلورن (Florentine Florin)، وینس کے دیکاٹ (Venetian Ducat) اور نیپولیٹن گلگیاٹو (Neapolitan Gigliato) کا استعمال کرتے۔ یہاں تک کہ یہ مسلمان حکمران جو عیسائی کافروں کے خلاف جہاد کا اعلان کرتے وہ بھی ان سکوں میں مالیے کی وصولی پر خوش رہتے، جن میں مسیح اور ان کی کنواری ماں کا پرچار ہوتا۔

یہ کتنے کا ہے؟

شکاری/متلاشیوں کے پاس کوئی نقدی نہیں ہوتی تھی۔ ہر گروہ شکار کرتا، اکٹھا کرتا اور گوشت سے دوا تک، صندل سے جادوٹونے تک اپنی ضرورت کی ہر چیز خود تیار کرتا۔ گروہ کے مختلف اراکین مخصوص اشیا میں مہارت حاصل کر سکتے تھے، لیکن وہ اپنی اشیا اور مہارت میں شراکت کرتے۔ ان کی اقتصادیات مہربانیوں اور احسانات پر مشتمل تھی۔ گوشت کا ایک ٹکڑا اگر مفت دیا جاتا تو اس امید میں کہ اس کے بدلے کچھ حاصل ہوگا، مثلاً مفت طبی امداد۔ یہ گروہ اقتصادی طور پر خود مختار تھے۔ محض چند اشیا جو مقامی طور پر دستیاب نہ ہوتیں مثلاً کوڑیاں، روغن اور اوبسیڈین وغیرہ، وہ اجنبیوں سے حاصل کی جاتیں۔ یہ اشیا کا سادہ تبادلہ تھا۔ ہم تمھیں دیدہ زیب کوڑیاں دیں گے، تم ہمیں اچھے چقماق دینا۔

زرعی انقلاب کی آمد کے بعد بھی یہ سلسلہ ایسے ہی جاری رہا۔ زیادہ تر افراد مختصر، یگانگت بھرے قبیلوں میں رہتے تھے۔ شکاری/متلاشیوں کے گروہوں کی مانند ہر آبادی ایک خود مختار اقتصادی یونٹ تھی، جس کا انحصار باہمی مہربانیوں، احسانات اور کچھ خارجیوں سے لین دین پر منحصر تھا۔ اگر ایک دیہاتی جوتے گانٹھنے میں ماہر تھا اور دوسرا معالجے میں، تو دیہاتیوں کو علم تھا کہ ننگے پاؤں کا علاج کس کے پاس ہے، اور درد دل کی دوا کہاں ملے گی۔ لیکن دیہات چھوٹے تھے اور ان کی اقتصادیات محدود، لہٰذا کل وقتی موچیوں اور ڈاکٹروں کی موجودگی غیر ممکن تھی۔ شہروں اور مملکتوں کے قیام اور ذرائع نقل وحمل میں بہتری سے مہارت کے حصول کے نئے امکانات پیدا ہوئے۔ گنجان آباد شہروں نے نہ صرف کل وقتی ڈاکٹروں اور موچیوں کو روزگار فراہم کیا بلکہ ترکھان، راہب، فوجی اور وکلا بھی پیدا کیے۔ جن آبادیوں نے عمدہ شراب، روغن زیتون یا کوزہ گری میں شہرت حاصل کی، انہیں احساس ہوا کہ ان ہی صنعتوں میں مزید مہارت حاصل کرنا ان کے لیے مفید ہے۔ اور وہ اپنی صنعت کا دوسری آبادیوں کی ان چیزوں سے تبادلہ کر سکتا ہیں جن کی انہیں ضرورت ہو۔ یہ بات بہت قابل فہم تھی۔ مٹی اور آب وہوا بہت متنوع ہوتے ہیں۔ تو اپنے پچھواڑے کی بدمزہ شراب پینے کی کیا ضرورت ہے اگر کسی ایسی جگہ سے مزیدار شراب حاصل کی جا سکتی ہو جہاں کی آب وگل انگوروں کے لیے موافق ہو؟ اگر آپ کے پچھواڑے کی مٹی سے مضبوط اور خوبصورت برتن بن سکتے ہیں تو آپ اشیا کا تبادلہ کر سکتے ہیں۔ پھر یہ کہ کل وقتی مے فروش، کوزہ گر، طبیب اور قانون دان سب ہی اپنے شعبوں میں مہارت حاصل کر کے سب کو فائدہ پہنچا سکتے ہیں۔ لیکن مہارت کے حصوں سے ایک اور مسئلہ پیدا ہو گیا۔ آپ مختلف ماہرین کے درمیان ان کی صنعت کے تبادلے کی شرح کیسے مقرر کریں؟

مہربانیوں اور احسانات کی اقتصادیات اس وقت ناکام ہو جاتی ہے جب بہت سے اجنبی تعاون کرنے کی کوشش کر رہے ہوں۔ بہن یا ہمسائے کو مفت میں مدد فراہم کرنا اور بات ہے، لیکن کسی خارجی کا خیال رکھنا جو کبھی احسان کا بدلہ نہ چکائے کچھ اور بات۔ تب ادل بدل کا سہارا لیا جا سکتا ہے۔ لیکن ادل بدل اشیا کی محدود اقسام میں ہی

کارگر ہوتا ہے، یہ کسی پیچیدہ اقتصادی نظام کی بنیاد نہیں بن سکتا۔

ادل بدل کی حدود کو سمجھنے کے لیے فرض کیجیے کہ آپ کسی پہاڑی پر سیبوں کے ایک باغ کے مالک ہیں، جو پورے صوبے میں سب سے زیادہ خستہ اور میٹھے سیب پیدا کرتا ہے۔ آپ اپنے باغ میں اتنی محنت کرتے ہیں کہ آپ کے جوتے تک گھس جاتے ہیں۔ اب آپ اپنی گدھا گاڑی جوت کر دریا کے کنارے بازار کا رخ کرتے ہیں۔ آپ کے ہمسائے نے آپ کو بتایا تھا کہ بازار کے جنوبی کنارے پر ایک جفت ساز نے اسے جوتوں کا ایک بہت مضبوط جوڑا بنا کر دیا تھا، جو پانچ موسموں تک باقی رہا۔ آپ نے جفت ساز کی دکان ڈھونڈ نکالی اور اسے جوتوں کے بدلے اپنے کچھ سیب پیش کیے۔

جفت ساز ذرا ہچکچایا، وہ بدلے میں کتنے سیب طلب کرے؟ سے روز درجنوں گاہک ملتے ہیں۔ ان میں سے کچھ تو بوریوں میں سیب لاتے ہیں، کچھ گندم، بکریاں یا کپڑا، سب کا معیار مختلف ہوتا ہے۔ جب کہ کچھ دیگر گاہک بادشاہ تک اس کی سفارش کرنے کا ذمہ لیتے ہیں، تو کچھ کمر کا درد دور کرنے کا۔ آخری بار جب جفت ساز نے جوتوں سے سیبوں کا تبادلہ کیا تھا تو اس نے تین بوری سیب مانگے تھے یا شاید چار بوری؟ لیکن غور کریں تو وہ وادی کے کھٹے سیب تھے، بہترین پہاڑی سیب نہیں تھے۔ پھر یہ بھی کہ اس وقت سیبوں کے عوض چھوٹے زنانے جوتے دیے تھے، یہ شخص تو مردانہ جوتے، تنگ رہا ہے۔ پھر گزشتہ چند ہفتوں میں ایک بیماری نے قصبے کے اطراف ریوڑوں کا صفایا کر دیا ہے اور کھال ملنی مشکل ہو گئی ہے۔ دباغ اب اسی مقررہ چمڑے کی مقدار کے عوض زیادہ تعداد میں بنے ہوئے جوتے طلب کر رہے ہیں، کیا اسے بھی حساب میں شامل نہیں کرنا چاہیے؟

بدلے کی اقتصادیات میں جفت ساز اور سیب فروش کو روزانہ درجنوں چیزوں کی قدروں کی نسبت کا خیال رکھنے گا۔ اگر بازار میں سو مختلف اشیا کا تبادلہ ہو رہا ہے، تو خریدار اور مال فروش کو ۴۹۵۰ مختلف دام ہائے تبادلہ جاننے ہوں گے۔ اور اگر ایک ہزار مصنوعات کی تجارت ہو رہی ہو تو خریداروں اور دکان داروں کو ۴۹۹۵۰۰ مختلف دام ہائے تبادلہ پر نظر رکھنی ہو گی۔ آپ یہ سب کیسے کریں گے؟

بات یہیں ختم نہیں ہوتی۔ اگر آپ نے کسی طرح یہ حساب لگا بھی لیا کہ ایک جوڑ جوتے کے عوض کتنے سیب دیے جائیں، تب بھی تبادلہ ہمیشہ ممکن نہیں ہوتا۔ تجارت کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ طرفین کو ایک دوسرے کی صنعت کی ضرورت ہو۔ اگر جفت ساز کو سیب پسند نہ ہوں تب کیا ہو؟ ممکن ہے کہ اس وقت اس کی ضرورت محض اپنی بیوی کو طلاق دینے تک محدود ہو۔ یہ درست ہے کہ کسان ایک وکیل ڈھونڈ کر ایک سہ طرفہ تجارت کر سکتا ہے، لیکن اگر اس وکیل کو سیبوں کی نہیں بلکہ ایک عدد حجام کی ضرورت ہوئی، پھر؟

کچھ معاشروں نے اس مسئلے کو یوں حل کرنے کی کوشش کی کہ ایک لین دین کا مرکزی نظام قائم کر دیا۔ جو مختلف ماہر کسانوں اور صنعت کاروں سے ان کی صنعت جمع کر کے ان لوگوں میں تقسیم کرتا جنہیں اس کی ضرورت ہوتی۔ اس کی سب سے بڑی اور معروف مثال سوویت یونین میں سامنے آئی، جہاں یہ بری طرح ناکام رہی۔ "ہر شخص اپنی اہلیت کے مطابق کام کرے اور اپنی ضرورت کے مطابق حاصل کرے"، کی جگہ ہوا یہ کہ "ہر فرد جتنا کم ممکن ہو کام کرے اور جتنا زیادہ بٹور سکتا ہو حاصل کرے"۔ کچھ درمیانے اور زیادہ کامیاب تجربے دوسرے مقامات پر کیے گئے، مثلاً انکا کی سلطنت میں۔ لیکن زیادہ تر معاشروں نے ماہرین کی بڑی تعداد میں رابطے کا ایک اور

ذریعہ پیدا کر لیا، انھوں نے پیسہ ایجاد کیا۔
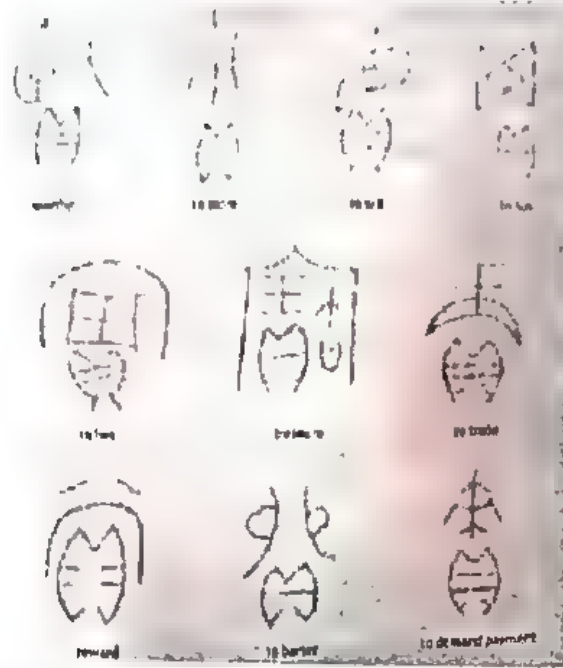
قدیم چینی خط میں کوڑیاں نقدی کی علامت تھیں، مثلاً ان الفاظ کی جگہ جہاں برائے فروخت یا انعام مفہوم ہوتا۔

کوڑیاں اور سگریٹیں

پیسہ بہت سی جگہوں پر کئی بار بنایا گیا۔ اسے بنانے میں کسی تکنیکی مہارت کی ضرورت نہیں پڑی، یہ محض ذہنی انقلاب تھا۔ یہ افراد کے درمیان ایک نئی حقیقت کا ادراک تھا جو محض ان کے اجتماعی تصور میں موجود ہے۔

پیسہ سکوں اور نوٹوں کا نام نہیں۔ پیسہ ہر وہ چیز ہے جس کے استعمال سے افراد دوسری اشیا کی حد مقرر کر سکیں تا کہ صنعت وخدمت کا تبادلہ کیا جا سکے۔ پیسے نے افراد کو اس قابل کر دیا کہ وہ مختلف صنعتوں کی قدر کا فوری اور با آسانی تقابل کر سکیں (مثلاً سیب، جوتے اور طلاقیں)، تا کہ کوئی چیز با آسانی دوسری سے بدلی جا سکے، اور دولت با آسانی اکٹھی کی جا سکے۔

نقدی کی بہت سی اقسام رہی ہیں، جن میں سب سے زیادہ معروف سکہ ہے، جو ایک مقررہ معیار کی دھات کا کندہ ٹکڑا ہے۔ لیکن پیسہ سکوں کی ایجاد سے بھی بہت پہلے موجود تھا۔ ثقافتیں دوسری اشیا کو نقدی کے طور پر استعمال کرتی رہیں: مثلاً سیپیاں، مویشی، کھال، نمک، اناج، موتی، کپڑے اور اقرار نامے۔ تقریباً چار ہزار سال پہلے کوڑیاں سارے افریقہ، جنوبی ایشیا، شمالی ایشیا اور سمندری جزائر میں نقدی کے طور پر استعمال ہوتی تھی۔ بیسویں صدی کے اوائل تک برطانوی یوگنڈا میں مالیہ کوڑیوں سے ادا کیا جا سکتا تھا۔

جدید قید خانوں اور جنگی قیدیوں کے خیموں میں سگریٹ اکثر نقدی کے بدلے استعمال ہوتی ہے۔ سگریٹ نوشی نہ کرنے والے قیدی بھی سگریٹ کو نقدی کے طور پر قبول کرنے پر تیار رہتے ہیں، اور دوسری اشیا و خدمات کی قیمت بھی نقدی کے مول پر مقرر کرتے ہیں۔ آشونز کیمپ (Auschwitz) میں زندہ بچ جانے والے ایک فرد نے کیمپ میں سگریٹ کی نقدی کا استعمال یوں بیان کیا تھا: "ہماری اپنی نقدی تھی، جس کے مول پر کوئی

سوال نہیں کرتا تھا۔ سگریٹ۔۔ ہر چیز کی قیمت سگریٹ میں بیان کی جاتی۔۔'عام' حالات میں جب کہ گیس چیمبر میں جھونکے جانے والے افراد ایک تسلسل سے وارد ہو رہے تھے، اس وقت ایک ڈبل روٹی کی قیمت بارہ سگریٹ تھی، دس اونس مکھن کی تیس سگریٹ، گھڑی اسی سے دو سو سگریٹ اور ایک چوتھائی گیلن شراب کی بوتل چار سو سگریٹ میں مل جاتی!"

آج بھی سکے اور نوٹ نقدی کی کمیاب اقسام ہیں۔ دنیا بھر میں ساٹھ ٹریلین ڈالر کی رقم موجود ہے، جب کہ سکوں اور نوٹوں کو ملا کر یہ مالیت صرف ۶ ٹریلین ڈالر بنتی ہے۔ نوے فیصد سے زیادہ نقدی یعنی تقریباً پچاس ٹریلین ڈالر ہمارے اکاؤنٹ میں محض کمپیوٹر پر وجود رکھتی ہے۔ لہٰذا زیادہ تر کاروباری لین دین محض الیکٹرانک اعداد و شمار ایک کمپیوٹر سے دوسرے کمپیوٹر تک منتقلی پر مشتمل ہے، طبعی طور پر کسی نقدی کی تبدیلی کے بغیر۔ مثلاً کوئی مجرم ہی بینک نوٹوں سے بھرا سوٹ کیس لیے نقد گھر خریدتا ہے، جب کہ لوگ الیکٹرانک اعداد و شمار کے بدلے صنعت وخدمت قبول کرنے پر تیار ہیں۔ یہ چمکدار سکوں اور کڑکتے نوٹوں سے بہتر ہے۔ ہلکا وزن، کم حجم اور ان پر باآسانی نظر رکھی جا سکتی ہے۔

پیچیدہ کاروباری نظام رواں رکھنے کے لیے کسی نہ کسی قسم کی کرنسی ضروری ہے۔ پیسوں کی اقتصادیات میں موچی کو صرف مختلف اقسام کے جوتوں کی قیمت سے واقفیت ضروری ہے، اسے سیبوں یا بکریوں کی مالیت جاننے کی ضرورت نہیں ہے۔۔ پیسے کی موجودگی میں سیبوں کا ماہر بھی سیبوں کے متلاشی موچی کی تلاش سے بے پرواہ ہو جاتا ہے، کیوں کہ پیسہ تو سب ہی کو درکار ہوتا ہے۔ یہی اس کی بنیادی خوبی ہے۔ ہر ایک کو ہر وقت پیسہ درکار ہوتا ہے کیوں کہ دوسرے تمام افراد کو بھی پیسہ چاہیے ہوتا ہے، گویا آپ کو جس چیز کی بھی خواہش یا ضرورت ہو وہ پیسے سے حاصل ہو سکتی ہے۔ جفت ساز ہمیشہ آپ کے پیسے بخوشی وصول کرے گا، کیوں کہ خود اسے جو بھی درکار ہو، سیب، بکری یا طلاق وہ سب پیسوں سے حاصل کر سکتا ہے۔

یعنی پیسہ تبادلے کا ایک عالمگیر ذریعہ ہے، جس کے ذریعے افراد کسی بھی چیز کو تقریباً کسی بھی دوسری چیز سے بدل سکتے ہیں۔ ریٹائرڈ فوجی اپنے فوجی فوائد سے کالج کی فیس ادا کر کے طاقت کو ذہانت میں تبدیل کر سکتا ہے۔ جب کوئی زمیندار اپنی زمین فروخت کر کے وفاداری خریدتا ہے، تو زمین تابعداری میں بدل جاتی ہے۔ جب کوئی ڈاکٹر اپنی فیس سے کسی وکیل کی خدمات حاصل کرتا ہے، یا کسی جج کو رشوت دیتا ہے تو صحت انصاف میں بدل جاتی ہے۔ یہاں تک کہ جفتی کو جزا سے تبدیل کیا جا سکتا ہے، جیسا کہ پندرھویں صدی کی طوائفوں نے کیا، جب وہ مردوں کے ساتھ ہم بستری کرتیں پھر وہ پیسہ کیتھولک چرچ سے آشیرباد حاصل کرنے کے لیے خرچ کرتیں۔

پیسے کی مثالی اقسام سے افراد نہ صرف اشیا کا تبادلہ کر سکتے ہیں بلکہ اس سے دولت بھی جمع کر سکتے ہیں۔ بہت سی قیمتی اشیا جمع نہیں کی جا سکتیں، مثلاً وقت یا خوبصورتی۔ بہت سی چیزیں، بہت کم مدت کے لیے محفوظ کی جا سکتی ہیں مثلاً اسٹرابری۔ دوسری اشیا بہت دیرپا ہوتی ہیں لیکن انہیں بہت جگہ درکار ہوتی ہے، ان کے لیے مہنگی جگہ اور دیکھ بھال کی ضرورت ہوتی ہے۔ مثلاً اناج کو سالوں کے لیے محفوظ کیا جا سکتا ہے، لیکن ایسا کرنے کے لیے بڑے گودام بنانے اور چوہوں، پانی، آگ، چوروں اور پھپھوند سے حفاظت کی ضرورت ہوتی ہے۔ پیسہ چاہے کاغذی ہو، کوڑیوں یا کمپیوٹر کی بٹ کی شکل میں ان مسائل کو حل کر دیتا ہے۔ کوڑیاں سڑتی نہیں ہیں، چوہوں کی غذا نہیں بنتیں، آگ ان پر بے اثر ہے اور اتنی چھوٹی ہوتی ہیں کہ انہیں ایک سیف میں تالہ لگا کر رکھا جا سکتا ہے۔

دولت کو استعمال کرنے کے لیے محض اسے اکٹھا کرنا ہی کافی نہیں۔ اسے اکثر ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے کی بھی ضرورت پڑتی ہے۔ دولت کی کچھ اقسام مثلا جائیداد اپنی جگہ سے منتقل نہیں ہو سکتیں۔ اناج مثلا گندم اور چاول بھی ذرا دقت سے منتقل کیا جاسکتا ہے۔ ایک متمول کسان تصور کیجیے جو کسی بنا پیسے والے علاقے میں مقیم ہو اور کسی دور دراز کے صوبے میں ہجرت کرنا چاہے۔ اس کی ساری دولت اس کی جائیداد اور چاول کی فصل ہے۔ کسان اپنی جائیداد ساتھ لے جاسکتا ہے اور نہ چاول کی کھڑی فصل۔ وہ انہیں ٹنوں چاول سے بدل سکتا ہے، لیکن اس سارے چاول کو منتقل کرنا بہت دشوار اور مہنگا ہوگا۔ پیسہ ان تمام مسائل کو حل کر دیتا ہے۔ کسان اپنی جائیداد کوڑیوں کی ایک بوری سے بدل سکتا ہے، جو وہ آسانی سے کہیں بھی لے جا سکتا ہے۔

کیوں کہ پیسہ دولت کو با آسانی بدل سکتا ہے، جمع کر سکتا ہے اور منتقل کر سکتا ہے، تو پیچیدہ کاروباری روابط اور محرک مارکیٹوں میں اس کا کردار بہت اہم ہے۔ پیسے کے بغیر کاروباری روابط اور مارکیٹ اپنے حجم، پیچیدگی اور حرکت میں محدود ہی رہتے۔

پیسہ کیسے کام کرتا ہے

کوڑیاں اور ڈالر صرف ہمارے مشترکہ تصور میں ہی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کی قدر کوڑیوں کی کیمیائی ساخت، نوٹ کی رنگت یا قیمت میں پوشیدہ نہیں۔ دوسرے الفاظ میں پیسہ ایک مادی حقیقت نہیں ہے، ایک نفسیاتی تصور ہے۔ یہ دماغ میں مادے کو تبدیل کر دیتا ہے لیکن اس کی کامیابی کا راز کیا ہے؟ بھلا کوئی ایک زرخیز چاول کی کاشت یا زمین کو مٹھی بھر بے کار کوڑیوں سے کیوں بدلے گا؟ بھلا آپ ہیمبر گر پلٹنے، صحت کا بیمہ فروخت کرنے یا تین بگڑے بچوں کی نگرانی پر کیوں آمادہ ہوتے ہیں، جب کہ اس تمام محنت کے عوض آپ کو محض رنگین کاغذ کے چند ٹکڑے ہی تو ملتے ہیں۔

لوگ یہ سب کرنے پر اس وقت آمادہ ہوتے ہیں جب وہ اپنے اجتماعی تصور پر بھروسہ کرتے ہیں۔ بھروسہ وہ خام مال ہے جس سے ہر قسم کا پیسہ بنایا جاتا ہے۔ جب ایک متمول کسان اپنی ملکیت ایک بوری کوڑیوں کے بدلے فروخت کرتا ہے، اور انہیں لے کر ایک اور صوبے میں وارد ہوتا ہے، تو اسے بھروسہ ہے کہ منزل پر پہنچ کر لوگ اسے ان کوڑیوں کے بدلے چاول، گھر اور کھیت فروخت کرنے پر آمادہ ہوں گے۔ لہذا پیسہ باہمی بھروسے کا ایک سلسلہ ہے۔ یہ باہمی بھروسہ کا کوئی عام سلسلہ نہیں، یہ باہمی بھروسے کا سب سے آفاقی اور سب سے موثر ذریعہ ہے جو کبھی ایجاد ہوا ہو۔

اس بھروسے کے پس پردہ سیاسی، سماجی اور اقتصادی تعلقات کے بہت پیچیدہ اور دیرپا نظام کارفرما تھے۔ میں کوڑیوں، سونے کے سکوں اور ڈالر نوٹ پر اس لیے یقین رکھتا ہوں کیوں کہ میرا ہمسایہ بھی ان پر یقین رکھتا ہے۔ میرا پڑوسی اس لیے بھروسہ کرتا ہے کیوں کہ میں ان پر یقین رکھتا ہوں۔ ہم سب ان پر اس لیے یقین رکھتے ہیں کیوں کہ ہمارا بادشاہ ان پر یقین رکھتا ہے، اور مالیہ میں ان کا طلبگار ہوتا ہے۔ ہمارا راہب ان پر یقین رکھتا ہے اور چندے میں ان کا دسواں حصہ طلب کرتا ہے۔ ایک ڈالر کا نوٹ لے کر اسے بغور دیکھیے۔ آپ دیکھیں گے کہ یہ محض رنگین کاغذ کا ایک ٹکڑا ہے، جس پر ایک طرف امریکی سیکریٹری خزانہ کے دستخط ہیں تو دوسری جانب یہ اعلان کہ ہم خدا پر یقین رکھتے ہیں۔ ہم ڈالر میں ادائیگی اس لیے قبول کرتے ہیں کیوں کہ ہمیں خدا اور امریکی سیکریٹری خزانہ پر یقین ہے۔

بھروسے کے اہم کردار سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ ہمارا اقتصادی نظام ہمارے سیاسی، سماجی اور فکری نظام سے اتنا پیوست کیوں ہے۔ ہماری اقتصادیات میں سیاسی اتار چڑھاؤ کیسے بحران پیدا کرسکتا ہے، اور کیسے بیوپاریوں کے موڈ کے ساتھ حصص کا بازار اتار چڑھاؤ کا شکار رہتا ہے۔

ابتدا میں جب پیسے کی اولین شکل وضع ہوئی تو لوگوں میں اس قسم کا بھروسہ موجود نہیں تھا، لہذا پیسہ ان چیزوں سے منسوب ہوتا جو واقعی کچھ قیمت رکھتیں۔ تاریخ کی سب سے پہلی نقدی" سمیری جو" ایک اچھی مثال ہے۔ تقریباً تین ہزار سال ق م یہ سمیر میں اس وقت اور مقام پر نمودار ہوا جب تحریر نمودار ہوئی۔ بالکل جیسے بڑھتے ہوئے انتظامی ضروریات کے دباؤ سے تحریر ایجاد ہوئی، اسی طرح جو کی شکل میں پیسہ ایجاد ہوا تاکہ بڑھتے ہوئے اقتصادی عمل کو سہارا دے سکے۔

جو کا پیسہ محض جو تھا۔ مخصوص مقدار میں جو ایک عالمگیر قدر تھی، جس سے دیگر تمام صنعت و خدمت ناپی جاتی۔ سب سے عام قدر 'سلا' (Sila) تھی جو تقریباً چوتھائی گیلن کے برابر تھی۔ بڑی تعداد میں مخصوص پیالے بنائے گئے جن میں صرف ایک سلا آسکتا تھا، تاکہ لوگ جب بھی کچھ خریدنا یا فروخت کرنا چاہیں تو جو کی ضروری مقدار ناپ سکیں۔ تنخواہیں بھی جو کی سلا میں مقرر اور ادا کی جاتیں۔ ایک مرد مزدور مہینے میں ساٹھ سلا کماتا، ایک مزدورنی تیس سلا۔ ایک فورمین بارہ سو سے پانچ ہزار سلا کماتا تھا۔ سب سے زیادہ پیٹو فورمین بھی ۱۲۵۰ گیلن جو تو ایک مہینے میں ہضم نہیں کرسکتا تھا، لیکن جو سلا وہ کھا نہیں سکتا تھا وہ انہیں دوسری قسم کی اشیا کے لیے استعمال کرسکتا تھا، روغن، بکریاں، غلام اور کبھی جو کے بدلے کھانے کی کوئی اور چیز۔ جو کی اگرچہ اپنی ایک ذاتی وقعت تھی لیکن لوگوں کو اس بات پر آمادہ کرنا آسان نہیں تھا کہ وہ اسے محض جنس کی ایک قسم کے بجائے پیسے کے طور پر استعمال کریں۔ اس تردد کو سمجھنے کے لیے ذرا سوچیے کہ اگر آپ جو سے بھری ایک بوری لے کر اپنے مقامی شاپنگ سینٹر جائیں اور ایک قمیض یا پیزا خریدنے کی کوشش کریں تو کیا ہوگا۔ دکاندار غالباً سیکیورٹی طلب کرلیں گے۔ پھر بھی جو کو اولین نقدی کے طور پر قبول کرنا نسبتاً آسان تھا کیوں کہ اس کی کچھ حیاتیاتی قیمت تو تھی۔ لوگ اسے کھا سکتے تھے، لیکن دوسری جانب جو کو محفوظ رکھنا یا اسے منتقل کرنا دشوار تھا۔

اقتصادیات کی تاریخ میں اصل موڑ اس وقت آیا جب لوگوں نے اس پیسے پر اعتبار کرنا شروع کردیا جس کی اپنی کوئی اوقات نہیں تھی، لیکن جسے اکٹھا کرنا اور منتقل کرنا آسان تھا۔ یہ نقدی سب سے پہلے تین ہزار سال ق م میں میسوپوٹیمیا میں نمودار ہوئی، یہ چاندی کے سکوں کی شکل میں تھی۔

چاندی کے یہ سکے دراصل سکے نہیں تھے بلکہ اعشاریہ تین اونس چاندی تھی۔ جب حمورابی کے ضابطے میں یہ اعلان ہوا کہ اگر کوئی ممتاز شخص کسی غلام عورت کے قتل کا مرتکب ہو، تو وہ اس کے مالک کو چاندی کے بیس سکے ادا کرے، تو اس سے مراد بیس سکے نہیں بلکہ چھ اونس چاندی تھا۔ قدیم صحیفے میں بیشتر مالی اصطلاحات میں سکے کے بجائے لفظ چاندی استعمال ہوا ہے۔ برادران یوسف نے انہیں اسماعیلیوں کے ہاتھوں چاندی کے بیس سکوں کے عوض فروخت کیا تھا، یا یوں کہیے کہ چھ اونس چاندی کے بدلے (ایک غلام عورت کی قیمت، بھئی وہ ایک نوجوان ہی تو تھے)۔

جو کی سلا کے مقابلے میں چاندی کے سکے کی کوئی ذاتی قدر نہیں تھی۔ آپ چاندی کو کھا سکتے ہیں نہ اوڑھ سکتے ہیں، اور یہ دھات موثر اوزار سازی کے لیے بھی بہت نرم ہے۔ ہل کی پھلی یا چاندی سے بنی تلوار اس تیزی سے

ڈ ٹیں گی جیسے چاندی کے ورق سے بنی ہوں۔ سونا اور چاندی عموماً زیورات، تاج اور امارت کی دوسری علامات کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔۔ سامان آرائش جو ایک مخصوص ثقافت کے اراکین اونچے سماجی مرتبے میں استعمال کرتے ہیں، ان کی قدر محض ثقافتی ہے۔

قیمتی دھات کے مقررہ اوزان نے بالآخر سکوں کو جنم دیا۔ تاریخ میں سکوں کا رواج سب سے پہلے ۶۴۰ ق م میں مغربی اناطالیہ کے علاقے لیڈیا کے شاہ الیاٹس کے ہاں ملتا ہے۔ یہ سکے سونے یا چاندی کے مقررہ وزن کے ہوتے جن پر ایک نشان کندہ ہوتا۔ یہ نشان دو باتوں کا ثبوت ہوتا۔ اولاً یہ کہ اس سکے میں قیمتی دھات کی کتنی مقدار موجود ہے۔ دوئم یہ اس اقتدار کو ظاہر کرتا جس نے یہ سکہ جاری کیا، اور جو اس کی قدر کی ضامن تھی۔ آج زیر استعمال تقریباً تمام سکے انہی لیڈین سکوں کی نسل سے ہیں۔

غیر نشان زدہ دھاتی ڈلی کے مقابلے میں سکوں کو دو اہم فوائد حاصل تھے۔ اول تو یہ کہ ڈلی کو کسی بھی کاروبار کے لیے دوبارہ تولنا پڑتا۔ دوسرے یہ کہ صرف ڈلی کا وزن کر لینا ہی کافی نہیں تھا۔ موچی کو یہ کیسے اطمینان ہو کہ اس نے اپنے جوتوں کے عوض جو چاندی کی ڈلی لی ہے وہ واقعی خالص چاندی ہے اور سیسے پر چاندی کا ورق نہیں چڑھا ہوا۔ سکہ ان مسائل کو حل کر دیتا ہے۔ اس پر لگی مہر اس کی قدر کی گواہ ہے۔ یوں موچی کو اپنے کیش رجسٹر کے ساتھ ترازو رکھنے کی ضرورت نہیں۔ زیادہ اہم بات یہ کہ سکے پر کندہ مہر کسی سیاسی قوت کی دستخط ہے جو اس سکے کی قدر کی ضامن ہے۔
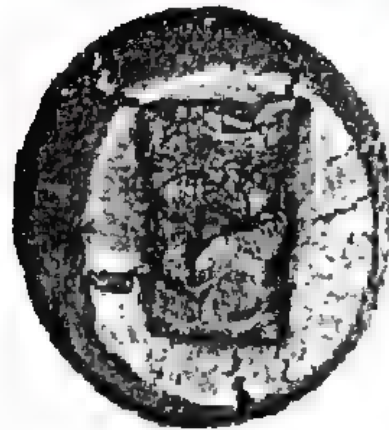
ساتویں صدی ق م کے لیڈیا کے اولین سکوں میں سے ایک

ساری تاریخ اس مہر کی شکل و ہیئت بہت تغیر پذیر رہی، لیکن پیغام ہمیشہ یکساں رہا۔ "میں فلاں شہنشاہ معظم ذاتی طور پر ضامن ہوں کہ اس دھاتی سکے میں اعشاریہ دو اونس سونا ہے۔ اگر کوئی اس سکے کی نقل تیار کرنے کی جرات کرتا ہے، تو اس کا مطلب ہوگا کہ وہ میری دستخط کی نقل کر رہا ہے، جو میری شہرت پر ایک داغ ہوگا۔ میں ایسے کسی جرم کی سخت ترین سزا دوں گا۔" یہی وجہ ہے کہ جعلی کرنسی چھاپنا کسی بھی اور جرم سے زیادہ سنگین جرم گردانا گیا ہے۔ جعلی کرنسی محض دھوکہ دہی نہیں یہ خود مختاری کو للکارنا ہے، یہ بادشاہ کی شخصیت، اقتدار اور اختیار کے خلاف بغاوت ہے۔ اس کی قانونی اصطلاح اقتدار کی خلاف ورزی (Lese Majesty) ہے، جس کی سزا عموماً تشدد اور موت تھی۔ جب تک لوگ بادشاہ کی طاقت اور اقتدار پر یقین رکھتے وہ اس کے سکے پر بھی یقین رکھتے تھے۔ ایک مکمل اجنبی بھی با آسانی رومن دیناریوس سکے کی قدر پر یقین کر لیں گے۔ کیوں کہ وہ رومن شہنشاہ کی طاقت اور سالمیت پر یقین رکھتے تھے، جس کا نام اور تصویر اس سکے کی زینت تھا۔

دیکھا جائے تو شہنشاہ کی طاقت دیناریوس پر منحصر تھی۔ ذرا غور کیجیے کہ سکوں کے بغیر رومن سلطنت کو چلانا کس قدر دشوار ہوتا۔ اگر شہنشاہ کو مالیہ کی وصولی اور تنخواہوں کی ادائیگی جو اور گندم کی کرنسی میں کرنی پڑتی۔ یہ ناممکن ہوتا کہ شام سے جو کا لیہ اکٹھا کر کے روم کے مرکزی خزانے میں جمع کیا جائے اور پھر وہاں سے برطانیہ بھیجا جائے تاکہ لشکروں کو ادائیگی کی جا سکے۔ سلطنت کو چلانا اتنا ہی دشوار ہوتا اگر رومن شہری تو سونے کے سکوں پر یقین رکھتے لیکن رعیت آبادی سونے کے سکوں پر یقین نہ رکھتی بلکہ وہ کوڑیوں، ہاتھی دانت کے موتیوں یا کپڑے کے تھانوں پر بھروسہ کرتے۔

نقرئی فرمان

رومن سکوں پر اعتماد اس قدر مستحکم تھا کہ سلطنت کی سرحدوں کے باہر بھی لوگ بخوشی دینار قبول کر لیتے۔ پہلی صدی عیسوی میں رومن سکے ہندوستان کے بازاروں میں قبول کیے جاتے، گرچہ قریب ترین رومن لشکر ہزاروں میل دور تھا۔ ہندوستانیوں کو شہنشاہ کی تصویر اور دینار پر اس قدر کامل یقین تھا کہ جب مقامی حکمرانوں نے خود اپنا سکہ رائج کیا تو انہوں نے دینار کی مکمل نقل تیار کی، رومن شہنشاہ کی تصویر سمیت! دیناریوس سکوں کا ایک عمومی نام رائج ہو گیا۔ مسلمان خلفا نے اسے عربی رنگ دے کر دینار کر دیا۔ آج بھی اردن، عراق، سربیا، میسی ڈونیا، تیونس اور دوسرے کئی ممالک میں کرنسی کا سرکاری نام دینار ہی ہے۔

جس وقت لیڈیا کی طرز کے سکے بحیرہ روم سے بحیرہ ہند تک پھیل رہے تھے چین نے ایک ذرا مختلف اقتصادی نظام رائج کیا، جو کانسی کے سکوں اور غیر نشان زد سونے اور چاندی کی ڈلیوں پر قائم تھا۔ پھر بھی ان دو اقتصادی سلسلوں میں اتنا اشتراک ضرور تھا (بالخصوص سونے اور چاندی پر انحصار کے معاملے میں) کہ چین اور لیڈیا کے حلقوں میں قریبی اقتصادی اور کاروباری روابط قائم ہو گئے۔ یورپی اور مسلمان بیوپاریوں اور فاتحین نے رفتہ رفتہ لیڈیا کے نظام اور نقرئی فرمان کو دنیا کے دور دراز کونوں تک پھیلا دیا۔ قریبی جدید تاریخ تک تمام دنیا ایک واحد اقتصادی نظام بن گئی، یہ پہلے سونے اور چاندی پر مبنی تھا اور پھر چند قابل بھروسہ کرنسیوں مثلاً برطانوی پاؤنڈ اور امریکی ڈالر پر۔

اگلوتے بین الریاستی اور بین الثقافتی اقتصادی نظام نے افروایشیا کے ملاپ کی راہ ہموار کی اور بالآخر ساری دنیا ایک واحد سیاسی و اقتصادی دائرے میں سما گئی۔ لوگ اب بھی ایک دوسرے کے لیے اجنبی زبان بولتے رہے، مختلف آقاؤں کے حکم مانتے رہے اور مختلف خداؤں کی عبادت کرتے رہے لیکن سب ہی سونے چاندی پر اور سونے چاندی کے سکوں پر یقین کرتے رہے۔ اس مشترکہ یقین کے بغیر عالمی تجارتی نظام تقریباً ناممکن تھا۔ وہ سونا اور چاندی جو سولہویں صدی کے فاتحین نے امریکہ میں حاصل کیا تھا اس سے یورپی تاجروں نے مشرقی ایشیا سے ریشم، چینی کے ظروف اور گرم مصالحہ خریدا۔ یوں یورپ اور مشرقی ایشیا دونوں جگہ ترقی کا پہیہ چل پڑا۔ میکسیکو اور انڈیز کی کانوں سے برآمد ہونے والی بیشتر چاندی اور سونا یورپی ہاتھوں سے گزر کر چینی ریشم کے کاری گروں اور کوزہ گروں تک پہنچا۔ عالمی اقتصادی نظام کا کیا ہوتا اگر چینیوں کو بھی کورٹیز کی مانند وہ بیماریٔ قلب لاحق نہ ہوتی اور اگر انہوں نے سونے اور چاندی میں ادائیگی قبول نہیں کی ہوتی؟

لیکن کیا وجہ ہے کہ چینی، ہندوستانی، مسلمان اور ہسپانوی جو بہت مختلف ثقافتوں سے متعلق تھے اور کسی دوسری چیز پر متفق نہ ہوتے، وہ سب مشترکہ طور پر سونے پر ایمان لے آئے۔ یہ کیوں نہیں ہوا کہ ہسپانوی سونے پر یقین رکھتے، مسلمان جو پر، ہندوستانی کوڑیوں پر اور چینی ریشم کے تھان پر۔ ماہرین اقتصادیات کے پاس اس کا ایک جواب موجود ہے۔ ایک دفعہ تجارت دو علاقوں کو جوڑ دے تو طلب و رسد کا دباؤ قابل منتقلی اشیا کی قیمت برابر کر دیتا ہے۔ اس بات کو سمجھنے کے لیے ایک مفروضے پر غور کیجیے۔ فرض کیجیے کہ جب ہندوستان اور بحیرہ روم کے درمیان تجارت کا آغاز ہوا تو ہندوستان سونے میں دلچسپی نہیں رکھتا تھا، اور ان کے لیے یہ بے قیمت تھا۔ لیکن روم میں سونا تکریم و امتیاز کا نشان تھا اور اس کی قدر اعلیٰ تھی، تو اب کیا ہوتا؟

ہندوستان اور روم کے درمیان سفر کرنے والے تاجر سونے کی قیمت میں اس فرق کو بھانپ لیتے۔ فائدہ حاصل کرنے کے لیے وہ ہندوستان سے سستا سونا خرید کے اسے روم میں مہنگے داموں فروخت کرتے۔ لہٰذا ہندوستان میں سونے کی طلب اور اس کی قیمت آسمان کو جا لگتی۔ اس کے ساتھ ہی روم میں سونے کی اضافی درآمد سے اس کی قیمت گر جاتی۔ کچھ ہی دیر میں ہندوستان اور بحیرہ روم کے علاقوں میں سونے کی قیمت یکساں ہو چکی ہوتی۔ رومن عوام کا سونے پر یقین ہندوستانیوں کو بھی سونے پر یقین کرنے پر آمادہ کرتا۔ گرچہ اب بھی ہندوستانی سونے کو زیادہ استعمال نہیں کرتے، لیکن یہ امر کہ رومن عوام میں اس کی طلب زیادہ ہے ہندوستانیوں میں بھی اس کی قدر بڑھا دیتی۔

یہ حقیقت کہ کوئی اور شخص بھی کوڑی، ڈالر یا کمپیوٹر کے اعداد و شمار میں یقین رکھتا ہے، ان پر خود ہمارا اعتماد بڑھا دیتا ہے۔۔ ویسے خواہ ہم اس شخص سے نفرت کرتے ہوں، نیچا دکھاتے ہوں یا اس کا مذاق اڑاتے ہوں۔ عیسائی اور مسلمان جو ویسے کسی مشترکہ عقائد پر یقین نہیں کر سکتے، اقتصادی یقین میں بہر حال اشتراک پر راضی ہو جاتے ہیں۔ اقتصادیات ہم سے یہ یقین کرنے کو کہتی ہے کہ دوسرے بھی کسی چیز پر یقین کرتے ہیں۔

ہزاروں سال فلسفیوں، مفکروں اور پیغمبروں نے پیسے کا مذاق اڑایا ہے، اور اسے تمام برائی کی جڑ بتایا ہے۔ دولت ہر شکل میں انسانی برداشت کی انتہائی آزمائش ہے۔ دولت، زبان، ریاستی قوانین، ثقافتی قواعد، مذہبی اعتقادات اور سماجی عادات سے زیادہ روشن خیال ہے۔۔ پیسہ انسانوں کا بنایا اعتماد کا وہ واحد نظام ہے جو کسی بھی

ثقافتی خلیج کو پر کرسکتا ہے۔ جو مذہب، صنف، نسل، عمر یا جنسی رویے کی بنا پر تعصب نہیں برتتا۔ پیسے کا شکریہ کہ وہ لوگ جو ایک دوسرے سے ناواقف ہوں اور ایک دوسرے پر بھروسہ نہیں کرتے وہ بھی بہرحال موثر تعاون پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔

پیسے کی قدر

پیسے کی بنیاد دو آفاقی حقیقتوں پر قائم ہے:

۱۔ تبدیلی کا عالمگیر امکان۔ کسی کیمیادان کی مانند پیسہ زمین کو وفاداری، انصاف کو صحت اور تشدد کو علم میں تبدیل کرسکتا ہے۔

۲۔ عالمگیر بھروسہ۔ اگر بھروسہ درمیانی ربط ہو تو کوئی بھی دو افراد کسی بھی کام کے لیے تعاون کر سکتے ہیں

ان اصولوں کی وجہ سے لاکھوں اجنبی موثر انداز میں تجارت اور صنعت کے لیے تعاون کرتے ہیں۔ لیکن ان بظاہر بے ضرر اصولوں کا ایک تاریک رخ بھی ہے۔ جب ہر چیز قابل تبدیلی ہو اور جب بھروسے کا دارومدار بے نام سکوں اور کوڑیوں پر ہے، تو مقامی روایات، انسانی اقدار اور قریبی تعلقات سب مٹ جاتے ہیں اور ان کی جگہ طلب ورسد کے سرد قوانین لے لیتے ہیں۔

انسانی خاندانوں اور قبیلوں نے ہمیشہ انمول اشیا پر یقین کیا ہے، جیسے عزت، وفا، اخلاق اور محبت۔ یہ چیزیں بازار کی پہنچ سے دور ہیں اور انہیں بیچنا یا خریدنا نہیں چاہیے۔ اگر بازار میں ان کی اچھی قیمت مل رہی ہو تب بھی۔ کچھ چیزیں قابل فروخت نہیں ہوتی چاہئیں۔ والدین کو اپنی اولاد غلامی میں فروخت نہیں کرنی چاہیے۔ ایک سچے عیسائی کو گناہ کبیرہ سے پرہیز کرنا چاہیے۔ ایک وفادار سالار کو بھی اپنے بادشاہ کو دھوکہ نہیں دینا چاہیے اور قبیلے کی آبائی زمین بھی اجنبیوں کو فروخت نہیں کرنی چاہیے۔

دولت نے ہمیشہ ان حدود کو عبور کرنے کی کوشش کی ہے، جیسے پانی کسی بند میں پڑی دراڑ سے رسنے لگے۔ والدین اس امر پر مجبور ہوئے ہیں کہ اپنی اولاد کو غلامی میں فروخت کر کے بقایا اولاد کا پیٹ بھر سکیں۔ دیندار عیسائیوں نے قتل، چوری اور بے وفائی کی ہے، اور پھر اس حرام کی کمائی سے چرچ سے معافی خریدی ہے۔ حریص سالاروں نے سب سے زیادہ بولی لگانے والوں کو اپنی وفاداری فروخت کی ہے، جب کہ خود اپنے تابعداروں کی وفاداری پیسے سے خریدی ہے۔ قبائلی زمین دنیا کی دوسری جانب سے آنے والے اجنبیوں کو فروخت کی گئی ہے، تاکہ عالمی اقتصادی بازار میں داخلے کا حق خریدا جاسکے۔

پیسے کا ایک اس سے بھی زیادہ تاریک رخ ہے۔ گرچہ پیسہ اجنبیوں کے درمیان بھروسہ قائم کرتا ہے۔ لیکن یہ بھروسہ انسانوں، قبیلوں یا اقدار پر مبنی نہیں بلکہ خود پیسے اور اس سے وابستہ غیر انسانی نظام پر ہے۔ ہم اجنبی یا دیوار ملے ہمسائے پر بھروسہ نہیں کرتے، ہم ان سکوں پر بھروسہ کرتے ہیں جو ان کی مٹھی میں دبے ہوں۔ اگر ان کا پیسہ ختم ہو جائے تو ہمارا بھروسہ بھی ختم ہو جائے۔ یہ پیسہ جس طرح قبیلوں، مذاہب اور ریاستوں کے مابین بندھن توڑتا ہے تو ڈر ہے کہ یہ دنیا ایک بڑے بازار کی غلام نہ بن جائے۔

لہذا انسان کی اقتصادی تاریخ ایک نازک رقص ہے۔ لوگ اجنبیوں سے تعاون کرنے کے لیے پیسے پر

بھروسہ تو کرتے ہیں لیکن اس سے یہ خوف بھی ہے کہ اس سے انسانی اقدار اور قریبی رشتے متاثر ہو سکتے ہیں۔ ایک طرف تو لوگ بخوشی وہ بندھن منہدم کرتے ہیں جس نے پیسے اور کاروبار کے پھیلاؤ کو اتنے عرصے روکے رکھا۔ اور دوسری جانب وہ مت شرے، مذہب اور ماحول کو بازاری قوتوں کا غلام بننے سے روکنے کے لیے نئے بند تعمیر کرتے ہیں۔

یہ یقین آج کل عام ہے کہ بالآخر مارکیٹ جیت جاتی ہے، اور شاہوں، پادریوں اور قبیلوں کے تعمیر کیے ہوئے بند زیادہ عرصے پیسے کا بہاؤ نہیں روک سکتے۔ یہ خام خیالی ہے۔ جنگجو سالاروں، مذہبی دیوانوں اور خطر پسند شہریوں نے اکثر عیار بیوپاریوں کو شکست دی ہے، بلکہ ان کی اقتصادیات تک کو از سر نو مرتب کیا ہے، لہذا انسانی یکجائی کو محض اقتصادی عمل کی نگاہ سے سمجھنا ناممکن ہے۔ یہ سمجھنے کے لیے کہ ہزاروں بکھرے ہوئے معاشرے کیسے مل کر آج ایک عالمی قبیلے میں ڈھل گئے ہیں ہمیں سونے اور چاندی کا کردار ضرور یاد رکھنا چاہیے، لیکن ہمیں اسٹیل کا انتہائی اہم کردار بھی فراموش نہیں کرنا چاہیے۔

○

شاہی بصارت

قدیم رومن کے لیے شکست کوئی انہونی بات نہیں تھی۔ تاریخ کی عظیم سلطنتوں کے بیشتر بادشاہوں کی مانند وہ لڑائی پر لڑائی ہارنے کے بعد بھی جنگ جیت جاتے۔ ایک سلطنت جو دھکہ کھانے کے بعد کھڑی نہ رہ سکے وہ سلطنت ہی کیا۔ لیکن دوسری صدی ق م کے وسط میں شالی آئبیریا سے آتے والی خبریں ہضم کرنا رومنوں کے لیے بھی دشوار تھا۔ ایک چھوٹے پہاڑی قصبے نیومنٹیا (Numantia) میں مقیم مقامی سیلٹ (Celts) نے رومن غلبہ اتار پھینکنے کی جرات کی تھی۔ یسی ڈونیا اور سلوکسی (Seleucid) سلطنتیں خاک میں ملا کر، شیر یونان کے غرور کو نیچا دکھا کر اور کارتھیج (Carthage) کو سلگتے کھنڈر میں بدلنے کے بعد رومن پورے بحیرہ روم کے ساحلی خطوں کے مالک تھے۔ نیومنٹیا والوں کے حق میں سوائے اپنی آزادی سے محبت اور نا قابل عبور جغرافیہ کے اور کچھ نہیں تھا۔ پھر بھی انہوں نے لشکر کے بعد لشکر کو شکست یا پسپائی کی شرمندگی سے دوچار کیا۔

بالآخر ۱۳۴ ق م میں روم نے صبر کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیا۔ سینیٹ نے روم کے سب سے نامور جرنیل شپیو ایمی لیانس (Scipio Amelianus) کو نیومنٹیا بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ جس نے کارتھیج کوز میں بوس کیا تھا۔ تیس ہزار فوجیوں کا ایک بڑا لشکر اس کی کمان میں سونپا گیا۔ شپیو جو نیومنٹیر کی جنگی مہارت اور دفاعی حکمت سے متاثر تھا اس نے اپنے سپاہی غیر ضروری معرکوں میں ضائع نہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس کے بجائے اس نے ایک قطار سے قلعے تعمیر کر کے نیومنٹیا کا محاصرہ کیا اور بیرونی دنیا سے اس کا رابطہ منقطع کر دیا۔ بھوک نے اس کے ہتھیار کا کام کیا۔ کوئی سال بھر بعد غذائی فراہمی ختم ہوگئی۔ جب نیومانٹیا والوں کو احساس ہو گیا کہ اب ان کے پاس کوئی چارہ نہیں ہے تو رومن وقوعہ نگاروں کے مطابق انہوں نے اپنے شہر کو آگ لگادی اور ان میں سے بیشتر نے روم کا غلام بننے پر خودکشی کو ترجیح دی۔

نیومانٹیا بعد میں اسپین کی آزادی اور جرات کا استعارہ بن گیا۔ میگویل سروینٹس، ڈان کیوزاٹ کے مصنف نے اس المیے کو 'نیومانٹیا کا محاصرہ' میں نظم کیا جو شہر کی تباہی پر ختم ہوتی ہے۔ لیکن ساتھ ہی اس کی نظر میں اسپین کے مستقبل کی عظمت بھی ہے۔ شعرا نے اس کے بے خوف محافظوں پر تعریفی نغمے لکھے اور مصوروں نے اس محاصرے کی عظمتوں کو کینوس پر اتارا۔ ۱۸۸۲ میں اسے ایک قومی ورثہ قرار دیا گیا اور یہ اسپین کے محب وطن افراد کے لیے جائے زیارت بن گیا۔ ۱۹۵۰ اور ۱۹۶۰ کے دوران اسپین کی سب سے مقبول کامک کتابیں کسی سپر مین یا اسپائڈر مین کے بارے میں نہیں تھیں، بلکہ وہ ال جباتو (El Jabato) کے گرد گھومتیں۔ قدیم آئبیریا کا ایک فرضی ہیرو جو

روم کے ظلم کے خلاف صف آرا ہوا۔ آج بھی قدیم نیومانٹیا والے اسپین میں بہادری اور حب الوطنی کا استعارہ ہیں، اور ملک کے نوجوانوں کے لیے قابل تقلید مثال۔

پھر بھی اسپین کے محب وطن نیومانٹیا کی تعریف ہسپانوی میں کرتے ہیں، ایک محبت کی زبان جو شپیو کی لاطینی سے نکلی۔ نیومانٹیا والے تو ایک سیلٹک زبان بولتے تھے جو اب مٹ کر کھو چکی ہے۔ سروانٹیس نے نیومانٹیا کا محاصرہ لاطینی میں لکھا اور یہ ڈرامہ قدیم یونانی و رومن ڈرامائی روایت کا پابند رہا۔ نیومانٹیا میں کوئی تھیٹر نہیں تھے۔ اسپین کے محب وطن جو نیومانٹیا کی بہادری کو سراہتے ہیں وہ عموماً رومن کیتھولک چرچ کے پیروکار ہوتے ہیں۔۔۔ یہاں پہلے لفظ پر غور کیجیے۔۔۔ وہ چرچ جس کے رہنما آج بھی روم میں رہتے ہیں اور جن کا خدا لاطینی میں مخاطب ہونے کو ترجیح دیتا ہے۔ اسی طرح جدید اسپین کے قوانین روم کے قانون سے مستعار ہیں۔ اسپین کی سیاست رومن بنیادوں پر کھڑی ہے۔ اسپین کی غذائی اور تعمیری تکنیک بڑی حد تک روم کی مقروض ہے، آئبیریا کی سیلٹک زبان کی نہیں۔ نیومانٹیا کا اب کھنڈرات کے سوا کچھ باقی نہیں۔ اس کی داستان تک ہمیں رومن مورخوں سے ہی ملی۔ اسے روم کے سامعین کے مذاق کے اعتبار سے بیان کیا گیا تھا، جو آزادی کے خواہاں جنگجوؤں کی کہانیاں پسند کرتے تھے۔ نیومانٹیا پر روم کی فتح اس قدر مکمل تھی کہ خود فاتحین نے مفتوحین کی یاد کو اپنا لیا۔

یہ ہمارے طرز کی داستان نہیں۔ ہم عموماً کمزور کو فتح مند دیکھنا پسند کرتے ہیں۔ لیکن تاریخ میں انصاف کہاں ہے؟ زیادہ تر پرانی ثقافتیں جلد یا بدیر بے رحم سلطنتوں کے ہاتھوں تاراج ہوئیں، جنھوں نے انہیں نیست و نابود کر دیا۔ سلطنتیں بھی بالآخر مٹ جاتی ہیں، لیکن وہ عموماً اپنے پیچھے اہم اور پائیدار ورثہ چھوڑ جاتی ہیں۔ اکیسویں صدی کے تقریباً تمام افراد کسی ایک یا دوسری سلطنت کی نسل سے ہیں۔

سلطنت کیا ہے؟

سلطنت دو اہم خصوصیات کا حامل ایک سیاسی قاعدہ ہے۔ پہلے تو یہ کہ سلطنت کہلانے کے لیے اس کے زیر حکومت خاصی تعداد میں متفرق رعایا ہو، جن کی متفرق ثقافتی پہچان اور علاقے ہوں۔ دو یا تین کافی نہیں بلکہ کئی مختلف اقسام کے۔ بیس سے تیس، بہت ہیں، ان کی درمیانی تعداد میں کہیں سلطنت تشکیل پاتی ہے۔

دوسرے یہ کہ سلطنتوں کی سرحدیں لچکدار ہوتی ہیں اور اس کی بھوک انمٹ، بغیر اپنی بنیادی شناخت یا ہیئت کو بدلے وہ زیادہ سے زیادہ علاقوں اور قوموں کو ہڑپ کر لیتی ہے۔ آج برطانوی ریاست کی سرحدیں بہت واضح ہیں جنھیں اس ریاست کی بنیادی ہیئت یا شناخت کو بدلے بغیر بڑھایا نہیں جا سکتا۔ ایک صدی پہلے زمین کا تقریباً کوئی بھی خطہ سلطنت برطانیہ کا حصہ بن سکتا تھا۔

ثقافتی تنوع اور علاقائی لچک سے سلطنت کو نہ صرف اس کا مخصوص کردار ملتا ہے بلکہ تاریخ میں اس کا مرکزی کردار بھی بنتا ہے۔ ان دو خصوصیات کی بنیاد پر ہی سلطنتوں نے متنوع نسلی گروہوں اور علاقائی خطوں کو ایک سیاسی چھتری کے نیچے اکٹھا کیا، یوں سارے زمین پر انسانی اسپیسی کے بڑے گروہوں کو باہم ملایا۔

اس بات کی اہمیت دہرانی ضروری ہے کہ سلطنت اپنی ابتدائی طرز حکومت، جغرافیائی وسعت یا آبادی کی تعداد کے بجائے صرف ثقافتی تنوع اور غیر واضح سرحدوں سے بیان ہوتی ہے۔ سلطنت کا فوجی فتوحات سے تعمیر ہونا

ضرورنہیں ہے۔ایتھنز کی سلطنت ایک رضا کارانہ اتحاد کے طور پر شروع ہوئی تھی، ہیپس برگ سلطنت کی بنیاد ازدواجی رشتے سے پڑی، چند سوچے سمجھے ازدواجی رشتوں کے ایک سلسلے کا نتیجہ۔سب سے بڑی سلطنت میں جمہوریت کی حکمرانی تھی۔دوسری جمہوری (یا کم از کم رپبلیکن) سلطنتوں میں جدید ہالینڈ، فرانس، بلجیم اور امریکہ شامل ہیں۔ قبل از جدید کی تاریخ میں نیوو گوروڈ (Novgorod)، روم کارتھیج اور ایتھنز کی سلطنتیں شامل ہیں۔

رقبے سے بھی فرق نہیں پڑتا۔سلطنتیں چھوٹی بھی ہوتی ہیں۔اپنے عروج کے زمانے میں ایتھنز کی سلطنت موجودہ یونان سے رقبے اور آبادی میں چھوٹی تھی۔ازٹیک سلطنت موجودہ میکسیکو سے چھوٹی تھی، لیکن دونوں بہرحال سلطنتیں تھیں، جب کہ جدید یونان یا جدید میکسیکو سلطنت نہیں ہیں۔کیوں کہ اول الذکر نے رفتہ رفتہ درجنوں بلکہ سیکڑوں مختلف سیاسی رقبوں کو شامل کیا، جب کہ آخر الذکر نے نہیں۔ایتھنز نے سو سے زیادہ سابقہ آزاد شہری ریاستوں پر حکومت کی، جب کہ اگر ان کے مالیے کے اندراجات پر یقین کیا جائے تو ازٹیک سلطنت تقریباً ۳۷۱ مختلف قبیلوں اور آبادیوں پر حاکم تھی۔

اتنی متنوع انسانی پھلواری کو ایک جدید چھوٹی ریاست میں کیسے سمو لیا تھا؟ یہ اس لیے ممکن تھا کہ ماضی میں دنیا میں اور بھی زیادہ متنوع افراد آباد تھے، جن میں سے ہر ایک کی آبادی مختصر تھی، اور آج کے ایک عام فرد کے مقابلے میں وہ کم جائیداد رکھتے تھے۔بحیرہ روم سے دریائے اردن کا درمیانی علاقہ، جو آج محض دو افراد کی امنگوں کو پورا کرنے میں کوشاں ہے، بائبل کے زمانے میں درجنوں قوموں، قبیلوں، چھوٹی ریاستوں کی آماجگاہ تھا۔

انسانی تنوع میں بہت زیادہ گھاگھی کی ایک اہم وجہ سلطنتیں تھیں۔بادشاہت کا پہیہ بہت سے افراد کی انفرادی خصوصیات کو کچل دیتا (جیسے نیومینٹیا والے)، انہیں مدغم کر کے نئے اور بڑے گروہ تشکیل دیتا۔

شیطانی سلطنتیں

ہمارے وقت میں سامراجیت سیاسی بدزبانی میں فسطائیت سے ذرا ہی کم ہے۔سلطنتوں پر عصری تنقید عموماً دو دلائل دیتی ہے:

۱۔ سلطنتیں کارگر نہیں ہوتیں۔طویل عرصے کے لیے یہ ممکن نہیں کہ افراد کی ایک بڑی تعداد کو فتح کر کے ان پر موثر طریقے سے حکومت کی جائے۔

۲۔ اگر ایسا ممکن ہو تب بھی ایسا نہیں ہونا چاہیے کیوں کہ سلطنتیں تباہی اور استحصال کے شیطانی آلہ کار ہیں۔ہر شخص کو ذاتی انتخاب کا حق ہے، اور اسے کسی دوسرے کے قوانین کا پابند نہیں ہونا چاہیے۔

تاریخی نکتہ نظر سے پہلی دلیل بکواس ہے اور دوسری بہت زیدہ دشوار۔

حقیقت یہ ہے کہ گزشتہ ڈھائی ہزار برسوں سے سلطنت دنیا کا سب سے زیادہ معروف سیاسی ڈھانچہ رہا ہے۔ان ڈھائی ہزار سالوں میں بیشتر انسان کسی سلطنت ہی کے باشندے رہے ہیں۔سلطنت ایک بہت مستحکم طرز حکومت بھی ہے۔زیادہ تر سلطنتوں نے بغاوت کو باآسانی کچل دیا ہے۔عموماً ان کا خاتمہ صرف بیرونی حملہ آوروں کے ہاتھوں یا خود حکمرانوں کی آپس کی چپقلش سے ہوا ہے۔اس کے برعکس مفتوحین کا اپنے شاہی آقاؤں سے از خود چھٹکارا حاصل کر لینے کا ریکارڈ بہت زیادہ شاندار نہیں ہے۔زیادہ تر کئی صدیوں تک غلام بنے رہے ہیں۔عموماً وہ

فاتح سلطنت میں بتدریج مدغم ہو گئے ہیں، یہاں تک کہ ان کی منفرد ثقافت ختم ہو جائے۔

مثال کے طور پر جب ۴۷۶ء میں مغربی روم کی سلطنت نے بالآخر جرمنی کے قبائل کے ہاتھوں شکست کھائی تو نیومانٹیا، آرورنی، ہیلویشین، سامی، لیوسیطانیہ، امبریہ، اٹرسکن اور سینکڑوں دوسری گم شدہ آبادیاں جنہیں روم نے صدیوں پہلے فتح کیا تھا وہ سلطنت کے ڈھانچے سے ایسے واپس برآمد نہیں ہو سکیں جیسے مچھلی کے پیٹ سے حضرت یونس۔ ان میں کوئی باقی نہیں بچا تھا۔ ان لوگوں کی طبعی نسلیں جو خود کو ان قوموں سے وابستہ بتاتی تھیں، جو کبھی خود اپنی زبان بولتی تھیں، اپنے خداؤں کے سامنے سر بسجود ہوتیں اور جن کی اپنی کہانیاں اور روایات تھیں۔ اب وہ رومن کی طرح ہی سوچتے، بولتے اور عبادت کرتے تھے۔

اکثر کسی سلطنت کی تباہی کا مطلب اس کی رعایا کی آزادی نہیں تھی۔ بلکہ بڑی سلطنت کی شکست یا انہدام سے جو خلا پیدا ہوتا اس کی جگہ ایک نئی سلطنت آ جاتی۔ اس کی سب سے واضح مثال مشرق وسطیٰ میں ملتی ہے: اس علاقے کی موجودہ سیاسی کہکشاں ۔۔ مستحکم سرحدوں والی بہت سی خودمختار سیاسی ریاستوں کے درمیان طاقت کا میزان ۔۔ اس کی گزشتہ کئی ہزار سالوں میں مثال نہیں ملتی۔ ماضی میں مشرق وسطیٰ نے اس قسم کی صورت حال کا سامنا آٹھویں صدی ق م میں کیا تھا، تقریباً تین ہزار سال پہلے! آٹھویں صدی ق م میں نئی اسیری سلطنت کے طلوع سے بارھویں صدی کے وسط میں برطانوی اور فرانسیسی سلطنتوں کے انہدام تک، مشرق وسطیٰ ایک سلطنت سے دوسری کے ہاتھوں ایسے منتقل ہوتا رہا جیسے کسی ریلے دوڑ کا ڈنڈا۔ پھر بالآخر جب برطانوی اور فرانسیسی سلطنتوں کا اختتام ہوا تو آرمینیا، اموئی، فونیقی، فلسطینی، موابی، ادومی اور اسیریوں کے دوسرے مفتوحین بہت عرصہ ہوئے مفقود ہو چکے تھے۔

یہ درست ہے کہ آج کے یہودی، آرمینیائی اور جارجیا والے کسی حد تک انصاف سے یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ مشرق وسطیٰ کے قدیم باشندوں کی اولاد ہیں۔ لیکن یہ محض چند استثنٰی ہیں، اور ان میں بھی کچھ بڑھا چڑھا کر بیان کیے گئے ہیں۔ یہ کہنے کی ضرورت ہی نہیں کہ جدید یہودیوں کے سیاسی، اقتصادی اور سماجی رواج بجائے قدیم یہودی روایات کے، اس سلطنت سے زیادہ قریب ہیں جس کے وہ دو ہزار سال مفتوح رہے۔ اگر آج یروشلم کی کسی بہت روایتی عبادت گاہ میں شہنشاہ داؤد نمودار ہوں تو وہ لوگوں کو مشرقی یورپ کے لباس میں ملبوس، جرمن زبان میں رنگی عبرانی بولتے اور تالمود کے کسی باب پر ان تھک بحث کرتے دیکھ کر بہت حیران ہوں گے۔ قدیم یہود میں نہ ایسی عبادت گاہیں تھیں اور نہ تالمود کے شمارے بلکہ توریت کے صفحات تک موجود نہیں تھے۔

کسی سلطنت کی تعمیر اور استحکام کے لیے عموماً آبادی کا بڑی تعداد میں بے رحمی سے قتل عام اور زندہ بچ جانے والوں پر عرصہ حیات تنگ کر دیا جاتا تھا۔ سلطنت کی تعمیر کے عمومی اوزار میں جنگ، غلامی، دربدری اور نسل کشی شامل ہیں۔ جب روم نے ۸۳ء میں اسکاٹ لینڈ پر حملہ کیا تو اسے تین مقامی کیلی ڈونیا قبائل کی سخت مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا، جس کے جواب میں انہوں نے خطے کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ روم کے پیغام امن کے جواب میں مقامی قبائلی سردار کیلگاکس (Calgacus) نے رومنوں کو "دنیا کے غنڈے" قرار دیا اور کہا کہ "وہ لوٹ مار، قتل عام اور ڈکیتی کو سلطنت کی تعمیر کہتے ہیں، وہ صحرا بنا کر اسے امن کا نام دیتے ہیں۔"

اس کا مطلب یہ نہیں کہ سلطنت اپنی راہ میں آنے والی قابل قدر ہر شے مٹا دیتی ہے۔ تمام سلطنتوں کو

تاریک قرار دینا اور تمام شہنشاہی ورثے کی مذمت کرنا بیشتر انسانی ثقافت کی نفی ہے۔ شاہی امرا اپنی فتح کی دولت سے نہ صرف قلعے اور لشکر تعمیر کرتے بلکہ فلسفہ، آرٹ، انصاف اور بیت المال قائم کرتے۔ انسانی ثقافتی کامیابیوں کا بیشتر حصہ مفتوح آبادی کے استحصال سے رقم ہے۔ رومن شہنشاہیت کے تمول اور فوائد سے سیسرو، سینیکا اور سینٹ آگسٹین کو فراغت ملی کہ وہ فکری بلندیوں کو تحریر کریں، مغلوں کا اپنی ہندوستانی رعایا کے استحصال کے بغیر تاج محل کا قیام نا ممکن تھا، اور ہیبس برگ سلطنت کے سلاویہ، ہنگری اور رومانیہ کے صوبوں سے حاصل فوائد ہی سے ہیڈن اور موزارٹ کی تنخواہیں ادا ہوتیں۔ کسی کیلی ڈونین لکھاری نے کیلگاکس کی تقریر اپنی آئندہ نسلوں کے لیے محفوظ نہیں کی۔ اس کے لیے ہم رومن مورخ ٹیسی ٹس کے شکر گزار ہیں، بلکہ شاید ٹیسی ٹس نے یہ کہانی گھڑی ہے۔ آج کے بیشتر اسکالر اس بات پر متفق ہیں کہ ٹیسی ٹس نے نہ صرف یہ تقریر خود تیار کی بلکہ اس کیلی ڈونیا کے قبائلی سردار کیلگاکس کا کردار بھی تخلیق کیا۔ یوں وہ خود اور دوسرے رومن امرا خود اپنے ملک کے بارے میں جو جذبات رکھتے تھے، ان کے لیے ایک استعارہ پیدا کیا۔

اگر ہم اعلیٰ تخلیقات اور ثقافت امرا سے بھی آگے دیکھیں، اور ان کے بجائے عام افراد کی زندگی ذہن میں رکھیں، تب بھی ہمیں جدید ثقافتوں کی اکثریت میں شاہی اثرات نظر آتے ہیں۔ آج ہم میں سے بیشتر اس زبان میں بولتے، سوچتے اور خواب دیکھتے ہیں جو ہمارے آبا پر تلوار کے زور سے مسلط کی گئی تھی۔ مشرقی ایشیا کے زیادہ تر باشندے ہن سلطنت کی زبان بولتے اور اسی میں خواب دیکھتے ہیں۔ امریکہ کے دونوں براعظموں کے باشندے، جزیرہ نمائے الاسکا سے آبنائے میگیلن (Magellan) تک، چاہے ان کی اصل کچھ بھی رہی ہو، چار سلطنتوں میں سے ایک کی زبان بولتے ہیں: ہسپانوی، پرتگالی، فرانسیسی یا انگریزی۔ آج مصری عربی بولتے ہیں، خود کو عرب تصور کرتے ہیں اور خوش دلی سے خود کو اس عرب سلطنت سے منسوب کرتے ہیں جس نے ساتویں صدی میں مصر کو فتح کیا اور اپنے خلاف اٹھنے والی بغاوتوں کو ایک دست آہنی سے کچل دیا تھا۔ آج جنوبی افریقہ کے ایک کروڑ زولو انیسویں صدی کی زولو عظمت کے گیت گاتے ہیں، حالانکہ ان کی اکثریت ان قبائل کی نسل سے ہے جو زولو سلطنت کے خلاف صف آرا ہوئے تھے۔ اور جنہیں خون آلود فوجی مہم جوئی کے ذریعے داخل سلطنت کیا گیا تھا۔

یہ تمھاری اپنی بہتری کے لیے ہے

سب سے قدیم سلطنت جس کے متعلق ہمیں معلومات مہیا ہیں وہ ۲۲۵۰ ق م میں عظیم سارگون (Sargon the great) کی اکیڈین سلطنت ہے۔ سارگون نے اپنا آغاز میسوپوٹیما کی ایک چھوٹی شہری ریاست کیش کی حکومت سے کیا تھا۔ چند دہائیوں میں ہی وہ نہ صرف میسوپوٹیما کی دوسری شہری ریاستوں کو فتح کرنے میں کامیاب رہا، بلکہ میسوپوٹیما سے باہر کے علاقے بھی۔ سارگون کا دعویٰ تھا کہ اس نے ساری دنیا کو فتح کر لیا ہے۔ درحقیقت اس کی حکومت خلیج فارس سے بحیرہ روم تک محدود تھی۔ اس میں موجودہ عراق، شام اور چند حصے ایران و ترکی کے شامل تھے۔

اکیڈین سلطنت اپنے بانی کے انتقال کے بعد زیادہ عرصے نہ چل سکی۔ لیکن سارگون اپنے پیچھے ایک شاہی چغہ چھوڑ گیا جس کا کوئی نہ کوئی دعویدار پیدا ہوتا رہا۔ آئندہ سترہ سو برس تک اسیری، بابل، ہیٹائٹ (Hittite)

بادشاہوں نے سارگون کو اپنا امام سمجھا اور انہوں نے بھی ساری دنیا کو فتح کرنے کا دعویٰ کیا۔ پھر تقریباً ۵۵۰ ق م میں فارس کا شہنشاہ عظیم سائرس اس سے بھی زیادہ بڑے دعوؤں کے ساتھ نمودار ہوا۔
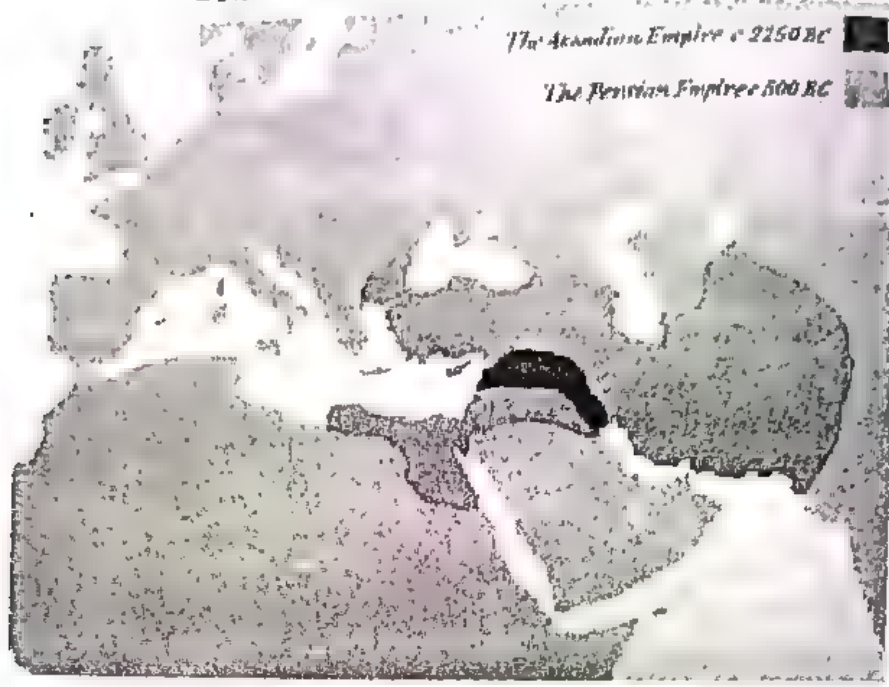
اکیڈین اور فارس سلطنتیں

اسیری شہنشاہ ہمیشہ اسیری شہنشاہ ہی رہے۔ اس وقت بھی جب وہ تمام عالم پر حکمرانی کے دعویدار تھے۔ یہ واضح تھا کہ وہ یہ سب اسیری شان وشوکت بڑھانے کے لیے کر رہے ہیں، اور انہیں اس پر کوئی شرمندگی نہیں۔ جب کہ سائرس صرف ساری دنیا پر حکمرانی کا دعویدار ہی نہیں تھا بلکہ اس کا کہنا تھا وہ ایسا سب کی بہتری کے لیے کر رہا ہے۔ فارس والوں کا کہنا تھا کہ "ہم آپ کو آپ کی اپنی بہتری کے لیے فتح کر رہے ہیں"۔ سائرس کی خواہش تھی کہ اس کے محکومین اس سے محبت کریں اور اپنی خوش قسمتی پر ناز کریں کہ وہ سائرس کی رعایا تھے۔ اپنی سلطنت کی تابعدار رعایا کا دل جیتنے کے لیے اس نے جو اقدامات کیے اس کی سب سے مشہور مثال وہ حکم نامہ تھا جس کے تحت اس نے بابل میں جلاوطن یہودیوں کو اپنے وطن لوٹ کر اپنا معبد بنانے کی اجازت دی۔ اس نے انہیں مالی امداد کی بھی پیش کش کی۔ سائرس خود کو یہودیوں پر حاکم فارسی بادشاہ کے بجائے خود کو یہودیوں کا بادشاہ بھی سمجھتا اور ان کی فلاح و بہبود کا ذمہ دار بھی۔

دنیا کی تمام آبادی کے مفاد کی خاطر پوری دنیا پر حکمرانی کا یہ خیال حیرت انگیز تھا۔ دوسرے سماجی لپستانیوں کی مانند ارتقا نے ہوموسیپین کو بھی اجنبیوں سے بیزار کر دیا تھا۔ سیپین جبلی طور پر انسانیت کو ہم اور وہ میں تقسیم کرتے ہیں۔ 'ہم'، آپ اور ہم جیسے افراد ہیں جن کی زبان، مذہب اور روایات مشترک ہوں۔ ہم ایک دوسرے کی ذمہ داری اٹھاتے ہیں لیکن اجنبیوں کی نہیں، ہم ان سے ہمیشہ جدا تھے اور کسی طرح بھی ان کے مقروض نہیں۔ ہم انہیں اپنے علاقے میں نہیں دیکھنا چاہتے اور ان کے علاقے میں کیا ہو رہا ہے اس سے بھی ہمیں کوئی سروکار نہیں۔ وہ تو شاید ہی انسان ہیں۔ سوڈان کے ڈنکا افراد کی زبان میں صرف ڈنکا ہی افراد ہیں۔ کوئی شخص جو ڈنکا نہیں وہ انسان نہیں بلکہ ڈنکا کے بدترین دشمن نیور (Nuer) ہیں۔ خود نیور زبان میں لفظ نیور کے معنی ہیں "اصلی لوگ"۔ سوڈان کے

صحراؤں سے ہزاروں میل دور الاسکا کے برفیلے میدانوں اور شمال مشرقی سائبیریا میں یوپیا (Yupia) مقیم ہیں۔ یوپک زبان میں لفظ یوپک کا کیا مطلب ہے؟ اس کا مطلب ہے "اصل لوگ"۔

اس نسلی تنہائی کے برعکس سائرس اور اس کے بعد کی سلطنتوں نے اجتماعیت اور شمولیت کی کوشش کی ہے۔ اگرچہ اس نے اکثر حاکم و محکوم کے درمیان تفریق کو واضح کیا ہے، لیکن پھر بھی اس نے دنیا کی بنیادی اکائی کو شناخت کیا ہے، ضابطوں کا اکلوتا قاعدہ تمام اوقات و مقامات پر حاکم کیا، اور تمام افراد کو ایک دوسرے کا ذمہ دار بنایا۔ انسانیت ایک بڑے خاندان کی مانند سمجھی گئی۔ ولدیت کے حقوق اور اولاد کی فلاح و ذمہ داری ساتھ ساتھ ہے۔

یہ نئی خسروانہ فکر فارس کے سائرس سے سکندر اعظم کو منتقل ہوئی۔ وہاں سے یونانی بادشاہوں، رومن شہنشاہوں، مسلمان خلفا، ہندوستان کے شاہی خاندان اور روسی وزیر اعظم سے امریکی صدر تک۔ اس فلاحی خسروانہ فکر نے سلطنتوں کے وجود کی تائید کی، محکوموں کی بغاوت کی نفی، بلکہ سلطنتوں کی توسیع پسندی کے خلاف آزاد انسانوں کی مزاحمت کی بھی نفی کی۔

فارس کے اس قاعدے سے بالکل الگ اسی قسم کی خسروانہ وجدان کے دنیا کے دوسرے کونوں میں بھی تجربے ہوئے بالخصوص وسطی امریکہ، اینڈیز علاقوں اور چین میں۔ مقبول چینی سیاسی نظریے کے مطابق دنیا میں تمام جائز حاکمیت کا منبع آسمان (تیان) ہے۔ تیان ہی سب سے مناسب فرد یا خاندان کو منتخب کر کے اسے آسمانی فرمان سپرد کرتا ہے۔ یہ فرد یا خاندان پھر زیر آسماں ہر شے (تیانژیا) کے مفاد میں اس پر حاکم ہوتا ہے۔ گویا ایک جائز حاکمیت اپنی تعریف کے اعتبار سے آفاقی ہے۔ اگر کسی حاکم کو آسمانی فرمان نصیب ہو تو وہ ساری دنیا میں امن اور انصاف تقسیم کرنے کا پابند ہے۔ آسمان سے اختیار کئی افراد کو بیک وقت نہیں سونپا جا سکتا، لہذا ایک وقت میں ایک سے زیادہ ریاستیں جائز نہیں ہو سکتیں

متحدہ چینی سلطنت کا پہلا شہنشاہ قن شی ہوانگدی (Qin shi Huangdi) دعویدار تھا کہ کائنات کی شش جہات میں ہر شے شہنشاہ کی ہے۔۔۔ جہاں کہیں بھی انسانی قدم جا سکیں وہاں کوئی ایسا نہیں جو رعایت سے باہر ہو۔۔۔ اس کا لطف و کرم گھوڑوں اور بیلوں تک پہنچتا تھا، کوئی اس سے محروم نہیں تھا۔ ہر آدمی اپنی چھت کے نیچے محفوظ ہے۔ لہذا چین کی سیاسی فکر اور چین کی تاریخی یادداشت میں سلطنت کا دورانیہ انصاف اور قانون کا سنہرا دور تھا۔ جدید مغربی نکتہ نظر کے برعکس کہ ایک منصفانہ دنیا مختلف قومی ریاستوں کا مجموعہ ہے، چین میں سیاسی تفرقات کو افراتفری اور ناانصافی کا تاریک دور سمجھا جاتا ہے۔ اس احساس نے چینی تاریخ پر گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔ جب بھی کوئی سلطنت منہدم ہوئی تو اس بااثر سیاسی نظریے نے اقتدار کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ چھوٹی آزاد آبادیوں کے بجائے اتحاد پر قائم رہیں۔ جلد یا بدیر یہ کوششیں ہمیشہ بارآور ہوتی تھیں۔

وہ کب ہم بن گئے

سلطنتوں نے بہت سی چھوٹی ثقافتوں کو چند بڑی ثقافتوں میں ضم ہونے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ خیالات، افراد، اجناس اور ٹیکنالوجی سیاسی طور پر منتشر علاقے کے مقابلے میں کسی ایک ہی سلطنت کی حدود میں زیادہ آسانی سے پھیلتے ہیں۔ اکثر سلطنتیں تو خود جان بوجھ کر افکار، ادارے، روایات اور اقدار کو پھیلاتی رہیں۔ اس کا ایک

مقصد خود ان کے کام کو آسان کر لینا تھا۔ کسی ایسی سلطنت پر حکومت کرنا زیادہ دشوار ہے، جس میں ہر چھوٹی تحصیل کا اپنا قانون ہو، اس کا اپنا انداز تحریر، اس کی اپنی زبان اور اس کی اپنی کرنسی۔ شہنشاہوں کے لیے معیار ایک عطیہ تھا۔

ایک مشترکہ ثقافت کے پھیلاؤ کی دوسری اور اتنی ہی اہم وجہ سلطنت کے لیے قانونی جواز کی تلاش تھی۔ کم از کم سائرس یا قن شی وانگڈی کے زمانوں سے سلطنتوں نے اپنے اقدامات، سڑکوں کی تعمیر سے خون بہانے تک کو، ایک بہتر ثقافت کے پھیلاؤ کی مد میں جائز قرار دیا، جس سے فاتحین سے زیادہ مفتوحین کا فائدہ ہو۔

کہیں تو یہ فوائد نمایاں تھے۔۔۔ قانون کا راج، شہری منصوبہ بندی، اوزان و پیائش کے معیار، تو کبھی مشکوک۔۔۔ مالیہ، جبری بھرتی، شہنشاہ کی عبادت۔ لیکن زیادہ تر شاہی امرا واقعی یہ تصور کرتے کہ وہ سلطنت کی رعایا کی بہبود کے لیے کام کر رہے ہیں۔ چین کے حکمران اپنے ملک کے ہمسایوں اور اس کی اجنبی رعایا کو وحشی جنگجو سمجھتے، جن تک ثقافت کے مفادات کی ترسیل سلطنت کا فریضہ تھی۔ شہنشاہ پر آسمانی اختیار اس لیے نہیں اترا تھا کہ وہ دنیا کا استحصال کرے بلکہ اس لیے کہ وہ انسانیت کو تعلیم دے۔ رومن بھی اپنی نوآبادیات کو یہی کہہ کر جائز قرار دیتے کہ وہ وحشیوں کو امن، قانون اور تہذیب سکھا رہے ہیں۔ وحشی جرمن اور رنگدار قدیم فرانسیسی گاول (Gauls) گندگی اور جہالت میں رہتے رہے جب تک کہ رومنوں نے انہیں قانون کی تعلیم نہ دی، عوامی حمام خانوں میں صاف نہ کیا اور فلسفے کی تعلیم سے ان کی تربیت نہ کی۔ تیسری صدی ق م میں موریہ سلطنت نے ایک جاہل دنیا کو بدھ مت کی تعلیم دینا اپنا فرض سمجھا۔ مسلمان خلفا کو رسول خدا پر اتری وحی پر امن انداز میں، ورنہ ضرورت پڑنے پر تلوار سے پھیلانے کا خدائی حکم تھا۔ اسپین اور پرتگال کی سلطنتیں دعویدار تھیں کہ وہ انڈیز اور امریکہ کی دولت کے تعاقب میں نہیں، وہ تو انہیں ایک سچے مذہب کا پیروکار بنانا چاہتی ہیں۔ آزادی اور آزاد تجارت کے برطانوی اصول پر کبھی سورج غروب نہیں ہوتا تھا۔ سوویت سامراجیت سے پرولتاریت کے یوٹوپیا کی جانب دشوار تاریخی سفر کو ممکن بنانا فرض سمجھتے تھے۔ آج بہت سے امریکی کہتے ہیں کہ یہ ان کی حکومت کا اخلاقی فرض ہے کہ تیسری دنیا کے ممالک تک جمہوریت اور انسانی حقوق کے فوائد پہنچائیں، چاہے یہ نصب العین کروز میزائل اور ایف ۱۶ سے ہی کیوں نہ پہنچائے جائیں۔

سلطنت کے پھیلائے ثقافتی رویے کبھی بھی صرف امرائے حکومت ہی وضع نہیں کرتے تھے۔ کیوں کہ خسروانہ فکر عالمگیر اور سب کے لیے ہوتی تو حکمرانوں کے لیے آسان تھا کہ وہ فکر، اقدار اور روایات کسی واحد چہڑی سے منڈھی روایات کے برخلاف، جہاں سے بھی ملیں اپنا لیں۔ گو کچھ شہنشاہوں نے اپنی ثقافت کو خالص رکھنے اور خود اپنی بنیاد سے پیوست رکھنے کی کوشش کی۔ زیادہ تر سلطنتیں تہذیبوں کے ملاپ سے ابھریں جس میں محکوم عوام سے بھی بہت کچھ حاصل کیا جاتا۔ روم کی شاہی ثقافت جتنی رومن تھی، اتنی ہی یونانی بھی۔ عباسی سلطنت کچھ حصہ فارس تھی، کچھ یونان اور کچھ عرب۔ منگول سلطنت چینیوں کی نقل تھی۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی سلطنت میں کینیا کی نسل کا امریکی صدر، اٹلی کا پیزا کھاتے، اپنی محبوب فلم لارنس آف عریبیہ دیکھ سکتا ہے، ایک برطانوی رزمیہ جس میں ترکوں کے خلاف عربوں کی مزاحمت دکھائی گئی ہے۔

ایسا نہیں ہے کہ اس ثقافتی کھچڑی سے محکومین کا ثقافت میں ضم ہو جانا آسان ہو جاتا تھا۔ سلطنت کی تہذیب میں محکومین کے بہت سے رویے شامل ہوتے تھے، لیکن یہ ملغوبہ بھی اکثریت کے لیے بہت نیا ہوتا تھا۔ جذب ہو جانے کا عمل بہت دردناک اور تکلیف دہ ہوتا۔ ایک مانوس، مقبول مقامی طریقے کو ترک کر دینا آسان

نہیں ہوتا، بالکل جیسے ایک نئی ثقافت کو اپنانا دشوار اور تکلیف دہ ہوتا ہے۔ مزید برآں اگر محکومین سلطنت کی ثقافت اپنا بھی لیتے، تو جب تک حاکم امرا انہیں اپنوں میں ہی تسلیم نہ کر لیتے، اس میں اگر صدیاں نہیں کئی دہائیاں ضرور لگ جاتیں۔ فتح کرنے ،وراسے تسلیم کرنے کے عمل کے دوران کئی نسلیں بھٹکتی رہتیں۔۔ وہ اپنی محبوب مقامی ثقافت کھو چکے تھے لیکن انہیں حاکموں کی دنیا میں برابری سے حصہ لینے کی اجازت نہیں تھی۔ بلکہ ان کی اپنائی ثقافت انہیں وحشی تصور کرتی رہتی۔

کسی آئبیرین کو تصور کیجیے جو نیومینٹیا فتح ہونے کے سو سال بعد بھی زندہ رہا ہو۔۔ وہ اپنی مقامی سیلٹک بولی میں اپنے والدین سے گفتگو کرتا ہے، لیکن اس نے ذرا بدلے لہجے میں بے داغ لاطینی بھی سیکھ لی ہے کیوں کہ اپنے کاروبار اور حکام سے معاملہ کرنے کے لیے اس کی ضرورت تھی۔ وہ اپنی بیوی کے قیمتی آراستہ زیورات کی عادت کو پورا کرتا ہے، لیکن ذرا شرمندگی سے کیوں کہ دوسری مقامی عورتوں کی مانند اس کی بیوی نے بھی اپنا قدیم سیلٹک مذاق برقرار رکھا ہے۔ اس کی خواہش تھی کہ اس کی بیوی بھی رومن گورنر کی بیوی کی مانند سادے زیورات پسند کرے۔ وہ خود رومن چغہ پہنتا ہے۔ رومن کاروباری باریکیوں سے واقفیت کی وجہ سے وہ اپنے مویشیوں کے کاروبار میں اتنا کامیاب رہا تھا کہ اس نے رومن طرز کا ایک قلعہ تعمیر کر لیا تھا۔ لیکن گو وہ ورجل کی تیسری کتاب 'جیورجکس' زبانی سنا سکتا تھا، رومن اب بھی اسے نیم وحشی ہی سمجھتے۔ وہ اس بات پر الجھتا کہ وہ کبھی کوئی حکومتی عہدہ حاصل کر سکے گا اور نہ ہی تھیٹر میں کوئی اچھی نشست۔

انیسویں صدی کے اواخر میں یہی سبق برطانوی آقا اپنے تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کو سکھا رہے تھے۔ ایک آرزومند ہندوستانی کی کہانی مشہور ہے جس نے انگریزی زبان کی باریکیوں پر عبور حاصل کر لیا تھا، مغربی انداز کا رقص سیکھ لیا تھا، یہاں تک کہ چھری کانٹے سے کھانا بھی سیکھ لیا تھا۔ ان نئے آداب کے ساتھ اس نے انگلستان جا کر یونی ورسٹی کالج لندن میں تعلیم حاصل کی اور اور ایک کامیاب وکیل بن گیا۔ پھر بھی یہ نیا قانون دان سوٹ اور ٹائی زیب تن کیے، برطانیہ کی جنوبی افریقہ کالونی میں ریل کے ڈبے سے باہر پھینک دیا گیا، کیوں کہ وہ درجہ سوئم کے بجائے درجہ اول میں سفر کرنے پر مصر تھا۔ جب کہ اس جیسے رنگ دار افراد کو درجہ سوئم میں ہی سفر کرنے کی اجازت تھی۔ اس شخص کا نام موہنداس کرم چند گاندھی تھا۔

کئی دفعہ ان ثقافتوں کے ملاپ سے بالآخر نئے آنے والوں اور قدیم امرا کے درمیان دیواریں منہدم ہو جاتیں۔ محکومین سلطنت کو ایک بیرونی قابض کے طور پر دیکھنا ترک کر دیتے، اور حاکم بھی محکومین کو اپنی برابری کا درجہ دیتے۔ حاکم و محکوم 'ان' کو 'ہم' گردانتے۔ روم کی تمام رعایا کو کئی صدیوں بعد بالآخر رومن شہریت دی گئی۔ غیر رومن بھی رومن لشکر کے بلند پایہ افسر تعینات ہوئے اور سینیٹ میں بھی تعینات ہوتے۔ ۴۸ عیسوی میں شہنشاہ کلاڈیس نے بہت سے فرانسیسی معززین کو سینیٹ میں داخل کیا، جو اس نے اپنی تقریر میں بیان بھی کیا "روایت، ثقافت اور شادیوں کے بندھن کے ذریعے اب ہم گھل مل گئے ہیں۔' گھمنڈی سینیٹروں نے ان سابقہ دشمنوں کو رومن سیاسی نظام کے عین قلب میں داخل کیے جانے پر اعتراض کیا۔ کلاڈیس نے انہیں ایک تلخ سچائی کا احساس دلایا۔ ان میں سے بیشتر سینیٹروں کے خاندان اطالوی قبیلوں کی نسل سے تھے جو کبھی روم سے مصروف پیکار رہے تھے، اور جنہیں بعد میں روم کی شہریت دی گئی تھی۔ بلکہ شہنشاہ نے انہیں یاد دلایا کہ خود اس کا خاندان اسپین کی نسل سے تھا۔

دوسری صدی عیسوی میں روم پر کئی شہنشاہ حاکم رہے جن کی پیدائش آیبریا کی تھی، اور جن کے خون میں مقامی آیبریا والوں کے خون کے چند قطرے تو ضرور ہی شامل رہے ہوں گے۔ ٹریجن، ہیڈرین، انتونینس پائس اور مارکس اوریلیس کے ادوار عموماً اس سلطنت کے سنہری ادوار شمار کیے جاتے ہیں۔ بہرحال تمام نسلی بند منہدم کیے جا چکے تھے۔ شہنشاہ سپٹیمیس سیویریس (۱۹۳۔۲۱۱) لیبیا کے قرطاجنی باشندوں کا پیوند تھا۔ ایلاگابیلس (۲۱۸۔۲۲۲) ایک شامی تھا۔ (۲۴۴۔۲۴۹) کے درمیان شہنشاہ فلپ کو عام بول چال میں عربی فلپ کہا جاتا تھا۔ اس سلطنت کے نئے باشندوں نے رومن سلطنت کی ثقافت کو کچھ ایسے ولولے سے اپنایا کہ صدیوں بلکہ سلطنت کے انہدام کے ہزاروں سال بعد بھی وہ سلطنت کی زبان بولتے رہے، اس عیسائی خدا پر ایمان رکھتے رہے، جو اس سلطنت نے لیوانت کے ایک صوبے سے اپنایا تھا اور شہنشاہ کے قوانین پر عمل کرتے رہے۔

عرب سلطنت میں بھی اسی قسم کا عمل دیکھا گیا۔

جب ساتویں صدی کے وسط میں یہ قائم ہوئی تو اس کا انحصار حاکم مسلمان عرب امرا اور محکوم مصریوں، شامیوں، ایرانیوں اور بربر گروہوں پر تھا۔ سلطنت کے بہت سے باشندوں نے اسلام قبول کرلیا، عربی بولنے لگے اور ایک مخلوط شاہی ثقافت اپنالی۔ قدیم عرب امرا ان نو دولتیوں کو حقارت سے دیکھتے۔ انہیں اپنا مخصوص مزاج اور شناخت کھو جانے کا خوف تھا۔ بے زار نو مسلم اس سلطنت اور اسلامی دنیا میں برابری کے لیے کوشاں رہے۔ بالآخر انہیں اپنی مرضی حاصل ہوگئی۔ مصری، شامی اور میسوپوٹیما والوں کو اب تقریباً عرب ہی سمجھا جانے لگا۔ لیکن خود یہ عرب، خواہ عربیہ سے آئے سچے عرب ہوں یا مصر و شام کے نو مسلم، ان پر زیادہ سے زیادہ غیر عرب غلبہ پانے لگے، بالخصوص ایرانی، ترک اور بربر۔ عرب شہنشاہیت کی سب سے بڑی کامیابی یہ تھی کہ اس کی تخلیق کی ہوئی سلطنتی ثقافت بہت سے عجمیوں نے صدق دل سے اپنالی۔ جو اس سے وفادار رہے، اصل سلطنت کے انہدام اور عربی النسل کی اپنی حکومت ختم ہو جانے کے بعد بھی اسے مزید بہتر بنا کر پھیلایا۔

چین میں سلطنت کا قیام اور بھی زیادہ مستحکم تھا۔ تقریباً دو ہزار سال تک مختلف نسلی اور ثقافتی گروہ جو پہلے وحشی کہلاتے تھے، کامیابی سے چینی شہنشاہی ثقافت میں رچ بس گئے، اور ہن چینی کہلانے لگے (ہن سلطنت سے معنون جو چین پر ۲۰۶ سے ۲۲۰ عیسوی تک قائم رہی)۔ چینی سلطنت کی انتہائی کامیابی یہ ہے کہ آج بھی باقی ہے اور پھل پھول رہی ہے۔ پھر بھی مضافاتی علاقوں مثلاً تبت اور ژنگ ژیانگ کو دیکھ کر ہی سلطنت کی پہچان ہوتی ہے۔ چین کی نوے فیصد سے زیادہ آبادی اپنی اور دوسروں کی نظر میں ہن ہی ہے۔ گزشتہ چند دہائیوں میں نوآبادیات کا خاتمہ بھی اسی طرح سمجھا جاسکتا ہے۔ جدید دور میں یورپ نے زمین کا بیشتر علاقہ ایک بہتر مغربی ثقافت کے پھیلاؤ کے بہانے قبضہ کرلیا۔ وہ اتنے کامیاب رہے کہ اربوں افراد نے بتدریج ان کی ثقافت کے مختلف رویے اپنالیے۔ ہندوستانیوں، افریقیوں، عربوں اور ماؤریوں نے فرانسیسی، انگریزی اور ہسپانوی سیکھ لی۔ وہ انسانی حقوق اور خودمختاری پر یقین کرنے لگے، انہوں نے مغربی افکار مثلاً آزادی خیالی، سرمایہ داری، کمیونزم، حقوق نسواں اور قوم پرستی اپنالیے۔

بیسویں صدی میں مقامی گروہ جنہوں نے مغربی افکار کو اپنایا تھا، وہ ان ہی اقدار کے نام پر یورپی حاکموں سے برابری کا مطالبہ کرنے لگے۔ بہت سی تحاریک آزادی، خودمختاری، سوشلزم اور انسانی حقوق مغربی میراث

کے سائے میں پلی بڑھیں۔ بلکہ جیسے مصریوں، ایرانیوں اور ترکوں نے اپنے اصل عرب آقاؤں کی شاہی ثقافت کو قبول کرکے اپنالیا تھا، اسی طرح آج کے ہندوستانی، افریقی اور چینیوں نے اپنے سابقہ مغربی حاکموں کی شاہی ثقافت کو قبول کرکے اسے اپنی ضروریات وروایت کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے۔

تاریخ کے اچھے، برے افراد

یہ بہت پرکشش ہے کہ تاریخ کو درمیان سے اچھے اور برے افراد میں تقسیم کردیا جائے، تمام سلطنتیں برے افراد میں شمار ہوں۔ کیوں کہ سلطنتوں کی واضح اکثریت کی بنیاد خون پر سینچی گئی اور ان کی طاقت جنگ و جبر کے ذریعے برقرار رہی۔ لیکن آج کی بیشتر ثقافتیں اپنی سلطنتوں سے مستعار ہیں۔ اگر وہ سلطنتیں خراب تھیں تو ہم کیا ہوئے؟

بہت سے فکری وسیاسی مکتبہ نظر انسانی ثقافت کو سامراجیت سے پاک کردینا چاہتے ہیں، اور اس کی جگہ شفاف اصل تہذیب کے خواہاں ہیں جو عصیاں سے داغ دار نہ ہوں۔ یہ نظریات کم از کم لاعلمی پر مبنی ہیں، یا محمل میں ملفوف خام قوم پرستی اور تعصب کا آئنہ ہیں۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ تاریخ کی ابتدا میں جو مختلف ثقافتیں نمودار ہوئیں، ان میں سے کچھ پاک، عصبیات سے غیر آلودہ اور دوسرے معاشروں کے اثرات سے آزاد رہی ہوں گی۔ لیکن اس ابتدا کے بعد سے کوئی ثقافت اس پاکیزگی کا دعویٰ نہیں کرسکتی، زمین کی موجودہ ثقافتوں میں سے تو یقیناً کوئی نہیں۔ تمام انسانی ثقافتیں کسی حد تک سامراج اور سامراجی تہذیب کی باقیات ہیں۔ کوئی تدریسی یا سیاسی جراحی مریض کو مارے بغیر اس سامراجی ورثے کو کاٹ کر الگ نہیں کرسکتی۔

ممبئی کا چھتراپتی شیواجی ریلوے اسٹیشن۔ ابتدا میں یہ وکٹوریہ سٹیشن ممبئی تھا۔ انگریزوں نے اسے انیسویں صدی کے اواخر میں برطانیہ میں مقبول نئے گوتھک طرز پر تعمیر کیا۔ ایک ہندو قوم پرست حکومت نے شہر اور اسٹیشن دونوں کا نام بدل دیا، لیکن اتنی خوبصورت عمارت منہدم کردینے کی انہیں ہمت نہیں ہوئی، گو یہ بھی بیرونی حملہ آوروں کی ہی تعمیر کردہ تھی

مثلاً آج کے آزاد ہندوستان اور برطانوی راج کے درمیان محبت ونفرت کے ملے جلے جذبات کو دیکھیے۔

ہندوستان پر برطانوی فتح اور قبضہ لاکھوں ہندوستانیوں کی زندگیوں کی قیمت پر ممکن ہوا تھا، اور پھر کروڑوں افراد کی مسلسل توہین اور استحصال کا باعث بنا۔ پھر بھی کسی تازہ ایمان لانے والے کی مانند بہت سے ہندوستانیوں نے خود مختاری اور انسانی حقوق کے مغربی افکار کو اپنا لیا۔ اور پھر وہ سخت ناراض ہوئے، برطانوی خود اپنے ہی اعلان شدہ اقدار کے مطابق مقامی ہندوستانیوں کو آزادی یا برطانوی عوام جیسے حقوق دینے سے انکاری تھے۔

بہر حال جدید ہندوستانی ریاست برطانوی سامراج کی اولاد ہے۔ برطانیہ والوں نے برصغیر کی آبادی کو قتل کیا، زخمی کیا اور انہیں دق کیا۔ لیکن ساتھ ہی انہوں نے بہت متفرق مصروف پیکار بادشاہتوں، ریاستوں اور قبائل کو متحد کر کے ایک مشترکہ قومی شناخت کو جنم دیا اور ملک کو ایک واحد سیاسی قوت میں بدل دیا۔ انہوں نے ہندوستانی نظام انصاف کی بنیاد رکھی، اس کا انتظامی ڈھانچہ مرتب کیا اور ریلوے کا جال بچھایا جو اقتصادی رابطوں کے لیے ناگزیر تھا۔ آزاد ہندوستان نے برطانیہ کی تقلید میں مغربی جمہوریت کا نظم حکومت منتخب کیا۔ انگریزی اب بھی برصغیر کی کاروباری زبان ہے، ایک غیر وابستہ بولی جسے ہندی، تامل اور ملیالم بولنے والے استعمال کرتے ہیں۔ ہندوستانی چائے اور کرکٹ کے بہت شوقین ہیں، یہ کھیل اور مشروب دونوں برطانوی سامراج کا ورثہ ہیں۔ کاروباری سطح پر ہندوستان میں چائے کی کاشت انیسویں صدی کے وسط تک موجود نہیں تھی، جب برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی نے اسے شروع کیا۔ یہ مغرور برطانوی صاحب تھے جنہوں نے پورے برصغیر میں چائے پینے کی روایت ڈالی۔

آج کتنے ہندوستانی انگریزی، چائے، کرکٹ، ریلوے نظام، قانونی نظام کو ترک کر دینے کے لیے ووٹ ڈالیں گے، کیوں کہ وہ سامراجی ورثہ ہیں۔ اور اگر وہ راضی بھی ہوئے تب بھی خود ووٹ ڈالنے کا عمل بھی قدیم آقاؤں کے قرض کا ہی مظاہرہ ہوگا۔

اگر ہم ایک جابر شہنشاہیت کے ورثے کو اس لیے ترک بھی کر دیں کہ اس سے پہلے سے موجود پاکیزہ ثقافتیں تحفظ پائیں گی، تو ہم شاید ایک اس سے بھی زیادہ پرانی اور اتنی ہی جابر سلطنت کا تحفظ کر رہے ہوں گے۔ جو برطانوی راج سے رنگی ہندوستانی ثقافت کی مذمت کرتے ہیں وہ غیر ارادی طور پر دلی کی سلطنت اور مغل بادشاہت کے ورثے کو درگزر کر دیتے ہیں۔ اور جوان مسلمان حملہ آوروں کی وراثت سے اصل ہندوستانی ثقافت کو الگ کرتے ہیں وہ گپتا، کیش اور موریہ سلطنتوں کے ورثے کو قبول کرتے ہیں۔ اگر ایک انتہا پسند ہندو قوم پرست برطانوی فاتحین کی تمام عمارتوں کو منہدم کر دے، مثلاً ممبئی کا مرکزی ریلوے اسٹیشن، تو ہندوستانی مسلم فاتحین کی عمارتوں کے متعلق کیا خیال ہے؟ مثلاً تاج محل۔

ثقافتی ورثے کے اس پیچیدہ سوال کو کیسے حل کیا جائے، کوئی نہیں جانتا۔ ہم جو بھی راہ اپنائیں سب سے پہلا قدم اس مسئلہ کی پیچیدگی کا اقرار ہے، اور اس بات کا اقرار کہ ماضی کو محض اچھے اور برے افراد میں تقسیم کرنا محض وقت کا زیاں ہے ورنہ ہمیں یہ تسلیم کرنے کے لیے آمادہ رہنا چاہیے کہ ہم عموماً برے افراد کی تقلید کرتے رہے ہیں۔

تاج محل، "اصلی" ہندوستانی ثقافت کی ایک مثال یا مسلمان سامراجیت کی ایک اجنبی تعمیر

نئی آفاقی سلطنت

۲۰۰ ق م سے تمام انسان کسی سلطنت کے سائے میں رہتے رہے ہیں۔ لگتا یہ ہے کہ مستقبل میں بھی زیادہ تر افراد کسی سلطنت میں ہی رہیں گے۔ لیکن اب یہ سلطنت واقعی عالمگیر ہوگی۔ تمام دنیا پر حکومت کی خسروانہ فکر اب بارآور ہوا چاہتی ہے۔

اکیسویں صدی کی آمد کے ساتھ قوم پرستی میدان چھوڑ رہی ہے۔ زیادہ سے زیادہ افراد اس بات پر یقین کر رہے ہیں کہ جائز سیاسی قوت کا سرچشمہ تمام انسانیت ہے، محض کسی خاص قومیت کے اراکین ہی نہیں۔ مزید یہ کہ انسانی حقوق کا تحفظ اور تمام انسانی اکائی کے مفادات کا تحفظ ہی سیاست کا رہنما اصول ہونا چاہیے۔ اگر ایسا ہے تو پھر ۲۰۰ آزاد ممالک اس راہ میں معاون نہیں بلکہ رکاوٹ ہیں۔ اگر سویڈن، انڈونیشیا اور نائیجیریا کے باشندے یکساں انسانی حقوق کے حقدار ہیں تو کیا یہ عقلمندی نہیں کہ ایک عالمگیر واحد حکومت ان سب کا تحفظ کرے؟

عالمگیر مسائل کے نمودار ہونے سے، مثلاً برفانی تودوں کا پگھلنا، آزاد ممالک کے جداگانہ وجود پر مزید ضرب لگتی ہے۔ کوئی بھی خودمختار ریاست اکیلے عالمی ماحولیاتی حرارت پر قابو نہیں پا سکے گی۔ آسمان نے اپنا قاعدہ چین کو تمام انسانیت کے مسائل حل کرنے کے لیے ودیعت کیا تھا۔ اب جدید آسمانی قاعدہ انسانیت سے جاری ہوگا کہ وہ آسمانی مسائل حل کرے، مثلاً اوزون چھتری میں سوراخ، اور ضرر آمیز گیسوں کا اجتماع۔ اس عالمگیر سلطنت کا رنگ شاید ہرا ہو۔

آج ۲۰۱۴ میں دنیا اسی سیاسی انتشار کا شکار ہے، لیکن ریاستیں تیزی سے اپنی آزادی کھو رہی ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی واقعی آزادانہ اقتصادی پالیسی نافذ کرنے کے قابل نہیں، نہ ہی اپنی مرضی سے اعلان جنگ کرنے یا جنگ جاری رکھنے، بلکہ خود اپنی مرضی سے اپنے اندرونی معاملات بھی نہیں چلا سکتا۔ ریاستیں بڑھتی ہوئی تعداد میں

عالمی اقتصادی نظام سے تعاون کر رہی ہیں۔ عالمگیر کمپنیوں اور غیر حکومتی اداروں کی دخل اندازی برداشت کر رہی ہیں، اور عالمی رائے عامہ اور بین الاقوامی نظام انصاف کے زیراثر ہیں۔ ریستوں پر لازم ہے کہ وہ اقتصادی رویے ، ماحولیاتی پالیسی اور انصاف کی عالمی قدروں پر پوری اتریں۔ مالیات، محنت کش اور معلومات کی طاقت ور لہریں ریاستی رائے اور سرحدوں سے اجتناب کرتی دنیا تراش رہی ہیں۔

یہ عالمی سلطنت جو ہماری نگاہوں کے سامنے تشکیل پا رہی ہے اس پر کسی ایک خاص ریاست یا نسلی گروہ کا اجارہ نہیں۔ رومن سلطنت کے آخری دور کی طرح اسے بھی بین النسلی امرا چلا رہے ہیں، مشترکہ ثقافت اور مشترکہ مفادات اسے باہم رکھے ہوئے ہیں۔ دنیا بھر میں بڑھتی ہوئی تعداد میں کاروباری افراد، انجینیر ، اسکالر، ماہرین، قانون دان اور مینیجر اس سلطنت سے وابستہ ہونے کے لیے طلب کیے جا رہے ہیں۔ ان کے لیے سوچنا لازم ہے کہ وہ اس سلطنت کی پکار پر کان دھریں یا اپنی ریاست اور اس کی آبادی سے وفادار رہیں۔۔ زیادہ سے زیادہ سلطنت کو منتخب کر رہے ہیں۔

O

قانونِ مذہب

وسطی ایشیا کے نخلستان میں واقع سمرقند کے قدیم بازار میں، شام کے بیوپاری نرم چینی ریشم پر ہاتھ پھیر رہے تھے۔ میدانوں سے جنگجو قبائلی مغرب بعید سے گھاس ایسے بالوں والے غلاموں کے تازہ گروہ کی نمائش کر رہے تھے، اور دکان دار چمکدار نقرئی سکے جن پر بدیسی تحریر اور اجنبی بادشاہوں کی تصاویر تھیں جیبوں میں بھر رہے تھے۔ مشرق و مغرب، شمال و جنوب اس دور کے ایک مرکزی چوراہے پر انسانیت روزانہ اکٹھی ہوتی تھی۔ یہی عمل اس وقت بھی دہرایا جاتا ہے جب قبلائی خان کی فوج نے بالآخر ہمت کر کے ۱۲۸۱ میں جاپان پر حملہ کیا۔ منگول گھڑ سوار کھال، پوستین زیب تن کیے، تنکوں سے بنی ٹوپیاں اوڑھے چینی پیادہ فوج کے شانہ بہ شانہ تھے۔ بلانوش کوریائی معاونین جنوبی چینی سمندر کے گدے بازوؤں والے ملاحوں سے جھگڑ رہے ہوتے، وسطی ایشیا کے انجینیر حیرت سے منہ کھولے یورپی مہم جوؤں کی لمبی داستانیں سن رہے تھے۔ یہ سب ایک ہی شہنشاہ کا حکم مانتے تھے۔

اسی دوران مکے میں خانہ کعبہ کے اطراف افراد کسی اور مقصد سے اکٹھے ہوتے تھے۔ اگر آپ ۱۳۰۰ء میں اسلام کی سب سے مقدس عمارت کے گرد طواف کرتے ہوئے زائر ہوتے تو اپنے ہمراہ میسوپوٹیمیا کے افراد دیکھتے جن کے لمبے چغے ہوا میں اڑ رہے تھے۔ ان کی آنکھیں بے خودی سے چمک رہی تھیں۔ ان کے منہ اللہ کے ننانوے ناموں کی گردان کر رہے ہوتے۔ ذرا اور آگے ممکن ہے کہ آپ کو موسم کی سختیوں والا ایشیا کے میدانوں سے ترک سردار کا چہرہ نظر آتا، ایک عصا کے سہارے چلتا وہ پرسوچ انداز میں اپنی داڑھی کھجا رہا تھا۔ اس جانب سیاہ فام جلد پر نقرئی زیور والے شاید افریقی ریاست مالی کے مسلمانوں کا ایک گروہ ہے۔ لونگ، ہلدی، چھوٹی الائچی اور سمندری نمک کی خوشبو ہندوستان سے آئے ساتھیوں کی خبر دے رہی تھی، یا شاید اس سے بھی مشرق میں واقع مصالحہ بھرے جزیروں کی۔

آج مذہب کو تعصب، اختلاف اور انتشار کی وجہ سمجھا جاتا ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ پیسے اور سلطنت کے ساتھ مذہب انسانیت کو متحد کرنے والا تیسرا بڑا عنصر ہے۔ کیوں کہ تمام سماجی قاعدے اور رتبے فرضی ہیں، لہذا وہ سب نازک ہوتے ہیں۔ جتنا بڑا معاشرہ اتنے ہی زیادہ نازک۔ مذہب کا اہم تاریخی کردار یہی رہا ہے کہ وہ ان نازک ڈھانچوں کو فوق البشر قانونی جواز فراہم کرتا ہے۔ مذہب کا دعویٰ ہوتا ہے کہ ہمارے قوانین نسانی خواہشات کا نتیجہ نہیں بلکہ ایک مطلق اور اعلیٰ ترین اختیار کا فرمان ہیں۔ اس سے کم از کم کچھ بنیادی قوانین تو اعتراض سے بالاتر ہو جاتے ہیں اور معاشرتی استحکام کو جنم دیتے ہیں۔

تو مذہب کی تعریف یوں بیان کی جاسکتی ہے کہ "انسانی اقدار اور معمولات کا ایسا نظام جس کی بنیاد مافوق البشر قواعد پر ہو۔" اس میں دو بہت مختلف معیار ہیں۔

ا۔ مذہب بتاتا ہے کہ یہ ایک مافوق البشر قاعدہ ہے جو انسانی معاہدوں یا مرضی کی پیداوار نہیں۔ پیشہ ور فٹبال کوئی مذہب نہیں ہے کیوں کہ بہت سے قوانین، دستور اور عجیب روایات کے باوجود سب کو معلوم ہے کہ فٹ بال خود انسان نے ایجاد کی تھی، اور فیفا (فٹ بال کی عالمی تنظیم) کسی وقت بھی گول کا ناپ بڑھا سکتی ہے، یا آف سائیڈ کا قانون بدل سکتی ہے۔

۲۔ اس مافوق البشر قاعدے کی وجہ سے مذہب ایسے قاعدے توانین وضع کرتا ہے جن کی پابندی لازم ہے۔ آج بہت سے مغربی بھوت، پری اور آواگون پر یقین رکھتے ہیں، لیکن اس یقین سے کوئی اخلاقیات یا رویوں کے معیار جنم نہیں لیتے۔ لہذا یہ مل کر کوئی مذہب قائم نہیں کرتے۔

بڑے پیمانے پر سماجی اور سیاسی قاعدوں کو قانونی وجود دینے کی اہلیت کے باوجود تمام مذاہب نے اس امکان سے فائدہ نہیں اٹھایا۔ انسان کے مختلف گروہوں کو ایک بڑی جغرافیائی زمین پر اپنے پروں کے نیچے متحد کرنے کے لیے کسی مذہب میں دو مزید خوبیاں درکار ہیں۔ اول تو اسے ایک آفاقی مافوق البشر قاعدہ نافذ کرنا ہے، جو ہر جگہ ہو اور ہمیشہ درست ہو۔ دوسرے وہ اس یقین کو ہر جگہ پھیلانے پر اصرار کرے۔ یعنی یہ نہ صرف آفاقی ہو بلکہ تبلیغی بھی۔

تاریخ کے سب سے معروف مذاہب اسلام اور بدھ ازم آفاقی اور تبلیغی ہیں۔ لہذا لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ سارے مذاہب ایسے ہی ہوں گے۔ درحقیقت قدیم مذاہب کی اکثریت مقامی اور استثنائی تھی۔ ان کے پیروکار مقامی دیوتاؤں اور ارواح پر یقین رکھتے تھے اور انہیں پوری انسانیت کو سدھارنے کا کوئی شوق نہیں تھا۔ جہاں تک ہمیں علم ہے آفاقی اور تبلیغی مذاہب پہلے ہزار سال قبل مسیح میں نمودار ہونا شروع ہوئے۔ ان کی آمد تاریخ کے سب سے اہم انقلابات میں سے ایک تھا، اور عالمگیر سلطنتوں اور عالمگیر دولت کی مانند انہوں نے انسانیت کو متحد کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔

بھیڑوں کو خاموش کرنا

جب روحیتِ مظاہر (animism) ہی غالب ایمانی نظریہ تھا تو انسانی قاعدے قوانین کے بہت سے دوسرے جانوروں کے مفاد کا بھی خیال رکھنا ہوتا تھا مثلاً حیوانات، نباتات، بھوت، پریاں۔ ممکن ہے کہ گنگا کی وادی میں کوئی متلاشی گروہ ایک قانون بنا دیتا جس میں لوگوں کو کھجور کے ایک بڑے درخت کے کاٹنے کی ممانعت ہوتی تا کہ کھجور کے درخت کی روح ناراض ہو کر انتقام پر نہ اتر آئے۔ کوئی اور گروہ جو وادئی سندھ میں مقیم ہو افراد کو سفید دم والی لومڑیوں کے شکار پر پابندی لگا دے، کیوں کہ ایک مرتبہ کسی سفید دم والی لومڑی نے ایک دانا بوڑھی عورت کو دکھایا تھا کہ ان کا گروہ قیمتی ادبیڈین کہاں سے حاصل کر سکتا ہے۔

یہ مذاہب اپنے دائرے میں بہت محدود ہوتے تھے۔ یہ مخصوص مقامات، ماحولیات اور لکڑوں کو اجاگر کرتے تھے۔ بیشتر متلاشی اپنی زندگی ایک ہزار مربع میل رقبے کے اندر ہی گزار دیتے۔ اپنی بقا کے لیے اس مخصوص

وادی کے باشندوں پر مافوق البشر قاعدے کو سمجھنا ضروری ہے جوان کی وادی کی نگراں ہے، اور لازم ہے کہ اپنا رویہ
اسی کے مطابق استوار کرے۔ کسی دور دراز کی وادی کے باسیوں کو اپنے قوانین کی پابندی پر رضامند کرنا حماقت
ہوتی۔ سندھ کے باشندے اپنے مبلغ گنگا نہیں بھیج سکتے تھے کہ وہ ان مقامیوں کو سفید دم والی لومڑیوں کے شکار سے
باز رکھیں۔

زرعی انقلاب کے ساتھ ہی لگتا ہے کہ مذہبی انقلاب بھی آیا۔ شکاری / متلاشی وحشی حیوانات اور نباتات کو
چنتے اور شکار کرتے جو ہوموسیپین کے برابر ہی سمجھے جاتے۔ یہ حقیقت کہ انسان بھیڑ کا شکار کرتے ہیں بھیڑوں کو
انسانوں سے کمتر نہیں کر دیتے۔ بالکل جیسے اگر چیتے انسانوں کا شکار کرتے ہیں تو اس سے انسان چیتوں سے کمتر نہیں
ہو جاتے۔ حیات کی مختلف صورتیں ایک دوسرے سے براہ راست مذاکرات کریں اور اپنے مشترکہ جغرافیہ میں
رہنے کے قوانین طے کر لیتے۔ اس کے مقابلے میں کسان حیوانات و نباتات کو پالتے اور سدھاتے اور وہ اپنے پالتو
سے مذاکرات کر کے اپنی توقیر کم نہیں کرتے۔ لہٰذا زرعی انقلاب کا پہلا مذہب تو یہ ہوا کہ حیوانات اور نباتات روحانی
دائرے میں برابری کے اراکین ہونے کے بجائے اب ان کی ملکیت بن گئے۔

لیکن اس سے ایک بڑا مسئلہ پیدا ہو گیا۔ ممکن ہے کہ کسان اپنی بھیڑوں پر مکمل تسلط کے خواہاں ہیں، لیکن
وہ خوب جانتے تھے کہ ان کا قبضہ محدود تھا۔ وہ بھیڑوں کو باڑے میں بند کر سکتے تھے، سور کو خصی کر سکتے تھے اور
بھیڑوں کی چنیدہ افزائش کر سکتے تھے۔ لیکن وہ پھر بھی یہ یقین دہانی نہیں کرا سکتے تھے کہ بھیڑیں حاملہ ہو کر صحت مند
بچوں کو جنم دیں، نہ ہی وہ مہلک وباؤں کو پھیلنے سے روک سکتے تھے، تو پھر وہ اپنے ریوڑ کی تعداد کیسے بڑھاتے؟

خداؤں کے وجود کے بارے میں ایک مقبول نظریہ یہ ہے کہ خداؤں کو اس لیے اہمیت حاصل ہوئی کہ وہ
مسائل کا حل فراہم کرتے تھے۔ افزائش کی دیوی، آسمان کا خدا اور خدائے طب اس وقت مرکزی حیثیت حاصل
کر گئے جب خداؤں کو انسانوں اور حیوانات و نباتات کے درمیان ثالث کا کردار ادا کرنا پڑا۔ قدیم دیومالائی
مفروضوں کا بیشتر حصہ دراصل ایک معاہدہ ہے جس میں انسان نباتات وحیوانات پر حکمرانی کے بدلے خداؤں پر دائمی
ایمان کا وعدہ کرتے ہیں۔ جینیسس کی کتاب کا پہلا باب ایک عمدہ مثال ہے۔ زرعی انقلاب کے بعد انسانی عبادات
کا طریقہ عموماً دیوتاؤں کے چرنوں میں بھیڑوں کی قربانی، شراب اور کیک کا چڑھاوہ تھا، جس کے عوض دیوتا ان
سے اچھی نصل اور افزائش مویشی کا وعدہ کرتے۔

ابتدا میں زرعی انقلاب سے غیر مادی اشیا کی قدر پر زیادہ فرق نہیں پڑا، مثلاً پتھر، چشمہ، بھوت اور
شیطان۔ لیکن جلد ہی نئے خداؤں کے سامنے یہ بھی ہار گئے۔ جب تک افراد اپنی ساری زندگی چند سو مربع میل کی حدود
میں گزار رہے تھے، اس وقت تک ان کی ضروریت مقامی ارواح سے پوری ہو جاتی تھیں۔ لیکن جب سلطنتیں اور تجارتی
نظام پھیلے تو افراد کو ایسے خداؤں کی ضرورت پڑی جن کی طاقت و حاکمیت پوری مملکت یا تجارتی رقبے پر لاگو تھی۔
ان ضروریات کے حل کی تلاش سے بہت سے خداؤں والے مذاہب نے جنم لیا۔ ان مذاہب کے اعتبار
سے یہ دنیا بہت سے طاقتور خداؤں کے ایک گروہ کے تابع تھی؛ مثلاً افزائش کا خدا، بارش کا خدا اور خدائے جنگ۔
انسان ان خداؤں سے مانگتے اور اگر کافی عبادات وقربانیاں بھیجی گئی ہوں تو ممکن ہے کہ یہ خداوند بارش، فتح اور صحت
سے ہمکنار کر دیں۔

کثیر خدائی مذاہب کے نمودار ہونے سے روحیت مظاہر کا مذہب ختم نہیں ہو گیا۔ تمام کثیر الخدائی مذاہب میں شیاطین، پریوں، بھوتوں، مقدس پتھروں، مقدس چشموں اور مقدس درختوں کو حیثیت حاصل رہی۔ یہ ارواح عظیم خداؤں سے تو بہت کم حیثیت تھیں لیکن انسانوں کی روزمرہ ضروریات کے لیے کافی تھیں۔ اگر بادشاہ اپنے دارالخلافے میں درجنوں فربہ دنبے عظیم خدائے جنگ پر قربان کر کے وحشیوں سے جنگ میں فتح کی دعا مانگتا، تو کسان اپنی جھونپڑی میں موم بتی جلا کر کھجور کے درخت کی پری سے مدد کا طالب ہوتا کہ اس کا بیمار لڑکا تندرست ہو جائے۔

لیکن ان عظیم خداؤں کے نمودار ہونے کا سب سے زیادہ اثر بھیڑوں یا بدروحوں پر نہیں بلکہ ہوموسیپین کی حیثیت پر پڑا۔ روحیت مظاہر کے مطابق انسان اس دنیا میں موجود بہت سی دوسری اشیا کی مانند محض ایک شے تھا، جب کہ کثیر خدائی مذاہب کے نزدیک یہ دنیا انسانوں اور خداؤں کے درمیان رشتے کا ایک عکس ہے۔ ہماری عبادت، قربانی، گناہ اور نیکی اس سارے ماحول کی قسمت کا فیصلہ کرتے ہیں۔ اربوں کی تعداد میں چیونٹیاں، ٹڈیاں، کچھوے، ہرن، زراف اور ہاتھی کسی ہولناک طوفان کے ہاتھوں صرف اس لیے مٹ سکتے تھے کہ چند احمق سیپین خداؤں کو ناراض کر دیتے۔ ان کثیر خدائی مذاہب نے نہ صرف خداؤں کا رتبہ بڑھایا بلکہ انسانوں کا بھی۔ روحیت مظاہر کے وہ بدقسمت اراکین اپنا رتبہ کھو کر انسانوں اور خداؤں کے تعلقات کے اس ڈرامے میں محض ایکسٹرا کردار بن گئے، یا سامانِ آرائش۔

بت پرستی کے فوائد

دو ہزار سالوں کی خدائے واحد کی پرستش سے مغربی ذہن کثیر الخدائی ایمان کا جہالت اور بچکانہ بت پرستی سمجھنے لگا ہے۔ یہ ایک غیر منصفانہ عمومیت ہے۔ کثیر خدائی پر ایمان کی اندرونی منطق کو سمجھنے کے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ اس یقین کا بنیادی نظریہ کیا تھا؟

بہت سے خداؤں پر ایمان لازماً اس بات کی نفی نہیں کرتا کہ یہ ساری کائنات ایک واحد طاقت یا قانون کے تابع ہے۔ درحقیقت بیشتر کثیر الخدائی مذاہب اور روحیت مظاہر کا مذہب بھی ایک عظیم طاقت کو تسلیم کرتے ہیں جو ان تمام خداؤں، بدروحوں اور مقدس پتھروں پر حاکم ہے۔ کلاسیکل یونانی کثیر الخدائی مذاہب میں زیوس، ہیرا اپولو اور ان کے ساتھی ایک قادر المطلق قوت کے تابع تھے۔۔۔ قسمت (موائرہ، انانکی)۔ نورڈک خداؤں کی تقدیر بھی قسمت سے وابستہ تھی، جس نے انہیں ریگناروک (Ragnarok) کے سیلاب میں مٹا دیا (خداؤں کا غروب)۔ مغربی افریقہ کے کثیر خدائی مذہب یوروبا میں تمام خداوند اس عظیم خدا اولوڈیومارے (Olodumare) کی اولاد تھے اور اسی کے تابع بھی۔ ہندو مذہب میں بھی ایک واحد حقیقت، اتمان، قسم قسم کے خداؤں، ارواح، انسانیت، طبع وحیاتیاتی دنیا پر حاکم ہے۔ یہ اتمان ہی ساری کائنات، ہر فرد اور ہر توعہ کی اصل روح ہے۔

کثیر الخدائی مذہب کی بنیادی فکر جو اسے خدائے واحد کے مذاہب سے الگ کرتی ہے یہ ہے کہ اس کائنات کا حاکم خدائے مطلق کسی تعصب یا فوائد سے بالاتر ہے، لہٰذا اسے انسانوں کی ارضی خواہشات، ضروریات اور پریشانیوں سے سروکار نہیں۔ اس سے جنگ میں فتح، صحت یا بارش مانگنا بے کار ہے کیوں کہ اس کے مقام عالی سے کیا فرق پڑتا ہے کہ کوئی مخصوص ریاست جیتے یا ہارے۔ کوئی مخصوص شہر ترقی کرے یا تنزلی، کوئی مخصوص فرد

صحت یاب ہو یا موت یا شکار۔ یونانیوں نے قسمت کے نام پر کوئی قربانی نہیں دی اور ہندوؤں نے اتمان کے کوئی مندر تعمیر نہیں کیے۔

کائنات کے اس خدائے مطلق سے رابطے کی واحد وجہ یہ ہوگی کہ اگر تمام خواہشات سے دست بردار ہو کر اچھائی کے ساتھ برائی کو اپنا لیا جائے، شکست غربت موت اور موت کو بھی گلے لگا لیا جائے۔ لہذا کچھ ہندو جنہیں سنیاسی یا سادھو کہا جاتا ہے وہ اپنی زندگی اتمان سے جوڑنے میں گزارتے ہیں اور یوں آگہی حاصل کرتے ہیں۔ وہ دنیا کو اس خدائے مطلق کے زاویہ نگاہ سے دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں کہ اس کی کائناتی نظر میں تمام ارضی خواہشات و دسوسے بیکار اور عارضی ہیں۔

لیکن زیادہ تر ہندو سادھو تو نہیں ہیں، وہ تو ارضی ضروریات کی دلدل میں پھنسے ہوئے ہیں جہاں اتمان مددگار نہیں ہوتا۔ ان معاملات میں مدد کے لیے ہندو ان خداؤں سے رجوع کرتے ہیں جن کی قدرت جزوی ہے۔ لہذا یہ خدا مثلاً گنیش، لکشمی اور سرسوتی تعصبات اور مفادات کے حامل ہیں۔ یعنی انسان ان جزوی طاقتوں سے سودا کر سکتے ہیں اور جنگ میں فتح یا بیماری سے صحت یابی کے لیے ان سے مدد مانگ سکتے ہیں۔ اور جب آپ ایک قادر مطلق کی طاقت کو تقسیم کرنے لگتے ہیں تو بہت سی جزوی طاقتوں کی ضرورت پڑتی ہے، یوں بہت سے خداؤں نے جنم لیا تھا۔

اس کثیر الخدائی نظریے کے مذہبی رواداری پر دور رس اثرات مرتب ہوئے تھے۔ کیوں کہ کثیر الخدائی ایک جانب تو خدائے مطلق پر یقین رکھتی ہے جو بالکل بے نیاز ہے، اور دوسری جانب بہت سے جزوی متعصب خداؤں پر۔ یوں ایک خدا کے ماننے والے کو کسی دوسرے کے خداؤں کے وجود اور کارکردگی کو تسلیم کرنے میں تامل نہیں۔ کثیر خدائی فطری طور پر کھلا ذہن رکھتی ہے اور عموماً ملحدوں اور کافروں کو مٹانے کے درپے نہیں ہوتی۔

یہاں تک کہ جب کثیر خدائی مذاہب نے بڑی سلطنتیں فتح کیں تب بھی انہوں نے اپنی رعایا کو بدلنے کی کوشش نہیں کی۔ مصریوں، رومن اور ازٹیک نے اجنبی علاقوں میں اپنے مبلغ بھیج کر اوسائرس (Osiris)، جیوپیٹر یا ہیوٹزیلو پوخلی (Huitzilopochtli۔ عظیم ازٹیک خدا) کی پرستش کی تبلیغ نہیں کی۔ نہ ہی انہوں نے اس مقصد کے لیے لشکر کشی کی۔ رعایا سے یہ توقع تھی کہ وہ سلطنت کے خداؤں اور عبادات کا احترام کریں گے کیوں کہ یہ خداوند اور عبادات سلطنت کی حفاظت اور بقا کے ضامن تھے۔ لیکن ان سے اپنے مقامی خداؤں اور عبادات کو ترک کر دینے کا مطالبہ نہیں کیا جاتا تھا۔ ازٹیک سلطنت میں مقامی رعایا سے ہیوٹزیلو پوخلی کے لیے معبد کی تعمیر کی توقع رکھی جاتی تھی، لیکن یہ معبد ان کے مقامی خداؤں کے معبد کے برابر تعمیر ہوتے تھے ان کی جگہ نہیں۔ بہت سی مثالوں میں شاہی امرا خود مقامی خداؤں اور ارواح کو اپنا لیتے۔ رومنوں نے بخوشی ایشیائی دیوی سیبل اور مصری دیوی آئسس کو اپنے مقدس گروہ میں شامل کر لیا تھا۔

وہ واحد خدا جسے رومن بہت عرصے تک قبول کرنے یا برداشت کرنے سے انکاری تھے وہ عیسائیوں کا انجیل والا خدائے واحد تھا۔ رومن سلطنت نے عیسائیوں سے ان کے ایمان و عبادات کو ترک کرنے کا مطالبہ نہیں کیا تھا، لیکن وہ یہ امید ضرور رکھتے تھے کہ وہ سلطنت کے محافظ خداؤں اور شہنشاہ کی الوہیت کی تعظیم کریں۔ یہ سیاسی وفاداری کا استعارہ تھا۔ جب عیسائیوں نے ایسا کرنے سے بزور انکار کیا اور مفاہمت کے سب دروازے بند کر دیے تو رومن نے اس فرقے کو مٹانے کی کوشش کی جسے وہ ایک تخریبی فرقہ سمجھتے تھے۔ اور ایسا بھی نیم دلی سے کیا گیا۔ مسیح

کے مصلوب ہونے سے شہنشاہ کونسٹنٹائن کے تبدیلئ مذہب تک تین سو سال کے دورانیے میں، کثیر خدائی رومن شہنشاہوں نے عیسائیوں کو مٹانے کی چار عمومی کوششوں پر اکتفا کیا۔ مقامی ذمہ داروں اور گورنروں نے خود اپنے طور پر عیسائیوں کے خلاف تشدد کو ہوا دی۔ پھر بھی ہم اگر ان تمام ایذا رسانی کے متاثرین کو اکٹھا کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان تین صدیوں میں کثیر خدائی رومن نے چند ہزار عیسائیوں سے زیادہ قتل نہیں کیے۔ اس کے متضاد اس کے بعد آنے والے پندرہ سو برسوں میں خود عیسائیوں نے ان عیسائیوں کا لاکھوں کی تعداد میں قتل عام کیا جو اس محبت درحم دلی کے مذہب کا ذرا سا مختلف مطلب نکالتے تھے۔

سولہویں اور سترھویں صدی میں کیتھولک اور پروٹسٹنٹ کے درمیان یورپ میں جو جنگیں ہوئیں انہوں نے بالخصوص نام کمایا۔ ان میں جتنے لوگ بھی شریک تھے سب کے سب مسیح کی رہبانیت اور ان کے پیغام محبت و آشتی پر یقین رکھتے تھے۔ لیکن وہ ان کے طریق محبت پر اختلاف رکھتے تھے۔ پروٹسٹنٹ کا کہنا تھا کہ الٰہی محبت اتنی مکمل تھی کہ خدا خود گوشت پوست کے سانچے میں اتر آیا اور اس نے اپنے اوپر تشدد و مصلوب کرنے کی اجازت دی، یوں اس نے اصل گناہوں کی مکافات کی، اور ان تمام لوگوں کے لیے جنت کے دروازے وا کر دیے جو اس پر ایمان رکھتے ہوں۔ کیتھولک کے خیال میں ایمان رکھنا ضروری تھا لیکن کافی نہیں۔ جنت میں داخلے کے لیے ایمان لانے والوں کو کلیسا میں عبادات اور نیک افعال کی ضرورت تھی۔ پروٹسٹنٹ اس سے انکار کرتے، ان کے نزدیک اس ادل بدل سے خدا کی عظمت اور محبت پر حرف آتا ہے۔ جو بھی یہ سمجھتا ہے کہ جنت میں داخلے کا دارومدار خود اس کے اعمال پر منحصر ہے، وہ خود اپنی ذات کی اہمیت کو بڑھاتا ہے اور گویا یہ عندیہ دیتا ہے کہ صلیب پر عیسیٰ کی تکلیف اور انسانیت کے لیے خدا کی محبت کافی نہیں تھی۔

یہ مذہبی تفریق اتنی پرتشدد ہوگئی کہ سولہویں اور سترھویں صدی میں پروٹسٹنٹ اور کیتھولک نے ایک دوسرے کو لاکھوں کی تعداد میں ہلاک کیا۔ ۲۳ اگست ۱۵۷۲ کو فرانسیسی کیتھولک جو اچھے اعمال کا درس دیتے تھے انہوں نے فرانسیسی پروٹسٹنٹ آبادیوں پر حملہ کیا جو انسانیت کے لیے خدا کی محبت پر ایمان رکھتے تھے۔ اس حملے میں جو سینٹ بارتھولومیو کے قتل عام کے نام سے مشہور ہوا چوبیس گھنٹوں سے کم وقت میں پانچ سے دس ہزار پروٹسٹنٹ قتل ہوئے۔ جب روم میں پوپ نے فرانس سے آنے والی یہ خبر سنی تو اسے اتنی مسرت ہوئی کہ اس نے اس موقع کا جشن منانے کے لیے تہواری عبادات منعقد کیں۔ اس نے جارجیو وساری کو طلب کیا کہ وہ ویٹیکن کے ایک کمرے میں اس قتل عام کے منظر کو مصور کرے (فی الوقت یہ کمرہ سیاحوں کے لیے بند ہے)۔ ان چوبیس گھنٹوں میں جتنے عیسائی دوسرے عیسائیوں کے ہاتھوں قتل ہوئے اتنے تو کثیر خدائی رومن سلطنت کے مکمل دور میں نہیں مارے گئے تھے۔

خدا ایک ہے

وقت گزرنے کے ساتھ کثیر خدائی والے اپنے مخصوص خدا سے اس قدر مانوس ہو گئے کہ وہ بنیادی کثیر الخدائی کو فراموش کر بیٹھے۔ وہ سمجھنے لگے کہ ان کا خدا ہی واحد خدا تھا اور وہی کائنات کا قادر المطلق تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی انہیں یہ بھی یقین تھا کہ یہ خدا مفادات و تعصبات رکھتا ہے اور وہ اس سے معاملہ فہمی کر سکتے ہیں۔ یوں خدائے واحد کے مذاہب نے جنم لیا، جن کے ماننے والے کائنات کے قادر المطلق سے تمنا رکھتے ہیں کہ وہ انہیں صحت دے،

لاٹری جتائے اور جنگ میں کامیابی عطا کرے۔

ایک خدا کا سب سے پہلا مذہب ۱۳۵۰ ق م میں مصر میں نمودار ہوا جب فرعون آخین تن نے اعلان کیا کہ مصری خداؤں میں ایک چھوٹا خدا ایٹن ہی دراصل ساری کائنات کا قادر المطلق تھا۔ آخینا تن نے ایٹن کی عبادت کو ریاستی مذہب کا درجہ دیا اور دوسرے تمام خداؤں پر پابندی عائد کرنے کی کوشش کی۔ لیکن اس کا مذہبی انقلاب ناکام رہا۔ اس کے انتقال کے بعد ایٹن کی عبادت ترک کر کے دوبارہ مقدس خداؤں کے گروہ کی عبادت شروع ہوگئی۔

کثیر الخدائی مذاہب سے یہاں وہاں یکتا خدائی مذاہب جنم لینے لگے، لیکن وہ محض حاشیائی ہی رہے، جس کی ایک وجہ خود ان کے اپنے کائناتی نظام کے فلسفے کو ہضم کرنے میں ناکامی تھی۔ مثلاً یہودیت نے یہ نظریہ پیش کیا کہ ان کا خدا مفادات و تعصبات رکھتا ہے، اور اس کی دلچسپی مختصری یہودی قوم اور غیر معروف اسرائیلی خطے سے وابستہ تھی۔ یہودیت کے پاس دوسری قوموں کو دینے کے لیے کچھ نہیں تھا، اور اپنی تمام تاریخ وہ تبلیغی مذہب نہیں رہا۔ اس مذہب کو "مقامی خدائے واحد کا مذہب" کہا جا سکتا ہے۔

اس میں بڑی تبدیلی عیسائیت کے ساتھ آئی۔ یہ عقیدہ یہودیوں کے ایک مخفی گروہ سے شروع ہوا، جو دوسرے یہودیوں کو یقین دلاتے تھے کہ نذرتھ کا عیسیٰ ہی ان کا مسیحا ہے کہ جس کے وہ منتظر تھے۔ لیکن اس عقیدے کے اولین رہنماؤں میں سے ایک تارسس کے پال نے دلیل دی کہ اگر کائنات کے قادر المطلق کے تعصبات اور مفادات ہیں، اور اگر انھوں نے انسانیت کی بقا کی خاطر گوشت پوست میں نمودار ہو کر مصلوب ہونے کی زحمت کی ہے تو اس بارے میں صرف یہودیوں کو نہیں بلکہ تمام عالم کو خبر ہونی چاہیے۔ لہٰذا قرار پایا کہ مسیح کے بارے میں پیغام ۔۔۔ انجیل ساری دنیا تک پہنچائی جائے۔

پال کے دلائل کی خوب پذیرائی ہوئی۔ عیسائیوں نے تمام انسانوں کو نشانہ بناتے ہوئے خوب دور دراز کے علاقوں کی تبلیغی جماعتیں مرتب کیں۔ تاریخ کے ایک عجیب کھیل سے یہودیوں کا یہ مخفی گروہ عظیم رومن سلطنت پر قابض ہو گیا۔

عیسائیت کی کامیابی سے ایک اور خدائے واحد کے مذہب کا ڈھانچہ تیار ہو گیا، جو ساتویں صدی عیسوی میں جزیرہ نمائے عرب میں نمودار ہوا۔۔۔ اسلام۔ عیسائیت کی مانند اسلام بھی دنیا کے ایک دور دراز کونے میں ایک چھوٹے فرقے کے طور پر شروع ہوا، لیکن اور بھی زیادہ تیزی اور حیرت انگیز سرعت سے یہ عرب کے صحراؤں سے نکل کر بحیرہ اوقیانوس سے ہندوستان تک ایک عظیم الشان سلطنت میں پھیل گیا۔ اس کے بعد سے دنیا کی تاریخ میں خدائے واحد کے تصور نے مرکزی کردار ادا کیا۔

ایک خدا کے پیروکار کثیر خدائی پیروکاروں سے کہیں زیادہ انتہا پسند اور تبلیغی ثابت ہوئے۔ ایک مذہب جو دوسرے اعتقادات کو بھی درست قرار دے گویا یہ بتاتا ہے کہ اس کا خدا کائنات کا واحد خدا نہیں، یا یہ کہ اس نے خدا سے صرف جزوی آفاقی سچائی وصول کی ہے۔ کیوں کہ ایک خدا کے ماننے والے عموماً یہ سمجھتے ہیں کہ اس خدائے واحد کا مکمل پیغام صرف ان پر نازل ہوا ہے، تو وہ دوسرے مذاہب کی تردید پر مجبور ہیں۔ پچھلے دو ہزار سالوں سے ایک خدا کے ماننے والوں نے اپنے استحکام کی خاطر اپنے ہر مد مقابل کو پر تشدد طریقے سے مٹانے کی کوشش کی ہے۔

عیسائیت اور اسلام کا پھیلاؤ

اور یہ ساز گار بھی رہا۔ پہلی صدی عیسوی کی ابتدا میں دنیا میں شاید ہی کوئی خدائے واحد کا ماننے والا تھا۔ سنہ پانچ سو تک دنیا کی عظیم ترین سلطنتوں میں سے ایک رومن سلطنت اور ایک عیسائی ریاست تھی۔ مبلغین عیسائیت کو دنیا کے دوسرے خطوں یورپ، ایشیا اور افریقہ میں پھیلانے میں مصروف تھے۔ پہلے ہزار سال عیسوی تک یورپ، مغربی ایشیا اور شمالی افریقہ میں زیادہ تر آبادی خدائے واحد پر ایمان رکھتی تھی، اور بحیرہ اوقیانوس سے ہمالیہ تک سلطنتیں ایک ہی خدا کی مذاہب کی پیروی کر رہی تھیں۔ سولھویں صدی کی ابتدا تک خدائے واحد کے مذاہب زیادہ تر افرو ایشیا میں لاگو تھے، سوائے مشرقی ایشیا اور افریقہ کے مغربی حصوں کے۔ اور اس نے اپنے طویل بازو جنوبی افریقہ، امریکہ اور آسٹریلیا کی جانب پھیلانے شروع کیے۔ آج مشرقی ایشیا سے باہر بیشتر آبادی کسی نہ کسی خدائے واحد کے مذہب کی پیروکار ہے۔ عالمی سیاسی قاعدہ ایک خدا کی بنیاد پر استوار ہے۔

لیکن جیسے روحیت مظاہر کا مذہب کثیر خدائی مذاہب کے اندر زندہ رہا تھا، اسی طرح خدائے واحد کے مذاہب میں بھی کثیر خدائی مذاہب باقی رہے۔ نظریاتی اعتبار سے جب کوئی شخص یہ مان لیتا ہے کہ تمام کائنات کے خدا کے تعصبات اور مفادات ہیں، تو جزوی خداؤں کی عبادت سے کیا حاصل؟ اگر صدر کے دروازے آپ کے لیے کھلے ہوں تو بھلا ایک ادنیٰ بیوروکریٹ کے پاس کون جائے گا؟ یقیناً خدائے واحد کی الہیات تمام دوسرے خداؤں کی نفی کرتی ہے، اور اگر کوئی ان کی عبادت کی جرات کرے تو ان پر دوزخ کی آگ اور گندھک برسائی جاتی ہے۔

لیکن پھر بھی راہبانہ نظریات اور تاریخی حقائق کے درمیان ہمیشہ ایک خلیج رہی ہے۔ زیادہ تر افراد نے خدائے واحد کا نظریہ پوری طرح قبول کرنے میں دشواری محسوس کی ہے۔ انہوں نے دنیا کو اب بھی 'ہم' اور 'وہ' میں تقسیم کر رکھا ہے، اور کائنات کے قادر المطلق کو اپنی ارضی ضروریات کے لیے بہت دور اور اجنبی۔ خدائے واحد کے مذاہب نے دوسرے خداؤں کو بہت زور و شور کے ساتھ صدر دروازے سے باہر پھینک دیا، لیکن پھر انہیں بغلی کھڑکیوں سے اندر گھسا لیا۔ مثلاً عیسائیت نے اپنے پیروں (Saints) کا ایک گروہ تراش لیا ہے جن کا مسلک کثیر خدائی سے زیادہ مختلف نہیں۔

بالکل جیسے خدا جیوپیٹر روم کا محافظ تھا اور ہوئٹزلوپوٹشلی ازٹیک سلطنت کا، اسی طرح ہر عیسائی ریاست کا اپنا ولی ہے جو اسے دشواریوں سے گزرنے اور جنگیں جیتنے میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔ انگلستان کی حفاظت سینٹ جارج کرتے ہیں، اسکاٹ لینڈ کی سینٹ اینڈریوز، ہنگری کی سینٹ اسٹیفن اور فرانس کی سینٹ مارٹن۔ شہر، قصبے، پیشے اور بیماریاں تک اپنا الگ ولی رکھتی تھیں۔ میلان شہر کے ولی سینٹ ایمروز جب کہ وینس کی حفاظت سینٹ مارک نے اٹھا رکھی ہے۔ چمنی صاف کرنے والوں کے ساتھ سینٹ فلورئن ہیں، جب کہ سینٹ میتھیو دشواری میں گرفتار ٹیکس جمع کرنے والوں کی مدد کرتے ہیں۔ اگر آپ کو سر میں درد ہو تو سینٹ آگسٹس سے دعا مانگیے، لیکن اگر دانت میں درد ہو تو سینٹ اپولونیا زیادہ بہتر سامع ہیں۔

یہ عیسائی ولی پرانے کثیر خدائی مذاہب کے خداؤں سے محض مشابہ ہی نہیں تھے، اکثر پردے میں پوشیدہ وہی خداوند تھے۔ مثلاً عیسائیت کی آمد سے پہلی آئرلینڈ کی دیوی بریجڈ تھیں۔ جب آئرلینڈ داخل عیسائیت ہوا تو بریجڈ نے بھی عیسائیت قبول کی، وہ سینٹ بریجڈ بن گئیں جو آج تک کیتھولک آئرلینڈ کی سب سے محترم ولی ہیں۔

خیر و شر کی جنگ

کثیر خدائی نے نہ صرف خدائے واحد کے مذاہب بلکہ دو رخی کو بھی جنم دیا۔ دو رخی مذاہب دو مخالف قوتوں پر یقین رکھتے ہیں، خیر و شر۔ خدائے واحد کے مذاہب کے مقابلے میں یہ دو رخی مذاہب مانتے ہیں کہ شر ایک خود مختار قوت ہے، نہ خدائے خیر کی تخلیق اور نہ ہی اس کو جواب دہ۔ اس دو رخی کے مطابق کائنات ان قوتوں کا میدان جنگ ہے، اور دنیا میں جو بھی ہوتا ہے وہ اسی جنگ کا حصہ ہے۔

یہ دو رخی نظریہ بہت پر کشش ہے کیوں کہ اس سے دنیا کے مشہور مسائلِ شر کا ایک سادہ جواب مل جاتا ہے۔ انسانی فکر کا ایک بنیادی سوال کہ دنیا میں شر کیوں ہے؟ افراد تکلیف کیوں اٹھاتے ہیں؟ نیک لوگوں کے ساتھ برائی کیوں ہوتی ہے؟ خدائے واحد پر یقین رکھنے والے مذاہب کو یہ سمجھانے کے لیے بہت ذہنی ورزشیں کرنی پڑتی ہیں کہ وہ قادر مطلق اور ایک مکمل خدائے خیر دنیا میں دکھوں میں موجودگی کی اجازت کیوں دیتا ہے؟ اس کا ایک معروف جواب یہ ہے کہ یہ خدا کا انسان کو آزادی عطا کرنے کا ایک شاخسانہ ہے۔ اگر شر نہ ہوتا تو انسان اچھے اور برے کے درمیان تمیز نہ کر پاتے، گویا کوئی شخصی آزادی نہ ہوتی۔ لیکن یہ غیر وجدانی جواب فوراً سوالوں کے ایک نئے سلسلے کو جنم دیتا ہے۔ آزادئ عمل انسانوں کو شر منتخب کرنے کی اجازت دیتی ہے اور یقیناً بہت سے شر کو منتخب بھی کرتے ہیں۔ یک خدائی مذاہب کے مطابق عموماً یہ انتخاب اپنے ساتھ خدا کی جانب سے سزا بھی لاتا ہے۔ اگر خدا کو یہ پہلے سے معلوم تھا کہ کوئی مخصوص شخص اپنی شخصی آزادی کے استعمال سے شر کا انتخاب کرے گا، اور نتیجے میں اسے دوزخ کی دائمی آگ میں جلنا پڑے گا تو خدا نے اسے تخلیق ہی کیوں کیا؟ مذہبی عالموں نے ایسے سوالات کے جوابات دینے کے لیے ان گنت کتابیں تحریر کی ہیں۔ کچھ افراد ان جوابات کو اطمینان بخش پاتے ہیں، کچھ نہیں۔ لیکن اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ خدائے واحد کے مذاہب کو شر کا وجود سمجھانے میں دشواری ہوتی ہے۔

دو رخی نظریے کے لیے شر کو سمجھانا آسان ہے۔ نیک افراد کے ساتھ برائی اس لیے ہوتی ہے کہ اس دنیا پر صرف نیکی کا خدا ہی حاکم نہیں۔ برائی کی ایک قوت بھی دنیا میں آزادو کار فرما ہے۔ یہ قوت شر خرابی پیدا کرتی ہے۔

اس دورخی مذہب کے اپنے مسائل ہیں۔ یہ شر کے وجود کو بیان کرتا ہے لیکن قواعد کو سمجھانے میں الجھ جاتا ہے۔ اگر یہ دنیا ایک خدا کی بنائی ہوئی ہے تو یہ سمجھنا آسان ہے کہ یہ دنیا اس قدر قاعدے سے کیوں چلتی ہے، کیوں کہ ہر چیز ان ہی توانین کی پابندی کرتی ہے۔ لیکن اگر دنیا پر حاکمیت کے لیے خیر و شر میں جنگ جاری ہے تو اس کائناتی جنگ کے قوانین کون مرتب کرتا ہے؟ دو مخالف قوتیں ایک دوسرے سے جنگ کر سکتی ہیں کیوں کہ دونوں ہی طبیعات کے اصولوں کی پابند ہیں۔ پاکستان سے چلا ہوا کوئی میزائل انڈیا میں اپنے ٹھکانے کو نشان بنا سکتا ہے، کیوں کہ کشش ثقل دونوں ممالک میں ایک ہی طرح سے عمل کرتی ہے۔ جب خیر و شر میں جنگ ہوتی ہے تو کون سے مشترکہ قوانین کی پابندی کرتے ہیں، اور وہ قوانین کس نے نافذ کیے؟

تو یک خدائی مذاہب توانین تو سمجھا دیتے ہیں لیکن شر کے مسئلے میں الجھ جاتے ہیں۔ دو رخی مذاہب شر کو سمجھا لیتے ہیں لیکن قواعد میں پھنس جاتے ہیں۔ تو اس پہیلی کو بوجھنے کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ کہ ایک ہی خدائے قادر مطلق وجود رکھتا ہے، جس نے ساری کائنات بنائی، اور وہ خود ہی شر ہے۔ لیکن تاریخ میں کسی کو اتنی جرات نہیں تھی کہ وہ اس پر یقین رکھتا۔

دورخی مذاہب تقریباً ایک ہزار سال تک پھلے پھولے۔ کوئی پندرہ سو سے ایک ہزار سال ق م میں، وسطی ایشیا میں کہیں زرتشت نامی ایک پیغمبر تھا۔ نسل در نسل اس کا عقیدہ پھیلتا رہا، یہاں تک کہ وہ اہم ترین دو رخی مذہب بن گیا، زرتشتی۔ زرتشت نے دنیا کو دو عالمگیر قوتوں، خدائے خیر اہورا مزدا (Ahura Mazda) اور خدائے شر انگرہ مینیو (Angra Mainyu) کے درمیان میدان جنگ تسلیم کر لیا۔ اس جنگ میں انسانوں کو خدائے خیر کی مدد کرنی تھی۔ فارس کی اسمینائی (Achaemenid) سلطنت (۵۵۰-۳۳۰ ق م) میں زرتشت ایک اہم مذہب تھا، بعد میں ساسانی سلطنت (۲۲۴-۶۵۱) کے دوران یہ سرکاری مذہب بن گیا۔ اس نے بعد میں آنے والے مشرق وسطیٰ اور وسطی ایشیا کے تقریباً تمام مذاہب کو متاثر کیا، اور بہت سے دورخی مذاہب مثلاً غناسطیت (Gnosticism) اور مانویت۔

تیسری اور چوتھی صدی عیسوی میں مانوی اعتقاد چین سے شمالی افریقہ تک پھیل گیا اور کچھ عرصہ تو ایسا لگا کہ یہ شاید رومن سلطنت میں تسلط کے لیے عیسائیت کو بھی پیچھے چھوڑ دے گا۔ لیکن مانویوں نے روم عیسائیوں کے ہاتھوں ہار دیا، اور زرتشتوں کی ساسانی سلطنت بھی یک خدائی مسلمانوں کے سامنے تہہ ہو گئی، یوں دورخی مذاہب کی لہر دم توڑ گئی۔ آج دورخی مذاہب کے مٹھی بھر ماننے والے ہندوستان اور مشرق وسطیٰ میں پائے جاتے ہیں۔

پھر بھی یک خدائی مذاہب کی بڑھتی ہوئی مقبولیت سے یہودیت کا خاتمہ نہ ہوا۔ یہودی، عیسائی اور مسلمان، یک رخی مذاہب نے بہت سے دورخی مذہبی عقائد اور روایات کو اپنا لیا۔ درحقیقت یک خدائی کے چند بہت بنیادی نظریات اپنی فکر و ابتدا میں دورخی ہیں۔ ان گنت عیسائی، مسلمان اور یہودی ایک طاقت ور شیطانی قوت پر یقین رکھتے ہیں، جسے مثلاً عیسائی شیطان کہتے ہیں۔ یہ آزادانہ حرکت کرتا ہے، خدائے خیر سے جنگ کرتا ہے اور خدا کی اجازت کے بغیر تباہی پھیلاتا ہے۔

کوئی ایک خدا کا ماننے والے ایسے دورخی اعتقاد کیسے رکھ سکتا ہے (جو بہر حال توریت میں کہیں نظر نہیں آتے)، منطقی طور پر یہ ناممکن ہے۔ یا تو آپ ایک قادر مطلق خدا پر یقین رکھتے ہیں، یا دو مدمقابل قوتوں پر، جن میں

سے کوئی بھی قادر مطلق نہ ہو۔ لیکن متضاد چیزوں پر یقین رکھنے کی انسانوں میں بہت صلاحیت ہے۔ لہذا اس میں کوئی حیرت نہیں کہ کروڑوں پارسا عیسائی، مسلمان اور یہودی بیک وقت ایسے قادر مطلق خدا اور آزاد شیطان پر یقین رکھتے ہیں۔ ان گنت عیسائی، مسلمان اور یہودی تو یہاں تک بڑھ گئے کہ ان کے نزدیک خیر کا خدا شیطان کے خلاف جنگ میں ہماری مدد کا ضرورت مند ہے، جس سے دوسری چیزوں کے ساتھ صلیبی جنگوں اور جہاد کو شہ ملی۔

ایک اور دورخی نظریہ، خصوصاً غناسطیت اور مانویت میں روح و جسم اور مادے و نفس کے درمیان واضح فرق تھا۔ غناسطی اور مانوی یہ دلیل دیتے ہیں کہ خدائے خیر نے روح و نفس کو پیدا کیا، جب کہ جسم و مادہ شر کے خدا کے پیدا کردہ ہیں۔ اس نظریے کے مطابق انسان کا وجود اچھی روح اور برے جسم کے درمیان جنگ کا میدان ہے۔ خدائے واحد کے اعتبار سے یہ حماقت ہے، بھلا روح و جسم اور نفس و مادے میں اس قدر واضح تفریق کی کیا ضرورت ہے؟ اور یہ کیوں کہا جائے کہ جسم و مادہ شر ہیں؟ آخر سب ہی چیزیں اس خیر کے خدا ہی کی تو بنائی ہوئی ہیں لیکن ایک خدا کے ماننے والے ان دورخی نظریات پر یقین کے سامنے بے بس ہو جاتے ہیں، بالخصوص کیوں کہ اس سے انہیں شر کو سمجھانے میں سہولت ہوتی ہے۔ تو یہی تضاد بالآخر عیسائی اور اسلامی فکر کی بنیاد بنا۔ جنت پر یقین (خیر کے خدا کی قلمرو) اور دوزخ (شر کے خدا کی ریاست) پر ایمان اس دورخی سے پیدا ہوا۔ اس اعتقاد کا توریت میں کوئی تذکرہ نہیں اور وہ کتاب یہ دعویٰ بھی نہیں کرتی کہ انسانی ارواح بعد از موت بھی باقی رہتی ہیں۔

درحقیقت یک خدائی مذاہب جس طرح مرتب ہوئے وہ ایک خدا، دورخی مذاہب، کثیر خدائی مذاہب اور روحیت مظاہر کے مذاہب کی سیر بین ہیں، جنہیں ایک ہی خدائی چھت کے نیچے اکٹھا کر دیا گیا ہے۔ ایک عام عیسائی خدائے واحد پر یقین رکھتا ہے، لیکن ساتھ ہی دورخی شیطان پر، کثیر الخدائی اولیا (سینٹ) پر اور غیر مادی بھوتوں پر۔ مذہبی علما کے پاس ان مختلف اور بعضے متضاد نظریات کا بیک وقت قبول کرنا، اور مختلف ماحصل سے روایات و عبادات کے اکٹھے ہونے کا ایک نام ہے، وہ اسے امتزاج ضدین (Syncretism) کہتے ہیں۔ امتزاج ضدین ہی شاید دنیا کا واحد عظیم مذہب ہے۔

قانون فطرت

ابھی تک ہم نے جن تمام مذاہب پر بحث کی ہے ان میں ایک خاصیت مشترکہ ہے، وہ سب خداؤں اور مافوق الفطرت موجودات پر یقین رکھتے ہیں۔ یہ سب مغرب والوں پر تو واضح ہے کہ جو عموماً خدائے واحد یا کثیر خدائی پر یقین رکھتے ہیں۔ لیکن درحقیقت عالمی تاریخِ مذاہب کی ابتدا خداؤں کی تاریخ سے شروع نہیں ہوئی تھی۔ پہلے ہزار سال ق م بالکل مختلف قسم کے مذاہب نے افروایشیا میں پھیلنا شروع کیا۔ یہ نو وارد مثلاً ہندستان میں جین اور بدھ مت، چین میں کنفیوشس اور تاؤ اور بحیرہ روم کے ساحل پر رواقیت، کلبی اور اپیی توریت (Epicureanism)، ان تمام مذاہب میں خدا کو نظر انداز کیا گیا تھا۔

ان عقائد کے مطابق کائنات کو چلانے والے مافوق الانسان قوانین، خدائی رضا سے آزاد اور فطری ہیں۔ اس قسم کے قوانینِ فطرت کے کچھ مذاہب خدا کے وجود کو ملوث کرتے رہے، لیکن ان کے خدا بھی انسانوں، پودوں اور جانوروں کی مانند قوانین فطرت کے تابع تھے۔ ماحول میں ہاتھی اور خارپشت کی طرح خدا بھی اپنا وجود

رکھتے تھے، لیکن وہ قوانین فطرت بدلنے میں کسی ہاتھی سے زیادہ قادر نہیں تھے۔ ان کی ایک اعلیٰ مثال بدھ مت ہے۔ قدیم فطری توانین والے مذاہب کا سب سے اہم رکن اب بھی ایک اہم مذہب کے طور پر برقرار ہے۔

بدھ مت کا مرکزی کردار کوئی خدا نہیں بلکہ سدھارتا گوتم نامی ایک انسان ہے۔ بدھ روایات کے مطابق پانچ سو سال قبل مسیح کے قریب گوتم ایک چھوٹی ہمالیائی ریاست کا وارث تھا۔ یہ نوجوان شہزادہ اپنے اطراف بکھرے دکھوں سے بہت متاثر تھا، اس نے دیکھا کہ مرد، عورت، بچے اور بوڑھے وقتاً فوقتاً نہ صرف جنگ اور طاعون جیسی وباؤں سے متاثر ہوتے ہیں بلکہ روزمرہ زندگی میں بھی پریشانی، مایوسی، اور بے اطمینانی میں گرفتار رہتے ہیں۔ یہ سب انسانی صورت حال کا ایک جز معلوم ہوتا ہے۔ لوگ طاقت اور دولت حاصل کرتے ہیں، علم و ملکیت اختیار کرتے ہیں، بیٹے اور بیٹیاں پیدا کرتے ہیں، گھر اور محلات تعمیر کرتے ہیں۔ لیکن وہ چاہے کچھ بھی حاصل کر لیں، وہ کبھی مطمئن نہیں ہوتے۔ جو غربت میں زندہ ہیں وہ امارت کے خواب دیکھتے ہیں۔ جن کے پاس دس لاکھ ہوں وہ بیس لاکھ کے خواہاں ہیں، جن کے پاس بیس لاکھ ہوں وہ ایک کروڑ چاہتے ہیں۔ یہاں تک کہ متمول اور شہرت یافتہ بھی شاید ہی کبھی مطمئن ہوتے ہیں۔ وہ بھی کبھی نہ ختم ہونے والی پریشانیوں اور تفکرات میں گھرے رہتے ہیں، یہاں تک کہ بیماری، بڑھاپا اور موت ان کا خاتمہ نہ کر دے۔ جو کچھ بھی کسی نے کمایا ہو وہ دھواں بن کر غائب ہو جاتا ہے۔ زندگی ایک چوہے کی بے مصرف دوڑ کی مانند ہے، لیکن اس سے کیسا بچا جائے؟

انتیس برس کی عمر میں گوتم اپنے خاندان اور ملکیت کو چھوڑ کر رات کے اندھیرے میں محل سے نکل گیا۔ وہ شمالی ہندوستان میں ایک بے گھر آوارہ گرد کی مانند دکھ سے نجات کے طریقے تلاش کرتا رہا۔ اس نے مختلف آشرم کے دورے کیے اور گرو کے قدموں میں جا بیٹھا، لیکن اسے مکمل اطمینان کہیں نصیب نہیں ہوا، لیکن اس نے ہمت نہ ہاری۔ جب تک کہ اسے مکمل آزادی کا طریقہ نہ معلوم ہو جائے، اس نے خود اپنے طور پر دکھوں کا مداوا تلاش کرنے کا عزم کیا۔ آئندہ چھ سال اس نے نفس پر قابو پانے میں صرف کیے۔ وہ انسانی دکھ کی وجوہات اور ان کے درماں تلاش کرتا رہا۔ بالآخر وہ اس نتیجے پر پہنچ کر تکلیف، بدقسمتی، سماجی ناانصافی آسمانی تحائف نہیں، بلکہ دکھ تو اپنے

ذہنی رویہ کی پیداوار ہے۔ گوتم کا خیال تھا کہ ذہن چاہے کچھ بھی محسوس کرے، اس کا ردعمل عموماً آرزومندانہ ہوتا ہے اور طلب ہمیشہ ناطمینانی کو جنم دیتی ہے۔

جب دماغ کوئی ناپسندیدہ چیز محسوس کرتا ہے تو اس پریشانی سے چھٹکارہ پانے کی آرزو کرتا ہے۔ لیکن جب دماغ کسی خوشگوار چیز سے روشناس ہوتا ہے تو اس کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ شے برقرار رہے اور بڑھ جائے۔ لہذا دماغ ہمیشہ بے چین اور غیر مطمئن ہے۔ جب ہم کوئی ناخوشگوار چیز مثلاً درد محسوس کریں تب تو یہ بہت واضح ہے۔ جب تک درد موجود ہو ہم غیر مطمئن رہتے ہیں اور اس سے محفوظ رہنے کی ہر ممکنہ کوشش کرتے ہیں۔ لیکن جب ہم کسی خوشگوار چیز کا سامنا کریں تب بھی مطمئن نہیں ہوتے۔ یا ہم اس خوف میں رہتے ہیں کہ یہ خوشگوار تاثر ختم ہو جائے گا یا اس امید میں کہ اس میں اضافہ ہو سکے گا۔ لوگ سالوں محبت کی آرزو کرتے ہیں مگر جب مل جائے تو اکثر اس سے مطمئن نہیں ہوتے۔ کچھ کو یہ فکر رہتی ہے کہ ان کا محبوب انہیں چھوڑ نہ دے۔ دوسروں کا خیال ہوتا ہے کہ انہوں نے جلدی کی اور وہ اس سے بہتر انتخاب کر سکتے تھے، ہم سب ایسے لوگوں سے واقف ہیں جو یہ دونوں کام کر سکتے ہیں۔

عظیم خداوند ہمیں برسات بھیج سکتے ہیں۔ سماجی ادارے ہمیں انصاف اور اچھی صحت کی ضمانت دے سکتے ہیں اور خوش قسمت اتفاقات سے ہم کروڑپتی بن سکتے ہیں۔ لیکن ان میں سے کوئی بھی ہماری بنیادی فکر کے رخ کو بدل نہیں سکتے۔ لہذا عظیم ترین بادشاہ بھی خوف کے احساس میں جیتے ہیں، مستقل دکھ اور اذیت سے فرار میں رہتے ہیں اور ہمیشہ فرحت بخش لحات کے تعاقب میں۔

گوتم نے اس تسلسلی دائرے سے نکلنے کا ایک طریقہ ڈھونڈ لیا۔ جب دماغ کسی خوشگوار یا ناخوشگوار چیز کو محسوس کرتا ہے، تو اگر وہ اس چیز کو اس کی اصلیت میں قبول کر لے تو کوئی دکھ باقی نہ رہے۔ اگر آپ دکھ برداشت کریں لیکن یہ توقع نہ رکھیں کہ دکھ باقی نہیں رہے گا تو آپ دکھی تو رہیں گے مگر اس سے تکلیف نہیں اٹھائیں گے۔ اس اداسی میں درحقیقت سکون بھی ممکن ہے اگر آپ بغیر اس طلب کے خوشی محسوس کریں کہ خوشی برقرار رہے گی اور بڑھے گی تو آپ بغیر اپنا ذہنی سکون کھوئے خوشی سے لطف اندوز ہوتے رہیں گے۔

لیکن آپ بغیر آرزومندی کے چیزوں کو جیسی ہیں کی بنیاد پر کیسے قبول کر سکتے ہیں؟ درد کو درد، خوشی کو خوشی اور غم کو غم کی طرح قبول کریں۔ گوتم نے مراقبے کے ایسے طریقے نکالے جس سے دماغ کسی حقیقت کو اس کی آرزو کیے بغیر قبول کر لیتا ہے۔ یہ مشقیں ساری دماغی توجہ اس امر پر مرکوز ہونے کی تربیت دیتی ہیں کہ میں اس وقت کیا محسوس کر رہا ہوں؟ بجائے اس کے کہ مجھے اس وقت کیا محسوس کرنا چاہیے۔ دماغ کو اس کیفیت میں لانا دشوار ہے، ناممکن نہیں۔

گوتم نے ان مشقوں کو ایسے اخلاقی خطوط پر وضع کیا کہ جس سے لوگوں کو بغیر تصورات و آرزوؤں کے اصل محسوسات کا حصول آسان ہو جائے۔ اس نے اپنے ماننے والوں کو قتل، چوری اور غیر ازدواجی جنسی تعلق سے منع کیا، کیوں کہ یہ اعمال آتشِ آرزو کو دوچند کرتے ہیں (طاقت، جنسی حظ اور تمول کے لیے)۔ جب یہ شعلے مکمل طور پر بجھ جائیں تو آرزو کی جگہ مکمل اطمینان اور سکون کی ایک حالت لے لیتی ہے جسے نروان کہتے ہیں (جس کے لغوی معنیٰ ہیں آگ بجھانا)۔ جنہیں نروان نصیب ہو جائے وہ تمام رنج والم سے چھٹکارا حاصل کر لیتے ہیں۔ وہ بغیر کسی تصور و فریب کے سچائی کا پوری حقیقت سے سامنا کرتے ہیں۔ گرچہ وہ اب بھی ناخوشی اور درد محسوس کریں گے

لیکن ان محسوسات سے انہیں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ کوئی شخص جو آرزو نہ رکھے تکلیف نہیں اٹھاتا۔

بدھ تعلیمات کے مطابق خود گوتم نے نروان حاصل کر لیا تھا اور وہ تکالیف سے آزاد ہو گیا تھا، اس کے بعد سے اسے بدھا کہا جانے لگا، جس کے معنی ہیں روشن خیال۔ بدھ نے اپنی ساری زندگی دوسروں کو اپنی دریافت سے آگاہ کرنے میں گزار دی تا کہ ہر فرد تکلیف سے نجات حاصل کر سکے۔ اس نے اپنی تعلیمات کو ایک ہی قانون کے تابع کر دیا: تکلیف آرزو سے پیدا ہوتی ہے۔ تکالیف سے مکمل نجات کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ ہے آرزوؤں سے مکمل آزادی۔ اور آرزوؤں سے مکمل آزادی کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ ہے اپنے دماغ کی تربیت کرنا تا کہ حقیقت کو جیسا ہے کی بنیاد پر قبول کر سکے۔

یہ قانون جسے 'دھرما' یا 'دھما' کہا گیا، بدھ کے پیروکار اسے کائنات کا نظام فطرت مانتے ہیں۔ تکلیف ہمیشہ آرزو سے پیدا ہوتی ہے، یہ ہمیشہ اور ہر جگہ حقیقت ہے، بالکل جیسے جدید طبیعات میں E ہمیشہ mc2 کے برابر ہے۔ بدھسٹ وہ لوگ ہیں جو اس قانون پر ایمان رکھتے ہیں اور اسے اپنے دوسرے تمام اعمال کے لیے سہارے کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ ان کے لیے خداؤں پر ایمان کم اہمیت رکھتا ہے۔ خدائے واحد کے مذاہب کا پہلا قاعدہ یہ ہے کہ "خدا موجود ہے، وہ مجھ سے کیا توقع رکھتا ہے؟"۔ بدھ مت کا پہلا قاعدہ یہ ہے کہ "تکلیف وجود رکھتی ہے، میں اس سے کیسے چھٹکارہ پا سکتا ہوں؟"

بدھ کے پیروکار خداؤں کے وجود کے منکر نہیں ہیں، وہ انہیں طاقتور وجود سمجھتے ہیں، جو بارش اور فتوحات ممکن بنا سکتے ہیں، لیکن ان کا اس قانون پر کوئی اجارہ نہیں ہے کہ تکلیف آرزو سے پیدا ہوتی ہے۔ اگر کسی شخص کا دماغ ہر آرزو سے آزاد ہے تو کوئی خدا بھی اسے دکھوں میں گرفتار نہیں کر سکتا۔ اسی کے مقابلے میں اگر کسی فرد کے دماغ میں آرزو پیدا ہو جائے تو کائنات کے سارے خدا مل کر بھی اسے دکھوں سے آزاد نہیں کر سکتے۔

لیکن خدائے واحد کے مذاہب کی مانند قبل از جدید قوانینِ فطرت کے مذاہب جیسے بدھ ازم بھی خود کو واقعتاً خداؤں کی پرستش سے آزاد نہیں کرا سکے۔ بدھ ازم لوگوں کو دکھوں سے مکمل نجات کی تعلیم دیتا ہے، راستے میں آنے والے اقتصادی تمول اور سیاسی قوت کی نہیں۔ لیکن ننانوے فیصد بدھسٹ کو نروان حاصل نہ ہوا۔ اگر وہ زندگی کے مستقبل میں کسی وقت اسے حاصل کرنے کی امید کرتے بھی تو انہوں نے اپنی بیشتر حالیہ زندگی ارضی معاملات کے حصول میں گزار دی۔ لہذا وہ مختلف خداؤں کی عبادت کرتے رہے۔ مثلاً ہندوستان میں ہندو خداؤں کی، تبت میں بون (Bon) خداؤں کی اور جاپان میں شنٹو خداؤں کی۔

پھر وقت گزرنے کے ساتھ بدھسٹ کے بہت سے گروہوں نے بدھ اور بدھی ستو اس کے اوتار بنا لیے۔ یہ انسان اور غیر انسانی وجود تھے جو دکھوں سے مکمل نجات پر قادر تھے، لیکن کیوں کہ افراد تب بھی دکھ کے دائرے میں گرفتار تھے تو انہوں نے بھی ان کی ہمدردی میں نجات حاصل نہیں کی۔ بجائے خداؤں کی پوجا کرنے کے، بہت سے بدھسٹ نے ان روشن ضمیروں کی پوجا شروع کر دی۔ وہ ان سے نہ صرف نروان کی دعا کرتے بلکہ ارضی مسائل کے حل کی بھی تمنا کرتے۔ لہذا ہمیں پورے مشرقی ایشیا میں بہت سے بدھ اور بدھی ستو اس ملتے ہیں جو اپنا وقت بارش برسانے، طاعون روکنے اور خونی جنگوں کو روکنے میں صرف کرتے ہیں، جس کے عوض انہیں عبادتوں، رنگ برنگے پھولوں، خوشبودار اگربتیوں اور چاول و قند کے نذرانے پیش کیے جاتے ہیں۔

انسان کی عبادت

گزشتہ تین سو سال کو سیکولرازم کا دور کہا جاتا ہے، جس میں مذاہب نے اپنی اہمیت بہت زیادہ کھوئی ہے۔ اگر ہم توحید پرست مذاہب کی بات کریں تو یہ کافی حد تک درست ہے۔ لیکن اگر ہم قوانین فطرت کے مذاہب کو دیکھیں تو جدیدیت شدید مذہبی ولولے کا دور ہے، بے مثال تبلیغی کام اور تاریخ کی سب سے خونی مذہبی جنگیں۔ دور جدید نے بہت سے قانون فطرت کے مذاہب کو نمودار ہوتے دیکھا ہے مثلاً آزاد خیالی، کیمونزم، سرمایہ داری، قوم پرستی اور نازی ازم۔ یہ اعتقادات اپنے آپ کو مذہب کے بجائے نظریہ کہلانا پسند کرتے ہیں، لیکن یہ محض معنوی مشق ہے۔ اگر مذہب کا مطلب ہے انسانی قاعدے جن کی بنیاد مافوق الانسان قواعد کے ایقان پر ہو تو روسی کیمونزم بھی اسلام سے کم مذہب نہیں ہے۔

ظاہر ہے کہ اسلام کیمونزم سے مختلف ہے۔ کیوں کہ اسلام کے مطابق دنیا پر حاکم مافوق الانسانی قوانین قادر مطلق کا آئین ہیں، جب کہ کیمونزم تو خداؤں پر یقین ہی نہیں رکھتا۔ لیکن بدھ ازم بھی خداؤں کے وجود پر یقین نہیں رکھتا، لیکن اسے تو ہم مذہب مانتے ہیں۔ بدھ ازم کی مانند کیمونزم بھی مافوق الانسان قدرتی اور ناقابل تغیر قوانین پر یقین رکھتا ہے جو انسانی اعمال کی رہ نمائی کریں۔ اگر بدھسٹ یہ یقین رکھتے تھے کہ قوانین فطرت سدھارتا گوتم نے دریافت کیے تھے، تو کیمونسٹ کہتے ہیں کہ قوانین فطرت کارل مارکس، فریڈرک اینگلز اور ولادیمیر ایلچ لینن نے ڈھونڈے ہیں۔ ان کی مماثلت یہیں ختم نہیں ہوتی۔ دوسرے مذاہب کی مانند کیمونزم کی بھی اپنی الوہی تحریریں اور پیغمبرانہ کتبے ہیں: مثلاً مارکس کا داس کاپیٹل جس نے پیش گوئی کی تھی کہ پرولیتاریت کی فتح کے ساتھ جلد ہی تاریخ کا اختتام ہو جائے گا۔ کیمونزم کی اپنی تعطیلات اور تہوار تھے مثلاً یکم مئی اور انقلاب اکتوبر کی سالگرہ۔ اس میں مارکسی جدلیات کے ماہر علما تھے۔ سوویت آرمی کے ہر یونٹ میں ایک راہب تھا جسے کیسار کہا جاتا جو سوروں اور افسروں کی نیک چلنی پر نظر رکھتا تھا۔ کیمونزم میں شہدا، مذہبی جنگیں اور بدعتیں ہوتیں جیسے ٹراٹسکائزم۔ سوویت کیمونزم ایک انتہا پسند تبلیغی مذہب تھا۔ ایک متقی کیمونسٹ عیسائی یا بدھسٹ نہیں ہو سکتا تھا۔ اور اس سے امید کی جا سکتی تھی کہ وہ مارکس و لینن کی الہامی کتابوں کی تبلیغ اپنی جان کے عوض بھی کرے گا۔

مذہب انسانی قاعدے و قانون کا ایک نظام ہے، جس کی بنیاد مافوق الانسان قاعدے پر ایمان ہے۔ نظریہ اضافت کوئی مذہب نہیں (کم از کم ابھی تک) کیوں کہ ایسا کوئی انسانی قاعدہ نہیں جس کی بنیاد اس پر قائم ہو۔ فٹ بال اس لیے مذہب نہیں کیوں کہ کوئی نہیں کہتا کہ اس کے قواعد مافوق الانسانی ہیں۔ اسلام، بدھ ازم اور کیمونزم سب مذاہب ہیں کیوں کہ یہ سب مافوق الانسان قواعد پر تعمیر ہوتے ہیں (مافوق الفطرت اور مافوق الانسان کے درمیان فرق ذہن میں رکھیے۔ بدھ کا قانون فطرت اور مارکس کے قوانین تاریخ مافوق الانسان ہے کیوں کہ وہ انسانوں کے بنائے ہوئے نہیں، لیکن وہ مافوق الفطرت نہیں ہیں)۔

مذہب انسانی قاعدے وقانون کا ایک نظام ہے، جس کی بنیاد مافوق الانسان قاعدے پر ایمان ہے۔ نظریہ اضافت کوئی مذہب نہیں (کم
ازکم ابھی تک) کیوں کہ ایسا کوئی انسانی قاعدہ نہیں جس کی بنیاد اس پر قائم ہو۔ فٹ بال اس لیے مذہب نہیں کیوں کہ کوئی نہیں کہتا کہ اس
کے قواعد مافوق الانسانی ہیں۔ اسلام، بدھ ازم اور کمیونزم سب مذاہب ہیں کیوں کہ یہ سب مافوق الانسان قواعد پر تعمیر ہوتے ہیں (
مافوق الفطرت اور مافوق الانسان کے درمیان فرق ذہن میں رکھیے۔ بدھ کا قانون فطرت اور مارکس کے قوانین تاریخ مافوق الانسان
ہے کیوں کہ وہ انسانوں کے بنائے ہوئے نہیں، لیکن وہ مافوق الفطرت نہیں ہیں)۔

ممکن ہے کہ بہت سے قارئین اس فکری رو سے ذرا بے آرام ہو جائیں۔ لیکن اگر آپ اس سے بہتر محسوس
کریں تو کمیونزم کو ایک مذہب کے بجائے نظریہ کہہ لیجیے، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہم عقائد کو خدائی مذاہب اور بنا
خدا کے قوانین فطرت پر مبنی نظریات میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ لیکن پھر ہم تسلسل قائم رکھنے کے لیے کم از کم بدھ ازم، تاؤ
ازم اور رواقیت کو نظریے کے بجائے مذہب کے خانے میں رکھیں گے۔ پھر اس کے متضاد یہ بھی ذہن میں رہے کہ بہت
سے جدید نظریات میں بھی خدا کا وجود موجود ہے، اور ان میں سے چند مثلاً آزاد خیالی اس یقین کے بغیر بے معنی ہے۔

یہاں یہ ناممکن ہوگا کہ ہم تمام نئے اعتقادات کی تاریخ کا جائزہ لیں، خاص طور پر کیوں کہ ان کے درمیان
کوئی واضح سرحدیں نہیں ہیں۔ امتزاج ضدین میں یہ خدائے واحد کے مذاہب اور بدھ مت سے کم نہیں ہیں۔ مثلاً
جیسے بدھسٹ ہندو دیویوں کی پوجا کرتے تھے، اور جیسے ایک خدا کا ماننے والا شیطان کے وجود پر بھی یقین رکھتا
ہے۔ اسی طرح آج ایک عام امریکی قوم پرست ہے (اسے امریکی قوم کے وجود پر یقین ہے جسے تاریخ میں ایک اہم
کردار ادا کرنا ہے)، ساتھ ہی اسے ایک آزاد تجارتی سرمایہ دارانہ نظام پر یقین ہے کہ شفاف مقابلہ بازی اور اپنے
مفادات کا تحفظ ہی ایک متمول معاشرے کے قیام کے لیے ضروری ہیں، اور ایک روشن خیال انسان بھی ہے (ان کا
خیال ہے کہ انسانوں کو ان کے خالق نے کچھ انمٹ حقوق سے نوازا ہے)۔ قوم پرستی پر اٹھارویں باب میں بات کریں
گے۔ کامیاب ترین جدید مذہب، یعنی سرمایہ داری کو ایک مکمل باب نصیب ہوگا، سولہواں باب جو اس کے بنیادی
اعتقادات اور رسومات کو بیان کرے گا۔ اس جاری باب کے بقایا صفحات میں مذاہب انسانیت کو بیان کروں گا۔
خدائی مذاہب خدا کی عبادات پر مرکوز ہیں۔ انسانی مذاہب میں انسانیت کی عبادت کی جاتی ہے، یا زیادہ

درست یہ کہ ہوموسیپین کی۔ انسانیت پرستی یہ یقین ہے کہ ہوموسیپین بھی ایک الوہی اور مقدس فطرت ہے، جو بنیادی طور پر دیگر تمام کائنات اور تمام مظاہر سے مختلف ہے۔ انسانیت پرست یہ یقین رکھتے ہیں کہ ہوموسیپین ہی دنیا کی اہم ترین چیز ہے، اور کائنات کا ہر وقوعہ ان ہی سے ظہور پذیر ہے۔ ہوموسیپین ہی عظیم سچائی ہیں۔ بقایا دنیا اور دوسرے تمام وجود صرف اس اکیلی کے فائدے کے لیے بنائے گئے ہیں۔

تمام انسانیت پرست انسانیت کی عبادت کرتے ہیں، لیکن وہ اس کی تعریف متعین کرنے سے قاصر ہیں۔ انسانیت کی تعریف متعین کرنے میں انسان پرستی تین حریف فرقوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ بالکل جیسے حریف عیسائی فرقے خدا کی درست تعریف متعین کرنے میں تقسیم ہو گئے تھے۔ آج سب سے اہم انسانیت پرست فرقہ انسانی آزاد خیالی ہے (لبرل ہیومن ازم)۔ جس کا یقین ہے کہ انسانیت انفرادی انسانوں کی خصوصیت ہے، لہذا فرد کی آزادی مقدس ہے۔ ان آزاد خیالوں کے لحاظ سے انسانیت کا مقدس عرق ہر منفرد ہوموسیپین میں موجود ہے۔ منفرد شخص کی اندرونی ذات ہی دنیا کو معنی بخشتی ہے، اور یہی تمام اخلاقی و سیاسی اقتدار کا منبع ہے۔ اگر ہمیں کسی اخلاقی یا سیاسی مسئلہ کا سامنا ہو، تو ہمیں اپنے اندر جھانک کر اپنی اندرونی آواز کو سننا چاہیے، انسانیت کی آواز۔ اس آزاد خیالی کے خاص احکامات اس اندرونی آواز کی آواز کو تحفظ دینے کے بارے میں ہیں۔ ان احکامات کو اجتماعی طور پر انسانی حقوق کہتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ آزاد خیال تشدد اور سزائے موت پر معترض ہوتے ہیں۔ ابتدائی یورپ میں سمجھا جاتا تھا کہ قاتل کائناتی قاعدے کو پامال اور بے وزن کرتے ہیں۔ کائنات کا توازن واپس بحال کرنے کے لیے ضروری تھا کہ مجرموں کو سرعام تشدد کا نشانہ بنایا جائے اور پھانسی دی جائے، تاکہ سب قاعدہ دوبارہ بحال ہوتے دیکھ سکیں۔ شیکسپیر اور مولیئر کے دور میں پھانسی کا ہولناک نظارہ لندن اور پیرس کے باشندوں کا مقبول مشغلہ تھا۔ آج کے لندن میں قتل کو مقدس انسانی فطرت کی پامالی سمجھا جاتا ہے۔ لیکن توازن کی بحالی کے لیے موجودہ دور کے یورپی تشدد کرتے ہیں نہ سزائے موت دیتے ہیں۔ اس کے بجائے وہ قاتل کو اپنے خیال میں سب سے زیادہ رحم دلانہ سزا دیتے ہیں۔ یوں اس کی انسانی قدر کی حفاظت اور یہاں تک کہ اسے دوبارہ تعمیر کرتے ہیں۔ قاتل کی انسانی فطرت کی تعظیم کر کے سب کو انسانی فطرت کے تقدس کا احساس دلایا جاتا ہے، اور قاعدہ دوبارہ مرتب ہوتا ہے۔ قاتل کا تحفظ کر کے ہم قاتل کی غلطی کا ازالہ کرتے ہیں۔

گو انسانی آزاد خیالی انسانوں کی تقدیس کرتی ہے، لیکن وہ خدا کے وجود سے انکاری نہیں ہے۔ بلکہ در حقیقت وہ خدائے واحد کے اعتقاد پر قائم ہے۔ ہر فرد کی آزاد اور مقدس فطرت میں آزاد خیالی لافانی انفرادی ارواح کا براہ راست ورثہ ہے۔ لازوال ارواح اور ایک خدائے واحد کے بغیر آزاد خیالوں کے لیے یہ شرمندگی کی حد تک دشوار ہوگا، بھلا ایک منفرد ہوموسیپین میں ایسی کیا خاص بات ہے۔

ایک اور اہم فرقہ اشتراکی انسانیت ہے۔ اشتراکیوں کے نزدیک انسانیت ایک انفرادی نہیں بلکہ اجتماعی یقین ہے۔ وہ فرد کی اندرونی آواز کو نہیں بلکہ تمام ہوموسیپین کو مقدس جانتے ہیں۔ جہاں آزاد خیالی زیادہ سے زیادہ انفرادی انسان کے لیے آزادی کی خواہاں ہے، اشتراکی انسانیت تمام انسانوں کے درمیان برابری کی خواہاں ہے۔ اشتراکیوں کے خیال میں ناہمواری انسانیت کے تقدس کی توہین ہے، کیوں کہ یہ انسانوں کے عالمگیر جوہر کے

بجائے ان کی حاشیائی خصوصیات کو فوقیت دیتی ہے۔ مثلاً جب امرا کو فقرا پر فوقیت ہو تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم دولت کو اس عالمگیر جوہر سے بالاتر سمجھتے ہیں جو امیر و غریب دونوں میں یکساں ہے۔

آزاد خیالی کی طرح اشترا کی انسانیت بھی خدائے واحد پر تعمیر ہوئی ہے۔ یہ نظریہ کہ تمام انسان برابر ہیں یہی خدائے واحد کے مذہب کے یقین کا دوسرا روپ ہے، کہ خدا کے سامنے تمام نفس برابر ہیں وہ واحد انسانیت پرست فرقہ جس میں واقعی روایتی خدائے واحد کے مذاہب سے راستہ الگ کیا ہے وہ انقلابی انسانیت ہے، جس کے سب سے معروف نمائندے نازی ہیں۔ نازیوں کو جس بات نے دوسرے انسانیت پرست فرقوں سے الگ کیا وہ ان کی 'انسانیت' کی تعریف ہے، جو نظریہ ارتقا سے بہت گہرا اثر لیتی ہے۔ دوسرے انسانیت پرستوں کے مقابلے میں نازی یہ سمجھتے تھے کہ انسانیت کوئی عالمگیر اور لازوال چیز نہیں، بلکہ ایک تغیر پذیر اسپیسی ہے جو سنور یا بکھر سکتی ہے۔ انسان مافوق الانسان میں سنور سکتا ہے یا اس کی انسان سے کم کسی ذات میں تنزلی ہو سکتی ہے۔

نازی ازم کا مرکزی خیال یہ تھا کہ وہ نسل انسانی کو تنزلی سے بچائے اور اس کی بتدریج ارتقا کو مہمیز دے۔ اسی وجہ سے نازیوں کا کہنا تھا کہ انسانوں کی اعلیٰ ترین نسل، آریائی، کو محفوظ رکھنا اور سہارا دینا ہے۔ جب کہ ہوموسیپین کی کمتر اقسام مثلاً یہودی، خانہ بدوش، ہم جنس پرست اور ذہنی مریضوں کو داخلی قرنطینہ کیا جائے یہاں تک کہ مٹا دیا جائے۔ نازیوں نے دلیل دی کہ خود ہوموسیپین اس وقت نمودار ہوئے جب قدیم انسانوں کی ایک بہتر آبادی نے نشو و نما پائی جب کہ کمتر آبادی مثلاً نینڈرتھال مٹ گئی۔ یہ مختصر آبادیاں ابتدا میں محض دو مختلف نسلیں تھیں لیکن پھر اپنے ارتقائی راستوں پر علیحدہ پروان چڑھیں، یہ دوبارہ بھی ممکن ہو سکتا ہے۔ نازیوں کے مطابق ہوموسیپین اس وقت بھی مختلف نسلوں میں بٹ چکے تھے، ہر ایک کی اپنی علیحدہ خصوصیات تھیں، ان میں سے ایک نسل، آریائی، بہترین خصوصیات کی مالک تھی۔ خصلت، حسن، ایمانداری اور محنت، لہٰذا امکان تھا کہ آریائی انسان کو مافوق الانسان کے درجے تک لے جائے۔ دوسری نسلیں مثلاً یہودی اور سیاہ فام موجودہ دور کے نینڈرتھال ہیں، جو کمتر خصوصیات کے مالک ہیں۔ اگر انہیں اختلاط اور بالخصوص آریاؤں سے ازدواج کی اجازت دی جائے تو وہ تمام انسانی آبادی میں ملاوٹ پیدا کر کے اسے تباہی کے دہانے تک لے جائیں گے۔

حیاتیات دان نازیوں کے اس جینیاتی نظریے کو مسترد کر چکے ہیں۔ بالخصوص ۱۹۴۵ کے بعد سے ہونے والی جینیاتی تحقیق نے ثابت کیا ہے کہ انسانوں کی موجودہ نسلوں کے درمیان فرق نازیوں کے بیان کردہ فرق سے بہت کم ہے۔ لیکن یہ نتائج نسبتاً نئے ہیں۔ ۱۹۳۳ میں موجود سائنسی علم کے آئینے میں نازی اعتقادات خارج از امکان نہیں تھے۔ مختلف انسانی نسلوں کا وجود، سفید فام کی برتری اور اس اعلیٰ نسل کو محفوظ رکھنے اور پروان چڑھانے کا یقین مغربی اشرافیہ میں عام تھا۔ ممتاز مغربی جامعات کے اسکالر اس زمانے میں رائج سائنسی طریقوں سے ایسی تحقیق چھاپ رہے تھے جو بظاہر سفید فام نسل کو زیادہ عقلمند، صاحب کردار اور افریقیوں یا انڈین سے زیادہ اہل ثابت کرتی تھیں۔ واشنگٹن، لندن اور کینبرا کے سیاست دانوں کے خیال میں یہ ان کا فرض تھا کہ وہ سفید فام نسل کو آلودگی اور تنزلی سے بچائیں۔ مثلاً چین یا اٹلی تک سے آریائی ممالک مثلاً امریکہ و آسٹریلیا ہجرت پر پابندی عائد کی جائے۔

ایک نازی تشہیری پوسٹر، جس میں دائیں ہاتھ پر ایک اصیل النسل آریائی ہے اور بائیں جانب ایک مخلوط۔ انسانی جسم سے نازیوں کی پرستش صاف ظاہر ہے۔ بلکہ جیسے ان کا یہ خوف کہ کمتر نسلیں اس میں ملاوٹ کر کے اسے مائل بہ تنزلی کر دیں گی۔

یہ تصورات محض نئی سائنسی تحقیق کی اشاعت سے نہیں بدلے۔ اس تبدیلی کی پشت پر طاقتور سیاسی، سماجی اور سیاسی محرکات تھے۔ اس لحاظ سے ہٹلر نے نہ صرف اپنی بلکہ نسلی تعصب کی بھی قبر کھودی تھی۔ دوسری جنگ عظیم شروع کر کے اس نے اپنے دشمنوں کو مجبور کر دیا تھا کہ وہ 'ہم' اور 'میں' کے درمیان واضح تفریق کریں۔ اس کے بعد کیوں کہ نازی نظریہ اس قدر متعصبانہ تھا، لہٰذا مغرب میں تعصب کو برا سمجھا گیا۔ لیکن اس تبدیلی میں بہت وقت لگا۔ سفید فاموں کی برتری امریکی سیاست میں کم از کم ۱۹۶۰ء تک ایک عام فکر رہی۔ سفید آسٹریلیائی پالیسی جو غیر سفید مہاجرین کی آسٹریلیا آمد پر پابندی عائد کرتی تھی ۱۹۷۳ء تک نافذ رہی۔ اصل قدیم آسٹریلیائی باشندوں کو ۱۹۶۰ء تک برابری کے سیاسی حقوق حاصل نہیں ہوئے۔ زیادہ تر کو اس لیے چناؤ میں حصہ لینے کی اجازت نہیں تھی کیوں کہ وہ شہری فرائض انجام دینے کے نااہل تھے!

نازی انسانیت کے خلاف نہیں تھے۔ انہوں نے آزادی پرست انسانیت، انسانی حقوق اور کمیونزم سے اس لیے جنگ کی کیوں کہ وہ خود اپنی تعریف پر پوری اترنے والی انسانیت کے عاشق تھے۔ وہ نسل انسانی کے عظیم امکانات پر یقین رکھتے تھے۔ لیکن ڈارون کی ارتقائی منطق کے حوالے سے ان کی دلیل تھی کہ فطری چناؤ کو اجازت دی جائے کہ وہ ناموزوں افراد کو ختم کر کے صرف موزوں ترین افراد کو بقا اور افزائش نسل کے لیے منتخب کرے۔ کمزوروں کی دست گیری سے آزاد خیال اور کمیونزم نہ صرف ناموزوں افراد کو زندگی دیتے ہیں، بلکہ انہیں افزائش کا موقع بھی فراہم کرتے ہیں، یوں فطری چناؤ کو مجروح کرتے ہیں۔ ایک ایسی دنیا میں موزوں ترین افراد لازمی طور پر غیر موزوں کمتر افراد کے سمندر میں ڈوب جائیں گے۔ ہر گزرتی نسل کے ساتھ انسانیت کمزور سے کمزور تر ہو جائے گی، جو اس کے خاتمے کا باعث بن سکتی ہے۔

۱۹۳۳ کا نازی کارٹون۔ ہٹلر کو ایک سنگ تراش دکھایا گیا ہے جو مافوق البشر انسان تراشتا ہے۔ ایک عینک لگائے آزاد خیال مفکر اس مافوق البشر کی تخلیق میں تشدد کی ضرورت سے ہراساں ہے (یہاں انسانی جسم کی شہوانی تعریف بھی قابل غور ہے)

۱۹۴۲ میں جرمن حیاتیات کی تدریسی کتاب کے باب "قوانین فطرت اور نوع انسانی" میں لکھا تھا کہ فطرت کے اعلیٰ قانون کے مطابق تمام انسان بقا کی ایک بے رحم جنگ میں مشغول ہیں۔ یہ بتانے کے بعد کہ نباتات کس طرح جگہ بنانے کے لیے جدوجہد کرتے ہیں، اور حشرات کس طرح اپنے ساتھی ڈھونڈتے ہیں وغیرہ، کتاب نتیجہ اخذ کرتی ہے کہ:

"بقا کی جنگ سخت اور بے رحم ہے۔ لیکن زندگی کی بقا کا یہ واحد راستہ ہے۔ یہ جنگ ہر اس چیز کو مٹا دیتی ہے جو حیات کے لیے ناموزوں ہو۔ اور ہر اس چیز کا انتخاب کرتی ہے جو بقا کے لیے موزوں ہو۔ فطرت کے یہ قوانین ناقابل تغیر ہیں۔ زندہ مخلوق خود اپنی بقا کے لیے اس کی بہترین مثال ہیں۔ یہ قوانین بے رحم ہیں، جو ان کی مزاحمت کرے گا مٹ جائے گا۔ حیاتیات نہ صرف ہمیں حیوانات و نباتات کے متعلق بتاتی ہے، بلکہ ہمیں وہ قوانین سکھاتی ہے جن پر ہمیں اپنی زندگیوں میں عمل پیرا ہونا چاہیے۔ اور ان قوانین کے مطابق جنگ لڑنے کے لیے اپنے ارادوں کو فولاد بنانا چاہیے۔ زندگی جدوجہد کا نام ہے۔ لعنت ہے ان پر جو ان قوانین کے منکر ہوں۔"

پھر اس کے بعد ہٹلر کی آپ بیتی مین کیمف (Mein Kampf) سے ایک قول درج ہے کہ "وہ شخص جو فطرت کی آہنی منطق سے لڑتا ہے، وہ ان قوانین سے لڑ رہا ہے جن کی بدولت وہ انسان ہے۔ فطرت کے خلاف جنگ خود اپنی تباہی کو آواز دینا ہے۔"

تیسرے ہزار عیسوی سالوں کی ابتدا میں انسانی ارتقا کا مستقبل غیر یقینی ہے۔ ہٹلر کے خلاف جنگ کے بعد ساٹھ سال تک ارتقا کو انسانیت سے منسلک کرنا اور حیاتیاتی طریقوں سے ہوموسیپین کا درجہ بڑھانا منع تھا۔ لیکن آج اس قسم کے پراجیکٹ دوبارہ داخل فیشن ہیں۔ کوئی بھی کمتر نسل یا کمتر افراد کو مٹانے کی بات تو نہیں کرتا، لیکن ہمارے بڑھتے ہوئے انسانی حیاتیاتی علم سے بہت سے فوق البشر تخلیق کرنے کی فکر میں ہیں۔

اسی کے ساتھ انسان کی فکری آزادی اور حیاتیاتی سائنس کے درمیان ایک بہت بڑی خلیج پیدا ہو گئی ہے۔
یہ خلیج اب مزید نظر انداز نہیں کی جا سکتی۔ ہمارا آزاد سیاسی اور قانونی نظام اس یقین پر قائم ہے کہ ہر فرد کی ایک مقدس اندرونی فطرت ہے، جو نا قابل تقسیم و تغیر ہے۔ جس سے دنیا میں رنگ بھرتا ہے اور جو تمام اخلاقی و سیاسی حاکیت کا منبہ ہے۔ یہ اس روایتی چینی یقین کی پیدائش نو ہے کہ ہر فرد کے اندر ایک آزاد اور لازوال روح موجود ہے۔ لیکن گزشتہ دو سو سالوں میں حیاتیات نے مستقل اس نظریہ کی مخالفت کی ہے۔ سائنس دان جو انسانی نفس کی گتھیاں سلجھاتے ہیں وہ کسی روح کی تلاش میں ناکام رہے ہیں۔ وہ پرزور طریقے سے یہ دلیل دیتے ہیں کہ انسانی رویوں کا ماخذ ہارمون، جینیات اور عصبی خلیوں کے درمیان رابطہ ہے، انسانی کی مرضی نہیں، بالکل وہی قوتیں جو چمپنزی، بھیڑیوں اور حشرات الارض کے رویے مرتب کرتی ہیں۔ ہمارے سیاسی اور عدالتی نظام ان تکلیف دہ حقائق پر پردہ پوشی کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن واقعتاً ہم کب تک حیاتیات اور سیاسی سائنس کے شعبہ جات کے درمیان علیحدگی کی دیوار کو قائم رکھیں گے۔

کامیابی کی کلید

تجارت، سلطنت اور عالمگیر مذاہب نے ہر براعظم کے تقریباً ہر فرد کو اس عالمی دنیا میں لا کھڑا کیا ہے جس میں آج ہم رہتے ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ یہ پھیلاؤ اور اجتماع کا یہ عمل سیدھا یا بنا کسی رکاوٹوں کے تھا۔ لیکن خیر، انسانی تاریخ کے محرکات کا ایک فضائی جائزہ لینے سے یہ معلوم ہوا کہ بہت سی چھوٹی ثقافتوں سے چند بڑی ثقافتیں اور پھر ایک واحد عالمی معاشرے کا قیام ناگزیر تھا۔

لیکن یہ کہنا کہ عالمی معاشرے کا قیام ناگزیر تھا کا یہ مطلب نہیں کہ نتیجہ اسی قسم کا عالمی معاشرہ ہوتا جس میں آج ہم زندہ ہیں۔ ہم یقیناً دوسرے نتائج بھی سوچ سکتے ہیں۔ آج انگریزی اتنی زیادہ کیوں رائج ہے، ڈینش کیوں نہیں؟ آج کیوں دو ارب عیسائی ہیں اور سوا ارب مسلمان لیکن صرف ڈیڑھ لاکھ زرتشت اور کوئی مانوی باقی نہیں۔ اگر ہم دس ہزار سال پیچھے جا کر وقت کو دوبارہ چلا دیں، بار بار تو کیا ہم ہر بار دورخی کا تنزل اور خدائے واحد کے مذاہب کو ابھرتا دیکھیں گے۔

کیوں کہ ہم یہ تجربہ کر نہیں سکتے تو ہم اس سوال کا جواب بھی نہیں جانتے، لیکن تاریخ کی دو اہم خاصیتوں کے مطالعے سے ہمیں کچھ اشارے ضرور ملتے ہیں:

پس اندیشی کی غلطی

تاریخ میں ہر نقطہ ایک چوراہا ہے۔ ماضی سے حال تک ایک ہی راستے پر چل کر پہنچتے ہیں۔ لیکن حال سے مستقبل میں بہت سے ممکنہ راستے نکلتے ہیں۔ ان میں سے کچھ راستے زیادہ ہموار، کشادہ اور بہتر نشان زد ہیں، اس لیے انہیں اختیار کیے جانے کا امکان زیادہ ہے۔ لیکن کبھی کبھار تاریخ، یا جو افراد تاریخ مرتب کرتے ہیں، وہ غیر متوقع موڑ لے لیتے ہیں۔

چوتھی عیسی کی ابتدا میں رومن سلطنت کے سامنے مذہبی امکانات کے بہت سے افق تھے۔ یہ اپنے روایتی، متنوع، کثیر خدائی پر قائم رہ سکتی تھی۔ لیکن اس کے شہنشاہ کونسٹنٹین نے گزشتہ صدی کی خانہ جنگیوں کو دیکھتے ہوئے شاید یہ محسوس کیا کہ ایک واضح عقائد والا مذہب ان متنوع اقلیتوں کی اقلیم کو محفوظ رکھے گا۔ وہ اس وقت رائج کئی عصری عقیدوں میں سے کسی کو بھی قومی مذہب کے طور پر رائج کر سکتا تھا۔: مانوی، متریت (Mithraism)، سیبیل یا آئسس کے فرقے، زرتشت، یہودیت بلکہ بدھ مت سب ہی ممکنات میں سے تھے۔ اس نے عیسائیت کا انتخاب

کیوں کیا؟ کیا عیسائی الہیات میں سے کسی بات نے اسے ذاتی طور پر متاثر کیا تھا؟ یا اس اعتقاد میں کسی بات نے اسے یہ سوچنے پر مجبور کیا تھا کہ وہ اسے اپنے مقاصد کے لیے با آسانی استعمال کر سکے گا۔ کیا اسے کوئی الہام ہوا تھا یا اس کے مصاحبوں نے مشورہ دیا تھا کہ عیسائیت تیزی سے پھیل رہی ہے اور اس قافلے میں شمولیت آسان ہوگی۔ مورخ اندازہ لگا سکتے ہیں، لیکن کوئی بھی یقین سے نہیں کہہ سکتا، وہ بیان کر سکتے ہیں کہ کس طرح عیسائیت نے رومن سلطنت پر قبضہ کر لیا تھا، لیکن وہ یہ نہیں بتا سکتے کہ یہی مخصوص امکان کیوں عمل میں آیا۔

کیسے اور کیوں کے بیان میں کیا فرق ہے؟ کیسے کا بیان یہ ہے کہ ایک مقام سے دوسرے تک کا سلسلہ کیسے مرتب ہوا تھا؟ کیوں کا بیان یہ ہے کہ دوسرے ممکنات کو ترک کر کے کسی مخصوص اپنائے گئے امکان کے درمیان ربط بیان کیا جائے۔

بعض اسکالر عیسائیت کے پھیلاؤ جیسے واقعات کے بارے میں فیصلہ کن نظریات بھی فراہم کرتے ہیں۔ وہ انسانی تاریخ کو گھٹا کر حیاتیات، ماحولیات یا اقتصادیات کی قوتوں کے حوالے سے بیان کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کے مطابق بحیرہ روم کی جغرافیہ، جینیات اور اقتصادیات میں کوئی ایسی بات تھی جس نے خدائے واحد کے مذہب کا پھیلاؤ لازم بنا دیا تھا۔ لیکن زیادہ تر مورخ ایسے معیناتی بیانات سے پرہیز کرتے ہیں۔ تدریسی مضمون کے طور پر یہ تاریخ کی خصوصیت ہے کہ جتنا کسی مخصوص تاریخی دور کو زیادہ جانتے ہوں گے، اتنا ہی یہ سمجھنا دشوار ہوگا کہ چیزیں کیوں کر ایک وضع سے ہوئیں کسی دوسرے رخ سے نہیں۔ وہ جنہیں کسی دور کی سطحی سی معلومات ہوتی ہے ان کی توجہ محض اس امکان پر مرکوز رہتی ہے جو وقوعہ پذیر ہو گیا تھا۔ وہ کوئی رواں سی کہانی سنا دیتے ہیں کہ یہی ہونا لازم تھا۔ لیکن جو کسی دور کے متعلق گہری معلومات رکھتے ہیں، وہ ان راہوں سے بھی واقف ہوتے ہیں جو منتخب نہیں کی گئیں۔

حقیقت میں جو افراد اس دور کو سب سے اچھی طرح جانتے ہیں، یعنی جو اس دور میں زندہ تھے، وہ تو اس معاملے میں بالکل لاعلم ہوتے ہیں۔ کونسٹنٹین کے دور میں ایک عام رومن کے لیے تو مستقبل ایک دھند لکا تھا۔ یہ تاریخ کا ایک اہم اصول ہے کہ جو پس بینی میں لازمی معلوم ہو وہ اس دور میں اتنا اہم نہیں لگتا۔ موجودہ دور بھی کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے۔ کیا ہم عالمی اقتصادی کساد بازاری کو پیچھے چھوڑ آئے ہیں، یا پا تال ابھی باقی ہے؟ کیا اولین سپر پاور بننے تک چین کی ترقی جاری رہے گی؟ کیا ریاست ہائے متحدہ اپنی سربراہی کھو دے گا؟ کیا خدائے واحد کی بنیاد پرستی مستقبل کی رو ہے یا ایک وقتی ابال جس کے کوئی دوررس نتائج نہیں ہوں گے۔ کیا ہم ماحولیاتی تباہی کی جانب بڑھ رہے ہیں، یا ٹیکنالوجی کی جنت کی سمت؟ ان تمام امکانات کے بارے میں اچھے دلائل پیش کیے جا سکتے ہیں، لیکن کسی کو بھی یقینی علم نہیں۔ کچھ دہائیوں بعد لوگ پیچھے مڑ کر دیکھیں گے تو سوچیں گے کہ ان کے جوابات کتنے واضح تھے۔

یہ بات خاص طور پر یاد رکھنی ضروری ہے کہ جو امکانات ہم عصروں کو ناممکن لگیں وہی اکثر وقوع پذیر ہو جاتے ہیں۔ جب ۳۰۶ میں کونسٹنٹین نے تخت سنبھالا تھا تو عیسائیت محض ایک مخفی مشرقی فرقہ تھی۔ اگر آپ اس وقت یہ پیشن گوئی کرتے کہ جلد ہی یہ روم کا ریاستی مذہب قرار دیا جائے گا تو آپ کا مذاق اڑا کے باہر نکال دیا جاتا۔ بالکل اسی طرح جیسے اگر آپ آج یہ تجویز کریں کہ ۲۰۵۰ تک ہری کرشنا امریکہ کا ریاستی مذہب ہوگا۔ اکتوبر ۱۹۱۳ میں بالشویک ایک مختصر انتہا پسند روسی فرقہ تھا۔ کوئی بھی سمجھدار آدمی یہ پیشن گوئی نہیں کر سکتا تھا کہ صرف چار سالوں میں یہ

سارے ملک پر قابض ہو جائیں گے۔ ۶۰۰ء میں یہ خیال کہ مٹھی بھر صحرائی عرب جلد ہی ایک بحر اوقیانوس سے انڈیا تک کے رقبے پر قابض ہوں گے، اس سے بھی زیادہ ناممکن لگتا تھا۔ یقیناً اگر بازنطینی فوج ابتدائی حملوں کو پسپا کر دیتی تو اسلام ایک نامعلوم فرقہ ہی رہ جاتا، جس سے ایک مٹھی بھر صاحبان ذوق ہی واقف ہوتے۔ پھر اسکالروں کو یہ سمجھانے میں آسانی ہوتی کہ ایک مذہب جو مکہ کے ایک ادھیڑ عمر تاجر پر وحی کی صورت اترا کیوں نہ پھیل سکا۔

ہر بات ممکن نہیں ہوتی۔ جغرافیائی، حیاتیاتی اور اقتصادی قوتیں حدود مرتب کر دیتی ہیں۔ لیکن ان حدود میں بھی حیران کن واقعات کے لیے کافی جگہ موجود ہوتی ہے جو کسی متعینہ حدود میں ہی ہوتے ہیں۔

یہ اختتام بہت سے لوگوں کو پسند نہیں آتا جو تاریخ سے متعین کرنے کی امید رکھتے ہیں۔ متعین کر سکنا پر کشش ہے۔ کیوں کہ اس سے یہ تاثر ملتا ہے کہ ہماری دنیا اور ہمارے اعتقادات تاریخ کی ایک فطری اور لازمی پیداوار ہیں۔ یہ فطری اور لازمی ہے کہ ہم قومی ریاستوں میں رہتے ہیں، اپنی اقتصادیات کو سرمایہ دارانہ اصولوں پر وضع کرتے ہیں اور انسانی حقوق پر سرگرمی سے یقین رکھتے ہیں۔ یہ مان لینا کہ تاریخ جبری تعین نہیں کرتی اس بات کو تسلیم کر لینا ہے کہ آج زیادہ تر لوگوں کا قومیت، سرمایہ داری اور انسانی حقوق پر اعتقاد محض اتفاقی ہے۔

تاریخ کو جبری تعین کے ذریعے نہیں سمجھایا جا سکتا، اور بے ترتیب ہونے کی وجہ سے اس کی پیشن گوئی بھی ممکن نہیں۔ اتنی ساری قوتیں کارفرما ہوتی ہیں اور ان میں روابط اتنے پیچیدہ ہوتے ہیں کہ ان طاقتوں کی قوت میں معمولی تبدیلی یا ان کے روابط میں فرق سے ممکنہ نتائج میں بہت بڑی تبدیلی آ سکتی ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ تاریخ کو درجہ دوئم کی افراتفری کہا جا سکتا ہے۔ بے ترتیب نظام دو طرح کے ہوتے ہیں۔ درجہ اول کی افراتفری والے نظام اپنے بارے میں ہونے والی پیشن گوئی سے تبدیل نہیں ہوتے، مثلاً موسم درجہ اول کی بے ترتیبی ہے۔ گو اس پر مختلف انواع کی قوتیں کارفرما ہوتی ہیں لیکن ہم ایسے کمپیوٹر ماڈل بنا سکتے ہیں جو ان تبدیلیوں کو زیادہ سے زیادہ زیر غور لائیں، اور موسم کی بہتر سے بہتر پیشن گوئی کریں۔

درجہ دوئم کی افراتفری اپنے بارے میں کی جانے والی پیشن گوئی پر ردعمل دکھا سکتی ہے، لہٰذا کبھی صحیح طور پر پیشن گوئی کی ہی نہیں جا سکتی۔ مثلاً حصص کے بازار میں درجہ دوئم کا انتشار ہوتا ہے۔ اگر ہم ایک ایسا کمپیوٹر ماڈل تیار کر لیں جو کل تیل کی قیمت کی سو فیصد درست پیشن گوئی کر دے تو کیا ہو؟ تیل کی قیمت اس پیشن گوئی پر فوراً ردعمل کرے گی، جس سے کل کی قیمت بدل جائے گی۔ اگر تیل کی موجودہ قیمت نوے ڈالر فی بیرل ہے، اور اگر غلطی سے کمپیوٹر ماڈل کہہ دے کہ کل اس کی قیمت سو ڈالر ہو گی تو تاجر فوراً تیل کی خریداری شروع کر دیں گے تا کہ وہ اس ممکنہ قیمت سے منافع حاصل کر سکیں۔ اس کے نتیجے میں کل کے بجائے آج ہی قیمت سو ڈالر ہو جائے گی۔ اب کل کیا ہو گا، یہ کوئی نہیں جانتا۔

سیاست بھی درجہ دوئم کا انتشار ہے۔ بہت سے لوگ سوویت ماہرین پر اس لیے تنقید کرتے ہیں کہ وہ ۱۹۸۹ء کے انقلاب کی پیشن گوئی نہ کر سکے۔ اور مشرق وسطیٰ کے ماہرین پر اس لیے ملامت کہ وہ ۲۰۱۱ء کے عرب انقلاب بہار کی پیشن گوئی میں ناکام رہے۔ یہ بات غیر منصفانہ ہے۔ انقلاب تو اپنی تعریف کے اعتبار سے ہی غیر متوقع ہوتے ہیں۔ متوقع انقلاب کبھی برپا نہیں ہوتا۔

کیوں نہیں؟ فرض کیجیے یہ ۲۰۱۰ء ہے اور کوئی بہت عقلمند سیاسی سائنسی ماہر کسی کمپیوٹر ماہر سے مل کر ایک ایسا

نا قابل غلطی کمپیوٹر ماڈل بناتا ہے، اور اسے پرکشش انٹرفیس میں پیش کرتا ہے جو انقلاب کی پیش گوئی کر سکے۔ پھر وہ دونوں مصر کے صدر حسنی مبارک کو اپنی خدمات پیش کرتے ہیں، اور ایک قابل قدر بیعانہ کے عوض مبارک کو بتاتے ہیں کہ ان کی پیشن گوئی کے حساب سے مصر میں آئندہ سال کے دورانیے میں انقلاب ضرور پھوٹ پڑے گا۔ اب مبارک کا ردعمل کیا ہو؟ غالب امکان یہ ہے کہ وہ فوراً مالیہ کم کردے گا، اربوں ڈالر عوام میں تقسیم کرے گا اور ساتھ ہی نبٹنے کے لیے اپنی خفیہ حفاظتی پولیس میں اضافہ کردے گا۔ بچاؤ کے یہ اقدامات کارگر رہتے ہیں۔ سال آکر گزر جاتا ہے اور حیرت انگیز طور پر کوئی انقلاب نہیں آتا۔ مبارک اپنے پیسوں کی واپسی کا مطالبہ کرتا ہے۔ "تمھاری الگورِدم فضول تھی!" وہ سائنس دانوں پر چیختا ہے۔ "اتنی ساری دولت لٹانے کے بجائے میں ایک اور محل تعمیر کر لیتا!" "لیکن انقلاب اس لیے نہیں آیا کہ ہم نے اس کی پیشن گوئی کردی تھی" سائنس دانوں نے اپنے دفاع میں کہا۔ "یہ پیغامبر ان چیزوں کی پیش گوئی کرتے ہیں جو وقوع پذیر نہیں ہوتیں"۔ مبارک نے اپنے محافظین کو انہیں پکڑنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "ایسے تو میں درجن بھر قاہرہ کے بازار سے بہت سستے داموں خرید سکتا تھا۔"

تو پھر تاریخ کے مطالعے کی ضرورت کیا ہے؟ طبیعات یا اقتصادیات کے مقابلے میں تاریخ درست پیش گوئی نہیں کرسکتی ہے۔ تاریخ ہم مستقبل کا علم حاصل کرنے کے لیے نہیں پڑھتے بلکہ اپنی نظر کی وسعت بڑھانے کے لیے کہ ہماری موجودہ حالت نہ قدرتی ہے نہ لازمی۔ لہذا ہمارے سامنے ہماری فکر سے بہت زیادہ امکانات ہوتے ہیں۔ تو اس امر کا مطالعہ کہ یورپین نے کب افریقیوں کو زیر کیا ہمیں یہ سمجھنے میں مدد دیتا ہے کہ نسلی ورثے میں کچھ بھی نظری یا لازمی نہیں، اور دنیا کو ذرا مختلف طریقے سے بھی مرتب کیا جاسکتا ہے۔

نابینا کلائیو

ہم تاریخ کے انتخاب کو نہیں سمجھ سکتے، لیکن ہم اس بارے میں کچھ اہم باتیں ضرور کہہ سکتے ہیں: تاریخ کے انتخاب انسان کے مفاد کے لیے نہیں ہوتے۔ اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ گزرتی تاریخ کے ساتھ انسان کی بہبود میں تیزی پیدا ہوئی ہے۔ اس بات کا بھی کوئی ثبوت نہیں ہے کہ انسان کے لیے مفید ثقافتیں پنپتی ہیں اور کامیاب رہتی ہیں، جب کہ کم مفید ثقافتیں مٹ جاتی ہیں۔ اس بات کا بھی کوئی ثبوت نہیں کہ عیسائیت مانویت سے بہتر انتخاب تھ، یا عرب سلطنت ساسانیوں سے بہتر تھی۔

اس بات کا کوئی ثبوت نہیں کہ تاریخ انسانی مفاد میں کام کر رہی ہے، کیوں کہ ہمارے پاس ایسا مقصدی پیمانہ نہیں ہے جس سے ہم اس مفاد کو ناپ سکیں۔ مختلف ثقافتیں اچھائی کی مختلف تعریف متعین کرتی ہیں، اور ہمارے پاس ان کے درمیان فیصلے کے لیے کوئی میزان نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ فاتح ہمیشہ یہ سمجھتے ہیں کہ ان کی تعریف درست ہے۔ لیکن ہم فاتحین پر کیوں یقین کریں؟ عیسائی سمجھتے ہیں کہ عیسائیت کی مانویت پر فتح انسانیت کے لیے مفید تھی، لیکن اگر دنیا کے بارے میں عیسائی نکتہ نظر پر یقین نہ کریں تو ان سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔ مسلمان یہ سمجھتے ہیں کہ ساسانی سلطنت کی مسلمانوں کے ہاتھوں شکست انسانیت کے لیے مفید تھی، لیکن یہ فوائد اسی وقت نظر آتے ہیں کہ اگر ہم مسلمانوں کا عالمی منظر نامہ قبول کریں۔ یہ بھی تو ممکن ہے کہ اگر عیسائیت اور اسلام شکست کھا جاتے تو یہ زیادہ بہتر ہوتا۔

اس سے بھی زیادہ اسکالر ثقافت کو ایک قسم کا ذہنی انفکشن یا ایک طفیلی جرثومہ سمجھتے ہیں، جس کا انسان غیر دانستہ میزبان ہو۔ نامیاتی جرثومے مثلاً وائرس اپنے میزبان کے جسم میں پلتے ہیں اور ایک سے دوسرے میزبان میں منتقل ہوتے ہیں، اپنے میزبان کی خوراک میں شریک ہو کر انہیں کمزور اور اکثر تو ہلاک کر دیتے ہیں۔ جب تک وہ میزبان زندہ ہے اور اپنے طفیلی جرثومے کو منتقل کرنے کا اہل ہے، یہ اپنے میزبان کی حالت سے لاتعلق رہتے ہیں۔ اسی طرح ثقافتی فکر انسانوں کے دماغ میں پلتی ہے۔ وہ افزائش پا کر ایک میزبان سے دوسرے میں منتقل ہوتی ہے، کبھی کبھار انہیں کمزور کرتی ہے اور کبھی تو انہیں مار بھی دیتی ہے۔ کوئی ثقافتی نظریہ، مثلاً آسمانوں کے اس پار جنت کا عیسائی ایمان یا کمیونسٹوں کا زمین پر ہی جنت کی موجودگی، کسی شخص کو اس نظریے کے پرچار پر مجبور کر سکتا ہے، چاہے اس میں اس کی موت ہی واقع کیوں نہ ہو جائے۔ انسان مر جاتا ہے، لیکن فکر پھیلتی ہے۔ اس رویے کے مطابق ثقافت کچھ افراد کا دوسرے افراد کو نیچا دکھانے کی سازش نہیں (جیسا کہ مارکسسٹ کہا کرتے تھے)۔ بلکہ ثقافتیں تو طفیلی ذہنی جرثومے ہیں جو حادثاتی طور پر شروع ہوتے ہیں پھر ہر اس فرد سے فائدہ اٹھاتے ہیں جو اس سے آلودہ ہو۔

اس رویے کو اکثر میمکس (memetics) کہتے ہیں۔ اس کے مطابق جیسے کسی نامیاتی انقلاب کا انحصار نامیاتی اطلاعاتی یونٹ یعنی جین کی نقل بنانے پر مصر ہیں، اسی طرح ثقافتی انقلاب کا دارومدار ثقافتی اطلاعاتی یونٹ میمز پر ہے۔ کامیاب ثقافتیں وہ ہیں جو ان میمز کی افزائش میں کامیاب ہیں، انسانی میزبانوں پر ان کے اثرات اور فوائد سے لاتعلق۔

انسانیت کے بیشتر ماہرین میمز کو ناپسند کرتے ہیں۔ وہ اس ثقافتی عمل کو خام حیاتیاتی مثالوں سے سمجھانے کی اناڑی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن ان ہی اسکالروں میں سے اکثر میمز کی جڑواں بہن بعد از جدیدیت پر یقین رکھتے ہیں۔ بعد از جدیدیت کے مفکر میمز کے بجائے مکالمے کو ثقافت کا تعمیری عنصر سمجھتے ہیں۔ لیکن ان کے مطابق بھی ثقافت انسانیت کے مفاد کو نظر انداز کر کے اپنی پرورش کر رہی ہے۔ مثلاً بعد از جدیدیت کے مفکر قومیت کو ایک ہلاکت خیز طاعون سمجھتے ہیں جو انیسویں اور بیسویں صدیوں میں دنیا میں پھیل کر جنگ، جبر، نفرت اور نسل کشی کا باعث بنا۔ جیسے ہی کسی ملک کے باشندے اس سے آلودہ ہوتے ہیں تو امکان یہ ہوتا ہے کہ ہمسایہ ملک بھی اس وائرس سے بچ نہیں سکیں گے۔ قوم پرستی کا وائرس انسانوں کے لیے مفاد کا لبادہ اوڑھ کر آیا تھا، لیکن دراصل وہ خود اپنے لیے ہی مفید ہے۔

اسی قسم کے دلائل سماجی سائنس میں بھی نظریہ کھیل میں عام ہیں۔ نظریہ کھیل کے مطابق کس طرح بہت سے کھلاڑیوں کے نظام میں وہ خیالات اور رویے جو تمام کھلاڑیوں کے لیے نقصان دہ ہوں، بہر حال جڑ پکڑ کر نمو پاتے ہیں۔ اس کی ایک معروف مثال ہتھیاروں کی دوڑ ہے۔ بہت سی ہتھیاروں کی دوڑیں بغیر فوجی توازن تبدیل کیے مقابلہ بازوں کو کنگال کر دیتی ہیں۔ جب پاکستان جدید طیارے خریدتا ہے تو انڈیا بھی جواباً یہی کرتا ہے۔ جب انڈیا جوہری بم بناتا ہے تو پاکستان بھی اس کی پیروی کرتا ہے۔ جب پاکستان اپنی بحریہ میں اضافہ کرتا ہے تو انڈیا بھی یہی کرتا ہے۔ اس عمل کے آخر میں طاقت کا توازن شاید وہی رہتا ہے۔ لیکن اس دوران دو اربوں ڈالر جو تعلیم و صحت پر خرچ ہو سکتے تھے، ان سے ہتھیار خریدے جاتے ہیں۔ لیکن اسلحہ کی دوڑ کے محرکات سے دامن بچانا دشوار ہے۔ ہتھیاروں کی دوڑ رویوں کا ایک سلسلہ ہے، جو ایک ریاست سے دوسرے کی جانب وائرس کی مانند پھیلتا ہے۔ اس

سے سب نقصان اٹھاتے ہیں لیکن ارتقائی نظریٔ بقا و افزائش کے اعتبار سے وہ خود اپنے لیے بہت مفید ہے (یہ بات یاد رکھیے کہ جین کی مانند اسلحہ کی دوڑ کی بھی کوئی خود آ گاہی نہیں ہے۔ یہ جان بوجھ کر بقا اور افزائش کی کوشش نہیں۔ اس کا پھیلاؤ ایک طاقت ور محرک کا غیر ارادی نتیجہ ہے)۔

آپ اسے کچھ بھی کہیں، نظریہ کھیل، بعد از جدیدیت یا میمٹکس، تاریخی محرکات انسانی بہبود کے لیے کوشاں نہیں۔ اس نظریے کی کوئی بنیاد نہیں کہ تاریخ کی سب سے کامیاب ثقافتیں ہی ہوموسیپین کے لیے یقیناً بہترین تھیں۔ ارتقا کی طرح تاریخ بھی انفرادی حیات کی مسرت کو در خور اعتنا نہیں سمجھتی۔ انفرادی انسان خود بہت کمزور اور لاعلم تھے کہ وہ خود اپنے مفاد کے لیے تاریخ کا رخ موڑ سکتے۔

تاریخ ایک چوراہے سے دوسرے کی جانب بڑھتی ہے۔ وہ کسی پراسرار وجہ کے تابع کبھی اس راہ پر چلتی ہے تو کبھی اس راستے پر۔ تقریباً پندرہ سو سال عیسوی میں تاریخ نے اپنا سب سے اہم انتخاب کیا جس سے نہ صرف تمام انسانیت بلکہ شاید دنیا میں موجود تمام حیات کی تقدیر بدل گئی۔ ہم اسے سائنسی انقلاب کہتے ہیں۔ یہ افرو ایشیا کی مغربی نوک پر واقع جزیرہ نما مغربی یورپ سے شروع ہوا، جس نے اس وقت تک تاریخ میں کوئی اہم کردار ادا نہیں کیا تھا۔ سائنسی انقلاب چین یا ہندوستان کے بجائے اسی مقام سے کیوں شروع ہوا؟ وہ دوسرے ہزار سال کے عین وسط میں کیوں شروع ہوا، دو صدیاں پہلے یا تین صدیاں بعد میں کیوں نہیں؟ یہ ہم نہیں جانتے۔ اسکالروں نے درجنوں نظریات پیش کیے ہیں مگر ان میں سے کوئی بھی معقول نہیں ہے۔

تاریخ کا امکانی افق بہت کشادہ ہے، اور کئی امکانات کبھی پورے نہیں ہوتے۔ تاریخ کو یوں سمجھا جاسکتا ہے کہ وہ تاریخی انقلاب سے روگردانی کر کے نسل در نسل آگے بڑھتی رہی۔ بالکل ایسے ہی جیسے تاریخ کو عیسائیت، رومن سلطنت یا نقرئی سکوں کے بغیر تصور کیا جاسکتا ہے۔

○

حصہ چہارم...... سائنسی انقلاب

ایلاموگورڈو (Alamogordo)۔ ۱۶ جولائی ۱۹۴۵ کو پانچ بج کر انتیس منٹ اور ترپن سیکنڈ۔ جوہری بم پھٹنے کے آٹھ سیکنڈ بعد کا منظر۔ جوہری طبیعات دان رابرٹ، وپن ہائمر نے اس دھماکے کو دیکھ کر بھگوت گیتا سے ایک قول نقل کیا: اب میں موت بن گیا ہوں، دنیاؤں کو مٹانے والا

لاعلمی کی دریافت

کیا خیال ہے کہ کوئی ہسپانوی کسان جو ۱۵۰۰ عیسوی میں سویا اور پانچ سو سال بعد بیدار ہوا ہو، اسے کولمبس کے ملاحوں کا نینا، پنٹا اور سانتا ماریہ کشتیوں پر سوار ہونے کی آواز سے تو دنیا خاصی مانوس لگی ہوگی۔ ٹیکنالوجی، رویوں اور سیاسی حدود میں بہت سی تبدیلیوں کے باوجود اس قدیم رپ وان ونکل (Rip Van Winkle) نے اپنے آپ کو گھر پر ہی محسوس کیا ہوگا۔ لیکن اگر کولمبس کا کوئی ملاح اسی طرح کی نیند میں گرتا رہو کر اکیسویں صدی میں کسی آئی فون کی گھنٹی سے بیدار ہوا ہو تو اسے دنیا اپنے تصور سے بھی بہت مختلف لگے گی۔ "کیا یہی جنت ہے؟" وہ شاید پوچھے گا۔ "یا شاید۔۔۔ دوزخ؟"

گزشتہ پانچ سو سالوں نے انسانی طاقت میں اضافے کے غیر معمولی مظاہر دیکھے ہیں۔ پہلے پندرہ سو سالوں میں دنیا میں تقریباً پچاس کروڑ ہوموسیپین تھے، آج تقریباً سات ارب ہیں۔ ۱۵۰۰ میں انسان کے بنائے تمام اجناس وخدمات کی کل مالیت، آج کے ڈالر کے نرخ میں تقریباً ڈھائی ارب ڈالر تھی۔ آج تقریباً ایک سال کی انسانی پیداوار کی مالیت ساٹھ ٹریلین ڈالر کے قریب ہے۔ ۱۵۰۰ میں انسانیت نے تقریباً ۱۳ ٹریلین توانائی کی کیلوریز روزانہ استعمال کی تھیں۔ آج ہم روزانہ تقریباً پندرہ سو ٹریلین کیلوریز استعمال کرتے ہیں (ایک لمحہ رک کر ان اعداد و شمار پر نظر ڈالیے۔۔۔ انسانی آبادی چودہ گنا بڑھی ہے، پیداوار دو سو چالیس گنا اور توانائی کا خرچ ایک سو پندرہ گنا)۔

فرض کیجیے آج کا کوئی بحری جہاز کولمبس کے وقت میں پہنچ جائے۔ چند منٹ کی مہلت میں وہ نینا، پنٹا اور سانتا ماریہ سے بہتے تختے نکال دیتا، اور پھر خود پر کوئی خراش آئے بغیر اس دور کی ہر عظیم طاقت کی بحریہ کو ڈبو دیتا۔ پانچ سامان کے جدید بحری جہاز، ساری دنیا کے تجارتی بیڑوں کا سامان لاد سکتے تھے۔ کسی جدید کمپیوٹر پر قدیم لائبریری کے ہر پارچے اور ہر کتاب کے تمام الفاظ و اعداد سما جاتے اور پھر بھی جگہ باقی رہ جاتی۔ آج کوئی بھی بڑا بینک پس از جدید تمام مملکتوں کی اکٹھی دولت سے زیادہ سرمایہ رکھتا ہے۔

۱۵۰۰ میں چند ہی شہروں کی آبادی ایک لاکھ سے زیادہ تھی۔ زیادہ تر عمارتیں مٹی، لکڑی اور بانس سے تعمیر تھیں، کوئی تین منزلہ عمارت فلک بوس بھی جاتی۔ سڑکیں پہیوں سے بنے مٹی پر نشان تھیں، جو گرمیوں میں گرد اور سردیوں میں کیچڑ بن جاتی۔ ان پر پیادے، گھوڑے، بکریاں مرغیاں اور چند چھکڑے چلتے۔ سب سے عام شہری آوازیں انسانی اور حیوانی چیخ و پکار تھی، جن میں کبھی ہتھوڑی اور آری کی آوازیں بھی شامل ہو جاتیں۔ سورج ڈھلے پر شہر کا منظر نامہ تاریک ہو جاتا۔ کوئی اکا دکا موم بتی یا کسی مشعل کی لو بھڑکتی۔ اگر کسی ایسے شہر کا مقیم جدید ٹوکیو، کیلی

ذرینایا ممبئی کو دیکھتا تو وہ کیا سوچتا؟

سولہویں صدی سے پہلے کسی انسان نے دنیا کا چکر نہیں لگایا تھا۔ ۱۵۲۲ء میں یہ اس وقت بدل گئے جب میگیلن کی مہم چوالیس ہزار میل کا فاصلہ طے کر کے اسپین واپس لوٹی۔ اس میں تین سال لگے اور میگیلن سمیت عملے کے تقریباً تمام افراد ہلاک ہو گئے۔ ۱۸۷۳ء میں جولیس ورن یہ سوچنے کے لائق ہوا کہ ایک متمول برطانوی مہم جو فلیاس فوگ (Phileas Fogg) شاید ساری دنیا کا چکر اسی دن میں لگانے میں کامیاب ہو جائے۔ آج کوئی اوسط آمدنی والا فرد، بحفاظت اور باآسانی دنیا کا چکر اڑتالیس گھنٹوں میں مکمل کر سکتا ہے۔

۱۵۰۰ء میں انسان زمین کی سطح تک محدود تھے۔ وہ مینار بنا لیتے اور پہاڑ عبور کر لیتے، لیکن آسمان پرندوں، فرشتوں اور دیوتاؤں کے لیے مخصوص تھا۔ بیس جولائی ۱۹۶۹ء کو انسان چاند پر اتر گیا۔ یہ صرف ایک تاریخی کارنامہ نہیں تھا بلکہ ایک ارتقائی اور شاید کائناتی فتح تھی۔ ارتقا کے گزشتہ چار ارب سالوں میں کوئی حیات زمین کے ہوائی کرہ سے بلند نہیں اڑ سکی تھی۔ اور یقیناً کسی نے چاند پر پاؤں نہیں رکھا تھا۔

تقریباً تمام تاریخ انسانوں کو 99.99% اس زمینی حیات کا علم نہیں تھا، جسے مائکرو آرگنزم (جرثومہ) کہتے ہیں۔ ایسا نہیں تھا کہ ان سے ہمارا کوئی واسطہ نہیں تھا۔ ہم میں سے ہر فرد اربوں یک خلیاتی حیات اپنے اندر مہمان رکھتا ہے، جو مفت کی سیر نہیں کر رہے۔ وہ ہمارے بہترین دوست اور بدترین دشمن ہیں۔ ان میں سے کچھ ہماری غذا کو ہضم ہونے میں مدد کرتے ہیں، اور ہماری آنت صاف کرتے ہیں جب کہ دوسرے بیماری اور وبا کا باعث بنتے ہیں۔ لیکن انسانی آنکھ نے پہلی بار کسی جرثومے کو ۱۶۷۴ء میں دیکھا، جب انٹون وان لیوین ہوک (Anton Van Leeuwenhoek) نے اپنے گھر پر بنائے مائکروسکوپ میں جھانکا تو پانی کے ایک قطرے میں لاکھوں اقسام کی حیات کو پھرتے دیکھا۔ آئندہ تین سو سالوں میں انسان نے بڑی تعداد میں مائکروسکوپ اجسی سے تعلق قائم کیا۔ ہم ان میں سے بیشتر مہلک بیماریوں کو شکست دینے میں کامیاب رہے، اور جرثوموں کو طب اور صنعتی فوائد کے لیے مطیع کیا۔ آج ہم جرثوموں پر انجینئرنگ سے دوائیں بناتے ہیں، حیاتیاتی ایندھن بناتے ہیں اور پیراسائیٹ کو ہلاک کرتے ہیں۔

لیکن گزشتہ پانچ سو برسوں کا سب سے اہم لمحہ ۱۶ جولائی ۱۹۴۵ء کو پانچ بج کر انتیس منٹ اور پینتالیس سیکنڈ میں آیا۔ عین اس سیکنڈ امریکی سائنس دانوں نے ایلاموگورڈو، نیو میکسیکو میں پہلی بار جوہری بم کا تجربہ کیا۔ اس وقت سے انسانیت کو یہ اہلیت مل گئی کہ نہ صرف وہ تاریخ کا رخ موڑ سکے بلکہ اسے ختم بھی کر سکے۔

وہ تاریخی عمل جس کے مظاہر ایلاموگورڈو اور چاند پر دیکھے گئے، اسے سائنسی انقلاب کہا گیا۔ اس انقلاب کے دوران انسان نے سائنسی تحقیق پر بہت وسائل صرف کر کے بہت وسیع طاقت حاصل کر لی ہے۔ یہ انقلاب اس لیے ہے کہ ۱۵۰۰ء تک ساری دنیا کے انسان نئی طبی، فوجی اور اقتصادی طاقت کے حصول کا اپنے آپ کو نااہل سمجھتے تھے۔ جب حکمران و امرا تعلیم و تحقیق کے لیے رقوم مختص کرتے تو بھی عموماً اس کا مقصد موجود اہلیت کو برقرار رکھنا ہوتا تھا، بجائے نئی اہلیت کی تلاش کے۔ ایک عام پس از جدید حکمران، پادریوں فلسفیوں اور شعرا کو اس امید میں عطیات دیتا کہ وہ اس کی حکومت کی حمایت کریں اور سماجی قاعدہ برقرار رکھنے میں مدد دیں۔ وہ ان سے نئی دواؤں کی دریافت، نئے ہتھیاروں کی ایجاد یا اقتصادی ترقی کو مہمیز دینے کی امید نہیں رکھتا تھا۔

گزشتہ پانچ صدیوں میں انسانوں کو زیادہ سے زیادہ یہ اعتماد ہونے لگا کہ وہ سائنسی تحقیق پر خرچ کر کے اپنی اہلیت میں اضافہ کر سکتے ہیں۔ یہ بالکل اندھا اعتماد نہیں تھا، بلکہ یہ بار بار درست ثابت ہوا ہے۔ جتنے زیادہ ثبوت ملتے حکومتیں اور امرا اتنے ہی زیادہ وسائل سائنس پر خرچ کرنے پر آمادہ ہوتے۔ اس سرمایہ کاری کے بغیر ہم کبھی چاند پر چہل قدمی، جرثوموں میں تغیر پیدا کرنے اور جوہر کو توڑنے کے قابل نہیں ہوتے۔ مثلاً امریکی حکومت نے گزشتہ کئی دہائیوں میں جوہری طبیعات پر اربوں ڈالر کے وسائل مختص کیے ہیں۔ اس تحقیق کے نتیجے میں جوہری توانائی کے اسٹیشن کی تعمیر ممکن ہوئی جو، مریکی کارخانوں کے لیے سستی بجلی فراہم کرتے ہیں۔ یہ کارخانے حکومت کو مالیہ دیتے ہیں۔ اس مالیے کا کچھ حصہ جوہری طبیعات پر مزید تحقیق کے لیے نامزد کر دیا جاتا ہے۔

جدید انسانوں نے تحقیق کے ذریعے نئی قوتوں کے حصول پر اعتماد کیوں کیا؟ سائنس، سیاست اور اقتصادیات میں یہ رشتہ کیوں کر استوار ہوا؟ س باب میں جدید سائنس کی منفرد قدرت پر نظر ڈالیں گے تا کہ اس سوال کا کچھ جواب دیا جا سکے۔ آئندہ دو ابواب میں یورپی سلطنتوں، سائنس اور سرمایہ دارانہ نظام کی اقتصادیات کے درمیان اتحاد کا جائزہ لیں گے۔

بے خبری

کم از کم اہلیت کے انقلاب کے بعد سے انسان کائنات کو سمجھنے کی کوشش کرتا رہا ہے۔ ہمارے آبا نے ان قوانین کو سمجھنے میں بہت وقت صرف کیا اور محنت کی جو قدرتی دنیا پر حکمران ہیں۔ لیکن جدید سائنس گزشتہ علمی روایات سے تین اہم نکات پر مختلف ہیں:

۱۔ لاعلمی کا اعتراف۔ جدید سائنس لاطینی لفظ اگنوراس (ہم لاعلم ہیں) سے مستعار ہے۔ اس کی بنیاد اس مفروضے پر ہے کہ ہم ہر چیز سے واقف نہیں۔ اس سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ یہ اس امر کو تسلیم کرتا ہے کہ کوئی مفروضہ، نظریہ یا تصور نہ مقدس ہے نہ رد ہو سکنے سے بالاتر

۲۔ مشاہدے اور ریاضی کی مرکزی اہمیت۔ لاعلمی تسلیم کر لینے کے بعد جدید سائنس نئے علوم حاصل کرنا چاہتی ہے۔ اس مقصد کے لیے وہ مشاہدات اکٹھا کرتی ہے، پھر ریاضی کے اوزار استعمال کر کے ان مشاہدات سے کامل نظریے تجویز کرتی ہے۔

۳۔ طاقت کا حصول۔ نئی سائنس صرف نظریات کی تشکیل سے ہی مطمئن نہیں۔ ان نظریات کے استعمال سے یہ نئی قوت حاصل کرتی ہے، بالخصوص نئی ٹیکنالوجی کو ترقی دیتی ہے۔

سائنسی انقلاب علم کا انقلاب نہیں ہے۔ سب سے زیادہ یہ جہالت کا انقلاب ہے۔ وہ عظیم دریافت جس نے نئے سائنسی انقلاب کا آغاز کیا یہ آگاہی تھی کہ انسان اپنے اہم ترین سوالات کے جوابات سے واقف نہیں۔

علم کی پس از جدید روایات مثلاً اسلام، عیسائیت بدھ مت اور کنفیوشس ازم یہ یقین دلاتی تھیں کہ دنیا کے متعلق تمام علم پہلے ہی حاصل کیا جا چکا ہے۔ عظیم خداؤں یا اس واحد خدائے عظیم یا ماضی کے دانا افراد اس تمام علم و ہنر سے واقف تھے، جو انھوں نے زبانی روایات اور صحیفوں کے ذریعے ہم تک منتقل کیا۔ عام فانی انسانوں نے ان قدیم تحریروں اور روایات کو پڑھ کر اور سمجھ کر علم حاصل کیا۔ یہ بات ناقابل فہم تھی کہ بائبل، قرآن یا ویدوں سے

کائنات کا کوئی اہم راز رہ گیا ہو، ایسا راز جسے یہ گوشت پوست کی مخلوق دریافت کر سکے۔

علم کے قدیم ماخذ صرف دو طرح کی لاعلمی کا اعتراف کرتے تھے۔اول تو یہ کہ کوئی فرد اپنی ذات میں کسی اہم چیز سے لاعلم ہو سکتا ہے۔اس علم کو حاصل کرنے کے لیے اسے اپنے سے زیادہ کسی عقلمند آدمی سے بات کرنے کی ضرورت تھی۔ کسی نئی دریافت کی ضرورت نہیں تھی جو کسی کو بھی معلوم نہ رہی ہو۔مثلاً اگر تیرھویں صدی کے یارک شائر دیہات میں کوئی کسان یہ جاننا چاہتا کہ نسل انسانی کی ابتدا کیسے ہوئی تو اس کا خیال تھا کہ عیسائی روایات میں یقیناً اس کا جواب موجود ہے۔اسے صرف مقامی راہب سے دریافت کرنے کی ضرورت تھی۔

دوسرے یہ کہ ایک پوری روایت ہی کچھ غیر اہم چیزوں سے ناواقف ہو۔اپنی تعریف کے اعتبار سے اگر عظیم خداؤں یا ماضی کے داناؤں نے ہمیں کسی چیز سے لاعلم رکھا تو وہ اہم نہیں رہی ہوگی۔مثلاً اگر ہمارا یارک شائر کا وہی کسان یہ بات جاننا چاہتا کہ مکڑی اپنا جالا کیسے بنتی ہے تو مقامی پادری سے دریافت کرنا بیکار تھا، کیوں کہ اس سوال کا جواب عیسائی صحیفوں میں موجود نہیں تھا۔اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ عیسائیت نامکمل تھی۔ بلکہ اس سے مراد یہ تھی کہ یہ جاننا کہ مکڑی اپنا جالا کیسے بنتی ہے غیر اہم تھا۔خدا کو تو بہر حال اس بات کا علم تھا ہی کہ مکڑی اپنا جالا کیسے بنتی ہے۔اگر یہ کوئی اہم معلومات ہوتی جو انسان کی ترقی اور بقا کے لیے ضروری ہوتی تو خدا نے یقیناً اسے بائبل کی تفصیل میں شامل کر دیا ہوتا۔

عیسائیت نے لوگوں کو مکڑی کے متعلق پڑھنے سے منع نہیں کیا۔لیکن مکڑیوں کے کوئی ماہرین، اگر قدیم یورپ میں ہوتے، تو انہیں معاشرے میں اپنا حاشیائی کردار قبول کرنا پڑتا، اور عیسائیت کی لازوال سچائیوں سے اس کی لاتعلقی بھی۔کوئی اسکالر مکڑیوں، تتلیوں یا گالاپاگوس کے جنگلات کے متعلق کچھ بھی دریافت کرتا وہ معمولی ہوتی، اور معاشرے، سیاست یا اقتصادیات کے حقائق سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

لیکن حقائق کبھی اتنے سادہ نہیں تھے۔ہر دور میں، سب سے روایت پرست اور اچھے ادوار میں بھی ایسے افراد موجود تھے جو یہ بتاتے کہ ان کی پوری روایات، بہت سی اہم چیزوں سے لاعلم ہیں۔لیکن ایسے افراد کو فارغ کر دیا جاتا یا مار دیا جاتا، یا وہ کسی نئی روایت کی بنیاد ڈال دیتے، اس دعوے کے ساتھ کہ جو بھی علم ضروری ہے وہ اس سے واقف ہیں۔مثلاً پیغمبر محمد نے اپنے مذہبی رویے کے آغاز میں ساتھی عربوں پر تنقید کر کے کہا کہ وہ خدائی سچائی سے لاعلم ہیں۔اس ابتدائی دور کے بعد انہوں نے اعلان کیا کہ وہ مکمل سچائی سے واقف ہیں، اور ان کے ماننے والوں نے انہیں نبیوں کا سردار مانا۔لہذا رسول خدا پر وحی کے نزول کے بعد مزید کسی پیغام کی آمد کی ضرورت نہیں تھی۔

جدید سائنس علم کی ایک انوکھی روایت ہے کیوں کہ وہ واضح طور پر اہم ترین سوالات کے بارے میں اجتماعی لاعلمی کا اقرار کرتی ہے۔ڈارون نے کبھی بابائے حیاتیات ہونے کا دعویٰ نہیں کیا، نہ یہ کہا کہ اس نے ہمیشہ کے لیے حیات کی گتھیوں کو سلجھا دیا ہے۔صدیوں پر محیط وسیع سائنسی تحقیق کے باوجود حیاتیات دان یہ تسلیم کرتے ہیں کہ وہ اب بھی اس بات سے لاعلم ہیں کہ دماغ میں شعور کیسے پیدا ہوتا ہے۔طبیعات دان اس لاعلمی کا اقرار کرتے ہیں کہ بگ بینگ کیسے ہوا، یا کوانٹم میکانکس کے نظریے کو عمومی اضافت کے نظریے سے کیسے ہم آہنگ کریں۔

دوسرے معاملات میں متضاد سائنسی نظریات پر نئے شواہد کی موجودگی میں گرما گرم بحث ہوتی ہے۔اس کی ایک اچھی مثال اقتصادیات کو چلانے پر بحث ہے۔اگر انفرادی ماہرین اقتصادیات چاہیں تو یہ دعویٰ کریں کہ ان

کا طریقہ سب سے احسن ہے، لیکن ہر اقتصادی بحران اور حصص کے بازار کا بلبلہ پھوٹنے پر اعتقادات بدل جاتے ہیں اور عمومی طور پر یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ اقتصادیات پر حرف آخر ابھی باقی ہے۔

دوسرے معاملات میں مخصوص نظریات کو موجود شواہد سے اس قدر استحکام ملا ہے کہ متبادل نظریات راستے سے ہٹ گئے ہیں۔ ان نظریات کو سچ مانا جاتا ہے۔ لیکن یہ سب جانتے ہیں کہ اگر نئے شواہد پیدا ہوں جو ان نظریات کی نفی کریں تو پھر نظریے پر نظرثانی ہوگی یا اسے مسترد کر دیا جائے گا۔ ان کی اعلیٰ امثال میں نظریہ ارتقا اور زلزلوں کے بارے میں ارضی ساخت کا نظریہ شامل ہے۔

لاعلمی کے اقرار نے جدید سائنس کو گزشتہ کسی بھی علمی روایت سے زیادہ محرک، لچکدار اور متجسس بنا دیا ہے۔ اس سے کاروبار دنیا کے بارے میں ہماری معلومات میں اضافہ ہوا ہے اور نئی ٹیکنالوجی کی دریافت بڑھی ہے۔ لیکن اس سے ایک پیچیدہ مسئلہ بھی سامنے آیا ہے جو ہمارے آبا کو درپیش نہیں تھا۔ ہمارا موجودہ مفروضہ کہ ہمیں ہر چیز کے بارے میں علم نہیں ہے اور جو علم ہم رکھتے ہیں وہ بھی تغیر پذیر ہے، یہ ان مشترکہ مفروضوں سے جاملتا ہے جن کی وجہ سے کروڑوں اجنبی ایک دوسرے سے موثر تعاون پر آمادہ ہوتے ہیں۔ اگر شواہد یہ ثابت کریں کہ ان مفروضوں میں سے بیشتر غلط تھے تو ہم معاشرے کو کیسے یکجا رکھیں؟ تب ہمارے قبیلے، ممالک اور بین الاقوامی نظام کیسے کام کریں گے؟

سیاسی وسماجی نظام کو مستحکم رکھنے کے تمام جدید طریقوں کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ ان دو غیر سائنسی طریقوں میں سے کسی ایک کو منتخب کریں:

۱۔ کوئی سائنسی نظریہ لے کے عام سائنسی طریقے کے برخلاف اعلان کر دیجیے کہ یہی آخری اور کامل سچائی ہے۔ یہی طریقہ نازیوں نے اپنایا (ان کا دعویٰ تھا کہ ان کی نسلی پالیسیاں حیاتیاتی حقائق کا منطقی نتیجہ ہیں)۔ اور کمیونسٹوں نے جن کا دعویٰ تھا کہ مارکس اور لینن نے کامل اقتصادی سچائیوں کو الوہی بنا دیا ہے، جنہیں کبھی بھی مسترد نہیں کیا جاسکے گا۔

۲۔ اس میں سے سائنس کو خارج کر دیجیے، اور غیر سائنسی کامل سچائی اپنا لیجیے۔ انسانیت کی آزادی والوں کا یہی رویہ رہا ہے، جو کہ انسانوں کی انوکھی وقعت اور حقوق کے کٹر اصولوں پر قائم ہے۔ ایک نظریہ جو شرمندگی کی حد تک ہوموسیپین کی سائنسی تحقیق سے میل نہیں کھاتا۔

لیکن اس پر ہمیں حیرت نہیں ہونی چاہیے۔ خود سائنس کو بھی اپنے وجود اور اپنی تحقیق کے لیے سرمائے کے حصول میں مذہبی اور نظریاتی اعتقادات کا سہارا لینا پڑتا ہے۔

پھر بھی جدید ثقافت گزشتہ کسی بھی ثقافت کے مقابلے میں لاعلمی کو زیادہ بخوشی قبول کرتی ہے۔ ایک چیز جس نے جدید معاشرتی نظام کو مستحکم رکھا ہے، وہ ٹیکنالوجی اور سائنسی تحقیق پر کسی مذہبی اعتقاد کی مانند بھروسہ ہے۔ اس نے کچھ ابدی سچائیوں کی جگہ لے لی ہے۔

سائنسی عقائد

جدید سائنس میں کوئی قوانین نہیں ہیں، لیکن تحقیقی طریقوں کا ایک مشترکہ ورثہ ضرور ہے، جو تجرباتی

مشاہدات اکٹھا کر کے بنایا گیا ہے۔ وہ جنہیں ہم کم از کم کسی ایک حس سے ضرور محسوس کر سکیں، اور انہیں ریاضی کے اوزار کی مدد سے اکٹھا کریں۔

تاریخ کے ہر دور میں افراد تجرباتی مشاہدات کرتے رہے ہے۔ لیکن ان مشاہدات کی اہمیت عموماً محدود تھی۔ جب ہمارے پاس تمام جوابات پہلے ہی سے موجود ہیں تو نئے مشاہدات کے حصول کے لیے قیمتی وسائل کے زیاں کی کی ضرورت ہے؟ لیکن کیوں کہ جدید انسان یہ تسلیم کرنے لگے کہ ان کے پاس چند بہت اہم سولات کے جوابات موجود نہیں، تو انہوں نے ضروری سمجھا کہ بالکل نئے علوم کو تلاش کیا جائے۔ لہذا غالب جدید تحقیقی طریقے پرانی معلومات کو نامکمل سمجھتے ہیں۔ پرانی روایات کے مطالعے کے بجائے اب زیادہ زور نئے مشاہدات و تجربات پر ہے۔ جب نئے مشاہدات کا پرانی روایات سے تصادم ہو تو ہم نئے مشاہدات کو فوقیت دیتے ہیں۔ یقیناً ماہرین طبیعات جو دور دراز کی کہکشاؤں کا مطالعہ کر رہے ہیں، ماہرین آثار قدیمہ جو کانسی کے دور کے کسی شہر پر تحقیق کر رہے ہیں، اور سیاسی سائنس دان جو سرمایہ داری کا مطالعہ کر رہے ہیں روایات کو نظر انداز نہیں کر دیتے۔ ابتداءوہ قدیم داناؤں کی تعلیمات سے ہی کرتے ہیں۔ لیکن کالج میں اپنے پہلے سال ہی سے ابھرتے ہوئے طبیعات دانوں، ماہرین آثار قدیمہ اور سیاست دانوں کو یہ سبق دیا جاتا ہے کہ انہیں آئن اسٹائن، ، ہائنرک شلی مین (Heinrich Schliemann) اور میکس ویبر سے آگے جانا ہے۔

لیکن صرف مشاہدہ ہی علم نہیں ہے۔ کائنات کو سمجھنے کے لیے ہمیں مشاہدات کی مدد سے کامل نظریات بنتے ہوں گے۔ قدیم روایات اپنے نظریوں کو عموماً کہانی کی شکل میں پیش کرتی تھیں، جدید سائنس ریاضی کو استعمال کرتی ہے۔

بائبل، ویداس، قرآن اور کنفیوشس میں بہت کم گراف یا اعداد و شمار ہیں۔ جب اولین اظراف اور صحیفے عمومی قوانین مرتب کر رہے تھے تو وہ ریاضی کے بجائے داستان کی شکل میں ہوتے۔ جیسے مانوی مذہب کا ایک بنیادی اصول یہ بتاتا ہے کہ دنیا خیر و شر کے درمیان ایک میدان جنگ ہے۔ ایک شر کی طاقت نے مادے کو پیدا کیا جب کہ خیر کی قوت سے ارواح تشکیل ہوئیں۔ انسان ان دو قوتوں کے درمیان پھنس گیا ہے اور اسے خیر کی طرف داری کرنی چاہیے۔ لیکن پیغمبر مانی نے ایسا کوئی ریاضی کا فارمولہ پیش نہیں کیا جس سے ان دو متضاد قوتوں کو ناپ کر انسانی انتخاب کو سہل بنا سکیں۔ اس نے یہ کبھی دریافت نہیں کیا کہ "اگر اسے جمع کی کمیت سے تقسیم کیا جائے تو کسی فرد پر لگائی جانے والی قوت اس کی روح میں تیزی کے برابر ہے"۔

سائنس دانوں کو اسی اصول کی تلاش تھی۔ ۱۶۸۷ء میں آئزک نیوٹن نے اپنا مقالہ "قدرتی فلسفے کے ریاضی قوانین" شائع کیا، جو غالباً جدید تاریخ کی سب سے اہم کتاب ہے۔ نیوٹن نے حرکت اور تبدیلی کے ایک عمومی رشتے کو پیش کیا۔ نیوٹن کے نظریے کی عظمت یہ تھی کہ اس سے کائنات میں ہر شے کی حرکت کا تخمینہ لگایا جاسکتا تھا، تین بہت سادہ ریاضی کے قوانین کے استعمال سے ایک گرتے ہوئے سیب سے ٹوٹتے ستارے تک۔

اس کے بعد سے اگر کسی کو بھی ایک توپ کے گولے یا سیارے کی حرکت معلوم کرنی تھی تو اسے محض اس شے کی کمیت، رخ اور تیز رفتاری کی پیمائش کرنی تھی، اور وہ قوتیں جو اس پر اثر کر رہی تھیں۔ ان اعداد کو نیوٹن کی مساوات میں رکھنے سے اس شے کا مستقبل میں مقام معلوم ہو سکتا ہے۔ یہ بالکل جادو کی طرح کارگر تھا۔ انیسویں

صدی کے اختتام پر سائنس دانوں کو چند ایسے مشاہدات ملے جو ان قوانین سے میل نہیں کھاتے۔ اس سے طبیعات میں ایک نئے انقلاب کا آغاز ہوا، نظریہ اضافت اور کوانٹم طبیعات۔

نیوٹن نے ہمیں بتایا کہ کتاب فطرت ریاضی میں لکھی گئی ہے۔ کچھ ابواب (مثال کے طور پر) ایک بالکل واضح مساوات کا بیان ہیں؛ لیکن اسکالروں نے جب نیوٹن کی مساوات کو حیاتیات، اقتصادیات اور نفسیات پر لاگو کیا تو انہیں یہ ادراک ہوا کہ ان شعبوں میں جو پیچیدگیاں ہیں ان سے یہ کوشش شاید بے کار ہوگی۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کا ریاضی پر سے ایمان اٹھ گیا۔ گزشتہ دو سو سالوں میں حقیقت کی پیچیدگیوں کو سلجھانے کے لیے ریاضی کی ایک نئی شاخ پروان چڑھی، شماریات۔

۱۷۴۴ء میں اسکاٹ لینڈ کے دو پریسبائی ٹیرین پادری (Presbyterian) الیگزنڈر ویبسٹر اور رابرٹ والیس نے زندگی کا بیمہ شروع کیا، جو مردہ پادریوں کی بیواؤں اور بچوں کو رقم فراہم کر سکے۔ انہوں نے تجویز کیا کہ کلیسا کا ہر راہب اپنی تنخواہ کا ایک معمولی حصہ اس فنڈ میں جمع کرائے، جو اس پیسے کی سرمایہ کاری کرے۔ اگر وہ راہب مر جاتا ہے تو اس کی بیوہ کو فنڈ کے منافع سے حصہ ملے، جس سے اس کی بقیہ زندگی آرام سے کٹ جائے۔ لیکن یہ جاننے کے لیے کہ فنڈ میں ہر راہب کتنی رقم جمع کرائے تاکہ اپنی ذمہ داریاں پوری کرنے کے لیے فنڈ کے پاس کافی رقم موجود رہے، اس کے لیے ویبسٹر اور والیس کو تخمینہ لگانا تھا کہ ہر سال کتنے راہب مریں گے، وہ اپنے ترکہ میں کتنی بیوائیں اور بچے چھوڑیں گے، اور ان کے بعد ان کی بیوائیں کتنے سال زندہ رہیں گی۔

ایک بات پر غور کیجیے جو ان پادریوں نے نہیں کی۔ انہوں نے خدا سے یہ دعا نہیں مانگی کہ وہ ان پر جواب نازل کردے۔ نہ ہی انہوں نے یہ جوابات کتاب مقدس یا دوسری قدیم مذہبی کتب میں تلاش کیں۔ نہ ہی وہ کسی تجریدی فسلفیانہ بحث میں الجھے۔ اسکاٹ ہونے کی وجہ سے وہ ذرا عملی انسان تھے، تو انہوں نے ایڈنبرا یونی ورسٹی میں ریاضی کے ایک پروفیسر کولن میک لارن سے رابطہ کیا۔ ان تینوں نے راہبوں کے انتقال کی عمر اور اعداد و شمار جمع کیے، پھر ان کے استعمال سے تخمینہ لگایا کہ ہر سال کتنے راہبوں کی موت کا امکان ہے۔

ان کے کام کی بنیاد شماریات اور امکانات کے میدان میں کئی جدید بنیادوں پر مبنی تھی۔ ان میں سے ایک جیکب برنولی کا بہت سے اعداد برتنے کا فارمولا تھا۔ برنولی نے دریافت کیا تھا کہ کسی ایک واقعے کی پیشن گوئی مشکل ہے، مثلاً کسی خاص شخص کی موت، لیکن یہ ممکن ہے کہ ایسے کئی واقعات کے اوسط کی پیشن گوئی کی جا سکے۔ یعنی مک لارین ریاضی کے استعمال سے یہ پیشن گوئی نہیں کر سکتا کہ کیا ویبسٹر اور والیس آئندہ برس مر جائیں گے۔ لیکن اگر اسے کافی اعداد و شمار مہیا ہوں تو وہ ویبسٹر اور والیس کو یہ ضرور بتا سکتا ہے کہ آئندہ برس کتنے پریسبائٹیرین راہب اسکاٹ لینڈ میں مر جائیں گے۔ خوش قسمتی سے انہیں یہ اعداد و شمار مہیا تھے جنہیں وہ استعمال کر سکتے تھے۔ پچاس سال پہلے ایڈمنڈ ہالے کے شائع کیے اعداد و شمار ان کے کام آئے۔ ہالے نے ۱۲۳۸ بچوں کی پیدائش اور ۱۱۷۴ اموات کے ریکارڈ کا جائزہ لیا تھا، جو اس نے جرمنی کے شہر بریسلو سے حاصل کیے تھے۔ ہالے کے اعداد و شمار سے یہ جاننا ممکن تھا کہ مثال کے طور پر کسی بیس برس کے آدمی کا کسی ایک سال میں مرنے کا امکان سو میں سے ایک تھا، لیکن کسی پچاس برس کے آدمی کا انتالیس میں ایک۔

ان اعداد کے جائزے سے ویبسٹر اور والیس نے تخمینہ لگایا کہ اوسطاً کسی بھی وقت ۹۳۰ اسکاٹش

پریسبائٹیرین راہب زندہ ہوں گے، اور اوسطاً ستائیس راہب ہر سال مریں گے، جن میں سے اٹھارہ کی بیوائیں زندہ رہیں گی۔ جن کی بیوہ نہیں ہوگی ان میں سے پانچ کے بچے رہ جائیں گے۔ اور جن کی بیوہ باقی رہ جائے گی ان میں سے دو کی گزشتہ شادی سے بھی اولاد زندہ ہوگی جن کی عمر اس وقت سولہ برس سے کم ہوگی۔ انہوں نے یہ بھی تخمینہ لگایا کہ بیوہ کب مرے گی، یا دوسری شادی کرے گی (ان دونوں حالات میں بیمہ رقم کی ادائیگی بند ہو جاتی)۔ ان اعداد و شمار نے ویبسٹر اور والیس کو اس قابل بنا دیا کہ وہ تخمینہ لگا سکیں کہ ہر راہب کو کتنی رقم ادا کرنی ہوگی تاکہ ان کے پیاروں کو بیمہ کی رقم مل سکے۔ دو پونڈ، بارہ شلنگ اور اور دو پینس سالانہ کی ادائیگی سے ایک راہب یہ یقینی بنا سکتا ہے کہ اس کی بیوہ کو کم از کم دس پونڈ سالانہ ملتے رہیں گے، جو اس زمانے میں ایک بڑی رقم تھی۔ اگر اس کے خیال میں یہ کافی نہیں تھا تو وہ زیادہ رقم جمع کرا سکتا تھا۔ چھ پاؤنڈ، گیارہ شلنگ اور تین پینس سالانہ جس سے اس کی بیوہ کو پچیس پاؤنڈ سالانہ کی خطیر رقم ملتی رہتی۔

ان کے حساب سے ۱۷۶۵ تک اسکاٹ لینڈ کلیسا کے راہبوں کی بیواؤں بچوں کے لیے ۵۸۳۴۸ پاؤنڈ کا سرمایہ جمع ہو چکا ہوگا۔ ان کا تخمینہ حیرت انگیز حد تک درست ثابت ہوا۔ جب وہ سال آیا تو فنڈ میں ۵۸۳۴۷ پاؤنڈ تھے، پیشن گوئی سے ایک پاؤنڈ کم!

امکانات کا تخمینہ جیسا کہ ان دو اسکاٹش راہبوں نے استعمال کیا تھا، وہ نہ صرف تخمینی (Actuarial) سائنس کا باعث بنا، جو کہ بیمہ اور پنشن کے کاروبار کا مرکزی جز ہے، بلکہ آبادیات کی سائنس کا بھی۔ (جو ایک اور انگلیکن پادری رابرٹ ، لتھس نے قائم کی)۔ علم آبادیات ہی وہ بنیادی پتھر ہے جس پر چارلس ڈارون (جو خود بھی ایک اینگلیکن پادری تھا) نے نظریہ ارتقا کی عمارت کھڑی کی۔ اگرچہ ایسی کوئی مساوات موجود نہیں جو یہ پیشن گوئی کر سکے کہ کسی مخصوص ماحول میں کس قسم کی حیات پروان چڑھے گی، جینیات دان حسابی امکان کے استعمال سے یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ کوئی مخصوص میوٹیشن کسی آبادی میں کتنی پھیلے گی۔ ایسے ہی امکانی نمونے اقتصادیات، سماجیات، نفسیات، سائنسی سیاسیات اور دیگر سماجی و قدرتی علوم میں مرکزی کردار ادا کرتی ہیں۔ یہاں تک کہ طبیعات نے بھی نیوٹن کی کلاسیکل مساوات کو کوانٹم میکانکس کے امکانات سے سہارا دیا۔

ہم محض تدریسی تاریخ پر ایک نظر دوڑائیں گے تو ہمیں احساس ہوگا کہ یہ عمل ہمیں کتنی دور لے آیا ہے۔ پوری تاریخ میں ریاضی ایک مخفی علم تھا جسے صاحب علم حضرات بھی شاید ہی کبھی سنجیدگی سے پڑھتے تھے۔ قدیم یورپ میں منطق، قواعد اور خطابت بنیادی تدریسی علوم تھے جب کہ ریاضی کی تعلیم شاید ہی کبھی سادے حساب اور جیومیٹری سے آگے بڑھتی۔ کوئی علم شماریات حاصل نہ کرتا۔ تمام سائنس کا بے تاج بادشاہ الہیات کا علم تھا۔

آج چند ہی طلبہ خطابت پڑھتے ہیں، منطق شعبہ فلسفی تک محدود ہے اور الہیات مذہبی مدرسوں تک۔ لیکن طلبہ بڑھتی ہوئی تعداد میں دلچسپی لے رہے ہیں یا مجبوراً ریاضی کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ بالکل درست سائنس کی جانب ایک نا قابل مزاحمت جھکاؤ ہے۔ درست کی تعریف ریاضی کے اصولوں سے متعین ہوتی ہے۔ علم کے وہ شعبے جو روایتی طور پر انسانیت کے مطالعے کا حصہ تھے، مثلاً انسانی لسانیات یا انسانی نفسیات، وہ بھی اب ریاضی پر انحصار کرتے ہیں، اور اپنے آپ کو درست سائنس کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ شماریات کے سبق اب صرف طبیعات اور حیاتیات ہی کی بنیادی ضرورت نہیں بلکہ نفسیات، سماجیات، اقتصادیات اور سیاسی سائنس کے بھی۔

میری اپنی جامعہ کے شعبہ نفسیات کی فہرست میں پہلا مضمون شماریات اور "طریقوں کا نفسیاتی تحقیق میں تعارف" ہے۔ سال دوئم کے نفسیات کے طلبہ کے لیے نفسیاتی تحقیق میں شماریاتی طریقے لازمی مضمون ہے۔ کنفیوشس، گوتم، بدھ، مسیح اور نبی کو اگر آپ یہ بتاتے کہ انسانی دماغ کو سمجھنے اور اس کی بیماریوں کا علاج کرنے کے لیے پہلے شماریات کا پڑھنا ضروری ہے تو وہ حیران رہ جاتے۔

علم طاقت ہے

زیادہ تر لوگوں کو جدید سائنس ہضم کرنے میں دشواری ہوتی ہے کیوں کہ ہمارے دماغ کے لیے اس کی ریاضی زبان سمجھنا مشکل ہے، اور اس کے مشاہدات اکثر عام فہم کی تردید کرتے ہیں۔ دنیا کے سات ارب افراد میں سے واقعی کتنے کوانٹم میکانکس، خلیوں کی حیاتیات یا کلیاتی معاشیات کو سمجھتے ہیں؟ لیکن پھر بھی سائنس ہمیں جو قوت عطا کرتی ہے اس کی وجہ سے وہ بہت معتزز ہے۔ صدر و جرنیل چاہے جوہری طبیعات کو نہ سمجھیں، لیکن انہیں اس بات کا خاصا ادراک ہے کہ جوہری بم کیا کر سکتا ہے۔

۱۶۲۰ میں فرانسس بیکن نے ایک نیا سائنسی منشور شائع کیا، جس کا عنوان تھا نیا آلہ (The new instrument)۔ اس میں وہ یہ دلیل دیتا ہے کہ علم طاقت ہے۔ علم کا اصل امتحان یہ نہیں کہ وہ درست ہے، بلکہ یہ کہ کیا یہ ہمیں طاقت عطا کرتا ہے۔ سائنس دان عموماً یہ فرض کرتے ہیں کہ کوئی بھی نظریہ صد فیصد درست نہیں ہوتا۔ لہٰذا سچائی علم کا ایک نامناسب میزان ہے۔ اصل میزان اس کا استعمال ہے۔ کوئی ایسا نظریہ جس سے ہمیں نئے کام کرنے میں مدد ملے وہی علم ہے۔

ان صدیوں میں سائنس نے ہمیں بہت سے نئے اوزار دیے۔ ان میں سے کچھ ذہنی اوزار ہیں، مثلاً وہ جو شرح اموات اور اقتصادی ترقی کا تخمینہ لگاتے ہیں۔ اس سے بھی زیادہ اہم ٹیکنالوجی کے اوزار ہیں۔ سائنس اور ٹیکنالوجی میں ربط اس قدر مضبوط ہے کہ آج لوگ ان میں تمیز بھول جاتے ہیں۔ ہم اکثر یہ سوچتے ہیں کہ سائنسی تحقیق کے بغیر نئی ٹیکنالوجی پیدا کرنا ناممکن ہے، اور اگر تحقیق نئی ٹیکنالوجی پیدا نہ کرے تو بیکار ہے۔

درحقیقت سائنس اور ٹیکنولوجی میں تعلق بہت نئی بات ہے سن ۱۵۰۰ سے پہلے سائنس اور ٹیکنالوجی بہت الگ شعبے تھے۔ جب بیکن نے سترھویں صدی میں ان کا امتزاج کیا تو یہ ایک انقلابی فکر تھی۔ سترھویں اور اٹھارویں صدیوں میں یہ تعلق اور مضبوط ہوا، لیکن ان میں گرہ تو واقعی انیسویں صدی میں بندھی۔ سن ۱۸۰۰ میں بھی بیشتر حکمران جو ایک مضبوط عسکری قوت کے خواہاں تھے، یا بیشتر کاروباری امرا جو ایک کامیاب کاروبار چاہتے تھے وہ طبیعات، حیاتیات یا اقتصادیات کی تحقیق میں سرمایہ کاری نہیں کرتے تھے۔

میرا یہ دعویٰ نہیں ہے کہ ہمیشہ ایسا ہی ہوتا ہے۔ کوئی اچھا مورخ ہر چیز کی ایک پرانی مثال ڈھونڈ ہی لیتا ہے۔ اور اس سے بھی بہتر مورخ یہ بھی جانتا ہے کہ یہ مثال کس دور سے ہیں اور کن بادلوں میں پوشیدہ رہیں۔ مجموعی طور پر پس از جدید حکمران اور کاروباری افراد کائنات کے بارے میں نئی تکنیک کی دریافت کے لیے تحقیق میں سرمایہ کاری نہیں کرتے تھے۔ اور زیادہ تر محقق اپنے مشاہدات کو تکنیکی اوزار میں نہیں بدلتے تھے۔ حکمران تدریسی اداروں میں سرمایہ لگاتے جن سے روایتی علم کی ترسیل اور موجودہ قاعدے کے استحکام کی توقع کی جاسکتی تھی۔

کبھی کبھار افراد کوئی نئی تکنیک ایجاد کر بھی لیتے، لیکن یہ عموماً ان پڑھ کاریگر ہوتے تھے جو اپنی غلطیوں سے سیکھتے، جو اسکالر باقاعدہ سائنسی تحقیق کر رہے ہوتے ان سے نہیں سیکھتے تھے۔ چھکڑا بنانے والے سالہا سال اسی خام مال سے ویسے ہی چھکڑے بناتے رہے۔ وہ اپنے منافع کا کوئی حصہ نئے طرز کے چھکڑے کی تحقیق کے لیے مختص نہیں کرتے تھے۔ کبھی کبھار چھکڑے کا نقشہ بہتر بھی ہوتا لیکن ایسا عموماً کسی مقامی ترکھان کی ہنرمندی سے ہوتا جس نے کبھی کسی جامعہ کی شکل بھی نہ دیکھی ہوتی، اور جو شاید پڑھنا جانتا بھی نہیں تھا۔

عوامی اور نجی شعبوں دونوں کی یہی کہانی تھی۔ جب کہ جدید ریاستیں تقریباً ہر قومی پالیسی وضع کرنے میں، اپنے سائنس دانوں سے ہر مسئلہ کے حل کے لیے رجوع کرتے ہیں۔ توانائی اور صحت سے لے کر کچرے کو ختم کرنے تک، قدیم مملکتیں شاذ ہی ایسا کیا کرتیں۔ کل اور آج میں سب سے واضح فرق ہتھیاروں میں ہے۔ جب ۱۹۶۱ میں رخصت ہوتے ہوئے امریکی صدر آئزن ہاور نے فوجی صنعتی گٹھ جوڑ کی بڑھتی ہوئی قوت کے بارے میں خبردار کیا تھا، تو انہوں نے اس مساوات کا ایک حصہ نظر انداز کر دیا تھا۔ انہیں فوجی، صنعتی، سائنسی گٹھ جوڑ کے بارے میں خبردار کرنا چاہیے تھا کیوں کہ آج کے دور کی جنگیں سائنسی پیداوار ہیں۔ دنیا کی فوجی طاقتیں ہی نوع انسان کی سائنسی تحقیق اور ٹیکنالوجی کے بیشتر حصے کا آغاز، ان کی رہنمائی اور ان میں سرمایہ کاری کرتی ہیں۔

جب پہلی جنگ عظیم ایک ناقابل فتح مورچوں کی جنگ میں بدل گئی تو دونوں متحارب گروہوں نے اس تعطل کو ختم کرنے کے لیے اپنے سائنسدانوں کو ملک کی حفاظت کے لیے طلب کیا۔ سفید کوٹ پہنے افراد شامل ہوئے اور فوراً ہی لیبارٹری سے نئے حیرت انگیز ہتھیاروں کی قطاریں نکلنے لگیں: جنگی جہاز، زہریلی گیس، ٹینک، آبدوز، زیادہ کارآمد مشین گن، توپوں کے حصے، بندوقیں اور بم۔

دوسری جنگ عظیم میں سائنس دانوں کا کردار اس سے بھی بڑا تھا۔ سنہ ۱۹۴۴ کے اواخر تک جرمنی جنگ ہار رہا تھا، ور شکست یقینی تھی۔ ایک سال پہلے جرمنی کے حلیف اٹلی نے مسولینی کا تختہ الٹ کر اتحادیوں کے سامنے ہتھیار ڈال دیے تھے۔ لیکن جرمنی نے جنگ جاری رکھی گو امریکی، برطانوی اور روسی افواج گھیرا تنگ کر رہی تھیں۔ جرمن فوجوں اور عوام کی یہ سوچ کہ ابھی سب ختم نہیں ہوا اس وجہ سے تھی کہ ان کے خیال میں جرمن سائنسدان نئے معجزاتی ہتھیار مثلاً وی ۲ راکٹ اور جیٹ طاقت کے طیارے بنا کے جنگ کا پانسہ پلٹنے والے تھے۔

جب کہ جرمن راکٹ اور طیاروں پر کام کر رہے تھے، امریکہ میں مین ہٹن پراجیکٹ کامیابی سے ایٹم بم بنا رہا تھا۔ جب اگست سنہ ۱۹۴۵ میں یہ بم تیار ہوا تو جرمنی پہلے ہی ہتھیار ڈال چکا تھا، لیکن جاپان نے جنگ جاری رکھی تھی۔ امریکی فوجی اس کے جزیروں پر حملہ آور ہونے کے لیے تیار تھے۔ جاپانیوں نے ان حملوں کے مقابلے کا حلف اٹھایا اور موت تک لڑنے کا ارادہ کیا، اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ دھمکی کھوکھلی نہیں تھی۔ امریکی جرنیلوں نے امریکی صدر ہیری ٹرومین کو خبردار کیا کہ جاپان پر حملے کی صورت میں دس لاکھ امریکی فوجی مارے جائیں گے، اور جنگ غالباً سنہ ۱۹۴۶ میں داخل ہو جائے گی۔ ٹرومین نے نئے بموں کے استعمال کا فیصلہ کیا۔ دو ہفتوں اور دو جوہری بموں کے استعمال کے بعد جاپان نے غیر مشروط ہتھیار ڈال دیے اور جنگ ختم ہو گئی۔
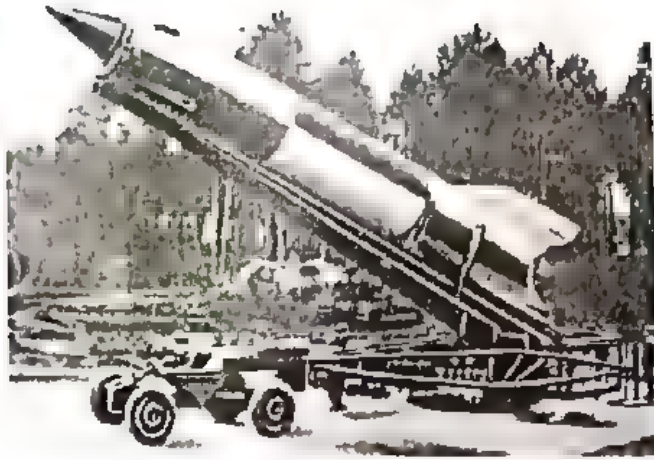
جرمن دی ٹو راکٹ چلنے کے لیے تیار۔ اس سے اتحادیوں کو شکست تو نہیں ہوئی مگر جرمن جنگ کے آخری دن تک تکنیکی معجزے کے انتظار میں رہے۔

لیکن سائنس کا تعلق صرف جارحانہ ہتھیاروں سے ہی نہیں ہے۔ یہ ہمارے دفاع میں بھی اہم کردار ادا کرتی ہے۔ آج زیادہ تر امریکی یہ یقین رکھتے ہیں کہ دہشت گردی کا حل سیاسی نہیں بلکہ ٹیکنالوجی میں پوشیدہ ہے۔ ان کا خیال ہے کہ بس نانو ٹیکنالوجی (Nano technology) کی صنعت کو کروڑوں دے دیجیے، اور امریکہ ہر افغان غار، یمنی مورچوں اور شمالی افریقہ کے کیمپوں میں جاسوس مصنوعی مکھیاں بھیج سکتا ہے۔ ایک دفعہ ایسا ہو جائے تو اسامہ بن لادن کے وارث بغیر یہ اہم معلومات سی آئی اے کے لینگلی (Langley) دفتر پہنچائے کانی کا ایک گگ بھی نہیں بنا سکتے۔ اگر دماغ کی تحقیق پر کروڑوں خرچ کیے جائیں تو جلد ہی ایرپورٹ پر بہت عمدہ ایف ایم آر آئی اسکینر نصب ہو جائیں گے جو فوراً لوگوں کے دماغ میں غصہ ور اور نفرت آمیز سوچ کو بھانپ لیں گے۔ کیا یہ کارگر ہوگا، کون جانتا ہے؟ کیا مکھیاں بنانا اور سوچ پڑھنے والے اسکینر بنانا مناسب ہے؟ ضروری نہیں۔ لیکن بہر حال جب آپ یہ سطریں پڑھ رہے ہیں تو امریکہ کا دفاعی شعبہ کروڑوں ڈالر ٹیکنالوجی اور دماغی تحقیق کو منتقل کر رہا ہے تاکہ ان پر اور ایسے دوسرے خیالات پر کام کیا جائے۔

فوجی ٹیکنالوجی سے یہ عشق، ٹینک سے جوہری بم سے جاسوس مکھیوں تک ایک حیرت انگیز طور پر جدید معاملہ ہے۔ انیسویں صدی تک فوجی انقلاب کا بیشتر حصہ تنظیمی ہوتا تھا تکنیکی نہیں۔ جب اجنبی تہذیبیں پہلی بار ملتی تھیں تو ٹیکنالوجی کی خلیج اکثر اہم کردار ادا کرتی تھی۔ لیکن ایسے مواقع پر بھی کم ہی شعوری طور پر اس خلیج کو بڑھانے یا کم کرنے کی بابت سوچتے۔ زیادہ تر سلطنتیں ٹیکنالوجی کی ذہانت سے قائم نہیں ہوئی تھیں، اور ان کے حاکمین نے ٹیکنالوجی میں بہتری پر زیادہ توجہ نہیں دی۔ عربوں نے ساسانیوں کو بہتر کمانوں یا تلواروں کی وجہ سے شکست نہیں دی۔ سلجوقوں کو بازنطینیوں پر کوئی تکنیکی سبقت حاصل نہیں تھی اور منگولوں نے چین کو کسی نئے انوکھے ہتھیار سے شکست نہیں دی تھی۔ بلکہ ان تمام مفتوحین کے پاس زیادہ بہتر فوجی اور سویلین ٹیکنالوجی تھی۔

رومن فوج بالخصوص ایک اچھی مثال ہے۔ اپنے دور کی یہ بہترین فوج تھی لیکن ٹیکنالوجی کے اعتبار سے انہیں قرطاج، میسی ڈونیا، یا سلوقیوں پر کوئی فوقیت حاصل نہیں تھی۔۔ اسے بہتر تنظیم، آہنی نظم و ضبط اور عددی برتری کا فائدہ تھا۔ رومن فوج نے کبھی تحقیق یا ترقی کے شعبے قائم نہیں کیے، اور اس کے ہتھیار صدیوں تک وہی رہے۔ اگر شیپو

ایمی لیانس (Scipio Aemillanus) کا لشکر جس نے قرطاج کو تاراج کیا اور نیوما نیشن کو دوسری صدی ق م میں شکست دی، اگر پانچ سو سال بعد عظیم کونسٹنٹین کے دور میں نمودار ہوتا تو وہ شاید کونسٹنٹین کو شکست دینے میں کامیاب رہتا۔ اب ذرا سوچیے کہ اگر چند صدیوں پہلے کا کوئی جنرل مثلاً نپولین کسی جدید بکتر بند ڈویژن کے خلاف لشکر لے آئے، نپولین حکمت عملی کا ماہر تھا اور اس کے فوجی پیشہ ور تھے، لیکن جدید ہتھیاروں کے سامنے اس کی اہلیت بے کار ہوتی۔ روم کی طرح، قدیم چین میں بھی زیادہ تر جنرل اور فلاسفر نئے ہتھیاروں کی پیداوار اپنی ذمہ داری نہیں سمجھتے تھے۔ چینی تاریخ کی سب سے اہم عسکری ایجاد بارود تھا۔ لیکن جہاں تک ہمیں معلوم ہے یہ گن پاؤڈر بھی اتفاقی طور پر دریافت ہوا تھا جب کوئی تاؤ کیمیا دان آب حیات کی تلاش میں تھا۔ اس گن پاؤڈر کا سفر اس سے بھی زیادہ دلچسپ ہے۔ آپ سوچ رہے ہوں گے کہ اس تاؤ کیمیا دان نے چین کو دنیا کا حاکم بنا دیا ہوگا۔ در حقیقت چینیوں نے اس بارود کو زیادہ تر پٹاخے بنانے کے لیے استعمال کیا۔ جب منگول حملے کے سامنے سونگ سلطنت گھٹنے ٹیک رہی تھی اس وقت بھی کسی شہنشاہ نے سلطنت کو بچانے کے لیے نہ کوئی قیامت خیز ہتھیار بنائے نہ کوئی مین ہٹن پراجیکٹ شروع کیا تھا۔ تقریباً پندرہویں صدی میں، گن پاؤڈر کی ایجاد کے چھ سو سال بعد افرو ایشائی جنگ کے میدانوں میں توپیں نمودار ہوئیں۔ اس مصالحے کی ہلاکت خیز خصوصیت کے عسکری استعمال میں اتنی تاخیر کیوں ہوئی۔ کیوں کہ یہ ایک ایسے دور میں نمودار ہوا تھا جب بادشاہ، اسکالر یا تاجر کوئی بھی اس فکر میں نہیں تھا کہ نئی عسکری ٹیکنالوجی انہیں محفوظ رکھے گی یا متمول بنا دے گی۔

صورت حال پندرہویں اور سولہویں صدی میں تبدیل ہوئی۔ لیکن پھر بھی زیادہ تر حاکموں کو نئے ہتھیاروں کی تحقیق اور پیداوار میں سرمایہ کاری میں دو سو سال لگ گئے۔ جنگوں کے نتائج پر نئی ٹیکنالوجی سے زیادہ نقل و حمل اور حکمت عملی اثر ڈالتی۔ نپولین کی فوجی مشین جس نے یورپی قوتوں کو ۱۸۰۵ میں آسٹرلیٹز کے مقام پر شکست دی تھی، وہ بھی تقریباً لوئی سولہ کی فوج جیسے ہتھیاروں سے ہی مسلح تھی۔ گو سائنسدانوں نے نپولین کو سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ اڑنے والی مشینوں، آبدوزوں اور راکٹوں میں سرمایہ کاری کرے، لیکن نپولین توپ خانے کا آدمی ہونے کے باوجود نئے ہتھیاروں میں بہت کم دلچسپی لیتا تھا۔

سائنس، صنعت اور فوجی ٹیکنالوجی صرف سرمایہ دارانہ نظام کی آمد اور صنعتی انقلاب کے بعد ہی یکجا ہوئے۔ لیکن ایک بار یہ رشتہ استوار ہو گیا تو اس نے بہت جلد دنیا کو تبدیل کر دیا۔

ترقی کا خیال

سائنسی انقلاب سے پہلے زیادہ تر انسانی ثقافتیں ترقی پر یقین نہیں رکھتی تھیں۔ ان کے خیال میں ماضی کا دور سنہری تھا اور دنیا اگر تنزلی نہیں تو جمود کا شکار تھی۔ اگر ہم اس عقلی دور سے وابستہ رہیں تو شاید پرانا سنہری دور واپس آجائے اور انسانی قوت اختراع شاید زندگی کے کسی پہلو کو بہتر کر دے۔ لیکن انسانی علم کو دنیا کے بنیادی مسائل کے حل کے لیے ناکافی تصور کیا جاتا تھا۔ اگر نبی، عیسیٰ، بدھ اور کنفیوشس جو دنیا کے ہر علم سے واقف تھے، وہ بھی دنیا سے قحط، بیماری، غربت اور جنگ کو ختم کرنے میں ناکام تھے تو بھلا ہم کیسے کر سکتے تھے؟

کئی مذاہب یہ یقین رکھتے ہیں کہ ایک دن ایک مسیحا آئے گا جو تمام جنگ، قحط اور خود موت کا خاتمہ

کردے گا۔ لیکن یہ تصور کہ انسان نئے علم اور نئے اوزار ایجاد کر کے ایسا کر سکتا ہے تو یہ مضحکہ خیز سے زیادہ گھمنڈی ہے۔ بابل کے مینار کی کہانی، آئکارس کی کہانی گولم (Golem) کی اور دوسری بہت سی داستانیں لوگوں کو یہی بتاتی تھیں کہ انسانی حدود سے باہر جانے میں صرف مایوسی اور تباہی کے سوا کچھ نہیں۔

بنجمن فرینکلن خداؤں کو غیر مسلح کر رہے ہیں

جب جدید ثقافت نے اعتراف کیا کہ وہ بہت سی اہم اشیا سے ناواقف ہے، جب لاعلمی کے ساتھ اس خیال نے جنم لیا کہ سائنسی ایجادات ہماری طاقت میں اضافہ کرسکتی ہیں تو لوگوں کو خیال ہوا کہ ترقی شاید واقعی ممکن ہے۔ جب سائنس ایک ناقابل حل مسئلے کو حل کر کے دوسرا حل کرنے لگی تو بہت سے افراد کو یقین ہو گیا کہ نوع انسان ہر مسئلہ اور کسی بھی مسئلہ کو نئے علوم کے حصول اور ان کے استعمال سے حل کر سکتی ہے۔ غربت، بیماری، جنگ، قحط، بڑھاپا اور خود موت انسانیت کے ضروری مستقبل نہیں تھے، وہ محض ہماری لاعلمی کا پھل تھے۔

اس کی ایک معروف مثال آسمانی بجلی ہے۔ بہت سی ثقافتیں یہ یقین رکھتی تھیں کہ برق آسمانی اک ناراض خدا کا چابک ہے جو گناہ گاروں کو سزا دینے کے لیے چابک کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ اٹھارویں صدی کے وسط میں سائنسی تاریخ کے سب سے زیادہ یاد کیے جانے والے تجربے میں بنجمن فرینکلن نے طوفانی برق و باراں کے دوران یہ ثابت کرنے کے لیے کہ آسمانی بجلی محض بجلی کا کرنٹ ہے، ایک پتنگ اڑائی۔ فرینکلن کے عملی مشاہدات اور برقی توانائی کی خصوصیات کے بارے میں اس علم کے استعمال سے اس نے وہ کڑکتی بجلی پیدا کر کے خداؤں کو نہتا کر دیا۔

غربت اس کی ایک اور مثال ہے۔ بہت سی ثقافتیں غربت کو اس پر عیب دنیا کا ایک لازمی جز تصور کرتی تھیں۔ نئی بائبل کے مطابق، مصلوب ہونے سے پہلے ایک عورت نے مسیح کے جسم پر تین سو دیناری کا مہنگا تیل مل دیا تھا۔ مسیح کے پیروکاروں نے اتنی خطیر رقم غریبوں میں تقسیم کرنے کے بجائے اس طرح ضائع کرنے پر عورت کو سرزنش کی۔ لیکن مسیح نے اس کی حمایت کی اور کہا کہ "غریب تو ہمیشہ تمھارے ساتھ رہیں گے، اور تم جب چاہو ان کی مدد کر سکو گے، لیکن میں ہمیشہ تمھارے ساتھ نہیں رہوں گا" (مرک ۷:۱۴)۔ آج بہت کم لوگ، اور بہت کم عیسائی بھی

مسیح کی اس بات سے متفق ہیں۔ اب غربت کو ایک تکنیکی مسئلہ سمجھا جاتا ہے جس میں مداخلت کی جا سکتی ہے۔ عام فہم یہ ہے کہ دہی معیشت، اقتصادیات، طب اور ثقافت میں جدید دریافتوں کے استعمال سے غربت کا خاتمہ کیا جا سکتا ہے۔

اور یقیناً دنیا کے کئی خطے غربت کی بدترین اقسام سے پاک ہو چکے ہیں۔ تمام تاریخ میں معاشرے دو طرح کی غربت کا شکار رہے ہیں: سماجی غربت، جس میں کچھ لوگوں کو وہ وسائل مہیا نہیں جو دوسروں کو مہیا ہیں۔ اور حیاتیاتی غربت، جس میں غذا اور سر پر چھت کی غیر موجودگی افراد کی زندگی ہی خطرے میں ڈال دیتی ہے۔ ممکن ہے کہ سماجی غربت کبھی ختم نہ کی جا سکے، لیکن دنیا کے کئی ممالک میں حیاتیاتی غربت اب قصہ پارینہ ہے۔

ماضی قریب تک بیشتر افراد حیاتیاتی غربت کے کناروں پر زندہ تھے، جہاں لوگوں کو لمبی عمر کے حصول کے لیے کافی غذائی وسائل مہیا نہیں تھے۔ معمولی غلطیاں یا بدقسمتی افراد کو قحط میں دھکیل دیتی۔ قدرتی آفات اور انسان کے پیدا مسائل کی وجہ سے پوری آبادیاں پاتال میں اتر جاتیں اور کروڑوں افراد کی موت کا باعث بنتیں۔ آج دنیا کی بیشتر آبادی نے پاتال میں گرنے سے بچاؤ کا ایک جال بچھایا ہے۔ افراد ذاتی بدقسمتی کے خلاف بیمہ، ریاست کا فراہم کردہ سماجی تحفظ اور کئی اقسام کی مقامی و بین الاقوامی این جی او سے تحفظ حاصل کر لیتے ہیں۔ جب کوئی آفت دنیا کے کسی بھی حصے کو متاثر کرتی ہے، تو دنیا بھر سے امداد اس خطے کو مزید خرابی سے بچا لیتی ہے۔ افراد اب بھی بہت سی بے عزتیوں، ذلت اور غربت سے وابستہ بیماریوں کا شکار ہوتے ہیں، لیکن زیادہ تر ممالک میں لوگ اب بھوک سے نہیں مرتے۔ درحقیقت بیشتر معاشروں میں افراد قحط کے بجائے موٹاپے سے موت کا شکار ہیں۔

گلگمش پراجیکٹ

انسانیت کے تمام ظاہری ناقابل حل مسائل میں جو سب سے زیادہ تکلیف دہ، دلچسپ اور اہم ہے وہ خود موت ہے۔ پس از جدید دور تک بیشتر مذاہب اور نظریات موت کو ہمارا لازمی اختتام سمجھتے تھے۔ مزید یہ کہ بیشتر مذاہب زندگی کے معنی موت کے بیان سے سمجھاتے۔ اسلام، عیسائیت یا قدیم مصری مذاہب کی ایسی دنیا کا تصور کیجیے جہاں موت کا وجود نہ ہو۔ ان اعتقادات نے لوگوں کو موت کو قبول کرنے اور اپنی امیدیں حیات بعد از موت سے وابستہ کرنے کی تعلیم دی۔ بجائے اس کے کہ موت پر قابو پا کر ہمیشہ زمین پر ہی رہیں، بہترین دماغ موت سے فرار کے بجائے اسے بامعنی کرنے میں مصروف تھے۔

یہ ہم تک پہنچنے والی قدیم ترین کہانی کا مرکزی خیال ہے۔ قدیم سومرائی گلگمش کی کہانی۔ اس کا ہیرو دنیا کا سب سے اہم اور طاقت ور ترین انسان تھا، اراک کا بادشاہ گلگمش جو جنگ میں کسی کو بھی شکست دے سکتا تھا۔ ایک دن گلگمش کا بہترین دوست این کیڈو مر گیا۔ گلگمش کئی دن اس کی میت کے پاس بیٹھا غم مناتا رہا، یہاں تک کہ اس نے اپنے دوست کے نتھنے سے ایک عورت کو برآمد ہوتے دیکھا۔ اس وقت گلگمش پر بہت دہشت طاری ہوئی اور اس نے طے کر لیا کہ وہ خود کبھی نہیں مرے گا۔ وہ کسی نہ کسی طرح موت کو شکست دینے کا طریقہ دریافت کر لے گا۔ پھر گلگمش نے اس کائنات کے کنارے تک سفر کیا۔ راستے میں شیروں کو مارتا، بچھو نما آدمیوں سے لڑتا وہ زمین کی پاتال تک پہنچ گیا۔ وہاں اس نے ارشانابی کی پتھریلی پراسرار چیزوں کو تہس نہس کیا، دریائے مردار کا کشتی بان اور پھر اتناپشتم کو تلاش کر لیا، اس اولین طوفان سے بچ جانے والا آخری فرد۔ پھر بھی گلگمش اپنی تلاش میں ناکام ہی

رہا۔ وہ ہمیشہ کی طرح فانی، خالی ہاتھ ہی واپس لوٹا، لیکن اپنی ذہانت میں اضافے کے ساتھ۔ گلگمش کو یہ ادراک ہوا کہ جب خداؤں نے انسان کو تخلیق کیا تو ساتھ ہی موت کو انسان کی لازمی منزل قرار دیا، لہذا انسان کو اس کے ساتھ زندہ رہنے کا ڈھنگ سیکھنا چاہیے۔

ترقی کے پیروکار اس شکست خوردہ رویے کو تسلیم نہیں کرتے۔ سائنس دانوں کے لیے موت ایک ناگزیر منزل نہیں، بلکہ محض ایک تکنیکی مسئلہ ہے۔ لوگ اس لیے نہیں مرتے کہ خداؤں نے یہ حکم نافذ کیا ہے بلکہ کسی تکنیکی ناکامی کی وجہ سے: دورۂ قلب، سرطان، انفکشن۔ اور ہر تکنیکی مسئلے کا ایک تکنیکی حل موجود ہوتا ہے۔ اگر دل کی دھڑکن بے ترتیب ہونے لگے تو اس میں ایک جنریٹر لگایا جاسکتا ہے یا دل بدلا جاسکتا ہے۔ اگر سرطان پھیل جائے تو اسے دواؤں یا شعاؤں سے شکست دی جاسکتی ہے۔ اگر جرثومے بڑھنے لگیں تو انہیں اینٹی بایوٹک سے فتح کیا جاسکتا ہے۔ ہم ان پر کام کررہے ہیں۔ ہمارے بہترین دماغ موت کو معنی دینے پر اپنا وقت ضائع نہیں کررہے۔ اس کے بجائے وہ بیماری اور بڑھاپے کے فعلیاتی، ہارمونی اور جینیاتی عوامل پر تحقیق میں مصروف ہیں۔ وہ نئی دوائیں ایجاد کررہے ہیں، انقلابی معالجے اور مصنوعی اعضا جن سے ہماری زندگی کو طوالت ملے، اور ایک دن موت کی فصل اتر نی بند ہوجائے۔

ابھی تک آپ نے کسی سائنسدان یا کسی اور فرد کو دوٹوک الفاظ میں یہ کہتے نہیں سنا ہوگا کہ موت کو شکست؟ کیا بکواس ہے۔ وہ اصرار کریں گے کہ "ہم تو صرف سرطان، تپ دق اور الزھائمر کا علاج دریافت کررہے ہیں!" لوگ موت کے مسئلہ کو اس لیے چھیڑتے ہی نہیں تھے کہ یہ ناقابل حصول مقصد لگتا تھا۔ ناممکن توقعات کا تعاقب کرنے کا کیا فائدہ؟ لیکن اب ہم ایک ایسے موڑ پر آگئے ہیں جہاں ہم اس پر واضح گفتگو کرسکتے ہیں۔ سائنسی انقلاب کا سرکردہ منصوبہ نوع انسانی کو بقائے دوام دینا ہے۔ اگر موت کو شکست دینا بہت دور کی بات لگتی ہے، تب بھی ہم نے وہ فتوحات حاصل کرلی ہیں جو چند صدیوں پہلے ناممکن تھیں۔ ۱۱۹۹ میں رچرڈ شیر دل کے بائیں شانے میں ایک تیر پیوست ہوگیا تھا۔ آج ہم اسے معمولی سا زخم کہیں گے۔ لیکن ۱۱۹۹ میں اینٹی بایوٹک کی عدم دستیابی اور صفائی کے اصولوں کی غیر موجودگی میں یہ زخم پک گیا اور اس میں گینگرین پیدا ہوگئی۔ بارھویں صدی کے یورپ میں گینگرین کا واحد علاج یہی تھا کہ بازو کاٹ دیا جائے، لیکن شانے کے زخم کے لیے تو یہ بھی ناممکن تھا۔ یہ گینگرین شیر دل کے پورے جسم میں سرایت کرگئی، کوئی بادشاہ کی مدد نہیں کرسکا اور وہ سخت تکلیف کے عالم میں دو ہفتوں بعد مرگیا۔

ابھی انیسویں صدی تک ڈاکٹروں کو یہ نہیں معلوم تھا کہ انفکشن سے کیسا بچا جائے، اور پیپ پڑنے سے کیسا روکا جائے۔ جنگی میدانی ہسپتالوں میں ڈاکٹر عموماً فوجیوں کے ہاتھ یا پاؤں کاٹ دیتے، کیوں کہ معمولی زخم سے بھی گینگرین پیدا ہوسکتی ہے۔ یہ، اور دوسری تمام اقسام کی جراحی (مثلاً داڑھ نکالنا) مریض کو بیہوش کیے بغیر کی جاتی تھی۔ بے ہوشی کی پہلی دوائیں۔۔ ایتھر، کلوروفام اور مارفین پہلی بار مغربی طب میں انیسویں صدی کے وسط میں استعمال ہوئیں۔ کلوروفارم کی دریافت سے پہلے چار فوجیوں کو اپنے ساتھی کو قابو کرنا پڑتا تھا تاکہ ڈاکٹر اس کا زخمی عضو کاٹ سکے۔ ۱۸۱۵ میں واٹرلو کی جنگ کے بعد، کٹے ہوئے ہاتھوں اور پیروں کا انبار میدانی ہسپتال کے سائے میں موجود تھا۔ اس زمانے میں جو بڑھئی اور قصائی فوج میں بھرتی ہوتے تھے انہیں اکثر میدانی ہسپتالوں میں تعینات کیا جاتا تھا، کیوں کہ جراحی کے لیے چاقو، چھری اور آری کا استعمال جاننا لازم تھا۔

واٹرلو کے بعد سے دو صدیوں میں چیزیں ناقابل شناخت حد تک بدل گئی ہیں۔ گولیاں، ٹیکے اور ماہرانہ جراحی ہمیں بہت سی ایسی بیماریوں اور زخموں سے محفوظ رکھتی ہیں جو کسی وقت موت کا پیغام لاتی تھیں۔ یہ ہمیں روز مرہ کے ان گنت درد و آلام سے محفوظ رکھتے ہیں۔ جو پس از جدید افراد سادگی سے قبول کر لیتے تھے۔ اوسط عمر پچیس سے چالیس سے بڑھ کر دنیا بھر میں سڑسٹھ سال، جب کہ ترقی یافتہ دنیا میں تقریباً اسی سال ہوگئی۔

موت کو سب سے عبرتناک شکست بچوں کی شرح اموات کے ضمن میں ہوئی۔ بیسویں صدی تک زرعی معاشروں میں چوتھائی سے ایک تہائی تک بچے لڑکپن کو نہیں پہنچ پاتے تھے۔ زیادہ تر امراض اطفال مثلاً چیچک، خسرہ اور خناق کے ہاتھوں جاں بحق ہوئے۔ سترھویں صدی کے ہندوستان میں ہر ہزار میں سے ڈیڑھ سو بچے عمر کے پہلے سال میں مرجاتے تھے، اور ایک تہائی بچے پندرہ برس کی عمر سے پہلے فوت ہو جاتے۔ آج ہزار میں سے پانچ انگریز بچے اپنی پہلی سالگرہ سے پہلے فوت ہوتے ہیں اور ہزار میں سے صرف سات بچے پندرہ برس کی عمر تک پہنچنے سے پہلے ختم ہو جاتے ہیں۔

اگر شماریات کو ایک طرف کر کے کوئی کہانی بیان کی جائے تو شاید ان اعداد کا اثر زیادہ نمایاں ہو جائے۔ ایک اچھی مثال شاہ ایڈورڈ اول اور ان کی اہلیہ ایلینور کی ہے (۹۰-۱۲۴۱)۔ ان کی اولاد کو قدیم یورپ میں بہترین ماحول اور پرورش مہیا تھی۔ وہ محلات میں رہتے، جتنی چاہے غذا کھاتے، انہیں وافر گرم کپڑے مہیا تھے۔ آتش دان روشن رہتے، پینے کو صاف ترین پانی اور خدام و طبیبوں کی ایک فوج حاضر تھی۔ ملکہ ایلینور نے ۱۲۵۵ سے ۱۲۸۴ کے درمیان جن سولہ بچوں کو جنم دیا تھا، تاریخ میں ان کا بیان کچھ یوں ملتا ہے:

۱۔ ایک گمنام بچی ۱۲۵۵ میں پیدائش پر ہی فوت ہوگئی
۲۔ دوسری بچی کیتھرین ایک سے تین برس کی عمر میں فوت ہوئی
۳۔ ایک جون نام کی بچی چھ ماہ کی عمر میں فوت ہوئی
۴۔ ایک بیٹا جان پانچ برس کی عمر میں فوت ہوا
۵۔ ایک بیٹا ہنری چھ برس کی عمر میں چل بسا
۶۔ ایک بیٹی ایلینور انتیس برس کی عمر میں فوت ہوئی
۷۔ ایک گمنام بیٹی نے پانچ ماہ کی عمر پائی
۸۔ ایک اور بیٹی جون پینتیس برس کی عمر میں چل بسی
۹۔ ایک بیٹا الفانسو دس برس کی عمر میں
۱۰۔ ایک بیٹی مارگریٹ اٹھاون برس کی عمر میں
۱۱۔ ایک بیٹی بیرنگیریا دو برس کی عمر میں فوت ہوئی
۱۲۔ ایک گمنام بیٹی پیدائش کے فوراً بعد جاں بحق ہوئی
۱۳۔ ایک بیٹی میری ترپن برس کی عمر میں فوت ہوئی
۱۴۔ ایک گمنام بیٹا پیدائش کے فوراً بعد چل بسا
۱۵۔ ایک بیٹی ایلزبتھ چونتیس برس کی عمر میں فوت ہوئی

۱۶۔ایک بیٹا ایڈورڈ

سب سے چھوٹا بیٹا ایڈورڈ وہ پہلا لڑکا تھا جو بچپن کے خطرناک سالوں میں زندہ رہا، اور اپنے باپ کے انتقال کے بعد شاہ ایڈورڈ دوئم کے طور پر تخت برطانیہ پر بیٹھا۔ دوسرے الفاظ میں ملکہ ایلینور کو کسی برطانوی ملکہ کا سب سے اہم فریضہ انجام دینے کے لیے سولہ بار کوشش کرنی پڑی کہ وہ اپنے شوہر کے لیے ایک مرد وارث پیدا کر سکے۔ ایڈورڈ دوئم کی ماں یقیناً ایک غیر معمولی اور بہت صابر خاتون رہی ہوگی۔ لیکن اپنی بیوی، فرانس کی ازابیلا، کے انتخاب میں وہ اتنا خوش قسمت نہیں تھا۔ جب وہ ۴۳ برس کا تھا تو ازابیلا نے اسے قتل کرا دیا تھا۔

جہاں تک ہمیں علم ہے ایڈورڈ اور ایلینور ایک صحتمند جوڑا تھے، اور انہوں نے اپنے بچوں کو کوئی مہلک جینیاتی بیماری بھی منتقل نہیں کی تھی۔ پھر بھی سولہ میں سے دس یعنی باسٹھ فیصد بچپن میں ہی فوت ہو گئے۔ صرف چھ ایسے تھے جو گیارہ برس کی عمر سے زیادہ زندہ رہ سکے، اور صرف تین یعنی اٹھارہ فیصد چالیس کا ہندسہ عبور کر سکے۔ یقیناً ایلینور کے کئی حمل ضائع بھی ہوئے ہوں گے۔ اوسطاً ایلینور اور ایڈورڈ کے ہاں ایک بچہ ہر تیسرے سال مر گیا، ایک کے بعد ایک کر کے کل دس بچے، آج کوئی والدین ایسا سوچ بھی نہیں سکتے۔

گلگمش کا پراجیکٹ، یعنی حیات جاوداں حاصل کرنے میں کتنا عرصہ لگے گا، سو سال؟ پانچ سو سال؟ ہزار سال؟ اگر ہم یہ یاد کریں کہ ۱۹۰۰ میں ہم انسانی جسم کے متعلق کتنا کم جانتے تھے، اور ایک صدی میں کتنا جان گئے ہیں تو بات امید افزا ہے۔ جینیاتی انجینیروں نے حال ہی میں ایک کیچوے (Caenorhabditis elegans) کی عمر دوگنی کر دی ہے۔ کیا وہ ہوموسیپین کے لیے بھی ایسا کر سکتے ہیں؟ نانوٹیکنالوجی کے ماہرین کروڑوں نانو روبوٹ پر مشتمل ایک بایونک دفاعی نظام بنا رہے ہیں۔ یہ ہمارے جسم میں رہے گا، اس کی بند شریانوں کو کھول دے گا، وائرس اور جرثوموں سے لڑ سکے گا، سرطانی خلیوں کا خاتمہ کر دے گا اور بڑھاپے کی تبدیلیوں تک کو واپس لوٹا دے گا۔ کچھ سنجیدہ اسکالروں کا خیال ہے کہ ۲۰۵۰ تک کچھ انسان صرف ان معنوں میں فانی رہ جائیں گے کہ وہ کسی حادثے کے نتیجے میں ہی مر سکیں، لیکن کسی مہلک حادثے کی عدم موجودگی میں ان کی زندگیاں ہمیشہ کے لیے بڑھائی جا سکیں گی۔

گلگمش کا یہ پراجیکٹ مکمل ہوتا ہے یا نہیں، لیکن تاریخی اعتبار سے یہ بات بہت دلچسپ ہے کہ بیشتر بعد از جدید مذاہب اور نظریات نے موت اور حیات بعد از موت کو اپنی مساوات سے خارج کر دیا ہے۔ اٹھارویں صدی تک مذاہب موت اور حیات بعد از موت کو زندگی کا اصل مقصد بتاتے تھے۔ اٹھارویں صدی کی ابتدا سے مذاہب اور نظریات مثلاً آزادخیالی، سماجیات اور تحریک نسواں حیات بعد از موت میں تمام دلچسپی کھو چکے تھے۔ جب کوئی کمیونسٹ مرتا ہے تو اس کے ساتھ کیا ہوتا ہے؟ سرمایہ دار کے ساتھ کیا ہوتا ہے؟ حقوق نسواں کے علم بردار کے ساتھ کیا ہوتا ہے؟ اس کا جواب مارکس، ایڈم اسمتھ یا سیمون ڈی بووایر کے پاس ڈھونڈنا بیکار ہے۔ واحد جدید نظریہ جو موت کو مرکزی حیثیت دیتا ہے، وہ قوم پرستی ہے۔ اپنے دشوار اور رومانوی اوقات میں قوم پرستی وعدہ کرتی ہے کہ قوم کی راہ میں ہلاک ہونے والے ان کی مشترکہ یادداشت میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ لیکن یہ وعدہ اتنا مبہم ہے کہ بیشتر قوم پرست بھی نہیں جانتے کہ اس سے کیا سمجھیں۔

سائنس کے متمول سرپرست

ہم ایک تکنیکی عہد میں زندہ ہیں۔ زیادہ تر افراد کو یقین ہے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کے پاس ہر مسئلہ کا جواب موجود ہے۔ ہمیں چاہیے کہ سائنس دانوں اور ٹیکنیشن کو ان کا کام جاری رکھنے دیں، وہ ہمارے لیے زمین پر ہی جنت بنا دیں گے۔ لیکن سائنس انسانی معاشرت سے علیحدہ کوئی اخلاقی یا روحانی عمل نہیں ہے۔ ہماری ثقافت کے دوسرے تمام حصوں کی مانند اس پر بھی اقتصادیات، سیاست اور مذہبی مفادات اپنا نقش چھوڑتے ہیں۔

سائنس بہت مہنگا کھیل ہے۔ کوئی حیاتیات دان جو انسانی حفاظتی نظام کے متعلق جاننا چاہے اسے لیبارٹری، امتحانی نلکیوں، کیمیکل اور جوہری مائکروسکوپ کی ضرورت ہوگی۔ لیبارٹری کے مددگار، الیکٹریشن، پلمبر اور صفائی کرنے والوں کا تو ذکر ہی کیا۔ کوئی ماہر اقتصادیات جو قرض مارکیٹ کو سمجھانا چاہے اسے کمپیوٹر درکار ہوں گے۔ اسے اعداد و شمار جمع کرنے کے بڑے بینک درکار ہوں گے، اور پیچیدہ اعداد و شمار سمجھنے کے پروگرام۔ کوئی آثار قدیمہ کا ماہر جو قدیم شکاری/متلاشیوں کے رویوں کو سمجھنا چاہے اسے دور دراز کے علاقوں کا سفر کرنا ہوگا، قدیم آثار کی کھدائی کرنی ہوگی اور قدیم ہڈیوں اور آثار کی عمر متعین کرنی ہوگی، ان سب پر رقم خرچ ہوگی۔

گزشتہ پانچ سو سالوں میں جدید سائنس نے حیرت انگیز کمالات دکھائے ہیں، جن میں حکومتوں، کاروبار، فاؤنڈیشن اور ذاتی عطیات دینے والوں نے بخوشی اربوں ڈالر سائنسی تحقیق پر خرچ کیے ہیں۔ گلیلو، گلیلی، کرسٹوفر کولمبس اور چارلس ڈارون کے مقابلے میں ان ڈالروں نے کائنات کے راز فاش کرنے، سیارے کا نقشہ بنانے اور حیوانات کی سلطنت کا کیٹلاگ بنانے میں زیادہ مدد کی ہے۔ یہ مخصوص ذہین افراد اگر پیدا نہیں ہوتے تو ان کے افکار شاید کسی دوسرے پر اترتے۔ لیکن اگر درست مقدار میں رقم مہیا نہ ہوتی تو کوئی ذہانت اس کا نعم البدل نہیں ہو سکتی تھی۔ مثلاً اگر ڈارون پیدا ہی نہ ہوتا تو آج ہم نظریہ ارتقا الفریڈ رسل والیس سے منسوب کر رہے ہوتے، جو فطری چناؤ کے راستے نظریہ ارتقا تک چند سال بعد ڈارون کی معاونت کے بغیر ہی پہنچ گیا تھا۔ لیکن اگر یورپی طاقتوں نے جغرافیائی، حیوانی اور نباتاتی تحقیق پر ساری دنیا میں سرمایہ کاری نہ کی ہوتی تو نہ ہی ڈارون اور نہ ویلس کے پاس مشاہداتی اعداد و شمار ہوتے کہ وہ نظریہ ارتقا تجویز کر سکیں۔ امکان تو یہ ہے کہ شاید وہ کوشش ہی نہیں کرتے۔

کاروباری اور حکومتی صندوقوں سے اربوں کی رقم کیوں جامعات اور لیبارٹریوں میں پہنچنے لگی؟ تدریسی حلقوں میں بہت سے سادہ لوح خالص سائنس پر یقین رکھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ حکومت اور کاروباری حلقے بے غرضی سے انہیں رقم فراہم کرتے ہیں کہ جو ان کے خیال میں آئے، وہ اس پر تحقیق کر سکیں۔ لیکن اس سے سائنس میں سرمایہ کاری کے حقائق بیان نہیں ہوتے۔

سائنسی تحقیق میں زیادہ تر سرمایہ کاری اس امید میں ہوتی ہے کہ کوئی یہ سمجھتا ہے کہ اس سے انہیں سیاسی، اقتصادی یا مذہبی فوائد حاصل ہوں گے۔ مثلاً سولہویں صدی میں بادشاہوں اور بینکروں نے کثیر سرمایہ جغرافیائی مہم جوئی پر لگایا، لیکن بچوں کی نفسیات کی تحقیق پر انہوں نے ایک پائی بھی خرچ نہیں کی۔ کیوں کہ بادشاہ اور بینکر یہ سمجھتے تھے کہ نئی جغرافیائی معلومات سے انہیں نئے علاقوں کو فتح کرنے میں مدد ملے گی اور تجارتی سلطنتیں بن سکیں گی لیکن بچوں کی نفسیات سمجھنے میں انہیں کوئی فائدہ نظر نہیں آیا۔

۱۹۴۰ء میں امریکی اور روسی حکومتوں نے زیر زمین آثار قدیمہ کے بجائے جوہری طبیعات کو سمجھنے میں بہت سرمایہ کاری کی۔ انہیں ادراک تھا کہ جوہری طبیعات کے علم سے انہیں جوہری ہتھیار بنانے میں مدد ملے گی جب کہ زیر آب آثار کی دریافت سے جنگ جیتنے میں مدد کا امکان نہیں۔ خود سائنس دان اکثر اس بات سے واقف نہیں کہ سیاسی، اقتصادی اور مذہبی مفادات رقم کے بہاؤ کے نگراں ہیں۔ بہت سے سائنس دان واقعی خالص ذہنی تجسس کی خاطر کام کرتے ہیں، لیکن شاذ و نادر ہی سائنس دان سائنسی ایجنڈا متعین کرتے ہیں۔

اگر ہم خالص سائنس میں سرمایہ کاری کرنا بھی چاہیں جو سیاست، اقتصادیات اور مذہبی مفادات سے پاک ہو، تب بھی شاید یہ ناممکن ہوگا۔ آخر کار ہمارے وسائل محدود ہیں۔ کسی کانگریس کے رکن سے کہیے کہ نیشنل سائنس فاؤنڈیشن کی بنیادی تحقیق کے لیے ایک ملین ڈالر اضافی مختص کر دے۔ اور وہ منصفانہ طور پر یہی دریافت کرے گا کہ یہی رقم اساتذہ کی بہتر ٹریننگ، یا اس کی تحصیل کی خاطر کسی دیوالیہ فیکٹری کو ضروری مالیہ میں چھوٹ نہ دے دوں؟ محدود وسائل کو مختص کرنے کے لیے ہمیں اس سوال کا سامنا ہوتا ہے کہ 'کیا ضروری ہے؟' اور 'کیا بہتر ہے؟' اور یہ سائنسی سوالات نہیں ہیں۔ سائنس یہ بیان کر سکتی ہے کہ دنیا میں کیا موجود ہے، چیزیں کیسے کام کرتی ہیں اور مستقبل میں کیا ممکن ہوگا۔ لیکن اپنی تعریف کے اعتبار سے اسے اس بات کا کوئی علم نہیں کہ مستقبل میں کیا ہونا چاہیے۔ صرف مذاہب اور نظریات ہی ایسے سوالات کے جوابات تلاش کرتے ہیں۔

اس معمے پر غور کیجیے۔ ایک ہی شعبے کے حیاتیات دان جن کی پیشہ ور مہارت ایک ہی جیسی ہے، دونوں اپنی موجودہ تحقیق کے لیے ایک ملین ڈالر امداد کی درخواست کرتے ہیں۔ پروفیسر سلگ ہارن اس بیماری پر تحقیق کرنا چاہتے ہیں جو گائے کے تھن کو متاثر کرتی ہے، جس سے ان کی دودھ کی پیداوار میں دس فیصد کمی ہوتی ہے۔ پروفیسر اسپراؤٹ یہ تحقیق کرنا چاہتے ہیں کہ کیا گائے اپنے بچھڑے سے جدا کیے جانے پر ذہنی کرب سے گزرتی ہے۔ اگر یہ فرض کر لیں کہ سرمایہ محدود ہے، اور دونوں تحقیقات میں سرمایہ کاری ممکن نہیں تو کس میں سرمایہ کاری ہوگی؟

اس سوال کا کوئی سائنسی جواب نہیں، محض سیاسی، اقتصادی اور مذہبی جوابات ہیں۔ آج کی دنیا میں یہ واضح ہے کہ سلگ ہارن کا سرمایہ حاصل کرنے کا امکان زیادہ ہے۔ اس وجہ سے نہیں کہ تھنوں کی بیماری سائنسی طور پر حیوانی کرب سے زیادہ دلچسپ ہوتی ہے، بلکہ اس لیے کہ ڈیری صنعت جو اس تحقیق سے فائدہ اٹھا سکتی ہے، اس کا سیاسی اور اقتصادی دباؤ حیوانات کے حقوق کی لابی سے زیادہ اہم ہے۔

شاید کسی ہندو معاشرے میں جہاں گائے مقدس ہوتی ہے، یا حیوانات کے حقوق کے بارے میں کسی حساس معاشرے میں پروفیسر اسپراؤٹ کا امکان زیادہ ہو۔ لیکن جب تک وہ ایسے معاشرے میں زندہ ہیں جہاں دودھ کی کاروباری اہمیت زیادہ ہے، اور جو گائے کے جذبات پر اپنے باشندوں کی صحت کو ترجیح دیتا ہے، وہ اپنی تحقیقی تجاویز ان حوالوں کو سامنے رکھ کر لکھے گا۔ مثلاً وہ یہ لکھ سکتا ہے کہ "افسردگی سے دودھ کی پیداوار کم ہو جاتی ہے۔ اگر ہم گائے کی ذہنی دنیا کو سمجھ سکیں، تو ہم ایسی دوائیں ایجاد کر سکتے ہیں جس سے ان کا مزاج بہتر ہو اور اس سے دودھ کی پیداوار دس فیصد بڑھ جائے۔ میرے خیال میں حیوانات کی نفسیاتی ادویات کے لیے ڈھائی سو ملین ڈالر کی سالانہ عالمی مارکیٹ ہے۔"

سائنس اپنی ترجیحات خود مقرر کرنے سے قاصر ہے۔ وہ اپنی دریافتوں کو استعمال کرنے سے بھی قاصر

ہے۔ مثلاً ایک خالص سائنسی نکتہ نظر سے یہ واضح نہیں کہ ہم اپنی بڑھتی ہوئی جینیاتی معلومات کو کیسے استعمال کریں۔ کیا ہم اس علم کو سرطان کے علاج کے لیے استعمال کریں، کیا اس سے جینیاتی انجینیرنگ کے ذریعے سپر مین تخلیق کریں، یا اسی جینیاتی انجینیرنگ کے ذریعے بہت بڑے تھن پیدا کریں۔ یہ واضح ہے کہ ایک ہی سائنسی دریافت کو ایک کمیونسٹ حکومت، ایک آزاد خیال حکومت، ایک نازی حکومت اور ایک سرمایہ دار کاروباری کمپنی بالکل مختلف مقاصد کے لیے استعمال کریں گی۔ ایک استعمال کو دوسرے پر ترجیح دینے کی کوئی سائنسی وجہ نہیں ہے۔

مختصر یہ کہ سائنسی تحقیق کسی مذہب یا نظریے کے ساتھ رفاقت میں ہی پروان چڑھ سکتی ہے۔ یہ نظریہ تحقیق پر سرمایہ کاری کا جواز فراہم کرسکتا ہے۔ لیکن یہی نظریہ سائنسی ایجنڈے پر اثر انداز ہوتا ہے اور یہ طے کرتا ہے کہ ان دریافتوں کو کیسے استعمال کیا جائے۔ لہذا یہ سمجھنے کے لیے کہ کسی متبادل منزل کے بجائے انسان الاموگورڈو یا چاند پر ہی کیوں پہنچا محض طبیعات دان، حیاتیات دان اور ماہرین سماجیات کی کامیابیوں کا جائزہ ہی کافی نہیں ہے۔ ہمیں یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ نظریاتی، سیاسی اور اقتصادی قوتوں نے طبیعات، حیاتیات اور سماجیات پر کیا اثر چھوڑا، اور دوسرے راستوں کو نظرانداز کر کے کسی مخصوص راستے پر گامزن کیا۔

دو قوتیں بالخصوص ہماری توجہ کی مستحق ہیں: سامراجیت اور سرمایہ کاری۔ گزشتہ پانچ سو سال سے تاریخ کا اہم انجن، سائنس، سلطنت اور سرمائے کے درمیان اطلاعاتی رشتہ ہے۔ آئندہ ابواب ان رشتوں کا جائزہ لیں گے۔ پہلے ہم یہ دیکھیں گے کہ سائنس اور سلطنت کے جڑواں انجن کیسے ایک دوسرے سے منسلک ہوئے، پھر یہ دیکھنا ہوگا کہ دونوں کیسے سرمایہ کاری کے نلکوں سے جڑ گئے۔

○

سائنس اور سلطنت کا ازدواج

سورج زمین سے کتنے فاصلے پر ہے؟ یہ وہ سوال ہے جس نے ابتدائی جدید ماہرین فلکیات کو تنگ کیا
ہے۔ بالخصوص کوپرنیکس کی اس دریافت کے بعد کہ زمین نہیں بلکہ سورج کائنات کا مرکز ہے۔۔ بہت سے ماہرین
فلکیات اور ریاضی دانوں نے یہ فاصلہ تخمینہ کرنے کی کوشش کی، مگر ان کے طریقوں نے بہت متنوع نتائج پیدا
کیے۔ اٹھارویں صدی کے وسط میں یہ فاصلہ ناپنے کا ایک قابل بھروسہ طریقہ دریافت ہوا۔ ہر چند سال بعد سیارہ زہرا
زمین اور سورج کے عین درمیان سے گزرتا ہے۔ زمین کے مختلف مقامات سے اس سفر کا وقت ذرا مختلف ہوتا ہے،
جس کی وجہ مشاہدہ کرنے والوں کے زاویہ نظر میں معمولی سا فرق ہے، اگر مختلف براعظموں سے اس سفر کے مختلف
مشاہدات کیے جائیں تو ایک سادہ مساوات سے ہمارا سورج سے فاصلہ معلوم کیا جا سکتا ہے۔

ماہرین فلکیات نے پیشن گوئی کی کہ زُہرہ کا آئندہ سفر ۱۷۶۱ء اور ۱۷۶۹ء میں ہوگا۔ لہذا یورپ سے دنیا
کے چاروں کونوں میں مہمات روانہ کی گئیں، تاکہ جتنے زیادہ مقامات سے ممکن ہو زُہرہ کے گزرنے کی پیمائش کی
جا سکے۔ ۱۷۶۱ء میں سائنس دانوں نے زہرہ کا سفر سائبیریا، شمالی امریکہ، مڈاگاسکر اور جنوبی افریقہ سے دیکھا۔
جب ۱۷۶۹ء میں سفر قریب آیا تو یورپ کے سائنس دانوں نے بہت کوشش کر کے سائنس دانوں کو شمالی کینیڈا اور کیلی
فورنیا (جو اس وقت جنگل تھا) روانہ کیا۔ لندن کی رائل سوسائٹی برائے اضافہ علوم فطرت نے طے کیا کہ یہ کافی نہیں
تھا۔ بہت درست اعداد معلوم کرنے کے لیے ضروری تھا کہ ماہرین فلکیات کو جنوب مغربی بحر الکاہل بھی بھیجا جائے۔

رائل سوسائٹی نے طے کیا کہ ایک معروف فلکیات دان چارلس گرین کو تاہیٹی بھیجنے میں پیسہ، محنت یا کوئی
اور دقیقہ نہ اٹھا رکھا جائے۔ لیکن کیوں کہ ایک انتہائی مہنگی مہم ترتیب پا رہی تھی لہذا اسے محض ایک فلکیاتی مشاہدے تک
ہی محدود کرنا عقلمندی نہیں تھی۔ لہذا گرین کے ساتھ مختلف شعبوں سے آٹھ دیگر سائنسدانوں کو بھیجا گیا جن کی سربراہی
ماہر نباتات جوزف بینکس اور ڈینیل سولینڈر کر رہے تھے۔ اس ٹیم کے ساتھ مصوروں کو بھی روانہ کیا گیا تاکہ وہ اس نئی
زمین، پودوں، جانوروں اور افراد کی تصویر کشی کریں جو وہاں ملیں گے۔ جو جدید ترین سائنسی آلات رائل سوسائٹی
خرید سکتی تھی ان سے مسلح یہ مہم کپتان جوزف کک کی سربراہی میں روانہ ہوئی جو ایک ماہر ملاح اور ایک ماہر ارضیات و
علم اقوام بھی تھا۔

یہ گروہ ۱۷۶۸ء میں انگلستان سے روانہ ہوا، تاہیٹی میں زُہرہ کو ۱۷۶۹ء میں گزرتے دیکھا۔ بہت سے
بحرالکاہل کے جزائر دیکھے، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کا دورہ کر کے ۱۷۷۱ء میں واپس انگلستان لوٹ گیا۔ یہ اپنے

ساتھ بڑی تعداد میں فلکیاتی، جغرافیائی، ارضیاتی، نباتاتی، حیوانی اور نشریاتی اعداد لائے۔ ان مشاہدات سے بہت سے شعبوں میں قابل قدر اضافہ ہوا۔ جنوبی بحرالکاہل کی حیرت انگیز داستانوں نے یورپ والوں کے تجسس کو ہوا دی، اور مستقبل کے ماہرین فطرت وفلکیات کی کئی نسلوں کو متاثر کیا۔

کک کی مہم سے جن شعبوں کو فائدہ پہنچا ان میں سے ایک طب تھا۔ اس زمانے میں جو جہاز دور دراز کے ساحلوں کے سفر پر نکلتے وہ جانتے تھے کہ ان کا آدھا عملہ اس سفر میں جاں بحق ہو جائے گا۔ ان کے دشمن غصہ ور مقامی تھے نہ دشمن جہاز اور نہ ہی گھر سے دوری۔ یہ اسکروی نام کی ایک پراسرار بیماری تھی۔ جو افراد اس بیماری کا شکار ہوتے ان میں مایوسی اور تھکاوٹ بڑھتی جاتی، ان کے مسوڑوں اور دوسرے ریشوں سے خون نکلنے لگتا۔ بیماری بڑھنے کے ساتھ ان کے دانت گر جاتے، کھلے زخم نمودار ہو جاتے، وہ بخار و یرقان میں مبتلا ہوتے اور ہاتھ پاؤں کی حرکت ان کے قابو میں نہیں رہ جاتی۔ سولہویں سے اٹھارویں صدی کے دوران اسکروی سے کوئی بیس لاکھ ملاح ہلاک ہوئے۔ کسی کو اس کی وجہ معلوم نہیں تھی اور کوئی علاج کارگر نہ ہوتا۔ ۱۷۴۷ء میں یہ سب اس وقت بدل گیا جب ایک برطانوی طبیب جیمز لنڈ نے اس بیماری میں مبتلا ملاحوں پر ایک محدود تجربہ کیا۔ اس نے انہیں مختلف گروہوں میں تقسیم کر دیا اور ہر گروہ کو مختلف دوا دی۔ ایک امتحانی گروہ کو ترش پھل کھانے کی ہدایت کی گئی، جو اسکروی کا ایک عوامی علاج تھا۔ اس گروہ کے افراد فوراً ٹھیک ہو گئے۔ لنڈ کو یہ نہیں معلوم تھا کہ اس پھل میں وہ کون سا جز تھا جو ملاحوں کے جسم میں نایاب تھا، لیکن اب ہم جانتے ہیں کہ یہ وٹامن سی تھا۔ اس زمانے میں جہاز کی عام غذا اس اہم جز میں نامکمل تھی۔ لمبی مسافتوں پر ملاح عموماً بغیر کسی سبزی یا پھل کے محض بسکٹ اور گائے کے سوکھے گوشت پر گزارا کرتے۔

شاہی بحریہ لنڈ کے تجربات سے مطمئن نہیں تھی، لیکن جیمز کک قائل ہو گیا تھا۔ اس نے ڈاکٹر کو درست ثابت کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے اپنی کشتی میں ایک بڑی تعداد میں بند گوبھی کا اچار رکھا، اور جب بھی مہم خشکی پر پہنچتی تو وہ اپنے ملاحوں کو بڑی تعداد میں سبزی اور پھل کھانے کی ہدایت کرتا۔ کک کا کوئی ملاح اسکروی سے ہلاک نہیں ہوا۔ آنے والی دہائیوں میں دنیا بھر کی بحریہ کک کی بحری غذا استعمال کرنے لگی، یوں ان گنت ملاحوں اور مسافروں کی جان بچ گئی۔

کک کی مہم کا ایک کم بے ضرر نتیجہ بھی تھا۔ کک ایک تجربہ کار ملاح اور ماہر ارضیات ہی نہیں بلکہ بحریہ کا ایک اعلیٰ افسر بھی تھا۔ رائل سوسائٹی نے اس مہم کا بیشتر خرچ اٹھایا لیکن یہ جہاز خود رائل بحریہ نے فراہم کیا تھا۔ بحریہ نے اس جہاز پر پچاسی مسلح ملاح اور فوجی بھی سوار کیے تھے، اور جہاز کو توپوں، بندوقوں، گن پاؤڈر اور دوسرے ہتھیاروں سے مسلح کیا تھا۔ اس مہم سے حاصل ہوئی بیشتر معلومات بالخصوص فلکیاتی، جغرافیائی، ارضیاتی اور بشریاتی، واضح سیاسی اور فوجی استعمال کی تھی۔ اسکروی کے موثر علاج کی دریافت نے دنیا بھر کے سمندروں پر برطانوی بحریہ کی حکمرانی کی راہ ہموار کر دی، اور دنیا کے دوسرے کونوں میں فوج بھیجنے کی اہلیت میں اضافہ کیا۔ کک نے برطانیہ کے لیے کئی جزائر اور خطے فتح کیے، جو اس نے دریافت کیے تھے۔ جن میں سب سے معروف آسٹریلیا ہے۔ کک کی مہم نے جنوب مغربی بحرالکاہل پر برطانوی قبضے کا آغاز کیا۔ آسٹریلیا کی فتح، تسمانیہ اور نیوزی لینڈ کی فتح اور ان خطوں میں لاکھوں یورپین کی آبادکاری، ان کی مقامی ثقافت کا خاتمہ اور ان کی بیشتر مقامی آبادی بھی اس نتیجے میں اختتام کو پہنچی۔

کک کی مہم کی بعد کی صدی میں آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے بہترین قابل کاشت علاقے یورپی آبادکاروں نے ان کے مقامی قدیم مالکوں سے چھین لیے۔ مقامی آبادی میں تقریباً نناوے فیصد کمی ہوگئی، اور بچ جانے والوں کو سخت ترین نسلی جبر کا سامنا کرنا پڑا۔ آسٹریلیا کے ایبوریجنیز (Aborigines) اور نیوزی لینڈ کے ماؤری (Maoris) کے لیے کک کی مہم ایک ایسی تباہی تھی جس سے وہ کبھی نہ سنبھل سکے۔

ٹروگانینی، تسمانیہ کا آخری مقامی باشندہ

تسمانیہ کے باشندوں کو اس سے زیادہ بدقسمتی کا سامنا کرنا پڑا۔ تقریباً دس ہزار سال کی تنہائی میں زندہ رہنے کے بعد وہ کک کی مہم کی ایک صدی میں ہی مٹ گئے۔ یورپی آبادکاروں نے پہلے انہیں جزیرے کے زیادہ زرخیز علاقوں سے باہر نکالا، پھر جنگلات میں انہیں ڈھونڈ کر سلسلہ وار قتل کیا۔ آخری بچے کچھے افراد کو ایک عیسائی ایوانجیلیکل (Evangelical) کیمپ میں بھر دیا گیا، جہاں بظاہر نیک مقصد لیکن متعصب مبلغوں نے انہیں جدید دنیا سے روشناس کرانے کی کوشش کی۔ تسمانیہ کے مقامی باشندوں کو لکھنا پڑھنا، عیسائیت، مختلف پیداواری کام مثلاً سلائی اور کھیتی باڑی سکھائی گئی۔ لیکن انہوں نے سیکھنے سے انکار کر دیا۔ وہ بڑھتی ہوئی یاسیت کا شکار ہوئے، انہوں نے اولاد پیدا کرنی بند کر دی، زندگی سے ان کی دلچسپی ختم ہوگئی، اور بالآخر انہوں نے جدید سائنس اور جدید ترقی یافتہ دنیا سے فرار کا واحد راستہ اختیار کیا۔۔ موت۔

افسوس یہ کہ سائنس اور ترقی نے موت کے بعد بھی ان کا تعاقب جاری رکھا۔ مردہ تسمانیہ والوں کی لاشوں پر سائنس کی آڑ میں ماہرین بشریات اور عجائب گھروں کے مہتمموں نے قبضہ کر لیا۔ ان کا وزن ہوا، انہیں چیرا پھاڑا گیا، پیمائش ہوئی اور یہ تجزیے اعلیٰ مقالوں میں شائع ہوئے۔ ان کی کھوپڑیاں اور ڈھانچے پھر میوزیم اور بشریاتی

عجائب گھروں میں زینتِ نمائش بنے۔ ابھی صرف ۱۹۷۶ء ہی میں تسمانیہ کے عجائب گھر نے ٹروگانینی کا ڈھانچہ تدفین کے لیے واپس کیا، جسے اکثر تسمانیہ کا آخری اصیل خون سمجھا جاتا تھا، اور جو سو برس پہلے مرا تھا*۔ برطانیہ کا رائل کالج آف سرجن اس کی جلد اور بالوں کے نمونوں پر ۲۰۰۲ء تک قابض رہا۔

کیا کک کا جہاز ایک سائنسی مہم تھا جسے فوج کی حفاظت مہیا تھی، یا یہ ایک عسکری مہم تھی جس میں چند سائنسدان ساتھ ہو لیے تھے۔ یہ سوال ایسا ہی ہے کہ جیسے آپ کا پٹرول ٹینک آدھا خالی ہے یا آدھا بھرا ہوا۔ یہ دونوں ہی ہے۔ سائنسی انقلاب اور جدید سامراجی توسیع پسندی ایک دوسرے سے پیوست تھے۔ کپتان جیمز کک اور ماہر نباتات جوزف بینکس جیسے افراد سائنس اور سلطنت میں تفریق کر سکے تھے، اور نہ ہی بدقسمت ٹروگانینی۔

یورپ ہی کیوں؟

یہ حقیقت کہ شمالی بحر اوقیانوس کے ایک بڑے جزیرے کے افراد جنوبی آسٹریلیا کے ایک بڑے جزیرے کی آبادی پر حاکم ہو گئے تاریخ کے اچنبھوں میں سے ایک ہے۔ کک کی مہم تک برطانوی جزائر اور مغربی یورپ عموماً بحیرہ روم کا ذرا دور دراز پچھواڑہ سمجھے جاتے تھے۔ وہاں کوئی اہم بات نہیں ہوتی تھی۔ رومن سلطنت جو کہ واحد پس از جدید یورپی سلطنت تھی اپنا سارا تمول شمالی افریقہ، بالکن اور مشرقِ وسطیٰ کے صوبوں سے جمع کرتی تھی۔ روم کے مغربی یورپی صوبے تو مفلس غیر تہذیب یافتہ مغرب تھے، جہاں سے غلاموں اور معدنیات کے علاوہ کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ شمالی یورپ اتنا اجاڑ اور وحشی تھا کہ اسے فتح کرنا بھی مفید نہیں تھا۔

پندرھویں صدی کے اختتام تک یورپ اہم عسکری، سیاسی، اقتصادی اور ثقافتی ترقی کا مرکز بن گیا۔ ۱۵۰۰ء سے ۱۷۵۰ء تک دوران مغربی یورپ زیادہ محرک ہو گیا، اور 'بیرونی دنیا' کا حاکم بن گیا، یعنی دو امریکی برِ اعظم اور سمندری دنیا۔ لیکن پھر بھی یورپ عظیم ایشیائی طاقتوں کے مقابلے میں کچھ نہیں تھا۔ یورپ امریکہ فتح کرنے اور سمندری حکمرانی کے لیے اس لیے قابل ہو گیا کہ ایشیائی طاقتوں کو ان میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ابتدائی جدید دور بحیرہ روم میں سلطنتِ عثمانیہ کا سنہرا دور تھا۔ فارس میں صفاویہ سلطنت، ہندوستان میں مغلیہ سلطنت اور چین کی منگ اور قن سلطنتیں۔ انہوں نے اپنے مفتوح علاقے بہت بڑھا لیے اور غیر معمولی آبادکاری اور اقتصادی ترقی کی۔ ۱۷۷۵ء میں دنیا کی اسی فیصد اقتصادیات ایشیا پر منحصر تھی۔ صرف ہندوستان اور چین کی مشترکہ اقتصادی دنیا کی دو تہائی پیداوار پر محیط تھی، اس کے مقابلے میں یورپ تو ایک اقتصادی پستہ قد تھا۔

۱۷۵۰ء سے ۱۸۵۰ء کے درمیان طاقت کا عالمی مرکز یورپ منتقل ہو گیا۔ جب یورپ نے ایشیائی طاقتوں کو مرحلہ وار کئی جنگوں میں شکست دے کر ایشیا کے ایک بڑے حصے پر قبضہ کر لیا۔ ۱۹۰۰ء تک یورپ دنیا کی اقتصاد اور اس کے بیشتر رقبے پر حاکم تھا۔ ۱۹۵۰ء تک مغربی یورپ اور امریکہ مشترکہ طور پر عالمی پیداوار کا پچاس فیصد مہیا کر رہے تھے، جب کہ چین کا حصہ کم ہو کر پانچ فیصد رہ گیا تھا۔ یورپی دورِ اقتدار میں ایک نیا عالمی قاعدہ اور عالمی ثقافت مرتب ہوئی۔ آج لباس، فکر اور مذاق میں تمام انسان جتنا تسلیم کرتے ہیں اس سے زیادہ یورپی ہیں۔ وہ اپنی خطابت میں چاہے یورپ کے کتنے ہی مخالف ہوں لیکن فی زمانہ تقریباً سب ہی کرۂ زمین پر سیاست، طب، جنگ

* آج تسمانیہ اور دوسری جگہوں پر ہزاروں افراد تسمانیہ کے قدیم لوگوں کے وارث ہیں، بالخصوص پلاوا اور لیہ پوناہ کی آبادیوں میں

اور اقتصادیات کو یورپی آنکھ سے دیکھتے ہیں، یورپی زبان میں لکھی موسیقی سنتے ہیں۔ آج کی بڑھتی ہوئی چینی اقتصادیات جو جلد ہی اپنی عالمی برتری دوبارہ حاصل کر سکتی ہے، وہ بھی پیداواری اقتصادیات کے یورپی طرز پر تعمیر ہے۔

یوریشیا کی اس منجمد استخوانی انگشت کے باشندوں نے کیسے دنیا کے ایک دور دراز کونے سے ساری دنیا کو فتح کر لیا؟ اکثر اس کا سہرا یورپی سائنس دانوں کے سر پر باندھتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں ۱۸۵۰ء کے بعد سے یورپی تسلط کی ایک بڑی وجہ عسکری۔صنعتی۔سائنسی اشتراک اور تکنیکی ذہانت ہے۔ تمام جدید کامیاب سلطنتوں نے سائنس کی اس امید پر سرپرستی کی کہ وہ تکنیکی ایجادات کی فصل کاٹ سکیں گی، اور بہت سے سائنس دان اپنا بیشتر وقت اپنے سامراجی آقاؤں کے لیے ہتھیار، ادویات اور مشینیں بنانے میں مصروف رہے۔ افریقی دشمنوں سے برسرپیکار یورپی فوجوں میں ایک کہاوت عام تھی کہ "چاہے کچھ بھی ہو جائے ہمارے پاس مشین گنیں ہیں اور ان کے پاس نہیں"۔ غیر فوجی ٹیکنالوجی بھی کم اہم نہیں تھی۔ ڈبوں میں بند خوراک سے فوجیوں کی شکم پری ہوئی۔ ریل اور بھاپ کے جہازوں سے فوجی اور ان کے ساز و سامان منتقل ہو سکے، جب کہ ادویات کی ایک نئی کھیپ سے فوجی، ملاح اور انجینئر صحت یاب ہو سکے۔ نقل و حمل کی اس برتری نے افریقہ پر یورپی فتح میں مشین گن سے زیادہ اہم کردار ادا کیا۔

لیکن ۱۸۵۰ء سے پہلے ایسا نہیں تھا۔ عسکری۔صنعتی۔سائنسی اشتراک ابھی شروع ہوا تھا، سائنسی انقلاب کے تکنیکی پھل ابھی کچے تھے، اور یورپ ایشیا اور افریقی طاقتوں میں زیادہ تکنیکی فرق نہیں تھا۔ ۱۷۷۰ء میں جیمز کک کے پاس یقیناً آسٹریلیا کے مقامیوں سے بہتر ٹیکنالوجی تھی، لیکن یہی برتری چینیوں اور عثمانیوں کو بھی حاصل تھی۔ پھر کیا وجہ تھی کہ آسٹریلیا کی مہم جوئی اور آبادکاری کپتان کک نے کی، کپتان وان ژیانگ سی یا کپتان حسین پاشا نے نہیں؟ زیادہ اہم یہ کہ اگر ۱۷۷۰ء میں یورپ کو مسلمانوں، ہندوستانیوں اور چینیوں پر کوئی خاص تکنیکی برتری حاصل نہیں تھی تو آنے والی صدی میں وہ اپنے اور بقیہ دنیا کے درمیان اتنی خلیج حائل کرنے میں کیسے کامیاب ہو گئے؟

عسکری۔صنعتی۔سائنسی اشتراک یورپ میں بڑھا، انڈیا میں کیوں نہیں؟ جب برطانیہ جست لگا کر آگے بڑھا تو فرانس، جرمنی اور امریکہ نے کیوں فوراً تقلید کی جب کہ چین پیچھے رہ گیا؟ جب صنعتی اور غیر صنعتی ممالک کے درمیان فرق ایک واضح اقتصادی اور سیاسی حقیقت بن گیا تھا تو کیوں کر روس، اٹلی اور امریکہ نے اسے عبور کر لیا، جب کہ مصر، فارس اور سلطنت عثمانیہ ناکام رہے۔ آخر پہلی صنعتی لہر کی ٹیکنالوجی تو بہت سادہ تھی۔ کیا چینیوں اور عثمانیوں کے لیے بھاپ کے جہاز، مشین گن اور ریل کی پٹری بچھانا اتنا دشوار تھا؟

دنیا کا پہلا تجارتی ریل نظام ۱۸۳۰ء میں برطانیہ میں شروع ہوا۔ ۱۸۵۰ء تک مغربی ممالک کے ۲۵۰۰۰ میل لمبائی میں ریل کی پٹری بچھ چکی تھی۔ لیکن پورے ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ میں صرف ۲۵۰۰ میل کی پٹریاں بچھائی گئی تھیں۔ ۱۸۸۰ء میں مغرب میں ۲۲۰،۰۰۰ میل ریل کی پٹری بچھ چکی تھی، جب کہ باقی دنیا میں ۲۲۰۰۰ میل لمبی ریل کی لائنیں تھیں (اور ان میں سے بیشتر برطانیہ ہی نے انڈیا میں بچھائی تھیں)۔ چین میں ریل کی پہلی پٹری ۱۸۷۶ء میں بچھائی گئی، جو یورپین نے بچھائی تھی اور پندرہ میل لمبی تھی۔ چینی حکومت نے ایک سال بعد ہی اسے اکھاڑ دیا تھا۔ ۱۸۸۰ء میں چینی سلطنت میں کوئی ریل کی پٹری نہیں تھی۔ فارس کی پہلی ریلوے پٹری ۱۸۸۸ء میں بچھائی گئی۔ یہ تہران کو چھ میل دور دارالخلافہ کے جنوب میں ایک مسلم زیارت گاہ سے ملاتی تھی۔ اس کی تعمیر اور چلانے کی ذمہ داری بھی ایک بلجیم کمپنی کے سپرد تھی۔ ۱۹۵۰ء میں پوری ایران کی کل ریلوے لائنیں صرف ۱۵۰۰ میل پر محیط تھیں،

ایک ایسے ملک میں جو برطانیہ سے رقبے میں سات گنا بڑا تھا۔

چین اور فارس کے پاس تکنیکی مہارت کی کمی نہیں تھی، مثلاً بھاپ کا انجن (جسے باآسانی نقل کیا یا خریدا جاسکتا تھا)۔ ان میں روایات، اقدار نظام انصاف اور سیاسی وسماجی قاعدے کی کمی تھی جنہیں یورپ میں بننے اور پروان چڑھنے میں صدیاں لگیں تھیں۔ انہیں نہ نقل کیا جاسکتا تھا اور نہ ہی تیزی سے اپنایا جاسکتا تھا۔ فرانس اور امریکہ، برطانیہ کے نقش وقدم پر جلد ہی چل پڑے کیوں کہ ان کی اہم روایات اور سماجی نظام برطانیہ سے مماثل تھے۔ چین اور فارس اتنی جلدی اس خلیج کو نہیں پاٹ سکے کیوں کہ انہوں نے اپنے معاشروں کو الگ انداز میں سمجھا اور مرتب کیا تھا۔

ان دلائل سے ۱۵۰۰ سے ۱۸۵۰ کے درمیانی دور پر نئی روشنی پڑتی ہے۔ اس دورانیے میں یورپ کو ایشیائی طاقتوں پر کوئی تکنیکی، سیاسی، عسکری یا اقتصادی برتری حاصل نہیں تھی، لیکن اس براعظم نے ایک منفرد صلاحیت پیدا کرلی جس کی اہمیت اچانک ۱۸۵۰ کے قریب ظاہر ہوئی۔ ۱۷۵۰ میں یورپ، چین اور مسلمان دنیاؤں میں بظاہر برابری محض ایک سراب تھا۔ دو معمار تصور کیجیے، دونوں بہت اونچے مینار تعمیر کر رہے تھے۔ ایک معمار لکڑی اور مٹی کی اینٹیں استعمال کرتا ہے جب کہ دوسرا اسٹیل اور کنکریٹ۔ ابتدا میں تو یہ لگتا ہے کہ دونوں کے طریقوں میں زیادہ فرق نہیں ہے، کیوں کہ دونوں ایک ہی رفتار سے بن رہے تھے اور ایک جیسی اونچائی تک پہنچے تھے۔ لیکن ایک بار ایک مخصوص بلندی تک پہنچنے کے بعد، لکڑی اور مٹی کا مینار مزید بوجھ برداشت نہ کرسکا اور منہدم ہوگیا۔ جب کہ اسٹیل اور کنکریٹ کا مینار تاحد نظر، منزل بہ منزل بلند ہوتا رہا۔

یورپ نے جدید دور کے اوائل میں ایسی کون سی صلاحیت پیدا کرلی تھی جس سے اسے جدید دور کے اواخر میں دنیا پر حاکمیت کا موقع ملا؟ اس سوال کے دو باہم انحصاری جوابات ہیں: جدید سائنس اور سرمایہ دارانہ نظام۔ یورپین کسی خاص تکنیکی برتری سے بہت پہلے سے ہی سائنسی اور سرمایہ دارانہ اندازِ فکر کے عادی تھے۔ جب ٹیکنالوجی کا بازار گرم ہوا تو کسی دوسرے کے مقابلے میں یورپ اس سے فائدہ اٹھانے کی بہترین حالت میں تھا۔ لہٰذا یہ کوئی اتفاق نہیں ہے کہ برطانوی سامراج نے اکیسویں صدی کی یورپی دنیا کو سب سے اہم ورثہ سائنس اور سرمایہ داری کا دیا۔ یورپ اور یورپ والے اب دنیا پر حاکم نہیں رہے لیکن سائنس اور سرمایہ ہمیشہ سے زیادہ طاقتور ہوگئے ہیں۔ سرمایہ داری کی فتح کا آئندہ باب میں تجزیہ ہوگا۔ یہ باب یورپی سامرج اور جدید نظام کے معاشقے کی کہانی ہے۔

فتح کی ذہنیت

جدید سائنس یورپی سلطنتوں میں ان ہی کی سرپرستی میں پروان چڑھی۔ ظاہر ہے کہ یہ علم قدیم سائنسی روایات کا بہت مقروض ہے مثلاً یونان، چین، انڈیا اور اسلامی روایات، لیکن اس کا خاص کردار جدید دور کے اوائل میں تراشا گیا۔ اسپین، پرتگال، برطانیہ، فرانس، روس اور ولندیز سامراجی توسیع کے شانہ بہ شانہ سائنسی انقلاب میں امریکہ اور آسٹریلیائی پولی نیشین بھی اہم اضافہ کرتے رہے۔ مسلم ماہرین اقتصادیات کے افکار کا ایڈم اسمتھ اور کارل مارکس نے مطالعہ کیا۔ مقامی امریکی طبیبوں نے معالجوں کی برطانوی طبی کتب تک رسائی حاصل کی اور آسٹریلیائی پولی نیشین سے حاصل اعداد نے مغربی بشریات میں انقلاب پیدا کردیا۔ لیکن بیسویں صدی کے وسط تک

جن افراد نے یہ متنوع سائنسی ایجادات اکٹھی کیں، اور اس عمل میں سائنسی طریقے وضع کیے وہ عالمی یورپی سلطنتوں کے حکمران اور فکری سربرآوردہ تھے۔ مشرق بعید اور اسلامی دنیا میں بھی یورپ جتنے ہی ذہین اور متجسس دماغ پیدا ہورہے تھے۔ لیکن ۱۵۰۰ سے ۱۹۵۰ کے دوران انہوں نے کوئی ایسی چیز پیدا نہیں کی جو نیوٹن کی طبیعات یا ڈارون کی حیاتیات کے قریب بھی آسکیں۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ یورپین میں سائنس کی کوئی خاص جین موجود ہے، یا وہ طبعیات اور حیاتیات کے میدانوں میں ہمیشہ آگے رہیں گے۔ لیکن جیسے اسلام عربوں کی اجارہ داری سے شروع ہوا، لیکن بعد میں ترکوں اور ایرانیوں کے زیر حکومت آگیا اسی طرح جدید سائنس بھی ایک یورپین خصوصیت کے طور پر شروع ہوئی، لیکن آج یہ کثیر النسلی واقعہ ہے۔

یورپی سامراج اور جدید سائنس کے درمیان کس چیز نے تاریخی تعلق پیدا کیا؟ ٹیکنالوجی انیسویں اور بیسویں صدی میں بھی اہم تھی، لیکن ابتدا میں اس کی اہمیت محدود تھی۔ اہم نکتہ یہ تھا کہ ایک پودوں کے متلاشی ماہر نباتات اور نوآبادیات کا متلاشی بحریہ کا افسر دونوں کی ذہنیت ایک تھی۔ لیکن سائنس دان اور فاتح۔ دونوں نے آغاز اپنی کم علمی کے اعتراف سے کیا۔ ان دونوں کا کہنا تھا کہ "ہم نہیں جانتے دوسری طرف کیا ہے؟" دونوں اپنے آپ کو نئی دریافتوں کے لیے مجبور پاتے تھے، اور ان دونوں کو امید تھی کہ اس سے حاصل ہونے والا علم انہیں دنیا کا حاکم بنا دے گا۔

یورپی سامراج تاریخ کے کسی بھی دوسرے سامراجی نظام سے مختلف تھا۔ گزشتہ سلطنتوں کے داعی یہ سمجھتے تھے کہ وہ دنیا سے واقف ہیں۔ ان فتوحات سے وہ دنیا کے بارے میں خود اپنا نکتہ نظر اور پھیلانا چاہتے تھے۔ مثلا عربوں نے مصر، اسپین یا انڈیا اس لیے فتح نہیں کیا تھا کہ انہیں کسی ایسی چیز کی کھوج تھی جسے وہ پہلے سے نہیں جانتے تھے۔ رومن، منگول اور ازٹیک طاقت اور تمول کی تلاش میں نئے علاقوں کو بے تحاشہ فتح کرتے گئے، علم کی تلاش میں نہیں۔ اس کے مقابلے میں یورپی سامراج دوردراز ساحلوں کی جانب نئے خطوں اور نئی معلومات کی تلاش میں نکلے تھے۔

اس طرح سوچنے والا جیمز کک پہلا مہم جو نہیں تھا۔ پندرھویں اور سولھویں صدی کے پرتگالی اور اسپینی مسافر پہلے ہی ایسا کرچکے تھے۔ جہازراں پرنس ہنری اور واسکوڈی گاما نے افریقہ کے ساحلوں کو چھانا اور ایسا کرنے میں جزیروں اور گودیوں پر قابض ہوئے۔ کرسٹوفر کولمبس نے امریکہ دریافت کیا اور فورا اس نئے خطہ پر اسپین کے بادشاہ کا علم لہرادیا۔ فرڈینینڈ میگیلین نے دنیا کے گرد ایک نیا راستہ تلاش کیا اور ساتھ ہی فلپائن پر اسپین کی فتح کی بنیاد ڈال دی۔

وقت گزرنے کے ساتھ خطے پر قبضے اور نئے علم کے حصول کا رشتہ مضبوط ہوتا گیا۔ اٹھارویں اور انیسویں صدی کی ہر اہم عسکری مہم جو یورپ کے ساحلوں سے دوردراز کے علاقوں کے لیے روانہ ہوئی، ان کے ساتھ سائنس دان بھی تھے جن کا کام جنگ نہیں بلکہ سائنسی دریافت تھا۔ جب نپولین نے ۱۷۹۸ میں مصر پر حملہ کیا تو وہ اپنے ساتھ ۱۶۵ اسکالر لے گیا۔ دوسری چیزوں کے ساتھ انہوں نے "علوم مصری" کا ایک نیا شعبہ قائم کیا، اور مذاہب، لسانیات اور نباتات کے علوم میں اہم اضافے کیے۔

۱۸۳۱ میں برطانوی بحریہ نے بیگل نامی جہاز جنوبی امریکہ کے فالک لینڈ اور گالاپاگوس جزائر کی نقشہ سازی کے لیے روانہ کیا۔ جنوبی امریکہ پر برطانوی سلطنت کی گرفت مضبوط کرنے کے لیے بحریہ اس معلومات کی خواہاں تھی۔ اس جہاز کا کپتان جو ایک شوقیہ سائنس دان بھی تھا، اس نے راستے میں ملنے والے خ' دں کے لیے ایک ماہر ارضیات کو بھی شامل کر لیا۔ جب کئی پیشہ ور ماہرین ارضیات نے یہ دعوت مسترد کر دی تو کپتان نے یہ نوکری کیمبرج کے ایک گریجوٹ، بائیس سالہ چارلس ڈارون کو دے دی۔ ڈارون نے ایک اینگلیکن پادری بننے کی تربیت حاصل کی تھی، لیکن اس کی اصل دلچسپی ارضیات اور قدرتی سائنس میں تھی، بائبل میں نہیں۔ اس نے یہ دعوت فوراً قبول کر لی اور باقی داستان تو اب تاریخ کا ایک حصہ ہے۔ کپتان نے اس سفر میں اپنا وقت عسکری نقشوں کی تیاری میں صرف کیا، جب کہ ڈارون نے عمومی اعداد و شمار جمع کیے، اور اپنی بصیرت سے وہ نظریہ پیش کیا جسے نظریہ ارتقا کہا گیا۔

۲۰ جولائی ۱۹۶۹ کو نیل آرمسٹرانگ اور بز آلڈرن چاند کی سطح پر اتر گئے۔ اس مہم کی مشق کے لیے اپولو گیارہ کے خلانوردوں نے مغربی امریکہ میں چاند سے مماثل صحرا میں تربیت حاصل کی۔ یہ علاقہ بہت سے مقامی ریڈ انڈین آبادیوں کی آماج گاہ ہے۔ ایک روایت خلانوردوں اور ایک مقامی کے درمیان گفتگو کو یوں بیان کرتی ہے:

ایک دن، مشق کے دوران خلانوردوں کو ایک بوڑھا مقامی امریکی ملا۔ اس بوڑھے نے دریافت کیا کہ "وہاں کیا کر رہے ہیں"۔ انہوں نے جواب دیا کہ "وہ ایک تحقیقاتی مہم کا حصہ ہیں جو جلد ہی چاند کو کھوجنے جانے والے ہیں"۔ جب اس بوڑھے نے یہ سنا تو چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گیا۔ پھر خلانوردوں سے پوچھا کہ "کیا وہ اس کا ایک کام کر دیں گے؟"

"کیا کام" انہوں نے دریافت کیا۔

"بھئی" بوڑھے نے جواب دیا، "میرے قبیلے کے افراد کا ایمان ہے کہ چاند پر مقدس ارواح مقیم ہیں۔ مجھے امید ہے کہ آپ میرے لوگوں کا ایک پیغام وہاں پہنچا دیں گے؟"

"کیا پیغام ہے"، خلانوردوں نے پوچھا

اس شخص نے اپنی مادری زبان میں کچھ کہا، اور پھر خلانوردوں کو اسے بار بار دہرانے کو کہا، یہاں تک کہ انہوں نے اسے درست طور پر یاد کر لیا۔

"اس کا مطلب کیا ہے؟" خلانوردوں نے دریافت کیا۔

"اوہ، یہ میں آپ کو نہیں بتا سکتا۔ یہ ایک ایسا راز ہے جسے جاننے کی صرف ہمارے قبیلے یا ماہتابی ارواح کو اجازت ہے"۔

جب وہ اپنے اڈے پر واپس پہنچے تو خلانوردوں نے بہت تلاش کے بعد ایک ایسا شخص تلاش کیا جو اس پیغام کا ترجمہ کر سکے۔ جب انہوں نے وہ دہرایا جو انہوں نے یاد کیا تھا تو مترجم قہقہے مار کر ہنسنے لگا۔ جب اس نے اپنے آپ پر قابو پایا تو خلانوردوں نے اس سے اس کا مطلب دریافت کیا۔ اس آدمی نے بتایا کہ "جو پیغام انہوں نے اس قدر احتیاط سے یاد کیا تھا اس کا کیا مطلب ہے۔ یہ لوگ جو بھی کہیں ان کے ایک لفظ پر بھی بھروسہ مت کرنا۔ یہ تمہاری سرزمین پر قبضہ کرنے آئے ہیں"۔

خالی نقشے

جدید 'دریافت وفتح' کی ذہنیت کا بہترین عکس دنیا کے نقشے کی بالیدگی میں دیکھا جاسکتا ہے۔ دورِ جدید سے پہلے دنیا کی بہت سی ثقافتوں نے دنیا کے نقشے بنائے۔ ظاہر ہے کہ ان میں سے کوئی بھی ساری دنیا سے واقف نہیں تھا۔ کوئی بھی افروایشیائی ثقافت امریکہ سے اور کوئی امریکی ثقافت افروایشیا سے واقف نہیں تھی۔ غیر مانوس علاقوں کو یا تو چھوڑ دیا گیا تھا یا ان پر خیالی عفریت اور تحیر نقش کر دیے گئے تھے۔ ان نقشوں میں خالی جگہ کوئی نہیں تھی۔ ان سے ساری دنیا سے مانوسیت کا احساس ہوتا تھا۔

پندرھویں اور سولھویں صدیوں میں یورپ نے بہت سی خالی جگہوں والے نقشے بنانے شروع کر دیے۔ یہ سائنسی ذہنیت کے رجحان اور یورپی سامراجیت کا ایک اشارہ تھا۔۔ یہ خالی نقشے ایک نفسیاتی اور نظریاتی انکشاف تھے، اس بات کا اعتراف کہ یورپ دنیا کے بڑے حصوں سے ناواقف ہے۔

۱۴۹۲ میں اہم موڑ اس وقت آیا جب کرسٹوفر کولمبس اسپین سے نکل کر مغرب کی جانب مشرقی ایشیا کی تلاش میں نکلا۔ کولمبس اس وقت دنیا کے پرانے بھرے ہوئے نقشوں پر یقین رکھتا تھا۔ ان کے استعمال سے کولمبس نے حساب لگایا کہ جاپان اسپین سے کوئی ۴۳۷۵ میل کے فاصلے پر مغرب میں واقع ہوگا۔ درحقیقت ۱۲۵۰۰ میل در ایک پورا نامعلوم براعظم اسپین اور مشرقی ایشیا کے درمیان واقع تھا۔ ۱۲ اکتوبر ۱۴۹۲ کو صبح تقریباً دو بجے کولمبس کی مہم اس نامعلوم براعظم سے جا ٹکرائی۔ وان راڈریگز، جو پنٹا نامی جہاز کے مستول سے چوکیداری کر رہا تھا، اسے ایک جزیرہ نظر آیا، جسے آج ہم بہاماس کہتے ہیں، وہ چلایا "زمین، زمین!"
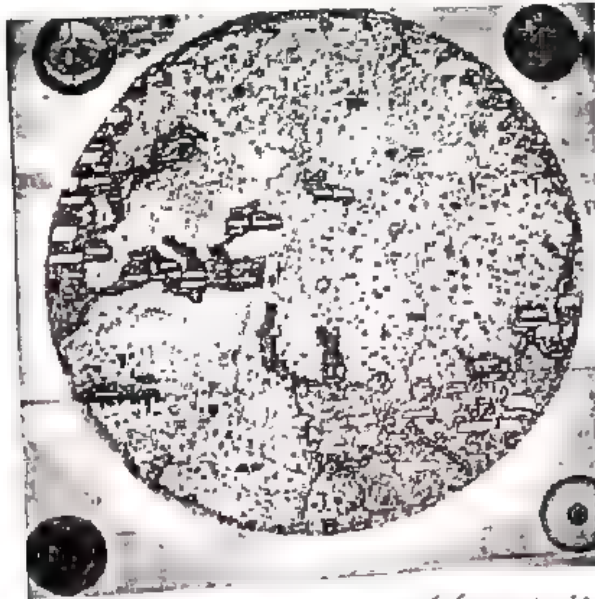
۱۴۵۹ میں دنیا کا ایک یورپی نقشہ (یورپ بالائی بائیں جانب ہے)۔ وہ مقامات مثلاً جنوبی افریقہ جن سے یورپ واقف نہیں تھا، وہ بھی تفصیل سے دکھائے گئے ہیں۔

کولمبس کا خیال تھا کہ وہ مشرقی ایشیا کے کسی چھوٹے جزیرے پر پہنچ گیا ہے۔ اسے جو لوگ نظر آئے اس

نے انہیں انڈین کہا کیوں کہ اس کا خیال تھا کہ وہ انڈیز پہنچ گیا ہے، جسے اب ہم مشرقی انڈیز یا جزائر انڈونیشیا کے نام سے جانتے ہیں۔ کولمبس اپنی بقیہ زندگی اسی غلط فہمی کا شکار رہا۔ یہ خیال کہ اس نے ایک مکمل نیا براعظم دریافت کرلیا ہے نہ اسے آیا اور نہ اس کے بعد آنے والی کئی نسلوں کو۔ ہزاروں سالوں سے

عظیم مفکر اور اسکالر بلکہ صحیفے بھی صرف یورپ، افریقہ اور ایشیا سے ہی واقف تھے۔ کیا وہ سب غلط ہوسکتے تھے؟ کیا انجیل نے آدھی دنیا کو نظر انداز کر دیا ہوگا؟ یہ تو ایسا ہی ہوتا کہ جیسے ۱۹۶۹ء میں چاند کی سمت سفر میں، اپولو گیارہ زمین کے گرد چکر لگاتے کسی نامعلوم چاند پر اتر جائے، جو کسی طرح تمام پرانے مشاہدات سے اوجھل رہا ہو۔ اپنی لاعلمی کو تسلیم نہ کرنے کے عمل میں کولمبس ایک قدیم انسان تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ ساری دنیا سے واقف ہے، اور اس کی یہ تاریخ ساز دریافت بھی اس کی یہ رائے تبدیل نہ کرسکی۔

پہلا جدید آدمی جس نے امریکہ کے کئی دورے کیے ایک اطالوی ملاح امریگو ویسپوچی تھا، جس نے ۱۴۹۹۔۱۵۰۴ کے درمیان کئی دورے کیے۔ ۱۵۰۲ سے ۱۵۰۴ کے درمیان ان مہمات کی تفصیل کے دو بیانات یورپ میں شائع ہوئے۔ دونوں ویسپوچی سے منسوب تھے۔ ان مضامین میں تجویز کیا گیا تھا کہ کولمبس کی دریافت کی ہوئی نئی سرزمین مشرقی ایشیا کا ساحل نہیں تھا، بلکہ ایک مکمل نیا براعظم تھا جو صحیفوں، قدیم نقشہ نویسوں اور عصری یورپ سے اوجھل رہا۔ ۱۵۰۷ء میں ان دلائل سے متاثر ہوکر والڈسی میولر نے دنیا کا ایک نیا نقشہ مرتب کیا جس میں پہلی بار اس جگہ کو ایک نیا براعظم دکھایا گیا تھا، جہاں یورپ سے مغرب کی سمت جانے والے بیڑے لنگر انداز ہوئے تھے۔ اسے بنانے کے بعد والڈسی میولر کو اسے کوئی نام بھی دینا تھا۔ اس غلط فہمی میں کہ امریگو ویسپوچی وہ پہلا فرد تھا جس نے اسے دریافت کیا، والڈسیمیولر نے اس کے اعزاز میں اس براعظم کا نام امریکہ رکھا۔ والڈسی میولر کا نقشہ بہت مقبول ہوا اور اس کے بعد بہت سے نقشہ نویسوں نے اس کی نقول تیار کیں، یوں اس نئی سرزمین کا نام پھیل گیا۔ یہ ایک رومان پرور انصاف ہے کہ ایک چوتھائی دنیا اور اس کے سات میں سے دو براعظم ایک غیر معروف اطالوی کے نام سے معنون ہوں جس کی شہرت کی وجہ بس اس کا فراغ دلی سے یہ تسلیم کرنا تھا کہ "ہم نہیں جانتے"۔

امریکہ کی دریافت سائنسی انقلاب کا بنیادی پتھر تھی۔ اس سے یورپ کو نہ صرف یہ سبق ملا کہ موجودہ مشاہدات کو سابقہ روایات پر ترجیح دے، بلکہ امریکہ فتح کرنے کی امنگ نے یورپ کو ایک ناقابل یقین تیزی سے نئے علوم کے حصول کی جستجو میں مبتلا کردیا۔ اگر وہ اس نئے بڑے خطے کو تابع کرنا چاہتے تھے تو لازم تھا کہ ان کے پاس نئے براعظم کے جغرافیہ، موسم، نباتات، حیوانات، لسانیات، ثقافتوں اور تاریخ کا علم ہو۔ عیسائی صحیفے، جغرافیہ کی پرانی کتابیں اور زبانی روایات مدد کرنے سے قاصر تھیں۔

اس کے بعد سے یورپی جغرافیہ دان بلکہ تمام علوم کے یورپی اسکالر بھی ایسے نقشے بنانے لگے جن میں پر کرنے کے لیے خالی جگہیں باقی تھیں۔ وہ یہ تسلیم کرنے لگے کہ ان کے نظریات کامل نہیں تھے اور وہ بہت سی اہم چیزوں سے واقف نہیں تھے۔

یورپ والے نقشے میں خالی جگہوں کی جانب کسی مقناطیس کی مانند کھنچتے، وہ جلد ہی انہیں بھرنے لگے۔ پندرھویں اور سولھویں صدی میں یورپی مہمات نے افریقہ کا چکر لگایا، امریکہ کو دریافت کیا، بحرالکاہل اور بحیرہ ہند کو عبور کیا، اور تمام دنیا میں آبادیوں اور اڈوں کا ایک جال بچھا دیا۔ انہوں نے پہلی بار واقعی عالمی سطح کی سلطنتوں کی

بنیاد رکھی، اور پہلے عالمی تجارتی راستوں کو مرتب کیا۔ یورپ کی سامراجی مہمات نے دنیا کی تاریخ بدل دی۔ اب یہ تنہا آبادیوں اور ثقافتوں کے بجائے ایک واحد منظم انسانی معاشرے کی تاریخ تھی۔

۱۵۲۵ کا سلویائی دنیا کا نقشہ۔ جب کہ ۱۴۵۹ کا نقشہ براعظموں، جزیروں اور تفصیلی وضاحتوں سے پر تھا، سلویائی نقشہ زیادہ تر خالی ہے۔ امریکی ساحلوں سے نگاہ جنوب کی جانب خالی جگہوں پر بھٹک جاتی ہے۔ کوئی بھی جس میں ذرا سا بھی تجسس ہو، اگر اس نقشے کو دیکھے تو یہ پوچھنے پر مجبور ہوگا کہ اس مقام آگے کیا ہوگا؟ اس نقشے میں جواب موجود نہیں۔ یہ اپنے ناظر کو سفر اور جستجو کی دعوت دیتا ہے۔

۱۵۲۵ کا سلویائی دنیا کا نقشہ۔ جب کہ ۱۴۵۹ کا نقشہ براعظموں، جزیروں اور تفصیلی وضاحتوں سے پر تھا، سلویائی نقشہ زیادہ تر خالی ہے۔ امریکی ساحلوں سے نگاہ جنوب کی جانب خالی جگہوں پر بھٹک جاتی ہے۔ کوئی بھی جس میں ذرا سا بھی تجسس ہو، اگر اس نقشے کو دیکھے تو یہ پوچھنے پر مجبور ہوگا کہ اس مقام آگے کیا ہوگا؟ اس نقشے میں جواب موجود نہیں۔ یہ اپنے ناظر کو سفر اور جستجو کی دعوت دیتا ہے۔

تلاش اور فتح کی ان یورپی مہمات سے ہم اتنے مانوس ہیں کہ ہم یہ بھی بھول جاتے ہیں کہ وہ کتنی غیر معمولی تھیں۔ اس سے پہلے ایسا کبھی نہیں ہوا تھا۔ دور دراز کی فتوحات کا سلسلہ کوئی قدرتی عمل نہیں ہے۔ بیشتر تاریخ میں زیادہ تر انسانی معاشرے مقامی مسائل اور ہمسایہ جھگڑوں میں اتنے الجھے رہتے کہ انہوں نے کبھی دور دراز علاقوں کی جستجو اور فتوحات پر غور نہیں کیا۔ زیادہ تر عظیم سلطنتوں نے اپنی حاکمیت اپنے قریبی ہمسایوں تک محدود رکھی۔ وہ دور دراز کے علاقوں تک صرف یوں پہنچتے کہ ان کا پڑوس پھیلتا رہتا۔ جیسے روم نے اٹروریا کو صرف روم کی حفاظت کے لیے فتح کیا (۳۰۰-۳۵۰ ق م)۔ پھر انہوں نے پو کی وادی اٹریا کی حفاظت کے لیے فتح کی (۲۰۰ ق م)۔ پھر پو کی حفاظت کے لیے پروینس پر قابض ہوئے (۱۲۰ ق م)، پروینس کی وجہ سے گول (۵۰ ق م) اور گول کو بچانے کے لیے برطانیہ (۵۰ عیسوی)۔ انہیں روم سے لندن پہنچنے میں چار سو سال لگے۔ ۳۵۰ ق م میں کوئی رومن براہ راست جہاز رانی کر کے برطانیہ کو فتح کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

شاذ ہی کوئی پرجوش حاکم یا مہم جو فتوحات کے دور دراز سلسلے پر نکلتا۔ لیکن یہ مہم بھی بہت مانوس سامراجی یا کاروباری راستوں کا تعاقب کرتی۔ مثلاً سکندر اعظم کی مہم سے کسی نئی سلطنت کا قیام عمل میں نہیں آیا بلکہ فارس کی پہلے سے موجود حاکمیت کا تختہ الٹا گیا۔ جدید یورپی سلطنتوں سے قریبی مماثلت ایتھنز اور کارتیج کی بحری حاکمیت اور ماجاپاہت کی قدیم بحری سلطنت تھی، جس نے چودھویں صدی میں بیشتر انڈونیشیا پر حکومت کی تھی۔ لیکن یہ سلطنتیں بھی نامعلوم سمندروں میں قدم نہیں رکھتی تھیں۔ جدید عالمی مہمات کے مقابلے میں ان کی بحری فتوحات تو مقامی سفر تھے۔

بہت سے اسکالروں کے نزدیک چینی منگ سلطنت کے ایڈمرل ژینگ ہی نے یورپی مہمات کو گہنا دیا۔

۱۴۰۵ سے ۱۴۳۳ کے درمیان ژینگ نے سات بڑے بحری جہاز چین سے بحیرہ ہند کے دور دراز ساحلوں تک سر براہی کی۔ ان میں سب سے بڑے بیڑے میں تقریباً تین سو جہاز اور تیس ہزار افراد تھے۔ انہوں نے انڈونیشیا، سری لنکا، انڈیا، خلیج فارس، بحیرہ احمر اور مشرقی افریقہ کی سیر کی۔ چینی جہاز حجاز کی مرکزی بندرگاہ جدہ میں لنگر انداز ہوئے اور مالنڈی کینیا کے ساحل پر۔ کولمبس کا ۱۴۹۲ کا بیڑا جس میں تین جہازوں پر ۱۲۰ ملاح سوار تھے، وہ ژینگ ہی کے اژدھوں کے مقابلے میں مچھروں کا ایک گروہ تھا۔

پھر بھی ایک اہم فرق تھا۔ ژینگ ہی نے سمندروں کو کھنگالا اور چین کے دوست حکمرانوں کی مدد کی۔ لیکن اس نے ان ممالک کو فتح کرنے یا نوآبادیات بنانے کی کوشش نہیں کی جہاں وہ گیا تھا۔ پھر ژینگ ہی کی مہمات چینی سیاسی اور ثقافت میں بہت پیوست نہیں تھیں۔ جب ۱۴۳۰ کی دہائی میں بیجنگ کا حکمران ٹولہ بدلا تو نئے آقاؤں نے اچانک مہم ختم کر دی، یہ عظیم بیڑہ بکھر گیا۔ اہم تکنیکی اور جغرافیائی معلومات بھی باقی نہ رہی۔ اس حیثیت و وسائل کا مہم جو پھر کبھی چین کی بندرگاہوں سے روانہ نہ ہوا۔ آنے والی صدیوں میں چینی حکمراں گزشتہ صدیوں کے حکمرانوں کی مانند اپنی دلچسپیاں اور امنگیں وسطی مملکت کے قریبی ہمسایوں سے وابستہ رکھتے۔

ژینگ ہی کی مہم یہ ثابت کرتی ہے کہ یورپ کو کوئی خاص تکنیکی برتری حاصل نہیں تھی۔ یورپین کو جو بات مخصوص بناتی ہے وہ ان کی تلاش اور فتح کرنے کی غیر متوازن اور انمٹ بھوک ہے۔ اپنی ممکنہ اہلیت کے باوجود روم نے کبھی انڈیا یا اسکینڈی نیویا کو فتح کرنے کی کوشش نہیں کی۔ فارس نے کبھی مڈگاسکر یا اسپین کو فتح کرنے کی اور چینیوں نے انڈونیشیا یا افریقہ کو۔ زیادہ تر چینی حکمرانوں نے قریبی جاپان کو بھی خود اس کے حکمرانوں پر چھوڑ دیا۔ اس میں کوئی عجیب بات نہیں تھی۔ عجیب بات یہ ہے کہ ابتدائی جدید یورپ کو ایسے بخار نے آگھیرا کہ وہ دور دراز اور مکمل علاقوں کی جانب جو اجنبی ثقافتوں کے حامل تھے چل پڑے۔ وہ ان کے ساحل پر پہلا قدم رکھتے ہی فوراً اعلان کر دیتے "میں ان خطوں کو اپنے بادشاہ کی حاکمیت میں داخل کرتا ہوں۔"
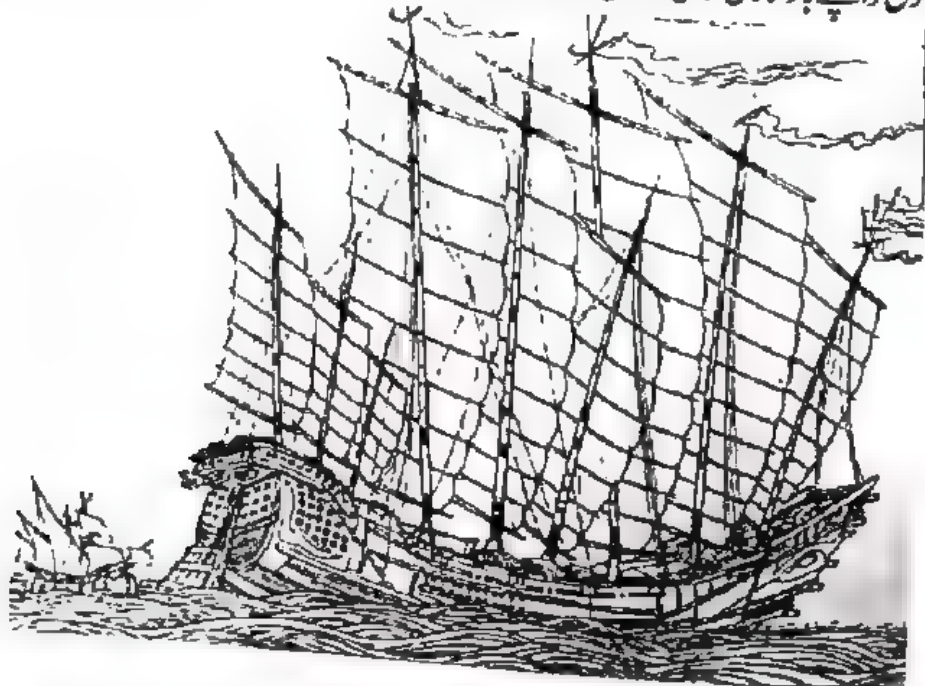
ژینگ ہی کا کلیدی جہاز کولمبس کے جہاز کے برابر میں

خلائی حملہ

۱۵۱۷ء کے آس پاس غرب الہند کے اسپینش آقاؤں نے میکسیکو کے مرکزی علاقے میں ایک طاقتور سلطنت کی موجودگی کی بابت مبہم افواہیں سنیں۔ صرف چار سال بعد وہ ازٹیک دارالخلافہ سلگتا کھنڈر بن چکا تھا، ازٹیک سلطنت ماضی کی داستان اور ہرنن کورٹیس میکسیکو میں ایک نئی وسیع اسپین کی سلطنت کا نیا حکمران ہو چکا تھا۔

اسپین والوں نے رک کر خودستائشی میں وقت ضائع کیا اور نہ ہی آرام کی سانس لی۔ انہوں نے فوراً ہر سمت میں تلاش اور فتح کی مہم شروع کر دی۔ وسطی امریکہ کے سابق حکمران ازٹیک، ٹولٹیک اور مایا جنوبی امریکہ کی موجودگی سے بالکل ناواقف تھے۔ نہ ہی اپنے دو ہزار سالوں میں انہوں نے اسے مطیع کرنے کی کوئی کوشش کی تھی۔ لیکن اسپین کے میکسیکو فتح کرنے کے دس سال کے اندر ہی فرانسسکو پزارو نے جنوبی امریکہ میں انکا سلطنت کا پتہ چلا لیا اور ۱۵۳۲ء میں اسے ملیامیٹ کر دیا۔

اگر ازٹیک اور انکا نے اپنے اطراف کی دنیا میں ذرا زیادہ دلچسپی لی ہوتی اور اگر انہیں معلوم ہوتا کہ اسپین اپنے ہمسایوں سے کیسا سلوک کرتا ہے تو وہ اسپین کی فتح کی زیادہ مزاحمت کرتے۔ ۱۴۹۲ء میں کولمبس کے امریکہ کی سمت پہلے سفر سے کورٹیس کی ۱۵۱۹ء میں میکسیکو آمد کے درمیان اسپین نے زیادہ تر جزائر غرب الہند پر قبضہ کر کے نوآبادیات کا ایک سلسلہ قائم کر دیا تھا۔ مفتوح آبادیوں کے لیے یہ نوآبادیات زمین پر جہنم سے کم نہ تھیں۔ لالچی اور بے ایمان حکمران ان پر آہنی گرفت رکھتے۔ انہیں غلام بنا کر کھیتوں اور کانوں میں کام پر مجبور کرتے اور جو ذرا بھی مزاحمت کرتا اسے قتل کر دیتے۔ زیادہ تر مقامی آبادی یا تو کام کے بہت جبری ماحول کی وجہ سے جلد ہی ختم ہو گئی، یا ان متعدی بیماریوں کا شکار ہو کر جو اسپینش حاکموں کے جہازوں پر سوار ہو کر یہاں تک آ پہنچی تھیں۔ بیس سال کے اندر ہی غرب الہند کی تقریباً آبادی ختم ہو چکی تھی۔ اسپینش نوآبادیات نے اس خلا کو پر کرنے کے لیے افریقہ سے غلاموں کو درآمد کرنا شروع کر دیا۔

یہ نسل کشی ازٹیک سلطنت کی دہلیز پر ہو رہی تھی مگر جب کورٹیس سلطنت کے مشرقی ساحل پر اترا تو ازٹیک کو اس کے متعلق کچھ علم نہیں تھا۔ اسپینش کی آمد ایسی ہی تھی جیسے خلا سے کسی بیرونی مخلوق نے حملہ کیا ہو۔ ازٹیک کو یقین تھا کہ وہ تمام دنیا سے واقف ہیں اور بیشتر پر حاکم ہیں۔ یہ بات ان کے تصور سے ماورا تھی کہ ان کی حکمرانی سے باہر بھی اسپین جیسی کوئی مخلوق موجود تھی۔ جب کورٹیس اور اس کے ساتھی موجودہ ویراکروز کے آفتابی ساحلوں پر اترے تو یہ پہلا موقع تھا کہ ازٹیک نے کوئی اجنبی افراد دیکھے تھے۔

ازٹیک سمجھ ہی نہیں سکے کہ کیسے ردعمل کا اظہار کریں۔ انہیں یہ طے کرنے میں دشواری ہوئی کہ یہ اجنبی کون تھے۔ تمام مانوس انسانوں کے برعکس یہ اجنبی سفید چمڑی کے مالک تھے اور ان کے چہرے پر بہت بال تھے۔ ان میں سے کچھ کے بال دھوپ رنگ کے تھے۔ ان کے پاس سے بدبو آتی تھی (مقامی حفظان صحت اسپین کی صفائی سے بہت بہتر تھی)۔۔۔ جب اسپین والے پہلی بار میکسیکو اترے تو مقامی اگربتی برداران پر متعین کیے گئے کہ وہ ہر جگہ ان کے ساتھ جائیں۔ اسپین والوں کے خیال میں یہ ایک الوہی اعزاز تھا۔ مقامی روایات سے ہمیں علم ہے کہ انہیں اسپینش کی بو ناقابل برداشت لگتی تھی۔

اسپین کی فتح کے وقت ازٹیک اور انکا سلطنتیں

ان اجنبیوں کی مادی ثقافت اس سے زیادہ حیران کن تھی۔ وہ اتنے بڑے جہازوں میں آئے تھے جن کا حجم دیکھنا تو دور کی بات، ازٹیک نے سوچا بھی نہیں تھا۔ وہ بہت بڑے خوفناک حیوانوں کی پشت پر سواری کرتے۔ وہ مختصر دھاتی نلکیوں سے بجلی چمکاتے اور دھماکے کرتے۔ وہ چمکدار لمبی تلواریں اور ناقابل دخل زرہ بکتر پہنے ہوتے، جن پر مقامیوں کی لکڑی کی تلوار اور چقماق کی برچھی بے کار تھی۔

کچھ ازٹیک کا خیال تھا کہ یہ یقیناً خدا ہوں گے۔ دوسروں کا خیال تھا کہ یہ آسیب ہیں یا مردہ افراد کی روحیں یا طاقتور جادوگر۔ تمام موجودہ قوتوں کو جمع کر کے اسپین والوں کا خاتمہ کرنے کے بجائے فکر مند ازٹیک مذاکرات میں وقت ضائع کرتے رہے۔ انہیں جلدی کی کوئی وجہ نظر نہیں آئی۔ آخر کورٹیس کے ساتھ صرف ۵۵۰ اسپینش تھے۔ ۵۵۰ افراد لاکھوں نفوس کی سلطنت کے سامنے کیا ٹھہرتے؟

کورٹیس بھی ازٹیک کے بارے میں انتہائی ناواقف تھا، لیکن اپنے دشمنوں کے مقابلے میں اسے اور اس کے ساتھیوں کو برتری حاصل تھی۔ جب کہ ازٹیک کو ان عجیب الشکل، بدبودار اجنبیوں کی آمد پر ردعمل کا کوئی تجربہ نہیں تھا، اسپین والے واقف تھے کہ یہ دنیا اجنبی انسانوں سے پُر ہے۔ انہیں اجنبی مقامات پر حملہ کرنے اور ایسی صورت حال سے نبٹنے کا زیادہ تجربہ تھا جن کے متعلق وہ مکمل طور پر لاعلم رہے ہوں۔ جدید یورپی سائنسدانوں کے لیے جدید یورپی فاتحین کی مانند نامعلوم میں قدم رکھنا بہت خوشگوار تھا۔

لہذا جب جولائی ۱۵۱۹ میں کورٹیس اس آفتابی ساحل پر اترا تو اس نے کسی سائنس فکشن کے اجنبی کی مانند جو خلائی جہاز سے اتر رہا ہو، بلا جھجک قدم اٹھایا۔ اس نے حیرت زدہ مقامیوں میں اعلان کیا کہ "ہم پرامن آئے ہیں، ہمیں اپنے سردار تک لے چلو"۔ کورٹیس نے بیان کیا کہ وہ اسپین کے عظیم بادشاہ کا پیام امن لایا ہے، اور اس نے ازٹیک حاکم مونتی زوما دوئم سے سفارتی ملاقات کی درخواست کی (یہ بے شرمی کی حد تک دروغ گوئی تھی۔ کورٹیس

کا قافلہ لالچی مہم جو افراد پر مشتمل ایک آزاد مہم تھی۔ اسپین کے بادشاہ نے نہ کبھی کورٹیس کے بارے میں سنا تھا اور نہ ہی ازٹیک کے بارے میں)۔ ازٹیک کے مقامی دشمنوں نے کورٹیس کو رہ نما، غذا اور کچھ عسکری مدد فراہم کی، پھر اس نے ازٹیک دارالخلافے ٹینوخٹلن (Tenochtitlan) کے عظیم شہر کی جانب پیش قدمی کی۔

ازٹیک نے اجنبیوں کو دارالخلافے تک آنے کی اجازت دی۔ پھر وہ اجنبیوں کے سربراہ کو باعزت طریقے سے شہنشاہ مونتی زوما سے ملانے لے گئے۔ اس ملاقات کے دوران کورٹیس کے اشارے پر آہنی زرہ بکتر پہنے اسپین والوں نے مونتی زوما کے محافظوں کو قتل کر دیا (جو صرف لکڑی کے کلہاڑوں اور پتھر کے چاقوؤں سے مسلح تھے)۔ معزز مہمان نے اپنے میزبان کو قید کر لیا۔

کورٹیس نے مونتی زوما کو محل میں قید رکھا۔ بظاہر یہ نظر آتا تھا کہ جیسے شہنشاہ آزاد اور حکمران تھا اور اسپینش سفیر ایک مہمان سے زیادہ کچھ نہیں تھا۔ ازٹیک سلطنت ایک بہت مرکزی ریاست تھی، اس صورت حال نے اسے مفلوج کر دیا۔ مونتی زوما ایسے متحرک رہا جیسے وہ ہی محل پر حاکم ہو، اور ازٹیک امرا اس کی اطاعت کرتے رہے، یعنی وہ کورٹیس کی اطاعت کرتے رہے۔ یہ صورت حال مہینوں تک جاری رہی جس دوران کورٹیس نے مونتی زوما اور اس کے درباریوں سے تفتیش کی، مترجموں کو کئی مقامی بولیوں میں تربیت دلائی اور ہر سمت مختصر اسپینش مہم روانہ کیں تاکہ وہ ازٹیک سلطنت، مختلف قبائل، اس کی رعایا اور شہروں سے واقفیت حاصل کر سکیں۔

ازٹیک امرا نے بالآخر مونتی زوما اور کورٹیس کے خلاف بغاوت کر دی، ایک نیا سلطان منتخب کیا اور اسپین والوں کو ٹینوخٹلن سے باہر نکال دیا۔ لیکن اس وقت تک شاہی عمارت میں کئی دراڑیں پڑ چکی تھی۔ کورٹیس نے اپنی حاصل شدہ معلومات سے اختلافات کو مزید ہوا دی اور سلطنت کو دولخت کر دیا۔ اس نے سلطنت کی رعایا کو آمادہ کیا کہ وہ حکمراں ازٹیک کے خلاف اس کا ساتھ دیں۔ رعایا نے بہت غلط اندازہ لگایا۔ وہ ازٹیک سے نفرت کرتے تھے لیکن انہیں اسپین یا غرب الہند کی نسل کشی کے بارے میں کوئی علم نہیں تھا۔ ان کا خیال تھا اسپین کی مدد سے وہ ازٹیک لبادہ اتار پھینکیں گے۔ انہیں کبھی یہ خیال نہیں آیا کہ خود اسپین والے ان پر قابض ہو جائیں گے۔ انہیں یقین تھا کہ اگر کورٹیس اور اس کے چند سو رفقا اگر کوئی مسئلہ پیدا کریں گے تو وہ باآسانی ان پر قابو پا لیں گے۔ ان باغی عوام نے کورٹیس کو لاکھوں پر مشتمل مقامی لشکر فراہم کیا اور ان کی مدد سے کورٹیس نے ٹینوخٹلن کا محاصرہ کر کے شہر کو فتح کر لیا۔

اس موقع پر بڑھتی تعداد میں اسپینش فوجی میکسیکو پہنچنے لگے، کچھ کیوبا سے اور کچھ براہ راست اسپین سے۔ جب تک مقامی آبادی کو معاملے کی سنگینی کا احساس ہوا بہت دیر ہو چکی تھی۔ ویرا کروز میں لنگر انداز ہونے کے ایک صدی کے اندر ہی مقامی آبادی میں نوے فیصد کمی واقع ہو چکی تھی۔ زیادہ تر ان نامعلوم بیماریوں کے ہاتھوں جو ان حملہ آوروں کے ساتھ امریکہ پہنچیں۔ زندہ رہ جانے والوں نے اپنے آپ کو ایک لالچی اور متعصب حکومت کے انگوٹھے کے نیچے پایا جو ازٹیک سے بدتر تھے۔

کورٹیس کے میکسیکو میں اترنے کے دس سال بعد پزارو انکا سلطنت کے ساحلوں پر اترا۔ اس کے ساتھ کورٹیز سے بھی کم سپاہی تھے۔ لیکن پزارو نے گزشتہ حملوں میں حاصل کی ہوئی تمام معلومات اور تجربے سے فائدہ اٹھایا۔ اس کے مقابلے میں انکا کو ازٹیک کے حشر کے بارے میں کوئی علم نہیں تھا۔ پزارو نے کورٹیس کی حکمت عملی کی نقل کی۔ اس نے خود کو اسپین کے شہنشاہ کا پرامن ایلچی قرار دیا۔ انکا کے حاکم اتاہوالپا کو سفارتی ملاقات کی دعوت دی

اور اسے اغوا کرلیا۔ مقامی اتحادیوں کی مدد سے پزارو نے مقلوج سلطنت کو زیر کر دیا۔ اگر انکا سلطنت کی رعایا کو میکسیکو کے باشندوں کا انجام معلوم ہوتا تو وہ حملہ آوروں کی حمایت نہ کرتے، لیکن وہ لاعلم تھے۔

صرف امریکہ کی مقامی آبادی کو ہی اپنی بے خبری کی قیمت ادا نہیں کرنی پڑی۔ ایشیا کی عظیم سلطنتوں عثمانی، صفوید، مغل اور اور چین سب نے فوراً ہی سن لیا کہ یورپ والوں نے کوئی اہم چیز دریافت کی ہے، لیکن انہوں نے ان ایجادات میں کسی دلچسپی کا اظہار نہیں کیا۔ وہ یہی یقین کرتے رہے کہ دنیا صرف ایشیا کے اطراف گھومتی ہے اور انہوں نے امریکہ پر تسلط یا بحرالکاہل اور اوقیانوس میں جہاز رانی کے حقوق کے لیے یورپ سے کوئی مقابلہ نہیں کیا۔ مختصر یورپی ریاستوں مثلاً اسکاٹ لینڈ اور ڈنمارک نے بھی چند تلاش اور فتح کی مہمات امریکہ روانہ کیں۔ لیکن اسلامی دنیا، انڈیا یا چین سے کوئی ایک مہم بھی تلاش کرنے یا فتح کرنے کے لیے روانہ نہیں کی گئی۔ پہلی عسکری طاقت جس نے ایک غیر یورپی مہم امریکہ بھیجنے کی کوشش کی، جاپان تھی۔ یہ جون ۱۹۴۲ کی بات ہے۔ ایک جاپانی مہم نے کسکا اور اٹو کے دو چھوٹے جزیرے الاسکا کے ساحل کے قریب فتح کر لیے، ساتھ ہی دس امریکی فوجی اور ایک کتا بھی۔ جاپان کبھی اس سے زیادہ امریکہ کے قریب نہیں پہنچ سکا۔

یہ دلیل دینا بیکار ہے کہ عثمانیہ یا چین بہت دور تھے یا ان کے پاس تکنیکی، اقتصادی یا عسکری معلومات نہ تھی۔ وہ وسائل جن سے ژرینگ ہی ۱۴۲۰ کی دہائی میں مشرقی افریقہ پہنچا، وہی امریکہ تک پہنچنے کے لیے کافی تھے۔ چین کوئی دلچسپی ہی نہیں رکھتا تھا۔ پہلا چینی عالمی نقشہ جس میں امریکہ موجود تھا وہ ۱۶۰۲ میں جاری ہوا، اور وہ بھی ایک یورپی مشنری کا مرتب کیا ہوا۔

تقریباً تین سو سال تک یورپ نے امریکہ، آسٹریلیا، بحرالکاہل اور بحر اوقیانوس پر بلا مقابلہ حکومت کی۔ ان علاقوں میں اہم جدوجہد خود یورپی طاقتوں کے مابین تھی۔ جو دولت اور وسائل یورپ والوں نے اکٹھا کیے ان کی بدولت انہوں نے ایشیا پر بھی حملہ کیا، سلطنتوں کو شکست دے کر آپس میں تقسیم کر لیا۔ جب تک عثمانیہ، فارس، انڈیا اور چین بیدار ہوتے بہت دیر ہو چکی تھی۔

بیسویں صدی میں آکر غیر یورپی ثقافتوں نے ایک واقعی عالمی نکتہ نظر اپنایا، یہ یورپی بالادستی کی شکست کی ایک اہم وجہ تھی۔ لہذا الجیریہ کی جنگ آزادی (۱۹۵۴ سے ۱۹۶۲) میں الجیریا کے گوریلوں نے ایک فرانسیسی فوج کو شکست دی جسے بہت زیادہ عددی، تکنیکی اور اقتصادی برتری حاصل تھی۔ الجیریا والے اس لیے کامیاب رہے کہ انہیں ایک عالمی نوآبادیاتی نظام کی مخالفت کی حمایت حاصل تھی، اور انہوں نے نہ صرف عالمی میڈیا کو اپنے مقصد کے لیے ہموار کیا، بلکہ خود فرانس میں رائے عامہ کو بھی۔ چھوٹے سے شمالی ویتنام نے دیوقامت امریکہ کو اسی حکمت عملی سے شکست دی۔ ان گوریلا فوجوں نے ثابت کیا کہ اگر مقامی جدوجہد ایک عالمی نعرہ بن جائے تو عالمی طاقتوں کو بھی شکست دی جا سکتی ہے۔ یہ سوچ دلچسپ ہے کہ اگر مونتی زوما اسپین کی رائے عامہ کو متاثر کرنے اور اسپین کے مخالفین پرتگال، فرانس یا سلطنت عثمانیہ کی حمایت حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا، تو؟

نایاب مکڑیاں اور بھولی بسری تحریریں

جدید سائنس اور جدید سلطنتوں کے پس منظر میں یہ بے چینی کارفرما تھی کہ شاید اگلے افق کے اس پار کچھ

اہم موجود ہے، کوئی چیز جس کی دریافت اور اس پر حاکیت ضروری ہے۔ پھر بھی سائنس اور سلطنت میں تعلق اس سے زیادہ گہرا تھا۔ نہ صرف تحریک بلکہ سلطنت قائم کرنے والوں کے طریقے بھی سائنس دانوں سے قریب تھے۔ جدید یورپ والوں کے لیے سلطنت کی تعمیر ایک سائنسی منصوبہ تھی، جب کہ کسی سائنسی شعبہ کی تعمیر بھی کسی کارخسروانہ سے کم نہ تھی۔

جب مسلمانوں نے انڈیا فتح کیا تو وہ اپنے ساتھ نہ ماہرین آثار قدیمہ لائے جو ہندوستان کی تاریخ کا مطالعہ کر سکتے، نہ ہندوستان کے ثقافتی مطالعے کے لیے ماہرین بشریات، ہندوستان کی زمینی ساخت معلوم کرنے کے لیے ماہرین ارضیات اور نہ ہی ماہرین حیوانات کہ جو ہندوستان کے حیوانات کا مطالعہ کر سکیں۔ جب برطانیہ نے انڈیا پر حملہ کیا تو انہوں نے یہ سب کیا۔ ۱۰ اپریل ۱۸۰۲ کو انڈیا کا عظیم سروے شروع ہوا اور ساٹھ سال تک جاری رہا۔ لاکھوں مقامی مزدوروں، اسکالروں اور رہنماؤں کی مدد سے برطانیہ نے پورے انڈیا کا احتیاط سے نقشہ تیار کیا، سرحدیں متعین کیں، فاصلے ناپے اور اس عمل میں پہلی بار کوہ ہمالیہ اور دوسری چوٹیوں کی درست بلندی معلوم کی۔ برطانیہ نے ہندوستانی ریاستوں کی عسکری قوت کا جائزہ لیا اور ان کی سونے کی کانوں کا پتہ چلایا۔ لیکن ساتھ ہی انہوں نے نایاب ہندوستانی مکڑیوں کا بھی پتہ چلایا، خوش رنگ تتلیوں کی تفصیل مرتب کی، متروکہ ہندوستانی زبانوں کی قدیم ابتدا معلوم کی اور گمشدہ آثار قدیمہ کھود نکالے۔

موئن جودڑو وادئی سندھ کی تہذیب کے اہم شہروں میں سے تھا جو تیسری صدی قبل مسیح میں قائم تھا اور تقریباً ۱۹۰۰ ق م میں تباہ ہوا۔ برٹش سے پہلے کبھی ہندوستانی حاکم، نہ موریہ نہ گپتا، نہ دلی کے سلطان اور نہ ہی عظیم مغلوں نے ان آثار پر ایک دوسری نظر ڈالی۔ لیکن برطانوی آثار قدیمہ نے ۱۹۲۲ میں اس جگہ کا مطالعہ کیا۔ پھر ایک برطانوی ٹیم نے اس جگہ کی کھدائی کر کے انڈیا کی پہلی عظیم تہذیب کا پتہ چلایا، جس سے کوئی انڈین پہلے واقف نہیں تھا۔

برٹش کے سائنسی تجسس کی ایک اور مثال کیونی فارم (Cuneiform) تحریر کو سمجھنا ہے۔ یہ رسم الخط پورے مشرق وسطیٰ میں تقریباً تین ہزار سال تک رائج رہا۔ لیکن وہ آخری فرد جو اسے پڑھ سکتا تھا وہ غالباً کسی وقت پہلے ہزار سال عیسوی میں ختم ہو گیا۔ اس کے بعد سے اس علاقے کے مقامی اکثر کیونی فارم رسم الخط یادگاروں، کتبوں، قدیم آثار اور ٹوٹے برتنوں پر دیکھتے۔ لیکن انہیں کوئی علم نہیں تھا کہ ان عجیب زاویائی لکیروں سے کیا مطلب اخذ کریں، لیکن جہاں تک ہمیں علم ہے انہوں نے کوئی کوشش بھی نہیں کی۔ کیونی فارم یورپ والوں کو ۱۶۱۸ میں پہلی بار اس وقت ملا جب اسپین کا سفیر قدیم دارالخلافے کے آثار قدیمہ کی سیر کو گیا۔ جب اس نے وہ تحریر دیکھی جس کا اسے کوئی مطلب نہیں بتا سکا۔ اس نامعلوم تحریر کی خبر یورپی پنڈتوں تک پہنچی اور ان کے تجسس کو ہوا دی۔ ۱۶۵۷ میں یورپی اسکالروں نے پرسی پولس سے کیونی فارم رسم الخط کی پہلی نقل شائع کی۔ مزید کوششیں ہوئیں اور تقریباً دو صدیوں تک مغرب میں اسکالروں نے اسے سمجھنے کی کوشش کی، مگر کوئی کامیاب نہ ہو سکا۔

۱۸۳۰ میں ایک برطانوی افسر ہنری رالنسن کو شاہ کی فوج کی یورپی انداز میں تربیت کے لیے فارس بھیجا گیا۔ اپنے فارغ وقت میں رالنسن فارس کی سیر کرتا۔ ایک دن مقامی رہنما اسے زاگروس کی پہاڑیاں دکھانے لے گئے اور اسے وسیع بے ستون تحریر دکھائی۔ پچاس فٹ اونچی اور اسی فٹ چوڑی ڈھلان کی سطح پر اسے ۵۰۰ ق م میں شاہ دارا اول کے حکم پر کھودا گیا تھا۔ کیونی فارم رسم الخط میں یہ تین زبانوں میں تحریر تھی۔ قدیم فارسی، ایلم اور بابل کی

زبانیں۔اس تحریر سے سب مقامی واقف تھے مگر پڑھ کوئی نہیں سکتا تھا۔رالنسن کو یقین ہوگیا کہ اگر وہ اس تحریر کو پڑھنے میں کامیاب ہوگیا،تو اس سے وہ اور دوسرے اسکالران لاتعداد تحریروں کو پڑھنے میں کامیاب ہوجائیں گے جو اس وقت پورے مشرق وسطیٰ سے برآمد ہورہی تھیں،جس سے قدیم گم شدہ دنیا کا دروازہ کھل جاتا۔

ان حروف کو سمجھنے کا پہلا مرحلہ یہ تھا کہ ان کی ایک نقل تیار کی جائے جسے یورپ بھیجا جاسکے۔رالنسن موت سے لڑتا اس سیدھی چٹان پر چڑھتا تاکہ ان حروف کی نقل تیار کرسکے۔اس نے کئی مقامیوں کو اپنی مدد کے لیے بھرتی کیا۔بالخصوص ایک کرد ش لڑکا جو ڈھلوان کے ناقابل عبور حصوں تک پہنچ گیا تاکہ اس کندہ تحریر کے بالائی حصے کی نقل تیار ہوسکے۔۱۸۴۷ء میں یہ منصوبہ مکمل ہوا اور ایک کامل و درست نقل یورپ روانہ ہوئی۔

رالنسن اسی کامیابی پر اکتفا کرکے بیٹھ نہیں گیا۔ایک فوجی افسر کی حیثیت سے اسے سیاسی اور عسکری فرائض انجام دینے تھے۔لیکن جب بھی اسے وقت ملتا وہ اس پراسرار تحریر پر غور کرتا۔اس نے ایک کے بعد دوسرا طریقہ آزمایا اور بالآخر قدیم فارسی زبان والا حصہ سمجھنے میں کامیاب ہوگیا۔یہی سب سے آسان تھا کیوں کہ قدیم فارسی بھی جدید فارسی سے بہت زیادہ مختلف نہیں تھی جس سے رالنسن بخوبی واقف تھا۔قدیم فارسی حصے کو سمجھنے سے اسے وہ کلید مل گئی جس نے ایلام اور بابل والے حصوں کے اسرار بھی کھول دیے۔یہ در عظیم وا ہوا تو قدیم جاگتی آوازوں کا ایک دریا داستان سنانے لگا۔سمیری بازاروں کی گہما گہمی،اسیری بادشاہ کے احکامات اور بابل کی نوکر شاہی کے مباحثے۔جدید یورپی سامراجی مثل رالنسن کی کوششوں کے بغیر ہم قدیم شرق وسطیٰ کی سلطنتوں کے بارے میں زیادہ نہیں جان سکتے تھے۔

ایک اور اہم سامراجی اسکالر ولیم جونز تھا۔جونز ستمبر ۱۷۸۳ء میں انڈیا پہنچا تاکہ بنگال کی سپریم کورٹ میں جج کے فرائض انجام دے سکے۔وہ انڈیا کے فسوں میں ایسا گرفتار ہوا کہ اپنی آمد کے چھ ماہ بعد ہی وہ ایشیائی سوسائٹی کی بنیاد رکھ چکا تھا۔یہ تدریسی ادارہ ایشیا بالخصوص انڈیا کی ثقافتوں تواریخ اور معاشروں کی تحقیق کے لیے وقف تھا۔دو سال کے اندر ہی جونز نے سنسکرت پر اپنے مشاہدات تحریر کیے۔جس سے تقابلی لسانیات کی راہ ہموار ہوئی۔

اپنی تحریروں میں جونز نے سنسکرت، ایک قدیم ہندوستانی زبان جو ہندو رسوم کی مقدس زبان بن گئی، یونانی ،ور لاطینی میں حیرت انگیز مماثلت کا ذکر کیا۔پھر ان تمام زبانوں کا گوتھک، سیلٹک ، قدیم فارسی، جرمن فرانسیسی اور انگریزی سے۔مثلاً سنسکرت میں ماں کو ماتار کہتے ہیں، لاطینی میں ماتر اور پرانی سیلٹک میں ماتھر۔جونز کی دلیل تھی کہ ان تمام زبانوں کی ابتدا مشترک تھی، یہ سب ایک ہی فراموش شدہ زبان سے نکلی ہیں۔یوں وہ پہلا فرد تھا جس نے اس بات کو دریافت کیا جنھیں بعد میں انڈو یورپین لسانیات کا خاندان کہا گیا۔

جونز کی تحقیق ایک اہم سنگ میل تھی، نہ صرف اپنے جرات آمیز (اور درست) نظریے کی وجہ سے، بلکہ وہ ترتیبی طریقہ جو اس نے زبانوں کے تقابلی جائزے کے لیے تجویز کیا۔حرف کے اسکالروں نے اسے اپنالیا اور اس کی مدد سے وہ ایک ترتیب سے دنیا کی زبانوں کی پیدائش کا مطالعہ کرسکے۔

لسانیات کو بہت پرجوش خسروانہ پذیرائی ملی۔یورپ کی بادشاہتیں یہ یقین رکھتی تھیں کہ موثر طریقے سے حکومت کرنے کے لیے انہیں رعایا کی زبانوں اور ثقافتوں سے واقف ہونا چاہیے۔انڈیا آنے والے برٹش افسروں کو کلکتہ کے ایک کالج میں تین سال تک انگریزی قانون کے ساتھ مسلم اور ہندو قوانین کو بھی پڑھنا پڑتا۔فارسی، اردو،

سنسکرت، یونانی اور لاطینی کے ساتھ ریاستی، جغرافیائی، اقتصادیات اور تامل، بنگال اور ہندوستان کی ثقافت کی تعلیم حاصل کرنی پڑتی۔ لسانیات کی تعلیم سے انہیں مقامی زبانوں کی ساخت اور گرامر کو سمجھنے میں بہت مدد ملی۔

ولیم جونز اور ہنری رالنسن جیسے لوگوں کی وجہ سے یورپی حاکمین اپنی سلطنت کو بہت اچھی طرح جانتے تھے۔ گزشتہ کسی بھی فاتح سے بہتر اور حد یہ تھی کہ خود مقامی آبادی سے بھی بہتر۔ اس بہتر واقفیت کے واضح عملی فوائد تھے۔ اس معلومات کے بغیر یہ ممکن نہیں تھا کہ ایک مضحکہ خیز حد تک مختصر برٹش گروہ دو صدیوں تک کروڑوں ہندوستانیوں پر حاکم رہتا، ان پر جبر کرتا اور ان کا استحصال کرتا۔ پوری انیسویں صدی اور بیسویں صدی کے آغاز تک پانچ ہزار سے کم برطانوی افسران، چالیس سے ستر ہزار برطانوی فوجی اور شاید ایک لاکھ سے زیادہ برطانوی کاروباری افراد، وہاں بس جانے، بیویاں اور بچے تیس کروڑ ہندوستانیوں کو زیر کر کے ان پر حکومت کے لیے کافی تھی۔

سلطنتوں کا نباتات، لسانیات، تاریخ اور جغرافیہ پر وسائل صرف کرنے کی وجہ صرف یہ عملی فوائد ہی نہیں تھے۔ یہ بات بھی اہم تھی کہ سائنس نے ان سلطنتوں کو نظریاتی جواز فراہم کیا۔ جدید یورپی اس بات پر یقین کرنے لگے کہ حصول علم ہمیشہ مفید ہوتا ہے۔ یہ حقیقت کہ سلطنتوں سے نئے علوم کے چشمے پھوٹتے رہے یہ تاثر دیتے کہ وہ ترقی پسند اور مثبت ادارے ہیں۔ آج بھی جغرافیہ، آثار قدیمہ، علم نباتات اور دوسرے سائنسی علوم کم از کم بالواسطہ یورپی سلطنتوں کو خراج تحسین پیش کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔ نباتات کی تاریخ ابوریجنل آسٹریلین کی تکالیف کے بارے میں خاموش ہے، لیکن وہاں عموماً جوزف بینکس اور جیمز کک کے بارے میں چند تعریفی جملے ضرور مل جاتے ہیں۔

پھر یہ کہ سلطنتوں کی اکٹھا کی ہوئی نئی معلومات سے کم از کم نظریاتی طور پر ایسا ضرور ہے کہ مفتوح رعایا کو "ترقی" کے فوائد حاصل ہوسکیں۔ انہیں ادویات و تعلیم کی فراہمی، سڑکوں اور نہروں کی تعمیر، انصاف اور تمول کا حصول یقینی بنایا جاسکے۔ سامراجیوں کا دعویٰ تھا کہ ان کی سلطنتیں استحصالی ادارے نہیں تھے بلکہ یہ تو غیر یورپی نسلوں کی خاطر فلاحی منصوبے تھے۔ رڈیارڈ کپلنگ 'سفید فام آدمی کا بوجھ' میں لکھتا ہے:

سفید فام آدمی کا بوجھ ایسا\
اپنے بہترین بھیج دیتا ہے\
اپنے بیٹے جلاوطن کر کے\
خدمت کرتا ہے اپنے مفتوح کی\
اسپ تازی کی طرح منتظر وہ رہتا\
بے چین و وحشی مقامیوں کا\
نئے محکوم یاس مارے لوگ\
نیم شیطان و نیم طفلوں کا

ظاہر ہے کہ حقیقت اس کہانی کی نفی کرتی ہے۔ برطانیہ نے ۱۷۶۴ء میں بنگال فتح کیا جو انڈیا کا سب سے متمول صوبہ تھا۔ نئے حکمرانوں کو دولت اکٹھا کرنے کے علاوہ کسی کام سے دلچسپی نہیں تھی۔ انہوں نے ایک نئی تباہ کن اقتصادی پالیسی اپنائی جس کی وجہ سے چند سال میں ہی بنگال کا عظیم قحط پھوٹ پڑا۔ ۱۷۶۹ء میں شروع ہوکر یہ ۱۷۷۰ء تک ہلاکت خیز ہوگیا اور ۱۷۷۳ء تک برقرار رہا۔ اس آفت میں صوبے کی ایک تہائی آبادی، تقریباً ایک کروڑ

افراد ہلاک ہوئے۔

حقیقت یہ ہے کہ نہ تو جبر واستحصال کی داستان اور نہ ہی سفید فام آدمی کا بوجھ حقائق کو پوری طرح بیان کرتا ہے۔ یورپی سلطنتوں نے اتنے زیادہ متنوع کام اتنے بڑے پیمانوں پر کیے کہ آپ کو دونوں جانب کے لیے کافی دلائل مل جائیں گے۔ اگر آپ کے خیال میں سلطنتیں شیطانی چرخے تھے جن سے دنیا بھر میں موت، جبر اور ناانصافی پھیلی تو ان کے جرائم سے آپ ایک پورا انسائکلو پیڈیا بھر سکتے ہیں۔ اگر آپ یہ دلیل دینا چاہیں کہ درحقیقت انہوں نے اپنی رعایا کے لیے نئی طبی دریافتیں، بہتر اقتصادی حالات اور بہتر تحفظ فراہم کیا تو آپ ان کے کارناموں سے ایک اور انسائکلو پیڈیا بھر سکتے ہیں۔ سائنس کے ساتھ اپنے قریبی تعاون کی وجہ سے یہ سلطنتیں اتنی طاقتور تھیں، اور انہوں نے دنیا کو اس قدر تبدیل کر دیا کہ شاید انہیں دوٹوک اچھا یا برا نہیں کہا جا سکتا۔ ہم جس دنیا سے واقف ہیں وہ ان ہی کی تراشی ہوئی ہے، بشمول ان نظریات کے جن کو استعمال کر کے ہم انہیں پرکھ رہے ہیں۔

لیکن سامراجیوں نے سائنس کو زیادہ مکروہ افعال کے لیے بھی استعمال کیا۔ حیاتیات دانوں، ماہرین آثار قدیمہ اور ماہرین لسانیات تک نے سائنسی ثبوت فراہم کیے کہ یورپین دوسری تمام نسلوں سے افضل ہیں۔ لہذا یہ ان کا حق ہے (اگر فریضہ نہیں) کہ وہ حکومت کریں۔ جب ولیم جونز نے دلیل دی کہ تمام انڈو یورپین زبانیں ایک ہی قدیم زبان سے نکلی ہیں تو بہت سے اسکالر اس اصل زبان کے بولنے والوں کی دریافت کے لیے بے چین تھے۔ انہوں نے دیکھا کہ ابتدائی سنسکرت بولنے والے جنہوں نے تین ہزار سال قبل وسطی ایشیہ سے انڈیا پر حملہ کیا اپنے آپ کو آریا کہلاتے تھے۔ فارسی زبان کے ابتدائی بولنے والے اپنے آپ کو ایریا کہتے تھے۔ یورپی اسکالروں نے اخذ کیا کہ وہ لوگ جو اصل قدیم زبان بولتے تھے، جن سے فارسی اور سنسکرت دونوں نکلیں (اور یونانی، لاطینی، گوتھک اور سیلٹک) یقیناً اپنے آپ کو آرین کہتے ہوں گے۔ کیا یہ محض اتفاق ہے کہ جنہوں نے عظیم انڈین، فارسی، یونانی اور رومن تہذیبوں کو قائم کیا وہ سب آریائی تھے؟

پھر برطانوی، فرانسیسی اور جرمن اسکالروں نے ان جفاکش آریاؤں کے متعلق لسانی نظریے کو ڈارون کے فطری چناؤ کے نظریے سے منسلک کر کے یہ عندیہ دیا کہ آریائی محض یک زبانی گروہ ہی نہیں بلکہ ایک حیاتیاتی گروہ تھے۔ ایک ہی نسل، اور وہ بھی کوئی عام نسل نہیں بلکہ بلند قامت، سنہری بال، نیلی آنکھوں والے جفاکش، دانا حاکم نسل جس نے شمال کی دھند سے نکل کر ساری دنیا میں ثقافتوں کی بنیاد رکھی۔ بدقسمتی سے جن آریاؤں نے ہندوستان اور فارس پر حملہ کیا انہوں نے ان خطوں میں موجود مقامی عورتوں سے بین النسلی شادیاں کیں۔ اپنی گوری رنگت اور سنہری بال کھو دیے اور اس کے ساتھ اپنی جانفشانی اور دانائی بھی۔ اس کے نتیجے میں ہندوستان اور فارس کی تہذیبیں زوال پذیر ہوئیں۔ اس کے مقابلے میں یورپ میں آریاؤں نے اپنی نسلی پاکیزگی برقرار رکھی۔ یہی وجہ ہے کہ یورپین دنیا کو فتح کرنے میں کامیاب رہے، اور اس وقت تک وہ اس پر حاکمیت کے اہل ہیں، جب تک کہ وہ دوسری کمتر نسلوں سے شادی نہ کریں۔

ایسے نسلی نظریات جو کئی دہائیوں تک مقبول اور معتزز رہے، اب سیاست دانوں اور سائنس دانوں کے لیے یکساں قابل نفرت ہیں۔ افراد نسلی تعصب کے خلاف جدوجہد جاری رکھے ہوئے ہیں، بغیر اس احساس کے کہ اب جنگ کا محاذ سامراجی نظریے سے بدل کر ثقافتی کلچرازم ہو گیا ہے۔ ایسا کوئی لفظ موجود نہیں ہے۔ اب وقت آ گیا

ہے کہ ہم اسے استعمال کریں۔ آج کی اشرافیہ میں، متنازعہ انسانی گروہوں کی امتیازی خصوصیات کا تذکرہ تاریخی ثقافتی تفرقات پر مبنی ہوتا ہے، نسلوں کے درمیان حیاتیاتی تفرقات پر نہیں۔ اب ہم یہ نہیں کہتے کہ "یہ تو ان کے خون میں شامل ہے"، بلکہ اب یہ کہتے ہیں کہ "یہ ان کی ثقافت کا حصہ ہے"

لہذا یورپین دائیں بازو کی جماعتیں جو مسلم مہاجرین کی مخالفت کرتی ہیں ہمیشہ نسلی اصطلاحات سے اجتناب کرتی ہیں۔ میرین لا پین کے تقریر لکھنے والے اگر فرانس کی نیشنل فرنٹ پارٹی کو ٹی وی پر یہ کہنے کی رائے دیتے کہ "ہم نہیں چاہتے وہ کمتر سامی نسل ہمارے آریائی خون کو آلودہ کرے، اور ہماری آریائی تہذیب کو برباد کرے" تو انہیں فوراً برخاست کر دیا جاتا۔ اس کے بجائے فرانسیسی نیشنل فرنٹ، ہالینڈ کی پارٹی برائے آزادی، آسٹریا کے مستقبل کا اتحاد اور ان ہی جیسے یہ دلیل دیتے ہیں کہ ہماری ثقافت یورپ میں پروان چڑھی ہے، بالخصوص جمہوری روایات، برداشت اور صنفی ہم آہنگی۔ جب کہ مسلمان ثقافت جو مشرق وسطیٰ میں پروان چڑھی اس کی خصوصیات ملوکیت، انتہا پسندی اور مردانہ برتری پر استوار ہیں۔ اور کیوں کہ دونوں ثقافتیں اس قدر مختلف ہیں، اور کیوں کہ مسلمان اس پر تیار نہیں (یا اس بات کے اہل نہیں) کہ وہ مغربی روایات کو اپنا سکیں لہذا انہیں داخلے کی اجازت نہیں ہونی چاہیے، ورنہ وہ اندرونی اختلافات کو جنم دے کر یورپ کی جمہوریت اور آزاد خیالی کو برباد کر دیں گے۔

ایسے ثقافتی دلائل کو بشریات اور سماجی سائنسوں سے کمک پہنچائی جاتی ہے، جن میں تہذیبوں کا نام نہاد ٹکراؤ دکھایا جاتا ہے، اور مختلف ثقافتوں میں بنیادی فرق اجاگر کیا جاتا ہے۔ تمام مورخ اور ماہرین بشریات ان نظریات کو تسلیم کرتے ہیں اور نہ ہی ان کے سیاسی استعمال کی حمایت۔ لیکن گرچہ آج کے حیاتیات دانوں کے لیے نسلی تعصب کی صنعت آسان ہے اور وہ یہ کہہ کر بری الذمہ ہو جاتے ہیں کہ موجودہ انسانی آبادیوں میں حیاتیاتی تفریق بہت معمولی ہے، لیکن مورخوں اور ماہرین بشریت کے لیے ثقافت کو مسترد کرنا آسان نہیں۔ بھئی اگر انسانی ثقافتوں کے درمیان فرق اتنا ہی معمولی ہے تو ہمیں مورخوں اور ماہرین بشریات کو تنخواہیں دے کر ان کی تحقیق کی کیا ضرورت ہے؟

سائنس دانوں نے سامراجی منصوبے کو عملی معلومات، نظریاتی تائید اور تکنیکی اوزار فراہم کیے ہیں۔ اس کمک کے بغیر یہ ناممکن لگتا ہے کہ یورپ دنیا پر قابض ہو سکتا تھا۔ فاتحین نے اس مہربانی کا صلہ یوں ادا کیا کہ دنیا کے دور دراز کونوں میں سائنس دانوں کو معلومات اور تحفظ، ہر قسم کے عجیب و غریب منصوبوں کے لیے وسائل اور سائنسی انداز فکر کی ترسیل کی۔ بغیر سامراجی مدد کے یہ بات مشکوک ہے کہ سائنس اتنی ترقی کر لیتی۔ بہت کم سائنسی شعبے ایسے ہیں جن کی ابتدا سامراجی توسیع کی خدمت گزاری سے نہیں ہوئی، اور جو اپنی دریافتوں، دفینوں، عمارتوں اور وظیفوں کے لیے عسکری افسروں، بحریہ کے کپتانوں اور سامراجی گورنروں کے مقروض نہ ہوں۔

ظاہر ہے کہ یہ مکمل کہانی نہیں ہے۔ سائنس کی مدد سلطنتوں کے علاوہ دوسرے اداروں نے بھی کی۔ اور یورپی سلطنتوں کے استحکام اور پھیلاؤ میں سائنس کے علاوہ دوسرے نکات بھی شامل تھے۔ سائنس اور سلطنت کی حیرت انگیز ترقی کے پس پشت بالخصوص ایک اہم قوت 'سرمایہ داری' محرک تھی۔ اگر یہ کاروباری افراد دولت اکٹھی کرنے کی سعی نہ کر رہے ہوتے تو کولمبس امریکہ نہ پہنچتا، نہ جیمز کک آسٹریلیا جاتا اور نہ ہی نیل آرم اسٹرانگ نے وہ چاند پر چھوٹا سا قدم اٹھایا ہوتا۔

عقیدۂ سرمایہ داری

پیسہ سلطنتوں کی تعمیر اور سائنس کی ترقی دونوں کے لیے بہت ضروری رہا ہے۔ لیکن کیا پیسے کا حصول ہی ان دونوں عزائم کا حتمی مقصد ہے یا محض ایک پرخطر ضرورت؟

جدید تاریخ میں اقتصادیات کے کردار کو سمجھنا آسان نہیں ہے۔ پیسے نے کس طرح نئی ریاستیں قائم کیں، یا انہیں تباہ کیا، نئے افق بنائے، لاکھوں کو غلام بنایا، صنعت کا پہیہ چلایا اور سینکڑوں انواع کو مٹا دیا، اس پر بہت سی کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ لیکن جدید اقتصادی تاریخ کو سمجھنے کے لیے آپ کو واقعی صرف ایک لفظ سمجھنے کی ضرورت ہے، وہ لفظ ہے بالیدگی۔ اچھے برے حال میں، صحت مندی و بیماری میں، جدید اقتصادیات کسی ایسے نوعمر کی مانند پروان چڑھتی رہی ہے جو ہارمون سے بدمست ہو۔ یہ راہ میں آنے والی ہر شے کو ہضم کر جاتی ہے، اور آپ کے تصور سے زیادہ ہی فاصلہ عبور کر لیتی ہے۔

بیشتر تاریخ میں معیشت کا حجم یکساں رہا ہے، لیکن عالمی پیداوار بڑھ گئی۔ اس کا بیشتر سہرا آبادی میں اضافے اور نئے علاقوں میں آبادکاری کے سر رہا۔ فی کس پیداوار وہی رہی۔ لیکن دور جدید میں یہ سب بدل گیا۔ ۱۵۰۰ء میں اجناس و خدمات کی عالمی پیداوار تقریباً ڈھائی سو بلین ڈالر تھی۔ آج یہ ساٹھ ٹریلین ڈالر ہے۔ زیادہ اہم بات یہ کہ ۱۵۰۰ء میں سالانہ فی کس پیداوار اوسطاً ۵۵۰ ڈالر تھی، جب کہ آج ہر مرد زن و بچہ اوسطاً آٹھ ہزار آٹھ سو ڈالر سالانہ پیدا کر رہا ہے۔ اس تیز رفتاری کا راز کیا ہے؟

معاشیات کا مضمون اپنی پیچیدگی کے لیے مشہور ہے۔ بات کو آسان کرنے کے لیے ایک سادہ سی مثال لیجیے:

سیموئیل گریڈی، ایک عقل مند سرمایہ کار ایل ڈوراڈو کیلی فورنیا میں ایک بینک قائم کرتا ہے۔ اے اے اسٹون، ایل ڈوراڈو کا ایک ابھرتا ہوا ٹھیکیدار، اپنا پہلا بڑا ٹھیکہ ختم کر کے تقریباً ایک ملین ڈالر کی نقد ادائگی وصول کرتا ہے۔ وہ اپنی رقم گریڈی کے بینک میں جمع کرا دیتا ہے۔ اب بینک کا سرمایہ ایک ملین ڈالر ہے۔ اسی دوران جین مک ڈونٹ، ایک تجربہ کار لیکن غریب ایل ڈوراڈو کی باورچن ایک کاروباری موقع دیکھتی ہے، اس کے علاقے میں کوئی بیکری نہیں ہے۔ لیکن اس کے پاس اپنا کوئی سرمایہ بھی نہیں ہے کہ وہ ایک اچھی جگہ خریدے جس میں صنعتی چولہے، سنک، برتن اور چھریاں موجود ہوں۔ وہ بینک جا کر اپنا کاروباری منصوبہ گریڈی صاحب کو پیش کرتی ہے اور اسے قائل کر لیتی ہے کہ یہ ایک اچھی سرمایہ کاری ہوگی۔ وہ اسے ایک ملین کا قرض دے کر اس کے اکاؤنٹ میں یہ رقم جمع کر دیتا ہے۔ مک ڈونٹ اب اسٹون کو ٹھیکہ دیتی ہے کہ وہ اس کی بیکری تعمیر کر کے اس میں چیزیں بھی نصب کر دے۔

اس کی فیس ایک ملین ڈالر ہے۔ جب وہ اسے اپنے اکاؤنٹ سے ایک ملین ڈالر کا چیک دیتی ہے تو اسٹون اسے گریڈی کے بینک میں جمع کرا دیتا ہے۔ تو اب اسٹون کے اکاؤنٹ میں کتنے پیسے ہوئے؟ دو ملین ڈالر!

یہ کہانی یہیں ختم نہیں ہوتی۔ جیسا کہ ٹھیکیدار اکثر کرتے ہیں، اس منصوبے کے دوسرے مہینے میں اسٹون مک ڈونٹ سے کہتا ہے کہ ان دیکھے مسائل اور اخراجات کی وجہ سے بیکری کی تعمیر کا تخمینہ تقریباً دو ملین ڈالر ہوگا۔ مک ڈونٹ ناخوش ہوتی ہے لیکن وہ اس منصوبے کو بیچ میں تو نہیں چھوڑ سکتی۔ وہ دوبارہ بینک جا کر گریڈی صاحب کو آمادہ کرتی ہے کہ وہ اسے ایک ملین ڈالر کا اضافی قرض دے دیں۔ وہ اس کے اکاؤنٹ میں مزید ایک ملین ڈالر جمع کر دیتے ہیں۔ وہ یہ پیسے ٹھیکیدار کے اکاؤنٹ میں منتقل کر دیتی ہے۔

اب ٹھیکیدار کے اکاؤنٹ میں کتنے پیسے ہوئے؟ تین ملین۔

لیکن بینک کے پاس دراصل کتنی رقم ہے؟ ایک ملین۔ درحقیقت بس وہی ایک ملین جو شروع سے ہی بینک میں رہا ہے۔ موجودہ امریکی بینک کے قوانین اجازت دیتے ہیں کہ یہ تبادلہ سات بار مزید کیا جا سکتا ہے۔ ٹھیکیدار کے پاس دس ملین تک جمع ہو سکتے ہیں، گرچہ بینک کے پاس صرف ایک ہی ملین ہو۔ بینکوں کو اجازت ہے کہ وہ اپنے ہر ڈالر کے بدلے دس ڈالر تک قرض دے دیں۔ یعنی ہمارے بینک اکاؤنٹ کی نوے فیصد رقم نوٹوں اور سکوں کی شکل میں موجود نہیں۔ اگر بار کلے بینک کے تمام صارفین اپنی تمام رقم یک مشت واپس مانگ لیں تو بار کلے بینک فوراً بیٹھ جائے گا (سوائے اس کے کہ حکومت اس میں دخل دے کر اسے بچا لے)۔ یہی بات لائیڈ، ڈوشیا، سٹی اور دنیا کے تمام بینکوں کے لیے درست ہے۔

کیا یہ ایک عظیم پونزی اسکیم نہیں لگتی؟ لیکن اگر یہ دھوکہ ہوتا تو تمام جدید اقتصادیات دھوکہ ہے۔ دراصل یہ فریب نہیں ہے لیکن انسانی تصور کی حیرت انگیز اہلیت کو خراج تحسین ہے۔ بینک اور تمام معیشت جس عنصر پر قائم رہتے اور پھلتے پھولتے ہیں وہ مستقبل پر ہمارا اعتماد ہے۔ یہی اعتماد دنیا بھر کی تمام دولت کے پس پشت کارگر ہے۔

مثلاً بیکری کی مثال میں، ٹھیکیدار کے اکاؤنٹ کی مالیت اور بینک میں موجود نقدی کے درمیان فرق بیگم مک ڈونٹ کی بیکری ہے۔ گریڈی صاحب نے بینک کا سرمایہ اس منصوبے میں اس امید پر لگایا ہے کہ ایک دن وہ فائدہ مند ہوگا۔ ابھی تک اس بیکری میں روٹی کا ایک ٹکڑا بھی تیار نہیں ہوا ہے، لیکن گریڈی اور مک ڈونٹ اس امید میں ہیں کہ ایک سال بعد یہ ہزاروں روٹیاں، کیک بسکٹ اور رول روزانہ فروخت کر رہی ہوگی اور شاندار منافع ہوگا۔ اس وقت بیگم مک ڈونٹ اپنا قرض سود کے ساتھ واپس کر دیں گی۔ اس وقت بینک کے پاس اتنی رقم ہوگی کہ اگر اس وقت اسٹون صاحب اپنی رقم نکلوانا بھی چاہیں۔ تو یہ سارا کاروبار ایک تصوراتی مستقبل پر اعتماد پر قائم ہے۔ وہ اعتماد جو اس کاروباری اور اس بینکر کو، سپنے خوابوں کی بیکری سے وابستہ ہے، اور ٹھیکیدار کو اس بینک کے مستقبل میں استحکام سے۔

ہم نے دیکھ ہی لیا کہ پیسہ ایک حیرت انگیز چیز ہے کیوں کہ یہ بہت سی متنوع چیزوں کی علامت ہے، اور یہ کسی بھی جنس کو کسی بھی دوسری جنس سے بدل سکتی ہے۔ لیکن دور جدید سے پہلے یہ اہلیت محدود تھی۔ پیسہ زیادہ تر صرف ان چیزوں کی علامت تھا، یا انہیں ہی بدل سکتا تھا جو فعلاً حال میں وجود رکھتی تھیں۔ اس سے ترقی بہت محدود ہو جاتی تھی کیوں کہ نئے منصوبوں میں سرمایہ کاری بہت دشوار ہوتی۔

دوبارہ بیکری کی مثال پر غور کیجیے۔ اگر بیکری صرف مادی اشیا کی علامت ہوتی تو کیا مکڈونت اپنی بیکری

تعمیر کر سکتی تھی؟ نہیں، کیوں کہ فی الحال اس کے پاس محض خواب ہیں کوئی بھی ٹھوس وسائل نہیں۔ وہ بیکری اسی صورت میں تعمیر کر پاتی کہ وہ ایک ایسا ٹھیکیدار تلاش کرے جو تعمیر آج کرے لیکن مزدوری چند سال بعد قبول کرے، جب بھی وہ بیکری پیسے کمانے شروع کرے۔۔۔ افسوس، ایسے ٹھیکیدار کہاں ملتے ہیں۔ تو ہماری اس کاروباری مشکل میں بیکری کے بغیر وہ کیک نہیں بنا سکتی، کیک کے بغیر پیسے نہیں بنیں گے، بغیر پیسوں کے ٹھیکیدار رضامند نہیں ہوگا اور بغیر ٹھیکیدار کے بیکری نہیں بنے گی۔

ہزاروں سال سے انسانیت اسی جال میں گرفتار تھی۔ اسی وجہ سے معیشت ترقی نہ کر پاتی۔ اس جال سے نکلنے کا طریقہ صرف دورِ جدید میں ہی سمجھ میں آیا، جب ایسا طریقہ وضع ہوا جس کی بنیاد مستقبل پر اعتماد تھی۔ اس میں افراد تصوراتی اجناس کو قبول کرنے لگے۔ وہ جنس جو حال میں موجود بھی نہیں تھی۔ ایک ایسے قسم کا پیسہ جسے قرض کہا گیا۔ قرض ہمیں مستقبل کے مفروضے پر حال کو تعمیر کی اجازت دیتا ہے۔ اس کی بنیاد اس مفروضے پر ہے کہ ہمارے مستقبل میں وسائل ہمارے موجودہ وسائل سے بہت زیادہ فراواں ہوں گے۔ اگر ہم مستقبل کی آمدنی پر حال کی تعمیر کر سکیں تو بہت سے امکانات کے در وا ہو جاتے ہیں۔

اگر قرض ایسی ہی حیرت انگیز چیز ہے تو پہلے کسی نے اس کے بارے میں کیوں نہیں سوچا تھا؟ بالکل سوچا تھا۔ تمام معلوم انسانی ثقافتوں میں، سمیری تک، قرض کسی نہ کسی شکل میں موجود رہا ہے۔ مسئلہ یہ نہیں تھا کہ پہلے کسی کے ذہن میں یہ خیال نہیں آیا تھا یا کسی کو اس کے استعمال کا علم نہیں تھا۔ مسئلہ یہ تھا کہ لوگ کبھی اس قسم کا قرض دینا نہیں چاہتے تھے کیوں کہ انہیں یہ بھروسہ نہیں تھا کہ مستقبل حال سے بہتر ہوگا۔ ہمیشہ یہی سمجھتے تھے کہ ماضی حال سے بہتر تھا اور مستقبل حال سے بدتر ہوگا یا زیادہ سے زیادہ اسی جیسا۔ اقتصادی زبان میں اسے یوں کہیے کہ وہ سمجھتے تھے کہ موجودہ تمول کی کل مالیت اگر زوال پذیر نہیں تو محدود ضرور تھی۔ لہذا وہ اسے ایک بری شرط سمجھتے تھے کہ وہ خود ذاتی طور پر یا ان کی ریاست یا ساری دنیا دس سال بعد زیادہ متمول ہوں گے۔ کاروبار کو نفع نقصان سے سوا سمجھتے تھے۔ یقیناً کسی مخصوص بیکری کا نفع بڑھ سکتا تھا لیکن ہمسائے بیکری کی قیمت پر۔ وینس ترقی کر سکتا تھا لیکن صرف جینوا کو غریب کر کے۔ انگلستان کا بادشاہ خود کو امیر کر سکتا تھا، لیکن صرف فرانس کے بادشاہ کو لوٹ کر۔ آپ روٹی کو چاہے کتنے مختلف طریقوں سے کاٹ لیں لیکن اس کا حجم نہیں بڑھتا۔

یہی وجہ ہے کہ بہت سی ثقافتوں میں بہت زیادہ پیسے بنانا گناہ سمجھا جاتا تھا۔ اسی لیے مسیح نے کہا تھا کہ "کسی امیر آدمی کا خدا کی مملکت میں داخلے کے مقابلے میں ایک اونٹ کا سوئی کے ناکے سے گزرنا آسان ہے" (میتھیو 19:24)۔ اگر روٹی بڑی نہیں ہو سکتی اور میں نے روٹی کا ایک بڑا ٹکڑا لے لیا ہے تو میں نے یقیناً کسی کا بڑا ٹکڑا لے لیا ہے۔ امرا پر لازم تھا کہ وہ اپنی شیطانی حرکتوں کا کفارہ اپنی اضافی دولت کو خیرات کر کے کریں۔

اگر عالمی روٹی اسی حجم کی رہتی تو قرضے کی کوئی گنجائش نہیں رہ جاتی۔ آج کی روٹی اور کل کی روٹی کے درمیان فرق قرضہ ہے۔ اگر روٹی کا حجم اتنا ہی رہنا ہے، تو قرض دینے کی کیا ضرورت ہے؟ اگر آپ کو یہ یقین نہ ہو کہ آپ کا بیکر یا بادشاہ جو آپ سے قرض مانگ رہا ہے وہ کسی مدمقابل کا ٹکڑا چرا رہا ہے، تو یہ قرض دینا خطرناک ہوگا۔ تو پس جدید دنیا میں قرض حاصل کرنا دشوار تھا اور اگر آپ حاصل کر بھی لیتے تو وہ بہت کم، مختصر المعیاد اور بہت اونچی شرح سود پر ہوتا۔ لہذا نئے کاروباری نئی بیکری کی تعمیر بہت دشوار محسوس کرتے۔ عظیم شہنشاہ جو محلات کی تعمیر یا

جنگ چھیڑنا چاہتے ان کے پاس مالیہ بڑھانے یا محصول عائد کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہوتا۔ یہ کسی شہنشاہ کے لیے تو ٹھیک تھا (جب تک رعایا اس کے تابع رہتی) لیکن کسی صفائی کرنے والی ملازمہ کے لیے جسے بیکری بنانے والے کا خیال آیا ہو، اور وہ دنیا میں آگے بڑھنا چاہتی ہو، وہ تو شاہی باورخانے کا فرش صاف کرتے ہوئے اس دولت کے صرف خواب ہی دیکھ سکتی تھی۔

اس میں نقصان ہی نقصان تھا۔ کیوں کہ قرض محدود تھا تو لوگوں کو نئے کاروبار کے لیے سرمایہ تلاش کرنے میں دشواری ہوتی۔ کیوں کہ نئے کاروبار کی تعداد بہت کم ہوتی تو معیشت ترقی نہیں کر سکتی تھی۔ کیوں کہ معیشت ترقی نہیں کرتی تو لوگ سمجھتے کہ یہ کبھی نہیں بڑھے گی، اور جن کے پاس دولت تھی وہ قرض دینے میں تامل کرتے۔ جمود کی امید خود اپنا پیٹ بھرتی۔

بڑھتی ہوئی روٹی

پھر سائنسی انقلاب اور ترقی کی امید پیدا ہوئی۔ ترقی کی امید اس بنیاد پر قائم ہے کہ ہم اپنی لاعلمی قبول کریں اور تحقیق پر وسائل صرف کریں تو چیزیں بہتر ہوں گی۔ یہ نظریہ جلد ہی اقتصادی زبان میں ڈھل گیا۔ جو بھی ترقی پر یقین رکھتا ہے وہ یہ سمجھتا ہے کہ جغرافیائی دریافت، تکنیکی ایجادات اور تنظیمی بہتری سے انسانی پیداوار، تجارت اور دولت میں اضافہ ہو سکتا ہے۔ اوقیانوس میں نئے بحری راستے بحیرہ ہند کے پرانے راستوں سے الجھے بغیر دریافت ہو سکتے ہیں۔ پرانی صنعت کی پیداوار کم کیے بغیر بھی نئی صنعت کی پیداوار بڑھائی جا سکتی ہے۔ مثلاً کوئی نئی بیکری کھول سکتا ہے جو چاکلیٹ کیک اور کروسان (Croissant) بنا سکتا ہے، بغیر ان بیکریوں کو نقصان پہنچائے جو روٹی کی پیداوار میں خصوصیت رکھتی ہیں۔ ہر ایک نیا ذائقہ پیدا کرے گا اور خوراک میں اضافہ کرے گا۔ میں بغیر تمہارے غریب ہوئے بھی امیر ہو سکتا ہوں۔ میرے موٹاپے کے لیے تمہارا بھوک سے مرنا ضروری نہیں۔ ساری دنیا کی روٹی بڑھ سکتی ہے۔

پچھلے پانچ سو سالوں میں ترقی کے خیال نے لوگوں کو مستقبل پر زیادہ سے زیادہ بھروسہ کرنا سکھایا ہے۔ اس بھروسے سے قرض نے جنم لیا۔ قرض سے اصل اقتصادی ترقی ہوئی اور ترقی نے مستقبل پر اعتماد کو مستحکم کیا، اور مزید قرض کی راہ ہموار ہوئی۔ یہ راتوں رات نہیں ہو گیا تھا۔ معیشت کسی غبارے کی بجائے ایک رولر کوسٹر کی مانند تھی۔ لیکن وقت کے ساتھ جیسے رکاوٹیں ہٹیں تو عمومی سمت صاف ظاہر تھی۔ آج دنیا میں اتنا قرض مہیا ہے کہ حکومتیں، کاروباری، کارپوریشن اور افراد باآسانی بڑی رقوم، طویل المیعاد اور کم شرح سود پہ حاصل کر سکتے ہیں، ان کی موجودہ آمدنی سے بہت زیادہ۔

عالمی وسائل میں اضافے پر یقین جلد ہی انقلابی صورت اختیار کر گیا۔ ۱۷۷۶ میں اسکاٹش ماہر اقتصادیات ایڈم اسمتھ نے "قوموں کا تمول" (Weath of nations) شائع کیا، غالباً کسی بھی دور میں شائع ہونے والا سب سے اہم اقتصادی آئین۔ اس کی پہلی جلد کے ابتدائی آٹھ ابواب میں اسمتھ نے یہ انوکھی دلیل پیش کی: جب کوئی زمیں دار، بافت کا ماہر کاریگر یا جفت ساز اپنے خاندان کی ضروریات سے زیادہ کماتا ہے، تو وہ اپنے نفع میں مزید اضافے کے لیے اپنی اضافی رقم سے مزید مددگار بھرتی کرتا ہے۔ جتنا زیادہ منافع اتنے ہی زیادہ مددگار

ملازم بھرتی کیے جاسکتے ہیں۔یعنی کاروباری افراد کے منافع میں اضافہ ہی اجتماعی تمول اور ترقی کی بنیاد ہے۔

اس میں شاید آپ کو کوئی خاص بات محسوس نہ ہو، کیوں کہ ہم ایک سرمایہ دارانہ دنیا میں رہتے ہیں جو اسمتھ کی دلیل کو فطری سمجھتی ہے۔ہم روزمرہ خبروں میں اس نظریے کی مختلف تشریحات سنتے ہیں۔لیکن اسمتھ کا یہ خیال کہ ذاتی منافع میں اضافے کی خودغرضانہ انسانی خواہش ہی اجتماعی تمول کی بنیاد ہے، یہ انسانی تاریخ کے سب سے انقلابی دلائل میں سے ایک ہے۔ یہ محض اقتصادی اعتبار سے ہی انقلابی نہیں، یہ سیاسی، وراخلاقی طور پر بھی انقلابی تھا۔درحقیقت اسمتھ یہ کہہ رہا تھا کہ لالچ اچھی چیز ہے، اور زیادہ امیر ہونے سے سب کو فائدہ پہنچایا جاسکتا ہے، صرف اپنے آپ کو ہی نہیں۔خودغرضی دراصل ایثار ہے۔

اسمتھ نے لوگوں کو یہ سوچنا سکھایا کہ معیشت سے سب فائدہ اٹھ سکتے ہیں، جس میں میرے منافع میں آپ کا بھی فائدہ ہے۔ہم دونوں بیک وقت وسائل سے ایک بڑا حصہ وصول کر سکتے ہیں۔اگر میں مفلس ہوں تو آپ بھی مفلس ہوں گے کیوں کہ اب میں آپ کی صنعت وخدمت نہیں خرید سکتا۔اگر میں مالدار ہوں تو آپ بھی مالدار ہوں گے کیوں کہ پھر آپ مجھے کچھ فروخت کرسکیں گے۔اسمتھ نے دولت اور اخلاقیات کے درمیان روایتی تضاد کی تردید کی اور امرا کے لیے جنت کے دروازے کھول دیے۔مالدار ہونے کا مطلب تھا زیادہ بااخلاق۔اسمتھ کی کہانی میں افراد اپنے ہمسایوں کی بربادی سے مالدار نہیں ہوتے بلکہ وسائل میں عمومی اضافے سے ہوتے ہیں۔جب وسائل میں اضافہ ہوتو سب ہی فائدہ اٹھاتے ہیں۔لہٰذا معاشرے میں مالدار افراد ہی سب سے زیادہ اہم اور مفید افراد ہیں، کیوں کہ وہ ہر ایک کے مفاد میں ترقی کا پہیہ چلاتے رہتے ہیں۔

لیکن اس کا دارومدار اس پر ہے کہ امرا دولت کو غیر پیداواری چیزوں پر ضائع کرنے کے بجائے نئی فیکٹریاں لگائیں اور نئے ملازمین بھرتی کریں۔گویا اسمتھ نے وہی پرانا منتر دہرایا کہ ' جب منافع بڑھے گا تو زمیں دار یا یافت کار زیادہ مددگار بھرتی کرے گا"، بجائے اس کے کہ "جب منافع بڑھے تو کنجوس اپنا پیسہ کسی صندوق میں بند کردے اور صرف اس وقت نکالے جب اسے سکے گننے ہوں"۔تو اس جدید سرمایہ دارانہ معیشت کا ایک اہم حصہ ایک نئی اخلاقیات کی ابتدا تھی، جس میں منافع کو دوبارہ صنعت میں ہی لگانا تھا۔اس سے مزید منافع پیدا ہوتا جسے دوبارہ صنعت میں لگا دیا جاتا، جس سے مزید منافع پیدا ہوتا، وغیرہ۔سرمایہ کاری کئی مختلف طریقوں سے کی جاسکتی ہے۔مثلاً فیکٹری میں اضافہ، سائنسی تحقیقات، نئی پیداواری صلاحیت۔پھر بھی اس تمام سرمایہ کاری سے کسی طرح پیداوار میں اضافہ اور زیادہ منافع پیدا ہونا ضروری تھا۔اس نئے سرمایہ دارانہ آئین میں سب سے مقدس حکم یہ تھا کہ "پیداوار سے پیدا ہونے والے منافع کو دوبارہ پیداوار میں اضافے کے لیے لگانا ضروری ہے"۔

اسی لیے سرمایہ داری کو سرمایہ داری کہتے ہیں۔سرمایہ داری سرمائے کو تمول سے ممتاز کرتی ہے۔سرمایہ پیسے، اشیا اور وسائل پر مشتمل ہے جسے پیداوار میں لگایا جاتا ہے۔جب کہ دولت یا تو زیرزمین چھپادی جاتی ہے یا غیر پیداواری امور پر صرف ہوتی ہے۔کوئی فرعون جو سرمائے کو غیر پیداواری اہرام پر خرچ کرے وہ سرمایہ دار نہیں ہے۔کوئی بحری قزاق جو اسپین کے خزانے کے جہاز کو لوٹ کر چمکدار سونے سے بھرے صندوق غرب الہند کے کسی ساحل میں دفنادے وہ بھی سرمایہ دار نہیں ہے۔لیکن فیکٹری کا کوئی محنتی مزدور جو اپنی آمدنی کا ایک حصہ دوبارہ حصص کے بازار میں لگادے وہ سرمایہ کار ہے۔

یہ خیال کہ پیداواری منافع کو دوبارہ پیداوار میں لگانا ضروری ہے، بظاہر معمولی دکھائی دیتا ہے لیکن تمام تاریخ یہ افراد کی آنکھوں سے اوجھل رہا۔ قبل از جدید لوگوں کا خیال تھا کہ پیداوار ایک ہی جیسی رہتی ہے۔ لہذا اگر کچھ بھی کرنے سے پیداوار میں اضافہ نہیں ہوتا تو اپنا منافع اس میں لگانے کی کیا ضرورت ہے؟ لہذا قدیم معززین رحم دلی اور دکھاوے کے اخراجات کو عزیز رکھتے۔ وہ اپنے وسائل کھیل کے مقابلوں، ضیافتوں، محلوں، جنگوں، سخاوتوں اور عظیم الشان کلیساؤں پر خرچ کرتے۔ کم ہی لوگ اپنے منافع کو دوبارہ اپنی زمین کی پیداوار بڑھانے، بہتر نسل کی گندم یا نئی مارکیٹوں کی تلاش میں خرچ کرتے۔

دور جدید میں ان اشرافیہ کی جگہ نئے ممتاز افراد نے لے لی ہے جو سرمایہ دارانہ آئین کے سچے پیروکار ہیں۔ یہ نئے سرمایہ دار امرا، ڈیوک اور مارکیز نہیں، بلکہ بورڈ کے چیرمین، حصص کے کاروباری اور صنعتکار ہیں۔ یہ امرا قدیم اشرافیہ سے کہیں زیادہ دولت مند ہیں۔ لیکن یہ نمائشی فضول خرچی میں زیادہ دلچسپی نہیں رکھتے، اور اپنے منافع کا بہت کم حصہ غیر پیداواری چیزوں پر صرف کرتے ہیں۔

قدیم اشرافیہ ریشم اور سونے کے رنگدار کپڑے پہنتے، اور اپنا بیشتر وقت ضیافتوں، میلوں اور قابل دید مقابلوں میں شرکت کر کے صرف کرتے۔ اس کے مقابلے میں کوئی جدید سربراہ ایک غیر پرکشش یونی فارم پہنتا ہے جسے سوٹ کہتے ہیں، جس میں ملبوس وہ کووں کی ایک ڈار نظر آتے ہیں۔ ان کے پاس تقریبات کے لیے زیادہ وقت نہیں ہوتا۔ ایک عام سرمایہ کار اس تلاش میں کہ وہ اپنا سرمایہ کہاں لگائے، ایک تجارتی میٹنگ سے دوسری کی جانب دوڑتا ہے، اور اپنے حصص و بانڈ کے نرخ میں اتار چڑھاؤ کا مطالعہ کرتا ہے۔ یہ درست ہے کہ اس کا سوٹ ورساچی (Versace) کا بنا ہوا ہوتا ہے، اور ممکن ہے کہ وہ ذاتی طیارے میں سفر کرے، لیکن یہ خرچ اس کے مقابلے میں کچھ نہیں جو وہ انسانی پیداوار میں اضافے کے لیے کرتا ہے۔

یہ صرف ورساچی میں ملبوس کاروباری مغل ہی نہیں ہیں جو پیداوار میں اضافے کے لیے سرمایہ کاری کرتے ہیں۔ عام افراد اور حکومتی ادارے بھی ان ہی خطوط پر سوچتے ہیں۔ جدید محلوں میں عشائیے پر گفتگو کتنی ہی بار اس لا متناہی بحث کی جانب مڑ جاتی ہے کہ پیسہ حصص کی مارکیٹ، بانڈ یا جائیداد میں لگایا جائے۔ حکومتیں بھی اپنے مالیے کی آمدنی ایسے پیداواری کاروبار میں لگاتی ہیں، جس سے ان کے مستقبل کی آمدنی میں اضافہ ہو سکے۔ مثلاً نئی بندرگاہوں کی تعمیر سے فیکٹریوں کو اپنی پیداوار کی برآمد میں آسانی ہوگی، جس سے ان کی قابل مالیہ آمدنی میں اضافہ ہوگا، جس سے حکومت کی مستقبل کی آمدنی میں اضافہ ہوگا۔ کوئی اور حکومت ممکن ہے تعلیم میں سرمایہ کاری کرے، اس امید پر کہ تعلیم یافتہ افراد جدید ٹیکنالوجی کی منافع بخش صنعت لگائیں گے، جو بہت وسیع بندرگاہوں کی سہولیات کا ڈھیر سارا مالیہ ادا کریں گی۔

سرمایہ کاری معاشیت کے ایک نظریے پر عمل کے طور پر شروع ہوئی تھی، جو مفصل بھی تھا اور تعمیری بھی۔ اس میں یہ بیان تھا کہ پیسہ کیسے کام کرتا ہے، اور یہ تفصیل کہ منافع کی دوبارہ سرمایہ کاری سے تیز رفتار اقتصادی ترقی حاصل کی جا سکتی ہے۔ لیکن سرمایہ داری جلد ہی ایک معاشی دستاویز سے زیادہ ہوگئی، اب یہ ایک طریقہ بن گئی۔ لوگوں کے رویے، ان کے بچوں کی تعلیم اور ان کی فکر تک کے بارے میں تعلیمات کا ایک سلسلہ۔ اس کا بنیادی وظیفہ یہ ہے کہ اقتصادی طریقہ ہی عظیم سچائی ہے، یا کم از کم عظیم سچائی کا استعارہ، کیوں کہ آزادی، انصاف اور

مسرت تک کا انحصار اقتصادی ترقی پر ہے۔ کسی سرمایہ دار سے دریافت کیجیے کہ زمبابوے یا افغانستان جیسی جگہوں پر انصاف اور سیاسی آزادی کیسے پہنچائی جا سکتی ہے، تو امکان یہ ہے کہ آپ کو ایک لیکچر سننے کو ملے گا کہ معاشی تمول اور خوشحال درمیانہ طبقہ کیسے مستحکم جمہوری اداروں کے لیے ضروری ہیں، اور کیوں کر افغان قبائل کو آزاد تجارت، احتیاط اور خود انحصاری کے بنیادی اصول اپنانے چاہئیں۔

اس نئے مذہب نے نئی سائنس کی ترویج میں بھی فیصلہ کن کردار ادا کیا۔ سائنسی تحقیق پر عموماً حکومتیں یا نجی کاروبار سرمایہ لگاتے ہیں۔ جب سرمایہ دار حکومتیں اور کاروبار کسی مخصوص سائنسی پراجیکٹ میں سرمایہ لگاتے ہیں تو عموماً پہلا سوال یہ ہوتا ہے کہ کیا اس پراجیکٹ سے ہماری پیداوار اور منافع میں اضافہ ہوگا؟ کیا اس سے معاشی ترقی ہوگی؟ کوئی ایسا پراجیکٹ جو یہ رکاوٹیں عبور نہ کر سکے اسے کوئی سرمایہ کار ملنے کا امکان نہیں۔ جدید سائنس کی کوئی تاریخ سرمایہ داری کو منظر سے باہر نہیں نکال سکتی۔

دوسری جانب سرمایہ داری کی تاریخ سائنس کے ملاحظہ کے بغیر نامکمل ہے۔ سرمایہ داری کا مستقل معاشی ترقی پر ایمان، کائنات کے بارے میں ہمارے تمام تصورات کے برعکس ہے۔ بھیڑیوں کا کوئی معاشرہ جو یہ یقین رکھے کہ دنبوں کی فراہمی ہمیشہ جاری رہے گی، انتہائی احمقوں پر مشتمل ہوگا۔ لیکن انسانی معیشت بہرحال تمام جدید دور میں ترقی کرتی ہی رہی ہے۔ اس میں سائنس کا بہت حصہ ہے جو ہر چند سال بعد کوئی نئی ایجاد، کوئی نیا کھلونا دریافت کر لیتی ہے۔ مثلاً براعظم امریکہ، اندرونی ایندھن (combustion) کا انجن یا جینیاتی طور پر تبدیل شدہ بھیڑ۔ بینک اور حکومتیں پیسہ چھاپتی ہیں لیکن بالآخر یہ سائنسدان ہیں جو یہ خرچ اٹھاتے ہیں۔

گزشتہ چند سالوں سے بینک اور حکومتیں بہت تیزی سے پیسہ چھاپ رہی ہیں۔ ہر ایک خوفزدہ ہے کہ موجودہ اقتصادی بحران سے معاشی ترقی رک نہ جائے۔ لہٰذا وہ کھربوں ڈالر، یورو اور ین بلا کسی بنیاد کے چھاپ رہے ہیں۔ نظام میں بہت سستا قرضہ مہیا کر رہے ہیں۔ سب اس امید میں ہیں کہ اس بلبلے کے پھوٹنے سے پہلے سائنس دان، ٹیکنیشن یا انجینیر پھر کسی بڑی دریافت میں کامیاب ہو جائیں گے۔ ہر شے کا دارومدار لیبارٹری میں موجود افراد پر ہے۔ ان شعبوں میں نئی ایجادات مثلاً بایوٹیکنالوجی اور نانوٹیکنالوجی سے مکمل نئی صنعتیں کھل جائیں گی، جن کے منافع سے ان کھربوں کی رقم کو بنیاد فراہم ہوگی، جو حکومتیں اور بینک ۲۰۰۸ سے چھاپ رہے ہیں۔ اگر یہ بلبلہ پھوٹنے سے پہلے سائنس دانوں نے یہ امید پوری نہیں کی تو ہم بہت برے وقت کی جانب بڑھ رہے ہیں۔

کولمبس سرمایہ کار کی تلاش میں

سرمایہ داری نے نہ صرف جدید سائنس بلکہ یورپی سامراج کے ارتقا میں بہت فیصلہ کن کردار ادا کیا۔ اور یہ یورپی سامراج ہی تھا جس نے سب سے پہلے سرمایہ دارانہ قرضے کا نظام متعارف کرایا۔ ظاہر ہے کہ قرض کا آغاز جدید یورپ سے نہیں ہوا تھا۔ یہ تمام زرعی معاشروں میں موجود تھا، اور ابتدائی جدید دور میں یورپی سرمایہ داری ایشیا کی اقتصادی ترقی سے قریبی طور پر وابستہ تھی۔ یاد رہے کہ اٹھارویں صدی کے اواخر تک ایشیا دنیا کی اقتصادی طاقت تھی، یعنی یورپ کے پاس چینیوں، مسلمانوں اور ہندوستانیوں کے مقابلے میں خرچ کرنے کے لیے بہت کم زر مہیا تھا۔

لیکن چین، انڈیا اور مسلم دنیا میں قرض بہت ثانوی کردار ادا کرتا تھا۔ استنبول، اصفہان، دہلی اور بیجنگ کے بینکار اور تاجر شاید سرمایہ سوچ رکھتے ہوں۔ لیکن محلوں اور قلعوں میں مقیم بادشاہ اور جنرل، تاجروں اور تاجرانہ سوچ کو ناپسند کرتے تھے۔ دور جدید کے اوائل کی بیشتر غیر یورپی سلطنتیں اور عظیم فاتحین مثلاً نوراسی اور نادر شاہ، یا نوکرشاہی اور فوجی. مرا کی قائم کردہ چن اور عثمانیہ سلطنتیں مالیہ اور روٹ مار سے دولت جمع کرتیں (دونوں میں بہت زیادہ فرق کے بغیر)۔ اس میں قرضے کا زیادہ دخل نہیں تھا اور انہیں بینکروں یا سرمایہ داروں سے زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔

جب کہ دوسری جانب یورپ میں بادشاہوں اور جرنیلوں نے بتدریج تاجرانہ فکر اپنا لی۔ یہاں تک کہ تاجر اور بینکر ہی حاکم امرا بن گئے۔ دنیا بھر میں یورپی فتوحات کی سرمایہ کاری زیادہ تر مالیے کے بجائے قرضے سے ادا کی جا رہی تھی۔ اب زیادہ تر سرمایہ داری ہی ان کا رخ متعین کرتی، جس کا مقصد ہی اپنے سرمائے پر زیادہ سے زیادہ منافع وصول کرنا ہوتا۔ فراک کوٹ اور اونچی ٹوپیوں میں ملبوس تاجروں اور بینکروں کی قائم کی ہوئی سلطنتوں نے نقرئی لباس اور چمکدار زرہ بکتر میں ملبوس بادشاہوں اور امرا کی بنائی سلطنتوں کو شکست سے دوچار کیا۔ تجارتی سلطنتیں اپنی فتوحات کی سرمایہ کاری میں کہیں زیادہ عقلمند تھیں۔ کوئی بھی مالیہ ادا کرنا نہیں چاہتا، لیکن سرمایہ لگانے کو سب تیار ہوتے ہیں۔

۱۴۵۴ میں کرسٹوفر کولمبس نے پرتگال کے بادشاہ سے درخواست کی کہ وہ ایک بحری بیڑے میں سرمایہ لگائے جو مغرب کی جانب مشرقی ایشیا پہنچنے کے نئے راستے دریافت کرے۔ یہ مہم بہت پر خطر اور مہنگی تھی۔ جہاز سازی، ساز و سامان کی خریداری، ملاحوں کی تنخواہ اور بحری فوج کے لیے خطیر رقم درکار تھی، اور کوئی ضروری نہیں تھا کہ اس سرمایہ کاری سے کوئی فائدہ بھی حاصل ہوتا۔ پرتگال کے بادشاہ نے انکار کر دیا۔

موجودہ دور کے کسی نئے کاروباری کی مانند کولمبس نے بھی ہمت نہیں ہاری۔ اس نے اپنا خیال یورپ کے دیگر ممکنہ سرمایہ کاروں کے سامنے پیش کیا۔ اٹلی، فرانس، انگلستان اور پھر دوبارہ پرتگال ہر بار اسے مسترد کر دیا گیا۔ اس نے نئے متحدہ اسپین کے فرڈیننڈ اور ازابیلا کے دربار میں قسمت آزمائی کی۔ وہ اپنے ساتھ کچھ تجربہ کار ترغیب کار لے گیا اور ان کی مدد سے ملکہ ازابیلا کو سرمایہ کاری پر آمادہ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ جیسا کہ اب اسکول کے بچوں کو بھی علم ہے ازابیلا کی تو لاٹری نکل آئی۔ کولمبس کی دریافتوں سے اسپین امریکہ کو فتح کرنے میں کامیاب رہا، جہاں انہوں نے سونے اور چاندی کی کانیں کھودیں، گنے اور تمباکو کی کاشت کی، جس سے اسپین کے بادشاہ، بینکار اور تاجر اپنے خوابوں سے بھی زیادہ دولت مند ہو گئے۔

سو سال بعد شہزادے اور بینکار کولمبس کے وارثوں کو مزید قرضہ دینے پر آمادہ تھے۔ ان کے پاس سرمایہ بھی زیادہ تھا جو امریکہ میں لوٹ مار سے جمع ہوا تھا۔ اس سے زیادہ اہم بات یہ کہ شہزادوں اور بینکاروں کو مہمات پر اعتماد ہو گیا تھا اور وہ رقم خرچ کرنے پر آمادہ تھے۔ سامراجی سرمایہ داری کا یہ جادوئی دائرہ تھا: نئی دریافتوں کے لیے قرضے کی سرمایہ کاری، دریافتوں سے نئی کالونیوں کی تعمیر، کالونیوں سے حاصل مالی فوائد؛ ان فوائد سے اعتماد کی بحالی؛ اعتماد کی وجہ سے مزید قرضے کی فراہمی۔ نوراسی اور نادر شاہ کا چند ہزار میل بعد زاد راہ ختم ہو گیا، جب کہ سرمایہ دار کاروباری اپنی ہر فتح کے ساتھ مزید مالی تقویت حاصل کرتے رہے۔

لیکن یہ مہمات بہرحال اتفاقی معاملے تھے لہٰذا قرضے کی فراہمی محتاط رہی۔ بہت سی مہمات یورپ خالی ہاتھ واپس لوٹیں، وہ کوئی قیمتی چیز دریافت نہ کر سکیں۔ مثلاً انگریزوں نے ایشیا تک قطب شمالی کے راستے ایک شمالی

مغربی گزرگاہ کی دریافت میں بہت پیسہ ضائع کیا، کئی مہمات تو واپس ہی نہیں لوٹیں۔ جہاز طوفانی تودوں سے ٹکرا گئے، منطقہ حارہ کے طوفانوں کی نذر ہوئے یا بحری قزاقوں کا نوالہ بنے۔ ممکنہ سرمایہ داروں کی تعداد بڑھانے کے لیے اور ان کے نقصان میں کمی کی خاطر یورپ والوں نے محدود ذمہ داری کی اشتراکی حصص کمپنیاں قائم کیں۔ بجائے اس کے کہ ایک ہی سرمایہ دار ایک تنہا خطرناک مہم پر ساری رقم لگا دیتا، یہ مشترکہ حصص والی کمپنیاں بہت سے سرمایہ کاروں سے پیسہ وصول کرتیں۔ یوں ہر ایک اپنے سرمایہ کے ایک چھوٹے حصے کا خطرہ مول لیتا۔ یوں نقصان کا اندیشہ تو کم ہو جاتا لیکن فوائد پر کوئی حد قائم نہیں تھی۔ درست جہاز پر ایک معمولی سرمایہ کاری بھی آپ کو لکھ پتی بنا سکتی تھی۔

گزرتی دہائیوں کے ساتھ مغربی یورپ نے ایسے قرینے کے مالیاتی نظام کو فروغ دیا جس سے مختصر مدت میں بڑی تعداد میں قرضہ نجی تاجروں اور حکومتوں کو مہیا ہو جاتا۔ اس نظام میں مہمات اور فتوحات کسی بادشاہت یا سلطنت سے کہیں زیادہ بہتر طریقے سے سرمایہ حاصل کر سکتی ہیں۔ قرضے کی اس نئی طاقت کی مثال اسپین اور ولندیز کے درمیان کش مکش میں دیکھی جا سکتی تھی۔ سولہویں صدی میں اسپین یورپ کی سب سے طاقت ور ریاست تھی جس کے ماتحت ایک وسیع عالمی سلطنت تھی۔ یہ بیشتر یورپ، شمالی اور جنوبی امریکہ کے حصوں، فلپائن کے جزائر اور ایشیا و افریقہ کے ساحلوں کے کچھاڑوں پر حاکم تھی۔ ہر سال امریکہ اور ایشیائی خزانوں سے لدے بحری جہاز کاڈیز اور اشبیلا کی بندرگاہوں پر لنگر انداز ہوتے۔ ہالینڈ ایک چھوٹا، طوفانی ہواؤں میں گھرا دلدلی علاقہ تھا، کسی قدرتی وسائل سے محروم۔ اسپین کے بادشاہ کی ریاستوں میں ایک چھوٹا سا کونا۔

۱۵۶۸ میں ولندیزی جو زیادہ تر پروٹسٹنٹ تھے، انہوں نے اپنے کیتھولک اسپینش حکمران کے خلاف بغاوت کر دی۔ ابتدا میں یہ باغی ڈان کیوزاٹ کا کردار ادا کرتے معلوم ہوتے تھے، جو بہادری سے ناقابل فتح ہوائی چکیوں کا رخ موڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔ لیکن اسی سال کی مدت میں ہالینڈ نے نہ صرف اسپین سے آزادی حاصل کر لی تھی بلکہ اسپین اور ان کے پرتگالی حلیفوں سے سمندری گزرگاہوں کی حکمرانی بھی چھین لی تھی، ایک عالمی ولندیزی سلطنت قائم کر لی اور یورپ کی امیر ترین ریاست بن گئے۔

ولندیز کی کامیابی کا راز قرضہ تھا۔ ولندیزی شہری باشندے جو زمینی جنگ میں دلچسپی نہیں رکھتے تھے، انہوں نے اسپین سے جنگ کے لیے کرائے کے فوجی بھرتی کیے، جب کہ خود ولندیزی بڑے بحری بیڑوں میں سمندروں میں نکل گئے۔ کرائے کے فوجیوں اور توپوں سے لدے بیڑوں پر کثیر رقم خرچ ہوئی، لیکن اسپین کی عظیم سلطنت کے مقابلے میں ولندیزی اپنی فوجی مہمات کے لیے سرمایہ اکٹھا کرنے میں زیادہ کامیاب رہے۔ کیوں کہ وہ تیزی سے بڑھتے یورپی معاشی نظام کا اعتماد حاصل کرنے میں کامیاب تھے۔ ایک ایسے وقت میں جب کہ بادشاہ کی لاپرواہی سے اس پر اعتماد کو زنگ لگ رہا تھا۔ سرمایہ کاروں نے ولندیزوں کو اتنا سرمایہ فراہم کیا کہ وہ فوجیں اور بیڑے قائم کریں۔ ان فوجوں اور بحری بیڑوں نے عالمی تجارتی راستوں پر ولندیز کو حاکمیت فراہم کی، جس سے بہترین منافع حاصل ہوا۔ اس منافع سے ولندیزیوں نے قرض اتارا جس سے سرمایہ داروں کا اعتماد مزید بڑھ گیا۔ ایمسٹرڈیم بہت تیزی سے نہ صرف یورپ کی اہم ترین بندرگاہوں میں شامل ہو رہا تھا بلکہ اس براعظم کا معاشی مکہ بن رہا تھا۔

ولندیز نے معاشی نظام کا اعتماد کیسے حاصل کیا؟ سب سے پہلے تو وہ اپنا قرض مقررہ وقت پر پوری رقم لوٹانے میں بہت ذمہ دار تھے۔ جس سے سرمایہ داروں کو قرض دینے میں خطرہ محسوس نہیں ہوتا تھا۔ دوسرے یہ کہ ان

کے ملک کا نظامِ انصاف آزاد اور محفوظ نجی حقوق پر قائم تھا، بالخصوص نجی ملکیت کے حقوق۔ سرمایہ ان آمرانہ ریاستوں سے نکلنے لگتا ہے جو نجی فرد اور اس کی ملکیت کی ضمانت نہ دیں۔ اور یہ ان ریاستوں میں منتقل ہو جاتا ہے، جہاں قانون کا بول بالا ہو اور نجی ملکیت محفوظ ہو۔

تصور کیجیے کہ آپ ایک مستحکم جرمن سرمایہ داروں کے خاندان کی اولاد ہیں۔ آپ کے والد کو بڑے یورپی شہروں میں اپنے کاروبار کے نئے مراکز کھولنے کا موقع نظر آتا ہے۔ وہ دس ہزار نقرئی سکے سرمایہ کاری کے لیے آپ کو ایمسٹرڈیم اور آپ کے چھوٹے بھائی کو میڈرڈ بھیجتا ہے۔ آپ کا بھائی اپنے ابتدائی سرمائے سے اسپین کے بادشاہ کو قرض دیتا ہے جسے فرانس کے بادشاہ سے جنگ کے لیے سرمایہ درکار ہے۔ جب کہ آپ اپنا سرمایہ ایک ولندیزی تاجر کو دیتے ہیں جو مین ہٹن نامی کسی ویران جزیرے کے جنوبی کونے میں ایک اجاڑ زمین خریدنا چاہتا ہے۔ اسے یقین ہے کہ دریائے ہڈسن کا ایک اہم تجارتی راستہ بن جانے کے بعد اس زمین کی قیمت آسمان سے باتیں کرنے لگے گی۔ دونوں قرضوں کی وصولی ایک سال بعد طے ہوئی ہے۔

سال گزر جاتا ہے۔ وہ ولندیزی تاجر خریدی زمین بہترین منافع کے ساتھ فروخت کرتا ہے، اور آپ کو آپ کی اصل رقم طے شدہ سود کے ساتھ واپس کرتا ہے۔ آپ کے والد بہت خوش ہوتے ہیں، لیکن میڈرڈ میں آپ کا چھوٹا بھائی پریشان ہے۔ فرانس کے بادشاہ کے خلاف جنگ اسپین کے بادشاہ کے لیے اچھی ثابت ہوئی، لیکن اب وہ ترکوں سے ایک جنگ میں الجھ گیا ہے۔ اس جنگ کے لیے اسے ہر پیسے کی ضرورت ہے، اور اس کے خیال میں پرانے قرضے واپس سے یہ کہیں زیادہ اہم کام ہے۔ آپ کا بھائی محل میں یادداشتیں روانہ کرتا ہے اور دربار میں موجود اپنے دوستوں سے مدد کی درخواست کرتا ہے، لیکن کوئی فائدہ نہیں۔ نہ صرف آپ کے بھائی نے طے شدہ منافع حاصل نہیں کیا بلکہ اس نے اصل رقم بھی کھو دی۔ آپ کے والد خوش نہیں ہیں۔

اس معاملے میں مزید خرابی اس وقت پیدا ہوئی جب بادشاہ نے اپنا ہرکارہ آپ کے بھائی کے پاس بھیج کر اس پر یہ واضح کر دیا کہ اسے اسی رقم کا ایک اور قرضہ فوری طور پر درکار ہے۔ آپ کے بھائی کے پاس دینے کے لیے کچھ نہیں۔ آپ کا بھائی اپنے باپ کو لکھتا ہے، انہیں اس بات پر آمادہ کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ اس بار بادشاہ رقم یقیناً واپس کر دے گا۔ خاندان کے اس سربراہ کو اپنے چھوٹے بیٹے سے بہت پیار ہے وہ آزردہ دل کے ساتھ مزید رقم ادھار دینے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ مزید دس ہزار نقرئی سکے اسپین کے خزانے میں دوبارہ کبھی نہ دیکھے جانے کے لیے غائب ہو جاتے ہیں۔ اسی دوران ایمسٹرڈیم میں حالات بہت بہتر ہو گئے ہیں۔ آپ کاروباری سوجھ بوجھ کے حامل ولندیزی تاجروں کو قرضے پر قرضہ دیتے ہیں جو اسے وقت پر واپس کر دیتے ہیں۔ لیکن پھر قسمت آپ کا ساتھ چھوڑ دیتی ہے۔ آپ کے ایک گاہک کا خیال ہے کہ کھڑاؤں پیرس کا آئندہ فیشن ہوگا، اور وہ آپ سے قرض مانگتا ہے تاکہ فرانس کے دارالخلافے میں جوتوں کی ایک دکان کھول سکے۔ آپ اسے پیسے دیتے ہیں لیکن بدقسمتی سے کھڑاؤں فرانسیسی خواتین میں مقبولیت حاصل نہیں کرتیں، اور ناکام تاجر قرض واپس کرنے سے انکار کر دیتا ہے۔

آپ کے والد شدید غصے میں ہیں، اور آپ دونوں سے کہتے ہیں کہ اب وقت آ گیا ہے کہ قانون کا سہارا لیا جائے۔ آپ کا بھائی میڈرڈ میں بادشاہ پر نالش کرتا ہے جب کہ آپ سابقہ کھڑاؤں کے تاجر پر ایمسٹرڈیم میں مقدمہ کرتے ہیں۔ اسپین میں عدالتیں بادشاہ کی ماتحت ہیں۔ جج حضرات بادشاہ کے اشارے پر کام کرتے ہیں اور

اسے ناراض کرنے سے خوفزدہ ہیں۔ ہالینڈ میں عدالتیں حکومت کی ایک علیحدہ شاخ ہیں اور وہ ملک کے شاہزادوں یا شہریوں سے خوف زدہ نہیں۔ میڈرڈ کی عدالت آپ کے بھائی کا مقدمہ خارج کر دیتی ہے۔ جب کہ ایمسٹرڈیم کی آپ کے حق میں فیصلہ دیتی ہے اور اس تاجر کے اثاثے رہن رکھ کر اسے ادائیگی پر مجبور کرتی ہے۔ آپ کے والد کو سبق مل گیا کہ بادشاہوں کے مقابلے میں تاجروں سے کاروبار کرنا زیادہ بہتر ہے اور میڈرڈ کے مقابلے میں ہالینڈ کی فضا زیادہ سازگار ہے۔

آپ کے بھائی کی مشکلات کا اختتام نہیں ہوا۔ اسپین کے بادشاہ کو اپنی فوج کی ادائیگی کے لیے رقم کی اشد ضرورت ہے۔ اسے یقین ہے کہ آپ کے بھائی کے پاس اضافی رقم یقیناً موجود ہے۔ لہٰذا وہ بھائی پر غداری کا جھوٹا مقدمہ قائم کرتا ہے۔ اگر وہ فوراً بیس ہزار نقرئی سکے فراہم نہ کر سکا تو تادمِ مرگ قید میں سڑے گا۔

آپ کے والد کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہے۔ وہ اپنے لاڈلے بیٹے کے لیے تاوان ادا کر دیتا ہے، لیکن دوبارہ کبھی اسپین میں کاروبار نہ کرنے کی قسم کھاتا ہے۔ وہ اپنی میڈرڈ کی شاخ بند کر کے آپ کے بھائی کو روٹرڈیم منتقل کر دیتے ہیں۔ اب وہ ولندیزی شاخیں ایک بہت اچھا خیال معلوم ہوتا ہے۔ انھیں پتہ چلتا ہے کہ خود اسپین کے سرمایہ کار اپنا سرمایہ ملک سے باہر بھیج رہے ہیں۔ وہ خود بھی سمجھ گئے ہیں کہ اگر وہ اپنی رقم برقرار رکھنا چاہتے ہیں، اور اس سے مزید دولت کمانے کے خواہاں ہیں تو بہتر ہے کہ وہ اپنا سرمایہ کہیں اور لگائیں، جہاں قانون کا بول بالا ہو، اور جہاں نجی املاک کی قدر ہو، مثلاً ہالینڈ میں۔

اس طرح اسپین کے بادشاہ نے سرمایہ کاروں کا اعتماد کھو دیا، جب کہ عین اسی زمانے میں ولندیزی تاجروں نے ان کا اعتماد حاصل کر لیا۔ اور یہ ولندیزی تاجر تھے، ولندیزی ریاست نہیں جس نے ڈچ سلطنت قائم کی۔ اسپین کا بادشاہ اپنی فتوحات باقی رکھنے کے لیے ناراض عوام پر نامقبول مالیے کی شرح بڑھا کر، سرمائے کے حصول کی کوششیں کرتا رہا۔ ولندیزی تاجر ان فتوحات کی معاشی ضرورت قرضے حاصل کر کے پوری کرتے رہے، اور اپنی کمپنیوں میں حصص کی فروخت بھی تاکہ حصص کنندگان منافع میں شراکت کر سکیں محتاط سرمایہ کار جو اپنی رقم کبھی اسپین کے بادشاہ کو نہ دیتے، اور جو کبھی ولندیزی حکومت کو قرض دینے سے پہلے بھی دوبار سوچتے، وہ ڈچ اشتراکی حصص کمپنیوں میں بخوشی سرمایہ لگاتے رہے جو نئی سلطنت کی ریڑھ کی ہڈیاں تھیں۔

اگر آپ کے خیال میں کوئی کمپنی بہت منافع بخش ثابت ہونے والی ہے، لیکن وہ اپنے تمام حصص فروخت کر چکی ہے، تب بھی آپ یہ حصص ان لوگوں سے خرید سکتے ہیں جو ان کے موجودہ مالک ہیں، ان کی ادا کی ہوئی قیمت سے کچھ زیادہ قیمت پر۔ اگر حصص خریدنے کے بعد آپ کو احساس ہوتا ہے کہ کمپنی کے حالات خراب ہیں تو آپ اپنے حصص کم داموں پر فروخت کر سکتے ہیں۔ کمپنیوں کے حصص کے اس کاروبار سے بیشتر یورپی شہروں میں حصص کی مارکیٹ قائم ہوئی: اسٹاک ایکسچینج، جہاں کمپنیوں کے حصص کی خرید و فروخت ہوتی۔

سب سے مشہور ڈچ حصص کی کمپنی وی او سی (Vereengde oostindische Compagine) ۱۶۰۲ء میں رجسٹر ہوئی۔ اسی زمانے میں کہ جب ڈچ اسپین کی حکومت سے جان چھڑا رہے تھے، لیکن اس وقت بھی اسپین کے توپ خانے کی دھمک ایمسٹرڈیم کی فصیلوں سے سنی جا سکتی تھی۔ وی او سی نے اپنے حصص کی فروخت سے جو سرمایہ جمع کیا اس سے جہاز سازی کی۔ انھیں ایشیا بھیج کر وہاں سے چینی، ہندوستانی اور انڈونیشیائی چیزیں درآمد

گیں۔ اس نے کمپنی کے جہازوں کی جنگی مہمات پر بھی سرمایہ لگایا جو قزاقوں اور تجارتی مدمقابل کے خلاف کی گئیں۔ بالآخر وی او سی کی رقم سے انڈونیشیا کی فتح کی سرمایہ کاری ہوئی۔

انڈونیشیا دنیا میں جزائر کا سب سے بڑا سلسلہ ہے۔ سترھویں صدی میں اس کے ہزاروں جزائر پر سینکڑوں بادشاہتیں، فرمانروا، سلطان اور قبائلی سردار حاکم تھے۔ جب وی او سی کے تاجر ۱۶۰۳ء میں پہلی بار انڈونیشیا کے ساحل پر اترے تو ان کا مقصد خالصتاً تجارت تھا۔ لیکن اپنے تجارتی مقاصد کے حصول اور حصص داروں کے منافع میں اضافے کے لیے انہوں نے مقامی سرداروں سے جنگ کی جو بہت زیادہ محصول طلب کرتے تھے، اور اپنے یورپی مخالفین سے بھی نبرد آزما ہوئے۔ وی او سی نے اپنے تجارتی جہازوں کو توپوں سے لیس کیا۔ یورپی، جاپانی، انڈونیشین کرائے کے فوجی بھرتی کیے، قلعے تعمیر کیے اور بھرپور جنگوں ومحاصروں میں حصہ لیا۔ یہ مہم جوئی ہمیں حیرت انگیز لگے گی، لیکن ابتدائی جدید دور میں نجی کمپنیوں کے لیے یہ عام بات تھی کہ وہ نہ صرف سپاہی بھرتی کرتے بلکہ جرنیل اور ایڈمرل بھی، توپیں، جہاز اور تیار افواج بھی۔ بین الاقوامی برادری کے لیے یہ معمول کی بات تھی اور وہ کسی نجی کمپنی کے سلطنت قائم کرنے پر انگلی نہیں اٹھاتے تھے۔

وی او سی جزیرے پر جزیرہ فتح کرتی گئی اور انڈونیشیا کا ایک بڑا حصہ اس کی کالونی بن گیا۔ وی او سی نے تقریباً دوسو سال انڈونیشیا پر حکومت کی۔ ۱۸۰۰ء میں ہالینڈ کی ریاست نے وی او سی کی حکومت سنبھالی، اور آئندہ ڈیڑھ سو برس کے لیے انڈونیشیا کو ڈچ نوجی کالونی بنالیا۔ آج بھی بہت سے لوگ خبردار کرتے ہیں کہ اکیسویں صدی کی کمپنیاں بہت طاقت حاصل کررہی ہیں۔ ابتدائی جدید تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ اگر کمپنیوں کو اپنے مفادات کے حصول کی بلا روک ٹوک اجازت دی جائے تو معاملہ کہاں تک جاسکتا ہے۔

جب وی او سی بحیرہ ہند میں کام کررہی تھی، ڈچ غرب الہند کمپنی یا ڈبلیو آئی سی بحیرہ اوقیانوس میں فعال تھی۔ دریائے ہڈسن سے تجارت کے اہم راستے پر غلبے کی خاطر ڈبلیو آئی سی نے دریا کے کنارے پر ایک نئی آبادی نیو ایمسٹرڈیم کے نام سے قائم کی۔ اس آبادی کو مسلسل ریڈ انڈین سے خطرہ لاحق رہتا اور اس پر برطانوی مسلسل حملے کرتے رہتے، جنہوں نے بالآخر ۱۶۶۴ء میں اس پر قبضہ کرلیا۔ برطانیہ نے اس کا نام بدل کر نیویارک رکھ دیا۔ اپنی نو آبادیات کی برطانیہ اور انڈین سے حفاظت کے لیے ڈبلیو آئی سی کی تعمیر کردہ دیوار کی باقیات پر آج دنیا کی مشہور ترین سڑک تعمیر ہے، وال اسٹریٹ۔

سترھویں صدی کے اختتام پر لاپرواہی اور مہنگی براعظمی جنگوں سے ولندیزی نہ صرف نیویارک بلکہ یورپ میں بھی اپنا معاشی اور سامراجی غلبہ کھو بیٹھے۔ اس مقام کے لیے برطانیہ اور فرانس میں سخت مقابلہ بازی تھی۔ ابتدا میں فرانس کی حیثیت بہت مضبوط معلوم ہوتی تھی۔ یہ برطانیہ سے بہت بڑا تھا، زیادہ متمول، زیادہ آبادی اور اس کی فوج بھی زیادہ بڑی اور تجربہ کار تھی۔ لیکن برطانیہ معاشی نظام کا اعتماد حاصل کرنے میں کامیاب رہا جب کہ فرانس ناقابل اعتماد ثابت ہوا۔ تاج فرانس کا رویہ بالخصوص "مسی سپی بلبلے" کے دوران بہت مشہور ہوا، یورپ میں اٹھارویں صدی کا سب سے بڑا معاشی بحران۔ وہ کہانی بھی ایک سلطنت قائم کرتی مشترکہ حصص کمپنی سے ہی شروع ہوتی ہے۔

۱۶۶۰ کا نیو ایمسٹرڈیم۔ جزیرہ مین ہٹن کے کونے پر اس آبادی کی حفاظتی دیوار آج ہموار ہو کے وال اسٹریٹ بن گئی ہے

۱۷۱۷ء میں فرانس سے جاری ہونے والی مسی سپی کمپنی زیریں مسی سپی وادی میں نوآبادیات قائم کرنے نکلی، اور اسی عمل میں نیو آرلینس کا شہر قائم ہوا۔ اس پر امنگ مہم کے لیے سرمایہ اکٹھا کرنے کی خاطر کمپنی نے، جس کے شاہ لوئی پندرہ کے دربار میں بہت رسوخ تھے، اپنے حصص پیرس کے حصص بازار میں فروخت کیے۔ کمپنی کا ڈائرکٹر جان لا ہی فرانس کے مرکزی بینک کا گورنر بھی تھا۔ مزید برآں بادشاہ نے اسے معیشت کا نگراں بھی بنادیا تھا، یہ عہدہ آج کے وزیر خزانہ کے برابر تھا۔ ۱۷۱۷ء میں زیریں مسی سپی دلدلی علاقے اور مگرمچھ سے زیادہ کچھ پیش نہیں کرتا تھا۔ پھر بھی مسی سپی کمپنی نے بہت زیادہ دولت اور بے اندازہ مواقع کی کہانیاں سنائیں۔ فرانس کے شرفا، تاجر اور شہری بورژوا کے امرا نے ان افواہوں پر یقین کیا اور مسی سپی حصص کی قیمت آسمان سے باتیں کرنے لگی۔ اس حصص کی اجرائی قیمت پانچ سو لیرا فی حصص تھی۔ یکم اگست ۱۷۱۹ء کو حصص کی قیمت ۲۷۵۰ ہو چکی تھی۔ تیس اگست کو ہر حصص کی قیمت ۴۱۰۰ لیرا تھی، اور چار ستمبر کو یہ بڑھ کر پانچ ہزار لیرا ہو چکی تھی۔ دو دسمبر کو ایک حصص کی قیمت دس ہزار لیرا عبور کر گئی۔ پیرس کی سڑکوں پر خوش حالی کے احساس کا راج تھا۔ لوگوں نے اپنے تمام اثاثے فروخت کر کے، بڑی تعداد میں قرضے لیے تاکہ مسی سپی کے حصص خرید سکیں۔ ہر ایک کو یقین تھا کہ انہوں نے امارت کا آسان راستہ تلاش کر لیا ہے۔

چند دنوں کے بعد ہراس کا آغاز ہوا۔ چند سٹے بازوں کو احساس ہوا کہ حصص کی قیمت بالکل مصنوعی اور غیر مستحکم تھی۔ انہوں نے سوچا کہ اس وقت جب کہ حصص کی قیمت اپنی بلندی پر تھی تو یہ حصص فروخت کرنے کا بہترین موقع تھا۔ جب مہیا حصص کی تعداد بڑھی تو اس کی قیمت گر گئی۔ جب دوسرے سرمایہ کاروں نے دیکھا کہ حصص کی قیمت گر رہی ہے تو انہوں نے بھی فروخت کرنا شروع کر دیے۔ اس سے حصص کی قیمت مزید گر گئی اور ایک تباہی کا آغاز ہو گیا۔ حصص کی قیمت مستحکم کرنے کے لیے فرانس کے مرکزی بینک نے اپنے گورنر جان لا کی ہدایت پر مسی سپی کے حصص خریدے، لیکن یہ مستقل تو ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ بالآخر اس کے پاس نقدی ختم ہو گئی۔ اس پر معیشت کے

نگراں، اسی جان لا نے حکم دیا کہ مزید نوٹ چھاپے جائیں تا کہ مزید حصص خریدے جا سکیں۔ اس سے پورا فرانسیسی اقتصادی نظام ایک بلبلے میں قید ہو گیا، اور یہ معاشی عیاری بھی طوفان کو نہ روک سکی۔ مسی سپی حصص کی قیمت دس ہزار سے گر کر واپس ایک ہزار لیرا ہو گئی۔ اور پھر مکمل طور پر منہدم ہو گئی۔ ان کی حیثیت کسی سو (Sou) کے برابر بھی نہیں رہی۔ اب مرکزی بینک اور شاہی خزانے میں بڑی تعداد میں بے وقعت حصص جمع ہو گئے لیکن کوئی رقم باقی نہ بچی۔ بڑے سٹے باز کوئی نقصان اٹھائے بغیر باہر نکل گئے، انہوں نے اپنے حصص بر وقت فروخت کر دیے تھے۔ چھوٹے سرمایہ دار سب کھو بیٹھے، ان میں سے کئی نے خودکشی کر لی۔

مسی سپی بلبلہ تاریخ کا سب سے ہولناک اقتصادی بحران تھا۔ فرانس کا شاہی اقتصادی نظام اس صدمے سے کبھی نہ سنبھل سکا۔ جس طرح مسی سپی کمپنی نے اپنے سیاسی تعلقات کے استعمال سے حصص کی قیمت پر اثر ڈالا، اور خریداری کے جنون کو ہوا دی، اس سے عوام میں فرانسیسی بینکاری نظام پر اعتماد ختم ہو گیا، اور فرانسیسی بادشاہ کی اقتصادی ذہانت پر بھی۔ لوئی پندرہ کے لیے قرض لینا زیادہ سے زیدہ دشوار ہو گیا۔ یہ ایک بڑی وجہ تھی کہ عالمی فرانسیسی سلطنت برطانیہ کے ہاتھوں میں آ گئی۔ جب کہ برطانوی قرضہ با آسانی کم سود کے نرخ پر حاصل کر سکتے تھے، فرانس کے لیے قرض کا حصول دشوار تھا، اور ملتا بھی تو سود کے بہت اونچے نرخ پر۔ بالآخر ۱۷۸۰ کی دہائی میں لوئی پندرہ جو اپنے دادا کے انتقال پر تخت نشین ہوا تھا اسے احساس ہوا کہ ریاست کی آدھی آمدنی قرضے کی قسطوں کی ادائیگی پر صرف ہو رہی تھی، اور وہ دیوالیہ ہونے والا تھا۔ ۱۷۸۹ میں اس نے ردوکد کے بعد اسٹیٹ جنرل کا اجلاس طلب کیا، فرانسیسی پارلیمنٹ جو ڈیڑھ سو سال سے جمع نہیں ہوئی تھی تا کہ وہ اس بحران کا حل تلاش کر سکیں۔ فرانس کے انقلاب کا اس وقت آغاز ہوا۔

جب کہ بین الاقوامی فرانسیسی سلطنت زوال پذیر تھی اس وقت برطانوی سلطنت تیزی سے بڑھ رہی تھی۔ خود سے پہلے ولندیزیوں کی مانند برطانوی سلطنت بھی عمومی طور پر لندن حصص بازار کی نجی اشتراکی کمپنیوں کے سہارے قائم ہوئی۔ شمالی امریکہ میں پہلی بار برطانوی نو آبادیات سترھویں صدی میں اشتراکی حصص کمپنیوں مثلاً لندن کمپنی، پلی متھ کمپنی، ڈورچیسٹر کمپنی اور میساچیوسٹس کمپنی کے ہاتھوں قائم ہوئیں۔

برصغیر بھی برطانوی ریاست نے فتح نہیں کیا بلکہ برطانیہ کی ایسٹ انڈیا کمپنی کی کرائے کی فوج نے۔ اس کمپنی نے وی اوسی کو بھی پیچھے چھوڑ دیا۔ لیڈن ہال اسٹریٹ لندن میں اپنے صدر دفتر سے اس نے عظیم ہندوستانی سلطنت پر تقریباً ایک صدی تک حکومت کی، جس میں ساڑھے تین لاکھ سپاہیوں کی فوج استعمال ہوئی، جو برطانوی بادشاہت کی فوج سے بھی زیادہ بڑی تھی۔ ۱۸۵۸ میں تاج برطانیہ نے ہندوستان اور کمپنی کی نجی فوج کو قومیا لیا۔ نپولین نے برطانیہ کا مذاق اڑاتے ہوئے انہیں دکان داروں کی قوم کہا تھا۔ لیکن ان دکان داروں نے خود نپولین کو شکست دی، اور ان کی سلطنت دنیا میں کبھی پیدا ہونے والی سب سے بڑی سلطنت تھی۔

سرمائے کے نام پر

تاج ہالینڈ کے ہاتھوں (۱۸۰۰) انڈونیشیا کو قومیائے جانا، اور تاج برطانیہ کے ہاتھوں ہندوستان کا (۱۸۵۸)، اس سے سلطنت اور سرمایہ داری کا تعلق ختم نہیں ہوا۔ بلکہ انیسویں صدی میں یہ تعلق اور مضبوط

ہوگیا۔ مشترکہ حصص کمپنیوں کو اب نوآبادیات قائم کرنے اور ان پر حکومت کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ ان کے مینیجر اور حصص کنندگان طاقت کی ڈوریاں لندن، ایمسٹرڈیم اور پیرس سے ہلاتے اور اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے وہ ریاست پر بھروسہ کرتے۔ جیسا کہ مارکس اور دوسرے سماجی نقادوں نے کہا تھا: مغربی حکومتیں اب سرمایہ داروں کی ٹریڈ یونین بن گئی تھیں۔۔ حکومتوں نے بڑے سرمائے کا کس طرح تحفظ کیا اس کی سب سے مشہور مثال افیون کی پہلی جنگ ہے: جو چین اور برطانیہ میں لڑی گئی (۱۸۴۰ سے ۱۸۴۲)۔ انیسویں صدی کے پہلے حصے میں برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی اور متفرق برطانوی کاروباری افراد نے بڑی تعداد میں ادویات، بالخصوص افیون چین کو برآمد کرکے بہت دولت کمائی۔ کروڑوں چینی نشے کے عادی ہوگئے، جس سے ملک اقتصادی اور سماجی طور پر کمزور ہوگیا تھا۔ ۱۸۳۰ میں چینی حکومت نے اس دوا کی تجارت پر پابندی عائد کردی، لیکن برطانوی ادویات کے تاجروں نے اس قانون کو نظر انداز کردیا۔ چینی حکام نے ادویات کا انبار ضبط کرکے اسے تباہ کرنا شروع کردیا۔ ان نشہ آور ادویات بنانے والوں کے گروہ کے ویسٹ منسٹر اور ڈاؤننگ اسٹریٹ سے قریبی تعلقات تھے۔ درحقیقت کئی اراکین پارلیمنٹ اور کابینہ کے وزرا ان ادویات کی کمپنیوں کے حصص کار تھے، لہٰذا انہوں نے حکومت پر دباؤ ڈالا کہ وہ قدم اٹھائے۔

۱۸۴۰ میں برطانیہ نے آزاد تجارت کے نام پر چین سے جنگ کا آغاز کردیا، یہ بالکل یکطرفہ جنگ تھی۔ ضرورت سے زیادہ پراعتماد چینیوں کا جدید برطانوی حیرت انگیز ہتھیاروں سے کوئی مقابلہ نہیں تھا۔ بھاپ سے چلنے والی کشتیاں، بھاری توپ خانے، راکٹ اور تیزی سے گولیاں برساتی بندوقیں۔ جس امن معاہدے پر دستخط ہوئے اس کے مطابق چین برطانوی ادویات کے تاجروں پر کوئی پابندی عائد نہیں کرسکتا تھا۔ چین پولیس کے ہاتھوں پہنچنے والے نقصانات کے ازالے کا بھی ذمہ دار تھا۔ مزید برآں برطانیہ نے ہانگ کانگ پر قبضے کا مطالبہ کیا اور اسے حاصل بھی کرلیا۔ اسے انہوں نے نشہ آور ادویات کی برآمد کے لیے ایک محفوظ مقام کے طور پر استعمال کیا (ہانگ کانگ ۱۹۹۷ء تک برطانوی ہاتھوں میں رہا)۔ انیسویں صدی کے اواخر میں تقریباً چار کروڑ چینی، ملک کی آبادی کا دس فیصد افیون کا عادی تھا۔

مصر نے بھی برطانوی سرمایہ داری کے لمبے ہاتھوں کی عزت کرنے کا سبق سیکھ لیا تھا۔ انیسویں صدی کے دوران فرانس اور برطانیہ کے سرمایہ کاروں نے مصری حکمرانوں کو بڑے پیمانے پر قرضے فراہم کیے، پہلے تو سوئز نہر کی تعمیر کے لیے اور بعد میں کم کامیاب منصوبوں کے لیے۔ مصر کا قرض بڑھتا گیا اور یورپ کے قرض خواہوں کا مصری معاملات میں اثر بڑھتا گیا۔ ۱۸۸۱ میں مصری قوم پرست تنگ آگئے اور انہوں نے بغاوت کردی۔ انہوں نے تمام بیرونی قرضوں سے یک طرفہ طور پر خاتمے کا اعلان کردیا۔ ملکہ وکٹوریا کو یہ بات پسند نہیں آئی۔ ایک سال بعد اس نے اپنی بحری اور بری افواج کو نیل کی سمت روانہ کیا اور مصر دوسری جنگ عظیم کے بعد تک برطانیہ کا ماتحت رہا۔

سرمایہ کاروں کے مفادات کے لیے بس یہی جنگیں نہیں لڑی گئیں۔ درحقیقت افیون کی مانند جنگ خود ایک حقیقت بن گئی۔ ۱۸۲۱ میں یونانیوں نے سلطنت عثمانیہ سے بغاوت کردی۔ اس بغاوت کو آزاد خیال اور رومان پرست برطانوی حلقوں میں بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔ برطانوی شاعر لارڈ بائرن یونان جاکر باغیوں کے ساتھ جنگ میں شریک ہوا۔ لیکن لندن کے سرمایہ داروں کو بھی ایک موقع نظر آیا۔ انہوں نے باغی، ماؤں کو پیش کش کی کہ قابل تجارت بغاوت بانڈ لندن کے حصص بازار سے جاری کریں۔ اگر باغی یہ جنگ جیت جاتے تو یہ بانڈ رقم کی بیع

سود واپسی کا وعدہ کرتے۔ نجی سرمایہ کار کچھ نفع کی ہوس میں بانڈ خریدتے، کچھ یونانیوں سے ہمدردی میں اور کچھ دونوں وجوہات سے۔ یونانی بغاوت بانڈ کی قیمت لندن کے حصص بازار میں، ہیلاس کے جنگی میدانوں میں عسکری کامیابی وناکامی کے ساتھ اترتی چڑھتی رہی، بتدریج ترکوں نے برتری حاصل کر لی۔ باغیوں کی شکست یقینی ہوئی تو بانڈ کے خریداروں کو رقم کے ڈوبنے کا اندیشہ ہوا۔ بانڈ خریداروں کا مفاد قومی مفاد تھا۔ لہٰذا برطانیہ نے ایک بین الاقوامی بیڑہ مرتب کیا اور ۱۸۲۷ کی جنگ ناوارینو میں عثمانیوں کا اہم بیڑہ ڈبو دیا۔ صدیوں کی غلامی کے بعد یونانی بالآخر آزاد تھے۔ لیکن یہ آزادی ایک خطیر قرض کے ساتھ آئی، جو یہ نیا ملک کسی طرح ادا نہیں کر سکتا تھا۔ یونانی معیشت آئندہ کئی دہائیوں تک برطانوی قرض خواہوں کے ہاتھوں رہن رہی۔

جنگ ناوارینو (۱۸۲۷)

سرمائے اور سیاست میں اس معانقے کے قرض بازار میں بہت دوررس نتائج نمودار ہوئے۔ کسی معیشت میں قرضے کی قدر نہ صرف خالص اقتصادی بنیادوں پر ہوتی ہے، مثلاً تیل کا کوئی نیا کنواں یا کسی نئی مشین کی ایجاد، بلکہ سیاسی واقعات مثلاً حکومتی تبدیلی یا زیادہ امکانی خارجی پالیسی پر بھی۔ ناوارینو کی جنگ کے بعد برطانوی سرمایہ دار اپنی رقم زیادہ خطرناک غیرملکی معاہدوں پر لگانے پر آمادہ ہو گئے۔ انہوں نے دیکھ لیا تھا کہ اگر کوئی بیرون ملک قرضدار قرضہ واپس کرنے سے انکار کرے تو ملکہ کی فوج رقم کی واپسی یقینی بنا دیتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ آج کسی ملک کی قرضے کی درجہ بندی اس کی معاشی صحت کے لیے اس کے قدرتی وسائل سے بھی زیادہ اہم ہے۔ قرضے کی درجہ بندی یہ طے کرتی ہے کہ اس ملک کا قرض واپس کرنے کا کتنا امکان ہے۔ خالص اقتصادی اعداد وشمار کے ساتھ وہ سیاسی، سماجی اور ثقافتی نکات کا بھی جائزہ لیتے ہیں۔ تیل کی دولت سے مالا مال کوئی ملک جس پر جابرانہ حاکم، خانہ جنگی اور بدعنوان نظام انصاف ہو اس کی قرضے کی درجہ بندی عموماً کم ہوگی۔ اس وجہ سے امکان ہے کہ وہ ملک نسبتاً غریب رہے گا کیوں کہ وہ اپنا تیل نکالنے کے لیے قرضہ حاصل نہیں کر سکے گا۔ کوئی ایسا ملک جس میں قدرتی وسائل نہ ہوں لیکن جہاں امن وامان کا دور دورہ ہو، منصفانہ نظام عدل ہو اور آزاد حکومت ہو، اس کی قرضے کی درجہ بندی بہت اونچی ہونے کا امکان ہے۔ جس سے اغلب یہ ہے کہ وہ سستے نرخ پر قرضہ حاصل کر کے ایک عمدہ نظام تعلیم اور بڑھتی ہوئی صنعتی پیداوار قائم کر سکے گا۔

آزاد معیشت کا مسلک

سرمائے اور سیاسی اثر رسوخ کا اتنا باہمی ربط ہے کہ ان کے تعلقات ماہرین اقتصادیات، سیاست دان اور عوام سب ہی میں زیر بحث رہتے ہیں۔ پر جوش سرمایہ داروں کے خیال میں سرمائے کو آزادی ہونی چاہیے کہ وہ سیاست پر اثر انداز ہو سکے، لیکن سیاست کو سرمائے پر اثر انداز نہیں ہونا چاہیے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ جب حکومتیں معیشت میں دخل دیتی ہیں تو سیاسی مفادات نامناسب سرمایہ کاری کرتے ہیں جس سے ترقی کی شرح کم ہو جاتی ہے۔ مثلاً کوئی حکومت صنعت کاروں پر بھاری مالیہ عائد کر کے بہترین بے روزگاری الاؤنس دے سکتی ہے، جو ووٹ دہندگان میں بہت مقبول ہوں۔ لیکن بہت سے کاروباری افراد کے خیال میں زیادہ بہتر یہ ہے کہ حکومت پیسہ ان ہی کے پاس رہنے دے۔ ان کا کہنا ہے کہ اس سے نئی صنعتیں لگا کر وہ بے روزگاروں کو ملازمت فراہم کر سکتے ہیں۔

اس نظریے کے مطابق بہتر اقتصادی پالیسی تو یہی ہے کہ سیاست کو معیشت سے دور رکھا جائے، مالیہ اور حکومتی قوانین کم کیے جائیں، اور بازار کی قوتوں کو خود اپنی راہ منتخب کرنے دیا جائے۔ نجی سرمایہ کار، سیاسی مفادات سے دور، وہاں پیسہ لگائیں گے جہاں انہیں زیادہ منافع ملے۔ جس سے سب کو فائدہ ہوگا، تب باقاعدہ اقتصادی ترقی جاری رہے گی، جس سے صنعتکاروں اور کارکنوں سب کو فائدہ پہنچے گا۔ اس میں حکومت کا کردار کم از کم ہے۔ آزاد مارکیٹ کا یہ فلسفہ فی الوقت سب سے زیادہ عام اور سرمایہ دارانہ سبق کا مقبول ترجمہ ہے۔ آزاد مارکیٹ کے سب سے پر جوش حامی بیرونی فوجی مہمات کی اسی طرح مذمت کرتے ہیں جیسے ملکی فلاحی اداروں کی۔ وہ حکومتوں کو وہی مشورہ دیتے ہیں جو زین ماسٹرز (Zen masters) ابتدائیں دیتے ہیں: بس کچھ مت کرو۔

لیکن اپنی انتہائی شکل میں آزاد معیشت پر یقین بھی اتنا ہی احمقانہ ہے جتنا سینٹا کلاز پر۔ تمام سیاسی تعصبات سے پاک معیشت تو وجود ہی نہیں رکھتی۔ سب سے اہم اقتصادی وسیلہ مستقبل پر بھروسہ ہے، اور یہ وسیلہ چوروں اور شیطانوں سے ہمیشہ خطرے میں رہتا ہے۔ بذات خود مارکیٹ دھوکے، چوری اور تشدد سے کوئی تحفظ فراہم نہیں کرتی۔ یہ سیاسی نظام کا کام ہے کہ وہ دھوکہ بازوں کے خلاف قانون سازی کر کے اعتماد بحال کرے اور پولیس، عدالت اور جیلوں کو مستحکم کرے جس سے قانون لاگو ہو سکے۔ جب بادشاہ اپنا کام پوری طرح انجام نہیں دیتے اور معیشت کو صحیح خطوط پر استوار نہیں کرتے تو اس سے اعتماد ختم ہوتا ہے، قرض خطرے میں پڑ جاتا ہے اور اقتصادی کساد بازاری آ جاتی ہے۔ ۱۷۱۹ کے مسی سپی بلبلے سے یہی سبق ملا تھا، اور اگر کوئی بھول بھی گیا تھا تو ۲۰۰۷ میں امریکی جائیداد کے انحطاط نے اس کی یاد دہانی کرا دی تھی جس سے قرض کی فراہمی دشوار اور کساد بازاری آسان ہو گئی تھی۔

سرمایہ دارانہ جہنم

آزاد معیشت کو مکمل آزادی دینے میں ایک اور بھی نقص ہے۔ ایڈم اسمتھ نے ہمیں یہ سبق دیا تھا کہ جفت ساز اپنی اضافی آمدنی سے مزید مددگار ملازم رکھے گا۔ اس سے یہ مطلب نکلتا تھا کہ ذاتی طمع سب کے لیے فائدہ مند ہے کیوں کہ نفع سے پیداوار میں اضافہ ہوتا ہے اور مزید ملازم بھرتی ہوتے ہیں۔

لیکن اگر وہ لالچی جفت ساز اپنے منافع میں اضافے کے لیے ملازمین کی تنخواہ کم کر کے ان کے اوقات کار بڑھا دے تو؟ ایک عام جواب یہ ہے کہ آزاد معیشت خود ہی ملازمین کو تحفظ فراہم کر دے گی۔ اگر آجر بہت کم تنخواہ دے گا اور زیادہ کام لے گا تو بہترین ملازم قدرتی طور پر اسے چھوڑ دیں گے، اور اس کے حریفوں کے پاس ملازمت کر لیں گے۔ اس ماہر جفت ساز کے پاس صرف خراب ملازم رہ جائیں گے یا کوئی بھی نہیں رہے گا۔ اسے اپنے طور طریقے بدلنے ہوں گے یا اس کا کاروبار ختم ہو جائے گا۔ اس کی اپنی لالچ اسے اپنے ملازمین سے بہتر سلوک پر مجبور کر دے گی۔

یہ نظریہ بظاہر غلطیوں سے مبرا لگتا ہے۔ لیکن درحقیقت غلطیاں با آسانی ہو سکتی ہیں۔ ایک مکمل آزاد معیشت میں جو بادشاہوں اور راہبوں کی نگرانی سے آزاد ہو، تو حریص سرمایہ دار اجارہ داری قائم کر سکتے ہیں یا اپنے ملازمین کے خلاف گٹھ جوڑ کر سکتے ہیں۔ اگر ملک میں جوتوں کے تمام کارخانے ایک ہی کارپوریشن کی ملکیت ہوں، یا اگر تمام فیکٹریوں کے مالکان ساز باز کر کے ایک ساتھ تنخواہ کم کر دیں تو کارکن نوکریاں بدل کر تحفظ حاصل کرنے میں ناکام رہیں گے۔ مزید یہ کہ لالچی آقا ملازمین کی آزادانہ نقل و حرکت کو غلامی یا قرض کی ادائیگی کے ذریعے محدود کر سکتے ہیں۔ قرون وسطیٰ اور عیسائی یورپ میں غلامی کا تصور بھی نہیں تھا۔ جدید دور کے اوائل میں یورپی سرمایہ داری اور غلاموں کی تجارت ایک ساتھ آگے بڑھی۔ اس لعنت کی ذمہ دار کوئی جابر سلطان یا نسلی تعصب نہیں، لامحدود بازار کی قوتیں تھیں۔

جب یورپ نے امریکہ فتح کیا تو انہوں نے سونے چاندی کی کان کنی کی، اور قند، کپاس اور تمباکو کی فصلیں اگائیں۔ یہ کانیں اور کھیت امریکی پیداوار اور برآمد کا بنیادی جز تھے۔ گنے کی کاشت بالخصوص بہت اہم تھی۔ قرون وسطیٰ کے یورپ میں شکر ایک نایاب عیاشی تھی۔ یہ مشرق وسطیٰ سے بہت مہنگے داموں درآمد کی جاتی، اور بہت معمولی مقدار میں ذائقے کے لیے خفیہ جز کے طور پر استعمال کی جاتی، یا سانپ کے تیل کی دواؤں میں۔ جب امریکہ میں گنے کے بڑے کھیت کاشت ہو گئے تو بڑھتی مقدار میں شکر یورپ پہنچنے لگی۔ شکر کی قیمت گر گئی اور یورپ نے کبھی نہ ختم ہونے والا میٹھے کا ذائقہ پیدا کر لیا۔ کاروباری افراد نے اس ضرورت کو پیدا کرنے کے لیے مٹھائیوں کی بڑی تعداد تیار کرنی شروع کر دی: کیک، میٹھے بسکٹ، چاکلیٹ، مٹھائی اور شیریں مشروبات مثلاً کوکا، کافی اور چائے۔ اوسط انگریز کا سالانہ شکر کا استعمال سترھویں صدی میں صفر سے بڑھ کر انیسویں صدی کی ابتدا میں تقریباً اٹھارہ پونڈ تک پہنچ گیا۔

لیکن گنے کی فصل اگانا اور شکر تیار کرنا بہت محنت طلب کاروبار تھا۔ کم ہی لوگ گرم علاقوں کے سورج تلے ملیریا سے بھرے گنے کے کھیتوں میں کام کرنا پسند کرتے تھے۔ عارضی ملازمین سے یہ جنس اتنی مہنگی ہوتی کہ اس کا عوامی استعمال ناممکن ہو جاتا۔ بازاری قوتوں کا احساس کرتے ہوئے، منافع اور اقتصادی ترقی کی لالچ میں یورپی کھیتوں کے مالکان غلامی کی جانب بڑھ گئے۔

سولہ سے انیسویں صدیوں کے دوران تقریباً ایک کروڑ افریقی غلام امریکہ درآمد کیے گئے، ان میں سے ستر فیصد گنے کے کھیتوں پر کام کرتے تھے۔ مزدوری کا ماحول انتہائی خراب تھا۔ زیادہ تر غلام مختصر دکھی زندگی گزارتے تھے اور دیگر لاکھوں غلاموں کو قید کرنے کی جنگوں میں یا اندرون افریقہ سے امریکی ساحلوں تک کے طویل

بحری سفر میں مارے جاتے۔ یہ سب اس لیے تھا کہ یورپ والے میٹھی چائے اور مٹھائی سے لطف اندوز ہو سکیں، اور شکر کے تاجر بڑے پیمانے پر منافع کما سکیں۔

غلاموں کی تجارت کسی ریاست یا حکومت کے زیر نگرانی نہیں تھی۔ یہ ایک خالصتاً اقتصادی کاروبار تھا۔ ضرورت و فراہمی کے قوانین کے تحت اس کا انتظام اور وسائل کی فراہمی آزاد معیشت سے ہوتی۔ غلاموں کی تجارت کرنے والی نجی کمپنیاں اپنے حصص ایمسٹرڈیم، لندن یا پیرس کے حصص بازروں میں فروخت کرتیں۔ متوسط طبقے کے یورپین جو اچھی سرمایہ کاری کی تلاش میں ہوتے یہ حصص خرید لیتے۔ ان پیسوں پر انحصار کر کے کمپنیاں جہاز خریدتیں، سپاہی اور ملاح بھرتی کرتیں، افریقہ سے غلام خریدتیں اور انہیں امریکہ منتقل کرتیں۔ وہاں وہ غلاموں کو کھیتوں کے مالکان کے ہاتھوں فروخت کر دیتیں۔ پھر اس رقم سے کھیتوں کی پیداوار خریدتیں مثلاً قند، کوکو، کافی، تمباکو، کپاس اور رم۔ یورپ واپس لوٹ کر وہ کپاس اور شکر اچھے داموں میں فروخت کر دیتیں، پھر دوبارہ ایک نئے دورے کے لیے افریقہ لوٹ جاتیں۔ حصص کار اس انتظام سے بہت خوش تھے۔ اٹھارویں صدی میں غلاموں کی تجارت میں سرمایہ کاری سے چھ فیصد سالانہ منافع حاصل ہوتا۔ جیسا کہ کوئی بھی جدید مشیر آپ کو بتا دے گا، یہ بہت صحت مند منافع تھا۔

آزاد معیشت کی دال میں کنکر ہے۔ اس سے نہ تو منافع کے منصفانہ حصول اور نہ ہی منصفانہ تقسیم کو یقینی بنایا جا سکتا ہے۔ بلکہ منافع اور پیداوار میں اضافے کی خواہش لوگوں کو راستے میں آنے والی کسی بھی رکاوٹ کی طرف سے اندھا کر دیتی ہے۔ جب منافع ہی عظیم سچ بن جائے، جس پر کوئی اخلاقی قدغن نہ ہو تو یہ با آسانی تباہی کا باعث بن سکتی ہے۔ کچھ مذاہب مثلاً عیسائیت اور نازی ازم میں نفرت آگ نے کروڑوں کو بھسم کر دیا ہے۔ سرمایہ داری نے کروڑوں کو سرد لاتعلقی اور لالچ کے ملاپ کے ہاتھوں ہلاک کیا ہے۔ اوقیانوسی غلاموں کی تجارت افریقیوں سے کسی متعصبانہ نفرت کا نتیجہ نہیں تھی۔ وہ افراد جنہوں نے حصص خریدے، وہ دلال جنہوں نے فروخت کیے اور غلاموں کی تجارتی کمپنیوں کے مینیجر اور نہ ہی گنے کے کھیتوں کے مالک شاید ہی کبھی افریقیوں کے بارے میں سوچتے ہوں گے۔ بہت سے مالکان کھیتوں سے بہت دور رہتے تھے اور انہیں صرف نفع و نقصان کے کھاتے درکار ہوتے۔

یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ اوقیانوسی غلاموں کی تجارت کسی شفاف پس منظر پر واحد داغ نہیں تھا۔ بنگال کا عظیم قحط جس کا گزشتہ باب میں ذکر ہو چکا ہے اسی قسم کے محرکات کا نتیجہ تھا۔ برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی کو ایک کروڑ بنگالی جانوں سے اپنا منافع زیادہ عزیز تھا۔ وی او سی انڈونیشیا میں عسکری مہم جوئی میں سرمایہ کاری کرنے والے ڈچ اشرافیہ بھی اپنے بچوں سے محبت کرتے، خیرات دیتے، اچھی موسیقی اور آرٹ سے شغف رکھتے تھے۔ مگر انہیں جاوا، سماٹرا اور مالاکا کے باشندوں کی تکالیف سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ اسی طرح، اس سیارے کے دوسرے علاقوں میں معیشت کی بالیدگی میں ان گنت برائیوں اور جرائم کا ہاتھ ہے۔

انیسویں صدی بھی سرمایہ داری کی اخلاقیات میں کوئی بہتری پیدا نہ کر سکی۔ یورپ کو اپنی لپیٹ میں لینے والے صنعتی انقلاب سے بینکر اور سرمایہ دار مزید امیر ہو رہے تھے، لیکن اس نے کروڑوں مزدوروں کو مفلسی کی اندھیری باؤلی میں دھکیل دیا۔ یورپ کی نوآبادیات میں حال اس سے زیادہ خراب تھا۔ ۱۸۷۶ میں بلجیم کے شاہ لیوپالڈ دوئم نے ایک غیر حکومتی انسان دوست ادارہ قائم کیا جس کا بیانیہ مقصد وسطی افریقہ کی دریافت اور دریائے کانگو کے ساتھ

غلاموں کی تجارت سے جنگ تھی۔ اس ادارے کے ذمہ اس علاقے کے باشندوں کی زندگی بہتر بنانے کے لیے سڑکوں اسکولوں اور ہسپتالوں کی تعمیر بھی تھی۔ ۱۸۸۵ء میں یورپی طاقتوں نے اس ادارے کو چودہ لاکھ مربع میل کانگو ترائی کا علاقہ تفویض کیا۔ یہ علاقہ جو بیلجیم کے رقبے سے پچھتر گنا بڑا تھا، اس کے بعد سے آزاد کانگو ریاست کہلانے لگا۔ کسی نے بھی اس علاقے کے دو، تین کروڑ باشندوں سے پوچھنے کی ضرورت بھی گوارا نہ کی۔

بہت مختصر مدت میں یہ انسانی ادارہ ایک کاروباری ادارہ بن گیا جس کا مرکزی مقصد منافع اور بابیدگی تھا۔ اسکول اور ہسپتال فراموش کر دیے گئے، اس کے بجائے کانگو کی ترائی کا علاقہ کانوں اور کھیتوں سے بھر گیا، جس میں زیادہ تر بیلجیم کے افسران علاقے اور مقامی آبادی کو بے رحمی سے استعمال کرتے۔ ربر کی صنعت خصوصی طور پر مشہور تھی۔ ربر تیزی سے صنعت کا خام مال بن رہا تھا، اور اس کی برآمد ہی کانگو کی اہم ترین آمدنی تھی۔ افریقی دیہاتی جو ربر اکٹھا کرتے ان سے بڑھتی تعداد میں حصہ طلب کیا جاتا۔ جو یہ حصہ فراہم کرنے میں ناکام رہتے انہیں اس 'سستی' پر بے رحمی سے سزا دی جاتی۔ ان کے بازو کاٹ دیے جاتے، اور اکثر پورے دیہات کو قتل کر دیا جاتا۔ بہت محتاط اندازوں کے مطابق ۱۸۸۵ء سے ۱۹۰۸ء کے درمیان نشوونما اور منافع طلبی سے ساٹھ لاکھ افراد ہلاک ہوئے (کانگو کی آبادی کا تقریباً بیس فیصد)۔ کچھ اس ہلاکت کا تخمینہ ایک کروڑ لگاتے ہیں۔

۱۹۰۸ء کے بعد اور خصوصاً ۱۹۴۵ء کے بعد سرمایہ داری کو کچھ لگام دی گئی، جس کی کچھ وجہ کمیونزم کا خوف تھا، لیکن ناہمواری تو اب بھی عام ہے۔ ۲۰۱۴ء کی کل معیشت ۱۵۰۰ء کی معیشت سے بہت بڑی ہے۔ لیکن یہ اتنی ناہموار طریقے سے منقسم ہے کہ افریقہ اور انڈونیشیا کے بہت سے کسان دن بھر کی مشقت کے بعد گھر لوٹتے ہیں تو ان کے پاس اپنے آبا سے ۵۰۰ برس پہلے سے بھی کم غذا ہوتی ہے۔ زرعی انقلاب کی مانند ممکن ہے کہ جدید معاشی انقلاب بھی ایک بہت بڑا دھوکہ ثابت ہو۔ انسانی اسپیسی اور عالمی معیشت شاید بڑھتی رہے، لیکن اور زیادہ افراد بھوک اور افلاس میں مبتلا رہیں۔

سرمایہ داری کے پاس اس تنقید کے دو جوابات ہیں: اول تو یہ کہ سرمایہ داری نے ایک ایسی دنیا تخلیق کر دی ہے جسے سوائے سرمایہ دار کے اور کوئی نہیں چلا سکتا۔ دنیا کو مختلف انداز سے چلانے کا بس ایک ہی طریقہ سنجیدگی سے آزمایا گیا تھا، کمیونزم، اور وہ ہر ممکنہ طور پر اس قدر خراب تھا کہ کسی نے اسے دوبارہ آزمانے کی نیت نہیں کی۔ ۸۵۲۰ ق م میں زرعی انقلاب پر آنسو بہائے جا سکتے تھے، لیکن زراعت کو ترک کر دینے میں تاخیر ہو چکی تھی۔ اسی طرح ہم سرمایہ داری کو ناپسند کرتے ہوں لیکن ہم اس کے بغیر رہ نہیں سکتے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ ذرا صبر کی ضرورت ہے۔ سرمایہ داروں کی دکھائی جنت بس ذرا ہی دور ہے۔ یہ درست ہے کہ غلطیاں سرزد ہوئیں مثلاً اوقیانوسی غلاموں کی تجارت اور یورپی مزدور طبقے کا استحصال۔ لیکن ہم نے سبق سیکھ لیا ہے، اور اگر ذرا دیر مزید صبر کر لیں، معیشت کا حجم بڑھنے دیں تو سب کے حصے میں بہتر نوالہ آئے گا۔ مہیا وسائل کی تقسیم کبھی بھی برابر نہیں ہو گی۔ لیکن اتنا ضرور ہو گا کہ ہر مرد، عورت اور بچے کے لیے کافی ہو، کانگو میں بھی۔

کچھ مثبت علامات یقیناً ہیں۔ کم از کم مادی معیار کے اعتبار سے۔ مثلاً اوسط عمر، بچوں کی شرح اموات اور غذا میں کیلوریز کی موجودگی۔ تو ۱۹۱۴ء کے مقابلے میں ۲۰۱۴ء میں ایک عام انسان کا معیار زندگی بہت بہتر ہے؟

انسانی آبادی میں توضیحی اضافے کے باوجود۔

پھر بھی کیا معیشت ہمیشہ بڑھتی ہی رہے گی؟ ہر ترقی کو خام مال اور ایندھن درکار ہوتا ہے۔ اختتام کا صور پھونکنے والے خبردار کرتے ہیں کہ جلد یا بدیر ہوموسیپین اس سیارے زمین کے خام مال اور ایندھن کو ختم کر دیں گے، پھر کیا ہوگا؟

O

صنعتی پہیے

جدید معیشت کی ترقی کے لیے ہمیں مستقبل پر اپنے اعتماد اور سرمایہ داروں کا منافع کو دوبارہ پیداوار میں لگانے کے لیے شکر گزار ہونا چاہیے۔ لیکن پھر بھی یہ کافی نہیں ہے۔ معاشی ترقی کے لیے خام مال اور توانائی بھی درکار ہوتی ہے جو لامحدود نہیں ہے۔ جب بھی یہ ختم ہو جائیں تو پورا نظام منہدم ہو جائے گا۔

لیکن ماضی سے ثبوت یہ بتاتے ہیں کہ یہ صرف نظریاتی تصور میں ہی محدود ہیں۔ حیرت انگیز طور پر گزشتہ چند صدیوں میں انسانوں کا خام مال اور توانائی کا استعمال بہت بڑھا ہے، لیکن ہمارے استعمال کے لیے مہیا تعداد میں درحقیقت اضافہ ہوا ہے۔ جب بھی ان میں سے کسی کی کمی کی وجہ سے ترقی کی رفتار میں کمی کا خطرہ لاحق ہوا تو سائنسی اور تکنیکی تحقیق میں سرمایہ کاری بڑھ گئی۔ ان سے ہر بار نہ صرف موجودہ وسائل کے استعمال کے بہتر طریقے دریافت ہوئے بلکہ توانائی کی نئی اقسام اور خام مال بھی۔

کاروں کی صنعت کی مثال لیجیے۔ گزشتہ تین سو سالوں میں انسانوں نے اربوں کی تعداد میں گاڑیاں بنائی ہیں۔ ٹھیلوں اور ریڑھی سے ریل، کار آواز سے تیز رفتار طیارے اور خلائی جہاز۔ یہ توقع کی جا سکتی تھی کہ ان حیرت انگیز کوششوں سے گاڑیوں کی پیداوار کے لیے درکار توانائی اور خام مال ختم ہو جائیں گے، اور آج ہم صرف تہہ میں باقی رہ جانے والی باقیات استعمال کر رہے ہوں گے، لیکن حقیقت اس کے متضاد ہے۔ جب کہ ١٧٠٠ میں گاڑیوں کی عالمی صنعت زیادہ تر لکڑی اور لوہے پر مشتمل تھی، آج اس کے استعمال میں بہت متفرق وسائل ہیں، مثلاً پلاسٹک، ربر، المونیم اور ٹائٹینیم۔ ہمارے آبا ان میں سے کسی سے بھی واقف نہیں تھے۔ جب کہ ١٧٠٠ میں ٹھیلے عموماً بڑھئی اور لوہار کی قوت بازو کی پیداوار ہوتے تھے، آج ٹویوٹا اور بوئنگ کی فیکٹریوں میں مشینیں پٹرول انجن اور جوہری توانائی سے چلتی ہیں۔ اسی قسم کا انقلاب تقریباً دیگر تمام صنعتوں میں بھی پیدا ہوا ہے۔ اسے ہم صنعتی انقلاب کہتے ہیں۔

صنعتی انقلاب سے چار ہزار سال پہلے بھی انسان توانائی کی مختلف اقسام کے استعمال سے واقف تھا۔ وہ لکڑی جلا کر لوہے کو پگھلانے، گھروں کو گرم رکھنے اور کیک پکانے کے کام آتے تھے۔ بادبان والے جہاز ہوائی طاقت استعمال کرتے، اور پانی کی چکیاں دریائی بہاؤ کے استعمال سے اناج پیستیں۔ لیکن ان تمام وسائل کی حدود واضح ہے۔ درخت ہر جگہ مہیا نہیں تھے، جب آپ کو ضرورت ہو ہوائیں چلنے نہیں لگتی تھیں اور آبی قوت بھی اسی صورت مہیا ہوتی کہ اگر آپ کسی دریا کے کنارے ہوتے۔

ایک اس سے بھی زیادہ اہم مسئلہ یہ تھا کہ لوگ توانائی کی ایک قسم کو دوسری میں تبدیل کرنے کا طریقہ نہیں جانتے تھے۔ پانی اور ہوا کی قوت کو استعمال کر کے بحری جہاز اور پن چکیاں چلا سکتے تھے، اس سے پانی گرم کرنے یا لوہے کو پگھلانے کا عمل نہیں جانتے تھے۔ دوسری جانب وہ لکڑی جلا کر حرارت کی توانائی سے پن چکی چلانا نہیں جانتے تھے۔ انسان صرف ایک ہی مشین سے واقف تھے جو اس طرح توانائی کی ایک قسم کو دوسری قسم میں تبدیل کر سکے، وہ تھی جسم۔ تحول کے فطری عمل میں انسانوں اور دوسرے حیوانوں کا جسم نامیاتی ایندھن یعنی غذا کو جلا کر حاصل ہونے والی توانائی سے عضلات کو حرکت میں لاتے ہیں۔ مرد، عورت اور جانور گوشت اور اجناس کھا کر، ان کے نشاستے اور چربی کو جلا کر اس توانائی سے رکشہ اور ہل چلاتے ہیں۔

کیوں کہ توانائی کی تبدیلی کے واحد آلات انسانوں اور جانوروں کے جسم تھے، تو تمام انسانی حرکات میں عضلاتی قوت کلیدی تھی۔ انسانی عضلات ٹھیلے اور گھر بناتے، بیل اپنے عضلات سے ہل چلاتے اور گھوڑوں کے عضلات سے سامان منتقل کیا جاتا۔ ان نامیاتی عضلاتی مشینوں کو چلانے کے لیے ایندھن کی صرف ایک ہی نوعیت تھی، نباتات۔ خود نباتات اپنا ایندھن سورج سے حاصل کرتے۔ ضیائی تالیف (Photosynthesis) کے ذریعے وہ شعاعوں کی قوت کو نامیاتی قوت میں مقید کر دیتے۔ ساری تاریخ انسانوں نے جو بھی کیا، اس کے لیے سورج ایندھن کا منبع تھا۔ نباتات شعائی قوت کو قید کرتے جو بعد میں عضلاتی قوت میں استعمال ہوتی۔

لہٰذا انسانی تاریخ پر دو اہم ادوار حاوی رہے: نباتات کی ترقی کا دور اور آفتابی توانائی کی تبدیلی کا دور (دن، رات، سردی اور گرمی)۔۔ جب گندم کی فصلیں ابھی ہری تھیں، اور سورج کی روشنی کم تھی تو انسانوں کے پاس توانائی بھی کم تھی۔ اناج کے گودام خالی تھے، مالیہ جمع کرنے والے بیکار، سپاہیوں کے لیے متحرک ہونا اور لڑنا دشوار تھا، اور بادشاہ عموماً امن بحال رکھنے کی کوشش کر رہے ہوتے۔ جب سورج روشن ہوتا اور گندم تیار ہوتی، تو کسان فصل اتارتے اور اناج کے گودام بھر جاتے۔ مالیہ جمع کرنے والے اپنا حصہ وصول کرنے میں پھرتی دکھاتے، سپاہی اپنی قوت بازو آزماتے اور شمشیریں تیز کرتے۔ بادشاہ اپنے مشیر جمع کر کے آئندہ مہم طے کرتے۔ سب ہی گندم، چاول اور آلو میں جمع آفتابی توانائی سے طاقت حاصل کرتے۔

مطبخ کے اسرار

ان ہزاروں سالوں میں انسان ہر سال توانائی پیدا کرنے والی اہم ترین ایجاد کے سامنے کھڑے رہتے، لیکن اسے پہچاننے سے قاصر تھے۔ جب بھی کوئی خاتون خانہ یا ملازم کیتلی میں چائے بنانے کے لیے پانی ابالنے رکھتا، یا چولہے پر آلو ابالنے کے لیے پتیلی رکھتا تو وہ اس وسیلے سے آنکھ ملاتے۔ جیسے ہی پانی میں ابال آتا تو کیتلی یا پتیلی کا ڈھکنا اچھلنے لگتا۔ یہاں حرارت، حرکت میں تبدیل ہو رہی تھی۔ لیکن پتیلی کا اچھلتا ڈھکنا بیزار کن تھا، بالخصوص اگر آپ چولہے پر پتیلی بھول جائیں اور پانی ابل جائے۔ کسی کو اس کا ممکنہ استعمال نظر نہیں آیا۔

حرارت کو حرکت میں تبدیل کرنے کی نیم کامیابی انیسویں صدی کے چین میں گن پاؤڈر کی ایجاد سے ہوئی۔ ابتدا میں گن پاؤڈر کے استعمال سے گولی چلانا اتنا بعید از قیاس تھا کہ صدیوں تک گن پاؤڈر صرف آتشی بموں کی تعمیر کے لیے استعمال ہوتا رہا۔ لیکن بالآخر شاید اس لیے کہ کسی ماہر بم بنانے والے نے گن پاؤڈر ہاون دستے میں

کوٹا اور دستہ قوت سے دور جا گرا، شاید اسی سے بندوقیں ایجاد ہوئیں۔ گن پاؤڈر کی ایجاد اور موثر گولہ باری کے
درمیان چھ سو برس کا فاصلہ تھا۔

پھر بھی حرارت کو حرکت میں بدلنے کا خیال اتنا غیر معمولی تھا کہ لوگوں کو حرارت کے استعمال سے چیزوں کو
حرکت دینے میں مزید تین صدیاں لگ گئیں۔ یہ نئی تکنیک برطانوی کوئلے کی کانوں سے نکلی۔ برطانیہ کی بڑھتی ہوئی
آبادی کے ساتھ جنگلات کاٹے گئے تاکہ بڑھتی معیشت کا ایندھن مل سکے، اور گھروں کھیتوں کے لیے جگہ ہموار
ہو سکے۔ برطانیہ میں آگ جلانے کی لکڑی کم پڑ گئی۔ لہذا اس نے لکڑی کی جگہ کوئلہ جلانا شروع کر دیا۔ کوئلے کی بہت
سی تہیں پانی بھرے علاقوں میں تھیں، اور پانی بھر جانے سے کان کن نچلی منزلوں سے کوئلہ نہیں نکال پاتے تھے۔ یہ
مسئلہ اپنے حل کی تلاش میں تھا۔ تقریباً ۱۷۰۰ء کے آس پاس برطانوی کانوں کی سرنگوں میں ایک اجنبی آواز گونجنے لگی۔
یہ آواز جو صنعتی انقلاب کی اولین صدا تھی، ابتدا میں ہلکی تھی لیکن پھر ہر دہائی میں بلند ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ اس نے
ساری دنیا کو ایک بہرہ کر دینے والی کرخت سُر میں لپیٹ لیا۔ یہ بھاپ کے انجن کی آواز تھی۔

بھاپ کے انجن کی بہت سی اقسام ہیں، لیکن ان کا ایک مشترکہ اصول ہے۔ آپ کوئی ایندھن، مثلاً کوئلہ جلا
کر پانی ابالیں جس سے بھاپ پیدا ہو۔ جب بھاپ پھیلتی ہے تو وہ پسٹن کو دھکیلتی ہے۔ جب پسٹن حرکت کرتا ہے،
تو اس سے منسلک کوئی بھی چیز حرکت کرنے لگتی ہے۔ آپ نے اب حرارت کو حرکت میں بدل دیا ہے! اٹھارویں صدی
کی برطانوی کوئلے کی کانوں میں یہ پسٹن ایک پمپ سے منسلک تھا جو کان کی سرنگ کی نچلی تہوں سے پانی کھینچ لیتا۔
ابتدائی انجن بہت غیر موثر تھے۔ آپ کو ذرا سا پانی ابالنے کے لیے بہت بڑی تعداد میں کوئلہ جلانا پڑتا۔ لیکن کانوں میں
کوئلہ بہت نزدیک اور وافر مہیا ہوتا لہذا کسی کو پرواہ نہیں تھی۔

آنے والی دہائیوں میں برطانوی کاروباریوں نے بھاپ کے انجن کو زیادہ موثر بنایا، اور اسے کان کی
رَسّی میں سے آئے، اور اسے چرخی اور روئی دھننے میں بھی استعمال کرنا شروع کر دیا۔ اس سے کپڑے کی پیداوار
میں انقلابی تبدیلی آ گئی، اور بڑی تعداد میں سستا کپڑا بنانا ممکن ہو گیا۔ پلک جھپکتے میں برطانیہ دنیا کا کارخانہ بن گیا۔
لیکن زیادہ اہم بات یہ کہ بھاپ کے انجن کو کان سے نکالنے سے ایک اہم نفسیاتی رکاوٹ دور ہو گئی۔ اگر آپ کوئلہ جلا
کر سوت کاتنے کی مشین چلا سکتے ہیں، تو اسی طریقے سے دوسری چیزوں کو کیوں حرکت نہیں دے سکتے، مثلاً گاڑیاں؟
۱۸۲۵ء میں ایک برطانوی انجینیر نے بھاپ کے انجن کو کوئلے سے لدے ریل کے ڈبوں سے جوڑ
دیا۔ اس انجن نے تیرہ میل کی پٹڑی پر ان ڈبوں کو کان سے باہر کھینچ کر قریب ترین گودی تک پہنچا دیا۔ یہ تاریخ کی پہلی
بھاپ سے چلنے والی ریل تھی۔ واضح تھا کہ اگر بھاپ کو کوئلے کی منتقلی کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے تو دوسری اشیا کے
لیے کیوں نہیں، اور افراد کے لیے کیوں نہیں؟ پندرہ ستمبر ۱۸۳۰ء کو پہلی تجارتی ریلوے لائن لیورپول سے مانچسٹر کے
درمیان شروع کی گئی۔ یہ ریل اسی بھاپ کی قوت سے چل رہی تھی، جو پہلے کپڑے کی کھڈیوں کو چلا رہی تھی۔ صرف
بیس سال کے اندر ہی برطانیہ میں لاکھوں میل کی ریل کی پٹڑیاں بچھ گئیں۔

اس کے بعد لوگوں پر جنون سا طاری ہو گیا کہ مشینوں اور انجنوں کے استعمال سے توانائی کی ایک قسم کو
دوسری قسم میں تبدیل کیا جائے۔ دنیا بھر میں کسی بھی مقصد کے لیے، کہیں بھی، کسی بھی قسم کی توانائی کو استعمال کیا
جا سکتا ہے اگر ہمارے پاس درست مشین موجود ہو۔ مثلاً جب طبیعات دانوں کو احساس ہوا کہ جوہر کے اندر بے

تماشہ توانائی جمع ہے تو انہوں نے فورا سوچنا شروع کیا کہ اس توانائی کو کیسے حاصل کر کے بجلی پیدا کی جائے، بندوقیں چلائی جائیں اور شہروں کو صفحۂ ہستی سے مٹایا جائے۔ چینی کیمیادانوں کے گن پاؤڈر کی ایجاد اور ترکی توپوں کا قسطنطنیہ کی فصلیں منہدم کرنے کے درمیان چھ سو سال کا فاصلہ تھا۔ لیکن آئن اسٹائن کی اس دریافت سے کہ کسی بھی قسم کی کمیت کو توانائی میں تبدیل کیا جاسکتا ہے، یعنی E=MC2 اور ایٹم بم کے ہیروشیما اور ناگاساکی کو تباہ کر دینے، ساری دنیا میں جوہری توانائی کے پلانٹ پھیل جانے کے درمیان صرف چالیس سال کا دورانیہ تھا۔

ایک اور اہم ایجاد اندرونی کھپت (کمبسشن) کا انجن تھا، جس نے تقریباً ایک نسل کے دورانیے میں انسانی نقل وحمل میں انقلاب پیدا کر دیا اور پٹرول کو مائع سیاسی قوت میں بدل دیا۔ پٹرول سے ہزاروں سالوں سے شناسائی تھی۔ اسے چھتوں کو پانی سے محفوظ رکھنے، اور دھرا کو چکنا کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ لیکن ابھی ایک صدی پہلے تک کسی کے ذہن میں یہ خیال نہیں آیا تھا کہ اس کا کوئی دیگر استعمال بھی ممکن ہے۔ آپ زمین، سونے، غلاموں اور مرچوں کے لیے جنگ کر سکتے تھے لیکن تیل کے لیے نہیں۔

بجلی کی داستان تو اور بھی زیادہ حیرت انگیز ہے۔ دو صدیوں پہلے تک بجلی معیشت میں کوئی کردار ادا نہیں کرتی تھی، اور محض پراسرار سائنسی تجربات یا عام جادوئی کرتب دکھانے کے لیے استعمال ہوتی تھی۔ ایجادات کے ایک سلسلے نے اسے کائنات کے چراغ میں بند کسی جن کی مانند بنا دیا ہے۔ ہم چٹکی بجاتے ہیں تو یہ کتاب چھاپ دیتی ہے، اور کپڑے سی دیتی ہے، ہماری سبزیاں تازہ رکھتی ہے اور ہماری آئس کریم پگھلتی نہیں، ہمارا کھانا پک جاتا ہے، ہمارے مجرموں کو سزائے موت دیتی ہے، ہمارے خیالات کا حساب رکھتی ہے، ہماری مسکراہٹیں درج کرتی ہے، ہماری شبوں کو روشن کرتی یہ ہمیں ان گنت ٹی وی کے پروگراموں سے مسرور رکھتی ہے۔ ہم میں سے چند ہی یہ بات سمجھتے ہیں کہ بجلی یہ سب کام کیسے انجام دیتی ہے، لیکن ان سے بھی کم تعداد اس کے بغیر زندگی کا تصور بھی نہیں کر پاتے ہیں۔

توانائی کا ایک سمندر

صنعتی انقلاب دراصل توانائی کی تبدیلی میں انقلاب ہے۔ اس نے بار بار یہ ثابت کیا ہے کہ ہمارے استعمال کے لیے مہیا توانائی لامحدود ہے۔ یا یہ کہنا زیادہ درست ہے کہ یہ حدیں صرف ہماری ناواقفیت کی وجہ سے مقرر ہیں۔ ہر چند دہائیوں بعد ہم توانائی کا ایک نیا ذریعہ دریافت کر لیتے ہیں، لہذا ہمیں مہیا کل توانائی کا ذخیرہ بڑھتا ہی رہتا ہے۔

تو اتنے سارے لوگ اس بات سے کیوں خوف زدہ ہیں کہ ہمارے توانائی کے ذخائر ختم ہو رہے ہیں؟ وہ ہمیں کیوں اس وقت سے ڈراتے ہیں کہ جب معدنی ایندھن ختم ہو جائے گا؟ ظاہر ہے کہ دنیا میں توانائی کی کمی تو نہیں ہے۔ صرف ہمارے پاس اس علم کی کمی ہے کہ اس توانائی کو کیسے قید کر کے اسے اپنی ضرورت کے لیے استعمال کیا جاسکے۔ زمین میں موجود تمام معدنی ایندھن اس مقدار کے مقابلے میں کچھ نہیں جو سورج ہمیں روز فراہم کرتا ہے۔ ہم تک شمسی توانائی کا صرف ایک معمولی حصہ پہنچتا ہے۔ پھر بھی یہ سالانہ ۳۷۶۶۸۰۰ ایگزا جیول توانائی کے برابر ہے (ایک جیول توانائی کی وہ قدر ہے جو آپ ایک چھوٹا سیب ایک گز کی بلندی تک اٹھانے میں خرچ کرتے ہیں۔ ایگزا

جیول ایک ارب، ارب جیول کے برابر ہے، یہ تو بہت سارے سیب ہو گئے)۔ دنیا کے تمام نباتات تقریباً تین ہزار ایگزا جیول ضیائی تالیف کے ذریعے اکٹھا کرتے ہیں۔ تمام انسانی حرکات اور صنعتیں مل کر تقریباً پانچ سو ایگزا جیول سالانہ استعمال کرتے ہیں۔ یہ تقریباً اسی مقدار کے برابر ہے جو ہم میں سے ہر ایک سورج سے ہر نوے منٹ بعد حاصل ہوتا ہے۔ اور یہ صرف شمسی توانائی ہے۔ اس کے علاوہ بھی توانائی کے دوسرے ذرائع ہمارے اطراف پھیلے ہوئے ہیں: جوہری توانائی، کشش ثقل کی توانائی جو سمندری لہروں کی طاقت میں واضح اس وقت دیکھی جا سکتی ہے جب چاند انہیں زمین سے اپنی جانب کھینچتا ہے۔

صنعتی انقلاب سے پہلے انسانی توانائی کا بازار صرف نباتات پر منحصر تھا۔ لوگ تین ہزار ہیگزا جیول توانائی بھرے سبزے کے کنارے پر رہتے تھے، اور اس میں سے جتنی ممکن ہو توانائی سمیٹتے تھے۔ لیکن ان سے توانائی کشید کرنے کی بھی ایک حد تھی، صنعتی انقلاب کے دوران ہمیں احساس ہوا کہ ہم تو دراصل توانائی کے ایک سمندر کے کنارے رہ رہے ہیں، جس میں ممکنہ توانائی کے اربوں جیول موجود تھے، بس ہمیں کشید کرنے کے بہتر پمپ درکار تھے۔

توانائی کو قید کرنے اور اسے موثر انداز میں تبدیل کر لینے سے وہ دوسرا مسئلہ بھی حل ہو گیا جس سے معاشی ترقی ست رفتار ہو گئی تھی: خام مال کی کمی۔ جب لوگوں کو بڑی تعداد میں توانائی قید کرنے کا گر آ گیا تو پہلے انہوں نے غیر میسر خام مال کو استعمال کرنا شروع کر دیا (مثلاً سائبیریا کی بنجر زمین میں لوہے کی کان کھودنا)، یا مزید دور دراز علاقوں سے خام مال منتقل کرنا (مثلاً برطانوی کپڑوں کی ملوں تک آسٹریلیہ کا اون پہنچنا)۔ اسی کے ساتھ سائنسی ترقی نے انسانیت کو بالکل خام مال کی ایجاد کے قابل بنا دیا، مثلاً پلاسٹک اور پہلے سے نامعلوم قدرتی مال کو دریافت کرنے کے قابل بنایا (مثلاً الموینیم اور سیلی کون)۔

کیمیادانوں نے الموینیم ۱۸۲۰ میں دریافت کر لیا تھا، لیکن اس دھات کو اس کے فلز سے علیحدہ کرنا بہت دشوار اور مہنگا تھا۔ کئی دہائیوں تک الموینیم سونے سے زیادہ مہنگا تھا۔ ۱۸۶۰ میں فرانس کے شہنشاہ نپولین سوئم نے اپنے خاص مہمانوں کے لیے الموینیم کے چمچے اور کانٹے طلب کیے۔ کم حیثیت کے حامل مہمانوں کو سونے کے چھری، کانٹے استعمال کرنے پڑتے۔ لیکن انیسویں صدی کے اختتام تک کیمیادانوں نے ایک ایسا طریقہ نکال لیا جس سے بڑی تعداد میں سستا اموینیم حاصل کر لیا تھا۔ اب موجودہ عالمی پیداوار تقریباً تین کروڑ ٹن سالانہ ہے۔ نپولین سوئم یہ سن کر حیران رہ جاتا کہ اس کی رعایا کے وارث اپنے سینڈوچ لپیٹنے اور بچا ہوا کھانا محفوظ کرنے کے لیے، ایک بار استعمال ہو سکنے والے الموینیم کے ورق میں لپیٹ دیتے ہیں۔

دو ہزار سال پہلے جب لوگ وادئی روم میں جلد کی خشکی کا شکار ہوتے تو وہ اپنے ہاتھوں پر زیتون کا تیل مل لیتے۔ آج وہ ہاتھوں پر ملنے کی کریم ایک ٹیوب سے نکالتے ہیں۔ ایک سادہ، جدید ہاتھ کی کریم کے اجزا درج ذیل ہیں جو میں نے ایک مقامی دکان سے خریدی تھی:

بھاری پانی، اسٹیریک تیزاب، گلیسرین، کیپرائلک، کیپریلک گلاسیرائڈ، پروپائلین گلائی کول، آئسو پروپائل مائی ری سٹیٹ، جن سنگ جڑ، خوشبو، ایسیٹائل الکوہل، ٹرائی ایتھونولامین، ڈائی میٹی کون، آرکٹو اسٹافائی لوس کے پتے، میگنیسیم ایسکوربائل فاسفیٹ، امیڈازولیڈائینیل یوریا، میتھائل پیرابن، کافور، پروپائل پیرابن، ہائیڈروکسی آئی سوہیکسائل کاربوکس ایلڈی ہائیڈ، ہائیڈروکسی سٹرونیلال، لینالول، بیوٹائل

فینائل میتھائیل پروپلونال، سٹرونیلال، لیمونین، گرینول۔

ان میں تقریباً ہر جز گزشتہ دو صدیوں میں ہی ایجاد یا دریافت ہوا تھا

پہلی جنگ عظیم کے دوران، جرمنی کے محاصرے سے وہاں خام مال کی شدید کمی واقع ہو گئی تھی، بالخصوص سالٹ پیٹرے، گن پاؤڈر اور دوسرے دھماکہ خیز مادے کا ایک لازمی جز۔ سالٹ پیٹرے کے سب سے اہم ذخائر چلی اور انڈیا میں تھے، جرمنی میں کوئی نہیں تھا۔ یہ درست ہے کہ سالٹ پیٹرے کی جگہ امونیا نے لے لی، لیکن اس کی پیداوار بھی مہنگی تھی۔ جرمنوں کی خوش قسمتی تھی کہ ان کے ایک ہم عصر شہری، فرٹز ہیبر، ایک یہودی کیمیا دان نے ۱۹۰۸ میں ایک ایسا عمل دریافت کر لیا تھا جس کے ذریعے امونیا کو تقریباً کہیں بھی پیدا کیا جاسکتا تھا۔ جب جنگ چھڑ گئی تو جرمنی نے ہیبر کی دریافت کے استعمال سے ہوا کو خام مال کے طور پر استعمال کر کے دھماکہ خیز مادہ ایجاد کیا۔ کچھ ماہرین کا خیال ہے کہ اگر ہیبر کی ایجاد سے فائدہ نہ اٹھاتا تو جرمنی نومبر ۱۹۱۸ سے بہت پہلے ہتھیار ڈال دیتا۔ اس دریافت پر ہیبر (جس نے جنگ کے میدان میں زہریلی گیس کے استعمال کو ایجاد کیا تھا) کو ۱۹۱۸ میں نوبل انعام دیا گیا، امن کا نہیں بلکہ کیمیا کا۔

زندگی منتقلی کی پٹی (کنویئر بیلٹ) پر

صنعتی انقلاب نے سستی اور وافر توانائی اور سستے وافر خام مال کا ایک ایسا ملاپ پیدا کیا جس کی پہلے مثال نہیں ملتی تھی۔ اس کا نتیجہ انسانی پیداوار میں دھماکہ خیز اضافے کی صورت میں نمودار ہوا۔ یہ دھماکہ سب سے پہلے اور سب سے واضح زراعت میں سنائی دیا۔ عموماً جب ہم صنعتی انقلاب کی بات کریں تو ہمارے تصور میں دھواں دیتی مضافاتی چمنیاں، یا زمین کے پیٹ میں پسینے میں شرابور استحصال کا شکار کوئلے کے کانکن ابھرتے ہیں۔ لیکن صنعتی انقلاب سب سے زیادہ تو دوسرا زرعی انقلاب تھا۔

گزشتہ دو سو سالوں میں صنعتی پیداواری طریقے زراعت کا بنیادی عنصر بن گئے ہیں۔ پہلے جو کام عضلاتی طاقت انجام دیتی تھی، یا نہیں کیے جاتے تھے، اب وہ ٹریکٹر انجام دینے لگے۔ زمین اور جانور دونوں کی پیداواری صلاحیت میں بہت اضافہ ہوا۔ جس کی وجہ مصنوعی کھاد، صنعتی کیڑے مار ادویات اور دیگر ہارمون وادویات کا ایک مکمل اسلحہ خانہ تھا۔ سرد خانوں، ہوائی اور بحری جہازوں کی مدد سے اب پیداوار کو مہینوں محفوظ کیا جاسکتا ہے، اور دنیا کے دوسرے کونوں تک جلدی اور سستا منتقل کیا جاسکتا ہے۔ یورپ والوں نے ارجینٹینا کا تازہ گائے کا گوشت اور جاپان کی سوشی اپنے عشائیے میں شامل کر لی۔

حیوانات و نباتات تک میکانکی ہو گئے۔ جس زمانے میں انسانی مذاہب ہوموسیپین کو اشرف المخلوقات کی نشست پر بٹھا رہے تھے، اسی دور میں کھیتوں پر کام کرنے والے جانوروں کو جیتی جاگتی مخلوق کے طور پر دیکھنا بند ہو گیا، جو درد اور تکلیف محسوس کر سکتے تھے۔ ان سے مشینوں جیسا سلوک ہونے لگا۔ آج ان جانوروں کو ملوں سے مشابہ اداروں میں بڑی تعداد میں اکٹھا پیدا کیا جاتا ہے۔ ان کے اجسام صنعتی ضرورت کے اعتبار سے تراشے جاتے ہیں۔ وہ اپنی ساری زندگی ایک مہیب پیداواری سلسلے میں کسی گراری کی مانند گزار دیتے ہیں۔ ان کی زندگی کا دورانیہ اور اس کا معیار تجارتی کمپنیوں کے نفع نقصان پر منحصر ہوتا ہے۔ جب صنعت انہیں زندہ و صحت مند رکھنے اور اچھی غذا

فراہم کرنے کی پابند ہوتی ہے تب بھی اندرونی طور پر انہیں ان جانوروں کی سماجی یا نفسیاتی ضروریات سے کوئی سروکار نہیں ہوتا (سوائے اس وقت کہ جب اس کا براہ راست اثر ان کی پیداوار پر مرتب ہو رہا ہو)۔

مثلاً انڈے دینے والی مرغیوں کی دنیا کا اپنا مزاج، رویہ، ضروریات اور محرکات ہوتے ہیں۔ ان میں اس بات کی پرزور تحریک ہوتی ہے کہ وہ اپنے اطراف میں چہل قدمی کریں، دانا دنکا تلاش کریں، سماجی تعلقات قائم کریں، گھونسلے بنائیں اور اپنی تالیف کریں۔ لیکن انڈوں کی صنعت اکثر مرغیوں کو تنگ پنجروں میں بند رکھتی ہے۔ ایک ہی پنجرے میں چار مرغیاں قید کر دینا عام ہے۔ ہر مرغی کو ۱۰ انچ X ۱/۲ ۸ انچ کی جگہ مہیا ہوتی ہے۔ مرغیوں کو کافی غذا ضرور ملتی ہے، لیکن وہ اپنی فطری جاگیر قائم کرنے، گھونسلا بنانے یا دوسری قدرتی حرکات میں ناکام رہتی ہیں۔ یہ پنجرے اتنے مختصر ہوتے ہیں کہ اکثر یہ مرغیاں پھڑ پھڑانے یا تن کر سیدھی کھڑے ہونے میں بھی ناکام رہتی ہیں۔

بندروں کے بعد سور غالباً سب سے زیادہ عقلمند اور کھوجی پستانیے جانور ہیں۔ لیکن صنعتی فارم پر دودھ پلاتی سورنیوں کو اکثر اتنے مختصر باڑے میں بند رکھا جاتا ہے کہ جہاں وہ مڑ بھی نہیں سکتیں، ٹہلنے یا غذا تلاش کرنے کا تو ذکر ہی کیا۔ بچے کی پیدائش کے بعد سورنیاں ان کٹہروں میں چار ہفتے قید رکھی جاتی ہیں۔ پھر ان کے نوزائیدہ ان سے علیحدہ کر دیے جاتے ہیں، اور سورنیوں کو دوبارہ حاملہ کر دیا جاتا ہے۔

ایک تجارتی مرغی خانے میں منتقلی پٹی پر چوزے۔ اس منتقلی کی پٹی سے مرغے اور عیب دار مرغیاں چن کر انہیں گیس چیمبر میں بھس دم کیا جاتا ہے، یا ایک خودکار چیتھڑے بنانے کی مشین میں ڈال دیا جاتا ہے، یا ایسے ہی کوڑے دان میں جہاں وہ دوسرے کوڑے کے ساتھ کچل جاتے ہیں۔ کروڑوں چوزے ہر سال اس طرح مرغی خانوں میں ہلاک ہوتے ہیں

بہت سی دودھ دینے والی گائیں اپنی متعین عمر ایک چھوٹے سے کٹہرے میں بسر کرتی ہیں، اپنے ہی بول و براز میں کھڑی، بیٹھی اور سوئی ہوئی۔ وہ اپنی غذا، ہارمون اور دواؤں کی مقررہ مقدار ایک مشین سے حاصل کرتی ہیں۔ ہر چند گھنٹوں بعد ایک اور مشین ان کا دودھ دھوتی ہے۔ اس عمل میں گائے کی مثال محض ایک دہانہ ہے جس میں خام مال جاتا ہے اور ایک تھن جس سے ایک صنعت برآمد پیدا ہوتی ہے۔ زندہ مخلوق جن کی پیچیدہ جذباتی ضروریات

ہوتی ہیں، انہیں مشینوں کی طرح برتنے سے ان میں نہ صرف جسمانی تکالیف بلکہ سماجی دکھ اور نفسیاتی الجھن پیدا ہوتی ہے۔

بالکل جیسے اوقیانوسی غلاموں کی تجارت کی وجہ افریقیوں سے نفرت نہیں تھی، اسی طرح جانوروں کی جدید صنعت کے پیچھے بھی نفرت کارفرما نہیں ہے۔ اس کی وجہ بے حسی ہے۔ بیشتر افراد جو انڈے، دودھ یا گوشت پیدا کرتے یا استعمال کرتے ہیں، وہ شاذ ہی کبھی ان مرغیوں، گایوں اور سوروں کے متعلق سوچتے ہیں، جن کا گوشت یا اخراج وہ استعمال کرتے ہیں۔ جو سوچتے بھی ہیں وہ بھی اکثر یہ دلیل دیتے ہیں کہ یہ جانور مشینوں سے زیادہ مختلف نہیں ہیں۔ کسی احساسات وجذبات سے عاری، تکلیف کے احساس کے نااہل۔ ستم یہ کہ وہی سائنسی شعبے جن سے ہماری دودھ کی مشینیں اور انڈوں کی مشینیں شکل پاتی ہیں، انہیں سے بلاشبہ یہ ثبوت ملے ہیں کہ پستیانے جانوروں اور پرندوں کا ایک پیچیدہ حسی اور جذباتی نظام ہوتا ہے۔ وہ نہ صرف جسمانی درد محسوس کرتے ہیں بلکہ جذباتی دکھ بھی۔

ارتقائی نفسیات کے حساب سے پالتو جانوروں کی جذباتی اور سماجی ضروریات کی نمو آزاد جنگلات میں ہوئی، جو وہاں بقا اور افزائش نسل کے لیے ضروری تھیں۔ مثلاً ایک جنگلی گائے کو علم تھا کہ دوسری گائے اور بیلوں سے کیسے تعلقات بڑھاتے ہیں، ورنہ وہ زندہ رہنے یا افزائش میں ناکام رہتیں۔ ان ضروری صلاحیتوں کو سیکھنے کے لیے ارتقا نے بچھڑوں اور دوسرے تمام سماجی پستیانے بچوں کی فطرت میں کھیل کود کی گہری امنگ بھر دی تھی (کھیل کود پستیانوں کا سماجی رویہ سیکھنے کا طریقہ ہے)، اور اسی نے ان کے اندر اپنی ماں سے قریبی تعلقات کی ضرورت کو بیدار کیا، جس کا دودھ اور دیکھ بھال ان کی بقا کے لیے لازم تھا۔

اب اگر کسی ایک بچھڑے کو اس کی ماں سے علیحدہ کرکے ایک کٹہرے میں بند کردیں، اسے غذا اور پانی فراہم کریں، بیماریوں کے خلاف ٹیکے لگائیں، اور پھر جب وہ بلوغت کو پہنچے تو اس میں بیل کا نطفہ داخل کردیں، تو؟ مقصدی نکتہ نظر سے اس بچھڑے کو بقا اور افزائش نسل کے لیے مادری شفقت یا ہم جولیوں کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن ذاتی حیثیت میں وہ بچھڑا اپنی ماں سے تعلق قائم رکھنے اور دوسرے بچوں کے ساتھ کھیلنے کے لیے بے چین ہے۔ اگر اس کی یہ ضروریات پوری نہ کی جائیں تو بچھڑے کو بہت تکلیف ہوگی۔ ارتقائی نفسیات کا یہی سبق ہے کہ جنگل میں جو ضرورت پیدا ہوئی تھی وہ ذاتی سطح پر بعد میں بھی جاری رہتی ہے، چاہے اب وہ بقا یا افزائش کے لیے درکار نہ ہو۔ صنعتی زراعت کا المیہ یہ ہے کہ جانوروں کی مقصدی ضرورت پوری کرتی ہے، لیکن ان کی ذاتی ضروریات نہیں۔

اس نظریے کی سچائی 1950 سے معلوم ہے کہ جب نفسیات دان ہیری ہارلو نے بندروں کی نفسیات کا مطالعہ کیا۔ ہارلو نے نوزائیدہ بندروں کو پیدائش کے چند گھنٹوں بعد ان کی ماؤں سے علیحدہ کردیا۔ یہ بچے کٹہروں میں تنہا بند کردیے گئے، اور انہیں نقلی ماؤں نے پروان چڑھایا۔ ہارلو نے ہر کٹہرے میں دو نقلی مائیں رکھیں۔ ایک دھاتی تاروں سے بنی تھی اور ایک دودھ کی بوتل سے منسلک تھی جس سے نوزائیدہ بندر دودھ چوس سکتا تھا۔ دوسری لکڑی کی بنی تھی جس پر کپڑا چڑھا تھا، اور وہ اصل ماں سے شباہت رکھتی تھی، لیکن اس سے نوزائیدہ بندر کو غذا میں کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا تھا۔ توقع یہ تھی کہ بجائے بنجر کپڑوں میں لپٹی ماں کے، یہ نوزائیدہ دودھ پلاتی دھاتی ماں سے وابستہ رہیں گے۔

ہارلو کی ماں سے جدا ہوئے نوزائیدہ بندروں میں سے ایک، کپڑوں سے بنی ماں سے لپٹا ہوا ہے، جب کہ تاروں سے بنی دوسری ماں سے دودھ پی رہا ہے۔

ہارلو حیران رہ گیا جب نوزائیدہ بندروں نے کپڑوں میں لپٹی ماں کے لیے واضح ترجیح کا اظہار کیا، اپنا بیشتر وقت اس کے ساتھ گزارتے۔ جب دونوں ماؤں کو قریب کر دیا جاتا، تو نوزائیدہ جب دھاتی ماں سے دودھ پیتا تو بھی کپڑے کی ماں سے لپٹا رہتا۔ ہارلو نے سوچا کہ شاید اس رویے کی وجہ یہ ہو کہ نوزائیدہ سردی کا شکار ہوں، لہذا اس نے تاروں سے بنی شبیہ کے اندر بلب جلا دیا جس سے انہیں حرارت ملتی رہتی۔ سب ہی بندر سوائے بہت ہی چھوٹی عمر والے کپڑوں سے بنی شبیہ کو ہی ترجیح دیتے رہے۔

اس تحقیق کی پیروی سے انکشاف ہوا کہ گو انہیں مکمل غذا فراہم کی جا رہی تھی لیکن ہارلو کے ماں سے بچھڑے بندر بڑے ہو کر جذباتی طور پر مضطرب رہے۔ بندروں کے معاشرے میں وہ کبھی گھل مل نہیں سکے۔ دوسرے بندروں سے تعلقات میں انہیں ہمیشہ دشواری ہوئی۔ ان پر بہت اضطراب اور جارحیت کے دورے پڑتے تھے۔ نتائج بہت واضح تھے۔ بندروں کی نفسیاتی ضروریات تھیں جو مادی ضروریات سے علیحدہ تھیں، اور اگر یہ پوری نہ ہوتیں تو انہیں بہت تکلیف ہوتی۔ ہارلو کے نوزائیدہ بندر کپڑے میں لپٹی بانجھ ماں کے ہاتھوں میں وقت گزارنا پسند کرتے تھے، کیوں کہ انہیں دودھ ہی کی نہیں، مادرانہ شفقت کی بھی ضرورت تھی۔ آنے والی دہائیوں میں بہت سی تحقیقات نے یہ ثابت کر دیا کہ یہ نتائج صرف بندروں پر ہی ثابت نہیں بلکہ دوسرے پستانیوں اور پرندوں پر بھی لاگو ہیں۔ فی الوقت بہت سے پالتو جانور ہارلو کے بندر جیسے حالات سے گزر رہے ہیں۔ کیوں کہ کسان معمول کے مطابق بچھڑوں، بکری کے بچوں اور دوسرے نوعمر جانوروں کو ان کی ماؤں سے جدا کر دیتے ہیں، تاکہ ان کی تنہائی میں پرورش کی جا سکے۔

کل ملا کر اربوں مویشی ایک میکانکی پیداواری قطار کے حصے کے طور پر زندہ رہتے ہیں، اور ہر سال ان

میں سے پچاس ارب ذبح کیے جاتے ہیں۔ ان صنعتی طریقوں کی مویشیوں کی پرورش، اور زرعی پیداواری طریقوں سے انسانی غذائی ذخائر میں تیزی سے اضافہ ہوا ہے۔ درخت اگانے کے میکانکی طریقوں کے ساتھ صنعتی افزائشی مویشی مل کر پوری جدید سماجی معیشت کو ترتیب دیتے ہیں۔ زراعت کی صنعت کاری سے پہلے کھیتوں میں پیدا ہونے والی بیشتر غذا کسانوں اور کھیتی باڑی کے جانوروں کا پیٹ بھرنے میں اضائع ہوتی تھی۔ کاری گروں، راہبوں، اساتذہ اور نوکر شاہی کے لیے غذا کا ایک معمولی حصہ ہی بچ پاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ہر معاشرے میں کسان آبادی کا نوے فیصد ہوتے۔ زراعت میں صنعتی انقلاب کے بعد کسانوں کی گھٹتی ہوئی تعداد بھی ملوں کے کاری گروں اور کلرکوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کا پیٹ بھرنے کے لیے کافی تھی۔ آج امریکہ میں آبادی کا صرف دو فیصد زراعت سے گزارا کرتا ہے، لیکن یہ دو فیصد اتنا پیدا کر لیتا ہے جو نہ صرف تمام امریکی آبادی کے لیے کافی ہے، بلکہ باقی دنیا میں برآمد کرنے کے لیے بھی۔ زراعت میں صنعت کاری کے بغیر شہری صنعتی انقلاب کبھی پیدا نہیں ہوتا۔ تمام فیکٹریوں اور دفاتر میں بھرتی کے لیے مددگار ہاتھ اور دماغ مہیا نہ ہوتے۔

جب یہ اربوں ہاتھ اور دماغ جو کھیتوں سے فارغ ہوئے تھے، ملوں اور دفاتر میں ملازم ہوئے تو مصنوعات کا ایک بے نظیر سیلاب امڈ آیا۔ اب انسانوں نے پہلے سے کہیں زیادہ اسٹیل کی پیداوار، کپڑوں کی بنائی اور تعمیرات شروع کر دیں۔ اس ہی کے ساتھ انہوں نے پہلے کبھی نہ سوچی جانے والی چیزیں ساخت کیں مثلاً روشنی کے بلب، موبائل فون، کیمرے اور برتن دھونے والی مشینیں شامل ہیں۔ انسانی تاریخ میں پہلی بار فراہمی نے ضرورت کو پیچھے چھوڑ دیا۔ اب ایک نئی مشکل پیدا ہو گئی۔ اسی کے ساتھ ایک بالکل نیا سوال سامنے آ گیا، یہ سب چیزیں خریدے گا کون؟

خریداری کا دور

جدید سرمایہ دارانہ معیشت کو اپنی بقا کے لیے مسلسل پیداوار میں اضافہ کرنا ضروری ہے، کسی شارک کی مانند جس کے لیے تیرنا لازم ہے ورنہ اس کا دم گھٹ جاتا ہے۔ لیکن صرف پیداوار ہی کافی نہیں ہے۔ ضروری ہے کہ کوئی یہ مصنوعات خریدے بھی، ورنہ سرمایہ کار اور صنعت کار دونوں دیوالیہ ہو جائیں گے۔ اس تباہی سے بچنے کے لیے اور یہ یقینی بنانے کے لیے کہ صنعتیں جو بھی مال پیدا کریں انہیں کوئی خرید لے، ایک نئی قسم کی اخلاقیات نے جنم لیا: تحریک صارفین۔

تاریخ کے بیشتر دور ایسے زیادہ تر افراد مفلسی میں گرفتار رہے۔ لہٰذا کنجوسی ان میں ایک مقبول لفظ تھا۔ اس کی مشہور مثالیں راسخ العقیدہ عیسائی اور اسپارٹا کے باشندے ہیں۔ ایک اچھا انسان وہ تھا جو عیش و آرام ترک کر دیتا، کبھی غذا پھینکتا نہیں اور پتلون پھٹ جانے پر نئی خریدنے کے بجائے اس کو رفو کر لیتا تھا۔ صرف بادشاہ اور امراہی خود کو اس بات کی اجازت دیتے کہ وہ ان اقدار سے انحراف کریں، اور اپنے تموّل کی نمائش کریں۔ صارفین کی یہ تحریک زیادہ سے زیادہ مصنوعات اور خدمات کے استعمال کو ایک مثبت چیز سمجھتی ہے۔ یہ لوگوں کو اکساتی ہے کہ وہ اپنے اوپر خرچ کریں، اپنے لاڈ اٹھائیں اور یہاں تک کہ استعمال کی زیادتی سے خود کو ہلاک کر لیں۔ کنجوسی ایک بیماری ہے جس کا علاج ضروری ہے۔ صارف کی اخلاقیات دیکھنے کے لیے آپ کو دور نہیں جانا پڑے گا۔ صرف

سیریل کے ڈبے کی پشت کو پڑھیے۔اسرائیلی کمپنی طلمہ کے بنائے میرے مرغوب سیریل کے ڈبے کی پشت پر یہ درج ہے:

"آپ کو بھی اکثر خوش ذائقے کی ضرورت ہوتی ہے، آپ کو بھی کچھ ذرا زیادہ توانائی درکار ہوتی ہے۔بعض اوقات ایسے ہوتے ہیں کہ وزن کا خیال رکھنا پڑتا ہے، لیکن کچھ ایسے بھی کہ جب کچھ اچھا کھالیا جائے۔۔۔اسی وقت! طلمہ صرف آپ کے لیے لذیذ سیریل بناتا ہے، بلاشرمندگی اپنی ضیافت کیجیے"۔

کچھ ڈبے سیریل کی ایک اور قسم بیان کرتے ہیں؛صحت مند غذا:

"صحت مند غذاؤں میں بہت سے پھل، اناج اور مغز شامل ہوتے ہیں، تاکہ آپ کو لذت کام و دہن اور صحت دے سکیں۔دن میں کسی بھی وقت ایک مزیدار غذا، ایک صحت مند زندگی کے لیے۔ایک اصلی غذا اضافی مزے کے ساتھ"۔

ساری تاریخ لوگ اس قسم کی تحریروں سے متاثر ہونے کے بجائے ان سے متنفر ہوتے تھے۔وہ انہیں خود غرضانہ، انحطاط پذیر اور اخلاقی طور پر گمراہ کن سمجھتے تھے۔تحریک صارفین نے اس عوامی نفسیات (بس ہوجائے!) کی مدد سے بہت محنت کی ہے، کہ لوگوں کو یقین دلا سکے کہ لطف اندوزی آپ کے لیے اچھی ہے جب کہ کنجوسی خود پر جبر کے مترادف ہے۔

یہ کامیاب رہا۔ہم سب اچھے صارف بن گئے۔ہم ان گنت ایسی اشیا خریدتے ہیں جن کی ہمیں ضرورت نہیں، اور کل جن کی موجودگی سے ہم واقف بھی نہیں تھے۔صنعت کار جان بوجھ کر مختصر عمر کی اشیا تیار کرتے ہیں۔بالکل اطمینان بخش اشیا کی بھی نئی اور غیر ضروری اقسام تیار کرتے ہیں، جنہیں ہم جدید نظر آنے کے لیے ضرور خرید لیتے ہیں۔خریداری اب ایک معقول مشغلہ بن گیا ہے، اور صارفین کی اشیا خاندان کے افراد، شریک حیات اور دوستوں کے درمیان رشتے استوار کرنے میں ایک لازمی جز بن گئی ہیں۔مذہبی تہوار مثلاً کرسمس خریداری کے میلے بن گئے ہیں۔امریکہ میں یوم شہدا تک، جو ابتدا میں مارے جانے فوجیوں کی یاد میں ایک سنجیدہ دن تھا، اب خصوصی سستی خریداری کا موقع بن گیا ہے۔زیادہ تر افراد اس غم کی یاد خریداری کر کے مناتے ہیں، شاید یہ ثابت کرنے کے لیے کہ آزادی کا دفاع کرنے والوں نے اپنی جانیں ضائع نہیں کیں۔

صارفین کے اخلاقیات کی سب سے چبھتی مثال غذائی بازار میں ہے۔روایتی زرعی معاشرے فاقوں کے سائے میں رہتے تھے۔آج کی متمول دنیا میں صحت کا ایک بڑا مسئلہ مٹاپا ہے! یہ غریبوں پر (جو اپنے آپ کو پیزا اور برگر سے بھر لیتے ہیں) امیروں سے زیادہ حملہ آور ہوتا ہے (امیر نامیاتی سلاد اور پھلوں کے جوس پر گزارا کرتے ہیں)۔ہر سال امریکی آبادی میں دبلا کرنے والی غذاؤں پر اس سے زیادہ رقم خرچ ہوتی ہے جتنی تمام دنیا کی بھوک مٹانے کے لیے درکار ہے۔مٹاپا تحریک صارفین کے لیے دہری جیت ہے۔بجائے کم خوراکی کے جس سے معیشت سکڑ جاتی، لوگ خوش خوراکی میں مبتلا ہیں، اور پھر دبلا کرنے والی اجناس خریدتے ہیں، جس سے معیشت کی ترقی دوگنی ہوجاتی ہے۔

ہم تحریک صارفین کی اخلاقیات کو کسی کاروباری فرد کی سرمایہ دارانہ اخلاقیت سے کیسے مناسبت دے

سکتے ہیں، جس میں نفع کو ضائع نہیں کیا جاتا بلکہ پیداوار میں دوبارہ سرمایہ کاری کی جاتی ہے۔ یہ بہت سادہ ہے۔ پچھلے ادوار کی مانند آج بھی اشرافیہ اور عوام کے درمیان محنت منقسم ہے۔ قدیم یورپ میں امرا اپنی دولت لاپروہی سے عیش وعشرت پر خرچ کرتے تھے، جب کہ کسان کفایت شعاری سے زندہ رہتے، ہر پائی کا حساب رکھتے۔ آج وقت بدل گیا ہے۔ اب امرا اپنے سرمائے اور اثاثوں کی بہت محنت سے حفاظت کرتے ہیں، جب کہ نسبتاً کم متمول افراد بلاضرورت گاڑیاں اور ٹیلی وژن خرید کر قرضوں کا بوجھ لاد لیتے ہیں۔

سرمایہ داری اور تحریک صارفین ایک ہی سکے کے دورخ ہیں، دو احکامات الٰہی کا اتصال ہے۔ امرا کے لیے سب سے مقدس حکم 'سرمایہ کاری' ہے، ہم باقی رہ جانے والوں کے لیے حکم 'خریدو!' ہے۔

یہ سرمایہ داری، صارفی اخلاق ایک اور وجہ سے بھی انقلابی ہے۔ بیشتر قدیم اخلاقی نظام افراد کو دشواریوں کی خبر سناتے تھے۔ وہ جنت کا وعدہ تو کرتے لیکن صرف اس شرط کے ساتھ کہ وہ ہمدردی، برداشت غصہ پینے، خواہش پر قابو پانے اور اپنے خودغرضانہ مفادات کو لگام دینے کے اوصاف پیدا کریں۔ زیادہ تر افراد کے لیے یہ بہت دشوار تھا۔ اخلاقیات کی تاریخ بہت عظیم خیالات کی ایک ایسی افسوسناک کہانی ہے کہ جس پر کوئی پورا نہیں اتر سکتا تھا۔ زیادہ تر عیسائی یسوع مسیح کے نقش قدم پر نہیں چل سکے۔ زیادہ تر بدھ مت کے پیرو گوتم بدھ کی پیروی میں ناکام رہتے ہیں، کنفیوشس اپنے بیشتر ماننے والوں کو دیکھ کر غصے میں آجاتا۔

اس کے مقابلے میں آج زیادہ تر افراد سرمایہ دارانہ۔ تحریک صارفین کے نظریے کے مطابق زندہ رہتے ہیں۔ نئی اخلاقیات اس شرط پر جنت کا وعدہ کرتی ہے کہ دولت مند لالچ کی گرفت میں رہیں، اور اپنا وقت مزید دولت کے حصول میں گزاریں، عوام اپنی خواہشات اور جذبوں کی لگام میں ڈھیلی چھوڑ دیں اور زیادہ سے زیادہ خریداری کریں۔ یہ تاریخ کا پہلا مذہب ہے جس کے ماننے والے وہی کرتے ہیں جو ان سے کہا گیا ہے۔ لیکن ہمیں یہ کیسے معلوم ہو کہ انعام میں ہمیں واقعی جنت ہی ملے گی؟ اسے ہم نے ٹیلی وژن پر دیکھ لیا ہے۔

○

ایک دوامی انقلاب

صنعتی انقلاب سے توانائی کی شکل بدلنے اور مصنوعات پیدا کرنے کے نئے طریقے نکل آئے، جس سے نوع انسانی اپنے اطراف کے ماحول پر انحصار سے آزاد ہوگئی۔ انسان جنگلات کاٹتے ہیں، دلدلی علاقے صاف کرتے ہیں، دریاؤں پر بند باندھتے ہیں، میدانوں میں دریا لے آتے ہیں، لاکھوں میل ریل کی پٹری بچھاتے ہیں اور فلک بوس شہر تعمیر کرتے ہیں۔ جب دنیا کو ہوموسیپین کی ضرورت کے مطابق ڈھالا جا رہا تھا، تو بہت سے طبعی مسکن تباہ ہوئے اور اسپیسی مٹ گئیں۔ کسی زمانے میں ہمارا ہرا اور نیلا سیارہ اب ایک کنکریٹ اور پلاسٹک کا شاپنگ سینٹر بن گیا ہے۔

آج زمین کے براعظم اربوں سیپین کی رہائش گاہ ہیں۔ اگر آپ تمام افراد کو جمع کر کے ایک بڑے ترازو میں رکھ دیں، تو ان کا مشترکہ وزن تین سو ملین ٹن ہوگا۔ پھر اگر آپ ہمارے تمام مویشی: گائے، سور، بھیڑ اور مرغیاں جمع کر کے انہیں ایک اور زیادہ بڑے ترازو میں رکھیں تو ان کا وزن تقریباً سات سو ملین ٹن ہوگا۔ اس کے مقابلے میں تمام زندہ بڑے جسموں والے جنگلی جانوروں، خار پشت سے پینگوین اور ہاتھی سے وہیل تک جمع کر لیں تو وزن سو ملین ٹن سے کم ہوگا۔ ہماری بچوں کی کتابیں، ہمارے ٹیلی وژن اسکرین اور مورتیاں اب بھی زراف، بھیڑیوں اور چمپینزی سے بھری ہوتی ہیں۔ لیکن اصلی دنیا میں اب ان میں سے بہت کم باقی ہیں۔ اب دنیا میں ڈیڑھ ارب مویشیوں کے مقابلے میں تقریباً اسی ہزار زراف باقی ہیں۔ دو لاکھ بھیڑیے، چار سو ملین پالتو کتے، اور ڈھائی لاکھ چمپینزی اربوں انسانوں کے مقابلے میں رہ گئے ہیں۔ انسان واقعی دنیا پر چھا گئے ہیں۔

ماحولیاتی تنزلی وسائل کی کمی سے مختلف ہے۔ جیسا کہ ہم گزشتہ باب میں دیکھ چکے ہیں، نوع انسان کو مہیا مسائل ہمیشہ بڑھتے رہے ہیں، اور بڑھتے رہیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ وسائل کے خاتمے کی قیامت خیز اطلاعات دینے والے غلطی کے مرتکب ہیں۔ اس کے مقابلے میں، ماحولیاتی انحطاط بہت اصلی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ مستقبل میں سیپین بہت مختلف اقسام کے نئے خام مال اور توانائی کے وسائل پر قادر ہوں، لیکن وہ بچے کچے مساکن کو بھی تباہ کر کے زیادہ تر دوسری اسپیسی کے خاتمے کا باعث بن جائے۔

درحقیقت، ماحولیاتی تباہی خود ہوموسیپین کی بقا کو خطرے میں ڈال سکتی ہے۔ عالمی درجہ حرارت میں اضافہ، سمندروں کی سطح اونچی ہونا اور ماحولیاتی آلودگی زمین کو ہماری نوع کے لیے کم مہربان کر سکتی ہے۔ ممکن ہے کہ مستقبل انسانی طاقت اور انسان کی پیدا کی ہوئی ماحولیاتی تباہی کی بڑھتی دوڑ کا شاہد بن جائے۔ جیسے انسان اپنی

طاقت کے استعمال سے فطری قوتوں کو زیر کرتا ہے، اور ماحول کو اپنی ضروریات و خواہشات کے تحت بدلتا ہے، تو وہ زیادہ سے زیادہ غیر متوقع اور مجرد اثرات بھی مرتب کرتا ہے۔ امکان ہے کہ ان پر قابو پانے کے لیے ماحول میں اور زیادہ بنیادی تبدیلی کی ضرورت پڑ جائے جس سے اور مزید انتشار پیدا ہو۔

بہت سے حضرات اس عمل کو فطرت کی تباہی کہتے ہیں، لیکن در حقیقت یہ تباہی نہیں ہے۔ یہ تبدیلی ہے۔ فطرت کو تباہ نہیں کیا جا سکتا۔ پینسٹھ ملین سال پہلے ایک شہاب ثاقب نے تمام ڈائنوسار کا خاتمہ کر دیا تھا، لیکن ایسا ہونے سے پستانیوں کے لیے میدان ہموار ہو گیا تھا۔ آج نوع انسانی بہت سی اسپیشی کو مٹا رہی ہے اور ممکن ہے کہ اپنا بھی خاتمہ کر لے۔ لیکن دوسری قسم کی حیات فروغ پا رہی ہے۔ مثلاً چوہے اور کاک روچ اپنے عہد شباب میں ہیں۔ یہ سخت جان مخلوق شاید کسی جوہری تباہی کے ملبے سے رینگ کر باہر آ جائے گی، اپنا ڈی این اے پھیلانے کے لیے تیار اور اہل۔ ممکن ہے کہ ۶۵ ملین سال بعد ذہین چوہے شکر گزاری میں مڑ کر انسان کی لائی تباہی کو دیکھ سکیں۔ جیسے ہم آج اس ڈائنوسار کا خاتمہ کرنے والے شہاب ثاقب کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔

پھر بھی ہمارے مٹ جانے کی افواہیں ابھی قبل از وقت ہیں۔ صنعتی انقلاب کے بعد سے انسانی آبادی اس قدر بڑھ گئی ہے جتنی پہلے کبھی نہیں تھی۔ ۱۷۰۰ء میں انسانی آبادی سات سو ملین تھی۔ ۱۸۰۰ء میں ۹۵۰ ملین۔ ۱۹۰۰ء تک ہم نے اپنی تعداد تقریباً دوگنی کر کے ایک عشاریہ چھ ارب کر لی اور ۲۰۰۰ء تک چار گنا بڑھا کر چھ ارب۔ آج سات ارب سے ذرا ہی کم سیپین زندہ ہیں۔

دور جدید

گرچہ یہ تمام سیپین اب قدرت کی مرضی سے لاپرواہ ہو گئے ہیں، لیکن اب وہ جدید صنعت اور حکومت کی قدروں کے پابند ہو گئے ہیں۔ صنعتی انقلاب سے سماجی انجینیرنگ کے تجربات کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا ہے، اور ایک اس سے بھی زیادہ طویل غیر ارادی روز مرہ کی زندگی اور انسانی سوچ میں تبدیلی کا۔ ان میں سے ایک مثال روایتی زراعتی سلسلے کے بجائے ایک ہموار، مقررہ صنعتی لائحہ عمل ہے۔

روایتی زراعت کا دارومدار قدرتی وقت اور نامیاتی پیداواری سلسلوں پر تھا۔ بیشتر معاشرے وقت کی درست پیمائش سے قاصر تھے، اور نہ ہی وہ ایسا کرنے میں بہت دلچسپی رکھتے تھے۔ دنیا گھڑیوں اور جدول کے بغیر ہی اپنا کام چلا رہی تھی۔ اس کا تعین صرف سفر آفتاب اور پیداواری نباتات سے ہوتا۔ کام کرنے کے اوقات ناہموار تھے اور روز مرہ کا معمول موسم کے ساتھ بہت تیزی سے تبدیل ہو جاتا۔ لوگ یہ جانتے تھے کہ سورج کہاں ہے، اور وہ بے چینی سے بارش کے موسم اور فصل اتارنے کے ماحولیاتی نشانیوں کے منتظر رہتے۔ انہیں گھنٹوں کا کوئی علم نہیں تھا اور سال سے انہیں کوئی رغبت نہیں تھی۔ اگر کوئی بھولا بھٹکا، وقت کا مسافر کسی قدیم گاؤں میں جا نکلے، اور کسی راہ گیر سے پوچھے کہ "یہ کون سا سال ہے؟"، تو وہ راہ گیر اس سوال سے اتنا ہی حیران ہو گا جتنا اس اجنبی کے لباس سے۔

قدیم کسانوں اور جفت ساز کے مقابلے میں جدید صنعت کار کو سورج یا موسم سے کوئی غرض نہیں۔ وہ تو درست وقت اور یکسانیت پسند کرتا ہے۔ مثلاً قدیم کارخانوں میں کوئی جفت ساز ایک پورا جوتا بناتا تھا، تلے سے لے کر فیتے تک۔ اگر کسی جفت ساز کو دیر ہو جاتی تو اس سے دوسرے سب کا کام نہیں رکتا تھا۔ لیکن آج کی جدید

جوتوں کی فیکٹری کی اسمبلی لائن میں ہر کارکن ایک علیحدہ مشین چلاتا ہے، جو جوتے کا ایک معمولی حصہ بناتی ہے، وہ پھر اگلی مشین کی جانب بڑھ جاتا ہے۔ اگر کوئی کارکن جو مشین نمبر پانچ چلاتا ہے سوتا رہ گیا، تو اس سے دیگر تمام مشینیں بھی متاثر ہوں گی۔ اس قسم کی تباہی کو روکنے کے لیے ہر ایک کو وقت کی پابندی کرنا ضروری ہے۔ ہر کارکن بالکل ایک ہی وقت پر کام پر پہنچتا ہے۔ سب ایک ساتھ کھانے کا وقفہ لیتے ہیں، چاہے وہ بھوکے ہوں یا نہیں۔ ایک سیٹی بجنے پر شفٹ ختم ہوتی ہے اور سب گھر چلے جاتے ہیں، اس وقت نہیں کہ جب ان کا پروجیکٹ ختم ہو۔
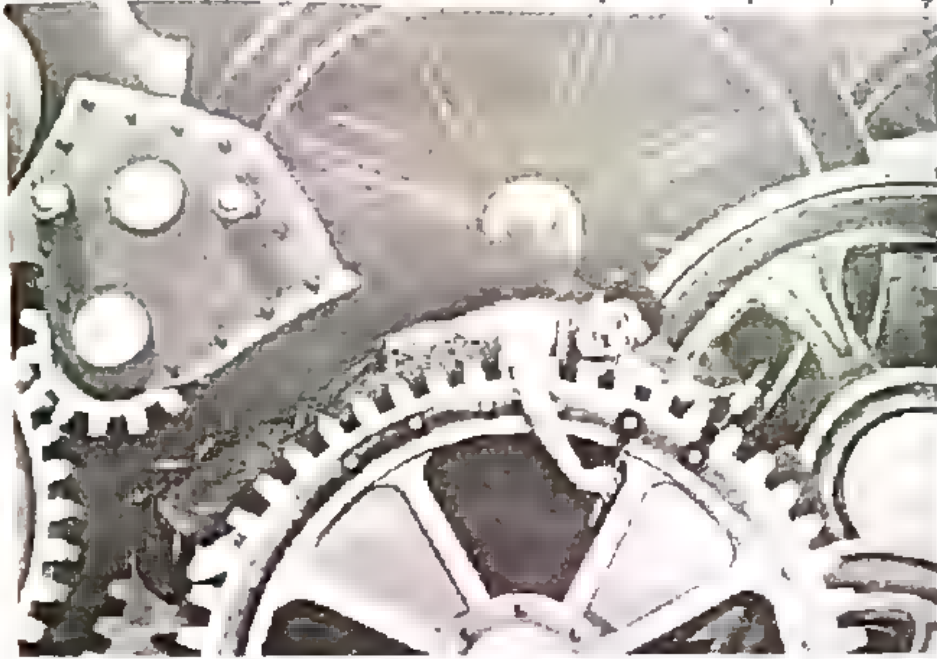
صنعتی اسمبلی لائن کی گراریوں میں الجھا ہوا، چارلی چیپلن ایک سادہ لوح کارکن کے روپ میں، ۱۹۳۶ء کی فلم 'دورِ جدید' میں

تمام انسانی حرکات کے لیے، صنعتی انقلاب نے اسمبلی لائن اور اوقات کار کا ایک سانچہ بنا دیا ہے۔ جب ملوں نے انسانی رویوں پر اوقات کار کی پابندی لگائی تو اس کے فوراً بعد اسکولوں نے بھی درست اوقات کار بنا لیے، جس کے بعد آئے ہسپتال، سرکاری دفاتر اور پنساری کی دکانیں۔ جن مقامات پر مشینیں اور اسمبلی لائنیں نہیں ہیں وہاں بھی اوقات کار کی حکومت قائم ہوگئی۔ اگر فیکٹری میں شفٹ شام پانچ بجے ختم ہوتی ہے، تو بہتر یہ ہے کہ مقامی شراب خانہ پانچ بج کر دو منٹ پر کھل چکا ہو۔

اس بڑھتے ہوئے اوقات کار کے سلسلے کی ایک اہم کڑی عوامی ذرائع نقل و حمل تھے۔ اگر کارکنوں کو اپنا کام صبح آٹھ بجے شروع کرنا تھا تو بس یا ریل کو فیکٹری کے دروازے پر ۷:۵۵ تک پہنچ جانا تھا۔ چند منٹ کی تاخیر سے پیداوار کم ہو سکتی تھی، اور شاید چند بدقسمت تاخیر سے پہنچنے والوں کی نوکری بھی ختم ہو سکتی تھی۔

۱۸۴۷ء میں برطانیہ سے شائع ہونے والے ایک بار برداری کے میزان اوقات میں صرف روانگی کا وقت درج تھا، پہنچنے کا نہیں۔ اس زمانے میں ہر برطانوی شہر اور قصبے کا اپنا الگ مقامی وقت ہوتا تھا، جو لندن کے وقت سے نصف ساعت تک مختلف ہو سکتا تھا۔ جب لندن میں بارہ بجے تھے تو اس وقت لیور پول میں ۱۲:۲۰ اور کنٹربری میں ۱۱.۵۰۔ کیوں کہ اس وقت کوئی ریڈیو، ٹیلی وژن، ٹیلی فون یا تیز رفتار ریل نہیں تھیں، لہٰذا کسے معلوم ہو سکتا تھا

اور کیسے لگی تھی؟

۱۸۳۰ میں لیورپول اور مانچسٹر کے درمیان پہلی تجارتی ریل شروع ہونے کے دس سال بعد ریل کا پہلا میزان اوقات شائع ہوا۔ یہ ریلیں پرانے باربرداروں سے کہیں زیادہ تیز رفتار تھیں، لہٰذا مقامی اوقات میں یہ فرق ایک مسئلہ بن گیا۔ ۱۸۴۷ء میں برطانوی ریل کمپنیاں سر جوڑ کر بیٹھ گئیں اور انہوں نے طے کیا کہ آئندہ ہر ریل کا میزان اوقات گرین وچ رصدگاہ کے وقت سے میل رکھے گا، بجائے لیورپول، مانچسٹر یا گلاسگو کے مقامی اوقات کے۔ زیادہ سے زیادہ ادارے ریل کمپنیوں کی تقلید کرنے لگے۔ آخر کار ۱۸۸۰ء میں برطانوی حکومت نے بے مثال قدم اٹھایا کہ تمام برطانوی میزان اوقات گرین وچ کی تقلید کریں گے۔ تاریخ میں پہلی بار کسی ملک نے ایک قومی وقت اپنالیا، اور اپنی آبادی کو مجبور کیا کہ کسی مقامی گھڑی یا طلوع سے غروب آفتاب کے وقت کے بجائے ایک مصنوعی گھڑی کی اطاعت کریں۔

اس سادہ سی ابتدا نے میزان اوقات کا ایک عالمی نظام شروع کر دیا جو ایک سیکنڈ کے مختصر ترین دورانیے تک درست ہوتا ہے۔ جب نشر و اشاعت کے اداروں مثلاً ریڈیو اور پھر ٹیلیوژن نے اپنی ابتدا کی تو وہ بھی میزان اوقات کی دنیا میں داخل ہوگئے۔ ریڈیو اسٹیشن سے سب سے پہلے وقت کا سگنل نشر ہوتا۔ وہ آواز جس سے دور دراز کی آبادیاں اور بحری جہاز اپنا وقت ملا لیتے۔ بعد میں ریڈیو اسٹیشن نے ہر گھنٹے خبریں نشر کرنے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ آج کسی خبرنامے کی سب سے پہلی خبر، کوئی جنگ چھڑ جانے سے بھی پہلے، وقت کا اعلان ہوتا ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران بی بی سی کی خبریں نازی مقبوضہ یورپ میں بھی نشر ہوتی تھی۔ یہ خبرنامہ بگ بین گھڑیال کی آواز براہ راست نشر کرنے سے شروع ہوتا تھا، آزادی کی جادوئی آواز۔ ذہین جرمن ماہرین طبیعات نے اس نشریات کی ڈنگ ڈانگ میں معمولی فرق سے لندن کے موسم کا اندازہ لگانا شروع کر دیا۔ یہ نازی فضائیہ کے لیے بہت اہم معلومات تھی۔ جب برطانوی سیکرٹ سروس کو اس دریافت کی اطلاع ملی، تو انہوں نے براہ راست نشریات کے بجائے اس مشہور گھڑی کی ایک ریکارڈنگ نشر کرنی شروع کر دی۔

میزان اوقات کے نظام کو چلانے کے لیے سستی لیکن درست قابل نقل گھڑیاں ضروری ہوگئیں۔ ممکن ہے کہ اسیری، ساسانی یا انکا شہروں میں کچھ آفتابی گھڑیال نصب ہوتے، یورپ کے قدیم شہروں میں عموماً ایک تنہا گھڑی لگی ہوتی، شہر کے چوراہے پر ایک اونچے مینار میں نصب بڑا گھڑیال۔ یہ گھڑیاں غلط ہونے کے لیے مشہور تھیں۔ مگر کیوں کہ شہروں میں اور کوئی گھڑی ہوتی ہی نہیں تھی کہ جس سے انہیں ملایا جا سکے تو کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ آج کسی متمول گھرانے میں عموماً اس سے بھی زیادہ گھڑیاں ہوتی ہیں جتنی کسی پورے قدیم ملک میں ہوتی تھیں۔ آپ اپنی کلائی کی گھڑی پر نظر ڈال کر وقت بتا سکتے ہیں، اپنے فون کو دیکھ کر، اپنے سرہانے رکھی گھڑی دیکھ کر، باورچی خانے میں نصب گھڑی سے، مائکرو ویو کی گھڑی سے، ٹی وی یا ڈی وی ڈی کی گھڑی سے یا اپنی آنکھ کے گوشے سے کمپیوٹر کی پٹی پر نظر ڈال کر۔ آپ کو خاصی محنت کرنی پڑتی ہے کہ آپ وقت سے ناواقف رہیں۔

ایک عام فرد دن میں کئی درجن مرتبہ ان گھڑیوں سے رجوع کرتا ہے، کیوں کہ ہم جو بھی کریں اسے ایک وقت مقررہ پر سرانجام دینا ہوتا ہے۔ ایک الارم گھڑی ہمیں سات بجے بیدار کرتی ہے، ہم اپنا جما ہوا بیگل ٹھیک پچاس سیکنڈ کے لیے مائکرو ویو میں گرم کرتے ہیں، اپنے دانت تین منٹ کے لیے اس وقت تک برش کرتے

ہیں جب تک کہ خودکار برش سے بیپ کی آواز نہ آجائے، کام پر جانے والی ۷:۴۰ کی ریل میں سوار ہوتے ہیں، جمنازیم میں ٹریڈمل پر نصف ساعت دوڑتے ہیں، یہاں تک کہ بیپ کی آواز آدھا گھنٹہ ختم ہونے کا اعلان کردے۔ شام سات بجے ٹی وی کے سامنے بیٹھ کر اپنا پسندیدہ پروگرام دیکھتے ہیں جس میں مقررہ وقتوں سے اشتہار رخنہ ڈالتے ہیں، جن کی قیمت ہزار ڈالر فی سیکنڈ ہوتی ہے، اور بالآخر اپنا سارا غصہ کسی معالج کے سامنے بیان کردیتے ہیں، ہماری بک بک سننے کے لیے اب تقریباً معالجے کا پچاس منٹ کا وقت مقرر ہے۔

صنعتی انقلاب سے انسانی معاشرے میں بہت سی اہم تبدیلیاں آئیں۔ صنعتی وقت کو اپنانا ان میں سے صرف ایک تھا۔ دوسری اہم امثال میں شہروں کی جانب ہجرت، کسانوں کی تعداد میں کمی، صنعتی محنت کشوں کی تعداد میں اضافہ، عام آدمی کی قوت میں اضافہ، جمہوریت، نوجوان ثقافت اور پدرانہ ثقافت کا بکھرنا شامل ہیں۔

لیکن یہ تمام تبدیلیاں، بس اہم ترین سماجی انقلاب کے سامنے پستہ قد ہیں جو انسانیت پر نازل ہوئی، خاندان اور مقامی قبیلوں کا انہدام اور ان کی جگہ ریاست اور مارکیٹ کا دخل۔ ہمارا بہترین قیاس یہی ہے کہ اولین اوقات سے افراد کوئی دس لاکھ سال پہلے مختصر قریبی برادریوں میں رہتے تھے، جن میں سے بیشتر افراد آپس میں رشتہ دار تھے۔ ادراکی اور زرعی انقلابات نے بھی اسے تبدیل نہیں کیا۔ ان ہی خاندانوں اور برادریوں نے باہم مل کر قبیلے، شہر، مملکت اور سلطنتیں قائم کیں، لیکن تمام انسانی معاشروں کا بنیادی تعمیری عنصر خاندان اور برادری ہی رہا۔ جب کہ صنعتی انقلاب نے صرف دو صدیوں میں ان تعمیری عناصر کو ان کے مختصر جواہر میں بکھیر دیا۔ اب خاندانوں اور برادریوں کے بیشتر روایتی کام ریاست اور مارکیٹ کو تفویض کردیے گئے۔

خاندان اور برادری کا انہدام

صنعتی انقلاب سے پہلے بیشتر افراد کی روزمرہ زندگی تین حوالوں کے گرد گھومتی تھی: مرکزی خاندان، دور پار کے عزیز اور مقامی قریبی برادری*۔ زیادہ تر افراد خاندانی کاروبار مثلاً خاندانی کھیتی باڑی یا کارخانے میں کام کرتے، یا وہ اپنے ہمسائے کے گھریلو کاروبار میں کام کرتے۔ خاندان ہی فلاح کا مرکز تھا: صحت کا وسیلہ، تعلیم کا ذریعہ، تعمیراتی صنعت، ٹریڈ یونین، پنشن فنڈ، بیمہ کمپنی، ریڈیو، ٹیلی وژن، اخبار، بینک اور پولیس بھی۔

جب کوئی فرد بیمار پڑ جاتا تو خاندان اس کی دیکھ بھال کرتا۔ جب کوئی شخص بوڑھا ہو جاتا تو گھر کے افراد اس کی مدد کرتے، اس کی اولاد اس کا پنشن فنڈ ہوتا۔ اگر کوئی شخص فوت ہو جاتا جو خاندانی یتیموں کی دیکھ بھال کرتا۔ اگر کوئی شخص کاروبار شروع کرنا چاہتا تو خاندان والے مل کر ضروری رقم اکٹھی کرتے۔ اگر کوئی شخص شادی کرنا چاہتا تو خاندان والے انتخاب کرتے، یا کم از کم ممکنہ شریک حیات کی چھان بین کرتے۔ اگر کسی پڑوسی سے جھگڑا ہو جائے تو گھر والے کمر کس لیتے۔ لیکن اگر کسی شخص کی بیماری خاندان کے افراد کی تیمارداری سے زیادہ مہلک ہوتی، یا کسی نئے کاروبار میں زیادہ بڑی سرمایہ کاری درکار ہوتی، یا ہمسایوں سے جھگڑا تشدد تک پہنچ جاتا تو مقامی برادری مدد کو آتی۔

* کوئی قریبی برادری افراد کا وہ گروہ ہے جو ایک دوسرے سے خوب واقف ہے اور اپنی بقا کے لیے ایک دوسرے پر انحصار کرتا ہے۔

برادری کی امداد مقامی روایات یا باہمی شکر گزاری کی معیشت پر مبنی تھی۔ جو عموماً آزاد مارکیٹ کی ضرورت اور فراہمی کے قانون سے بہت مختلف ہے۔ ایک روایتی قدیم برادری میں جب میرے ہمسائے کو ضرورت ہوئی تو میں نے بغیر کسی معاوضے کی امید کے اس کی جھونپڑی بنانے میں اس کی مدد کی، اور اس کے دنبے کی دیکھ بھال کی۔ جب مجھے ضرورت پڑی تو ہمسائے نے وہ مہربانی لوٹا دی۔ اسی دور میں مقامی سردار ہم سب گاؤں والوں کو بغیر کوئی دم ادا کیے اپنے قلعے کی تعمیر میں استعمال کرتا، اس کے بدلے ہم اس سے توقع رکھتے کہ وہ ہمیں لٹیروں اور وحشیوں سے محفوظ رکھے گا۔ گاؤں کی زندگی میں اس قسم کے بہت تبادلے ہوتے لیکن معاوضے بہت کم۔ کچھ بازار یقیناً تھے لیکن ان کا کردار بہت محدود تھا۔ آپ نایاب مصالحے، کپڑے اور اوزار خرید سکتے تھے، یا وکیلوں اور ڈاکٹروں کی خدمات لے سکتے تھے۔ لیکن عام طور پر پیدا ہونے والی مصنوعات اور خدمات میں سے تو دس فیصد سے بھی کم بازار سے خریدی جاتیں۔ بیشتر انسانی ضروریات خاندان اور برادری سے پوری ہوتیں۔

پھر مملکتیں اور ریاستیں تھیں جو جنگ کرنے، سڑکیں بنانے اور محلات کی تعمیر کے اہم کام انجام دیتیں۔ ان مقاصد کے لیے بادشاہ مالیے میں اضافہ کرتے اور کبھی کبھار مزدور اور سپاہی بھی بھرتی کرتے۔ لیکن سوائے چند مثالوں کے یہ عموماً خاندانوں اور برادری کی روزمرہ زندگی سے الگ رہتے۔ اگر وہ دخل اندازی کرنا بھی چاہتے تب بھی زیادہ تر بادشاہ مشکل ہی سے ایسا کر پاتے۔ روایتی زرعی معیشت میں شاید ہی کچھ اضافی بچتا جس سے سرکاری کارندوں، پولیس والوں، سماجی کارکنوں، اساتذہ اور ڈاکٹروں کے جم غفیر کا پیٹ بھرتا۔ لہذا زیادہ تر حکمران بڑے پیمانے پر فلاحی ادارے، صحت کے ادارے یا تعلیمی ادارے قائم نہ کرتے۔ یہ امور وہ خاندان اور برادری کے لیے چھوڑ دیتے۔ کبھی اگر کسی حاکم نے کسانوں کی روزمرہ کی زندگی میں دخل دینے کی کوشش کی بھی (مثلاً چین کی چن سلطنت) تو انہوں نے خاندان کے سربراہ یا برادری کے بزرگوں کو سرکاری کارندہ مقرر کر دیا۔

اگر نقل وحمل اور اطلاعتی روابط اتنے دشوار تھے کہ بہت سی مملکتیں دور دراز کی آبادیوں میں بنیادی شاہی استحقاق مثلاً مالیہ اور تشدد بھی مقامی برادریوں پر چھوڑ دیتے۔ مثلاً خلافت عثمانیہ نے کوئی بڑی شاہی فورس رکھنے کے بجائے خاندانی جھگڑوں کو خود منصفی پر چھوڑ دیا تھا۔ اگر میرے عم زاد نے کسی کو قتل کر دیا تو ہو سکتا ہے کہ مقتول کے بھائی تسلیم شدہ انتقامی سزا میں مجھے قتل کر دیں۔ استنبول کا سلطان یا صوبائی پاشا تک ایسے جھگڑوں میں ملوث نہیں ہوتے تھے، جب تک کہ تشدد قابل قبول حدود کے اندر رہے۔

چین کی منگ سلطنت (۱۳۶۸ سے ۱۶۴۴ء) میں آبادی کو بیوجیا (Baojia) نظام میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ دس خاندانوں کو ملا کر ایک 'جیا' قائم ہوتا اور پھر دس جیا ملا کر ایک 'باؤ' تشکیل دیتے۔ جب باؤ کا کوئی فرد ارتکاب جرم کرتا تو باؤ کے بقیہ اراکین کو اس کی سزا ملتی، بالخصوص باؤ کے بزرگوں کو۔ اسی طرح مالیہ بھی باؤ پر لاگو ہوتا۔ ریاست کے کارکنوں کے بجائے یہ باؤ کے بزرگوں کا فرض تھا کہ وہ ہر خاندان کی صورت حال کا جائزہ لے کر اس کے مالیے کا تخمینہ لگائیں۔ ریاستی نکتہ نظر سے اس نظام کے بہت فوائد تھے۔ بجائے ہزاروں مالیہ افسران کے جو ہر خاندان کی آمدنی اور اخراجات پر نظر رکھیں، یہ کام برادری کے بزرگوں پر چھوڑ دیا گیا تھا۔ بزرگوں کو معلوم تھا کہ گاؤں کے کسی بھی باشندے کی مالی حیثیت کیا ہے اور وہ شاہی فوج کو ملوث کیے بغیر مالیہ وصول کر لیتے تھے۔

درحقیقت کئی ریاستیں اور مملکتیں محض بڑے حفاظتی فریبوں سے زیادہ کچھ نہیں تھیں۔ بادشاہ آقاؤں کا آقا

ہوتا (Capo di futti i capi) جو حفاظت کا معاوضہ جمع کرتا اور جواب میں یہ بات یقینی بناتا کہ جرائم کے بڑے گروہ یا چھوٹے مقامی مجرم اس کی حفاظت میں لوگوں کو تنگ نہ کریں۔ اس سے زیادہ اس کا کوئی کام نہیں تھا۔

خاندان اور برادری کے نچلے طبقے میں زندگی آسان نہیں تھی۔ خاندان اور برادری اپنے افراد کا تنی بے رحمی سے استحصال کرتی تھے جیسے جدید ریاست یا مارکیٹ۔ ان کی اندرونی سیاست اکثر تناؤ کا شکار تشدد آمیز ہوتی، لیکن لوگوں کے پاس کوئی چارہ نہ ہوتا۔ ۱۷۵۰ میں اگر کوئی عورت اپنے خاندان اور برادری کو کھو دے تو اس سے وہ مردہ ہی بہتر تھی۔ اسے کوئی ملازمت نہ ملتی نہ کوئی تعلیم۔ بیماری یا مشکل وقت میں کوئی مدد میسر نہ ہوتی۔ کوئی اسے قرض دیتا اور نہ ہی مشکل میں اس کی مدد کو آتا۔ کوئی پولیس، کوئی سماجی کارکن اور کوئی لازمی تعلیم میسر نہیں تھی۔ اپنی بقا کے لیے ایسے فرد کو فوراً ایک متبادل خاندان یا برادری سے وابستہ ہونا پڑتا۔ وہ لڑکا یا لڑکی جو گھر سے فرار ہو جائیں وہ زیادہ سے زیادہ کسی نئے گھرانے میں نوکر ہو جانے کی توقع کر سکتے تھے، اور زیادہ بدتر صورت میں فوج تھی یا چکلہ۔

گزشتہ دو صدیوں میں یہ سب ڈرامائی طور پر بدل گیا۔ صنعتی انقلاب نے مارکیٹ کو بے تحاشہ نئی قوت دی، ریاست کو رابطے اور نقل و حمل کے نئے ذرائع مہیا کیے، اور حکومت کے استعمال کے لیے کلرکوں، اساتذہ، پولیس اور سماجی کارکنوں کی ایک فوج مہیا کر دی۔ ابتدا میں ریاست اور مارکیٹ نے خاندان اور برادری کو اپنے راستے کی رکاوٹ جانا، جو اپنے معاملات میں بیرونی مداخلت پسند نہیں کرتے تھے۔ والدین اور برادری کے بزرگ اپنی نوجوان نسل کو قومی تعلیمی نظام کے تابع کرنے سے گریز کرتے۔ فوج میں بھرتی ہونے یا اجنبی زمین پر شہری پرولتاری بننے سے بھی روکتے۔

وقت گزرنے کے ساتھ ریاست اور مارکیٹ نے اپنی بڑھتی قوت کو خاندان اور برادری کے روایتی بندھن توڑنے کے لیے استعمال کیا۔ ریاست نے خاندان کے جھگڑے نبٹانے کے لیے اپنی پولیس بھیجی، اور ان کی جگہ عدالتی فیصلوں نے لے لی۔ مارکیٹ نے اپنے پھیری والے بھیج کر قدیم مقامی روایات ختم کر کے ان کی جگہ ہمیشہ تغیر پذیر تجارتی فیشن آراستہ کر دیا۔ پھر بھی یہ سب کافی نہیں تھا۔ خاندان اور برادری کی طاقت واقعی ختم کرنے کے لیے انہیں ایک پانچویں کالم کی ضرورت تھی۔

ریاست اور مارکیٹ نے افراد کو ایسی ترغیب دی جسے رد کرنا ان کے لیے دشوار تھا۔ "منفرد بن جاؤ" وہ کہتے۔ "اپنے والدین سے پوچھے بغیر جس سے چاہو بیاہ کرو۔ جو نوکری تمہارے لیے موزوں ہو وہ لے لو، چاہے برادری کے بزرگ اس پر منہ بنائیں۔ جہاں چاہے رہو، خواہ اس کی وجہ سے تم ہر ہفتے خاندان کے مشترکہ عشایئے میں شرکت سے قاصر رہو۔ اب تم اپنے خاندان، برادری پر منحصر نہیں ہو۔ ان کے بجائے ہم ریاست اور مارکیٹ تمہاری دیکھ بھال کریں گے۔ ہم غذا، چھت، تعلیم، صحت، بہبود اور نوکری فراہم کریں گے۔ ہم پنشن، بیمہ اور تحفظ دیں گے"۔

رومانوی ادب اکثر فرد کو ریاست اور مارکیٹ کے درمیان منقسم دکھاتا ہے، اس سے زیادہ غلط بات ہو ہی نہیں سکتی۔ ریاست اور مارکیٹ فرد کے ماں باپ ہیں، اور فرد صرف ان کی مہربانی سے ہی بقا پا سکتا ہے۔ مارکیٹ ہمیں نوکری، پنشن اور بیمہ دلاتی ہے۔ اگر ہم کوئی پیشہ اختیار کرنا چاہیں تو ہماری تعلیم کے لیے حکومتی اسکول موجود ہیں۔ اگر ہم کسی کاروبار کا آغاز کرنا چاہیں تو بینک ہمیں قرضہ دے سکتا ہے، جو بعض دفعہ تو امدادی نرخ پر، اور کبھی

ریاست سے بیمہ ہوتا ہے۔ اگر تشدد پھوٹ پڑے تو پولیس ہمارا تحفظ کرتی ہے۔ اگر ہم کچھ دن بیمار پڑ جائیں تو صحت کا بیمہ ہمارا خیال رکھتا ہے۔ اگر ہم کئی ماہ کے لیے بالکل لاغر ہو جائیں تو قومی خدماتی سماجی گروہ دخل دیتا ہے۔ اگر ہمیں چوبیس گھنٹے مدد کی ضرورت ہو تو ہم مارکیٹ جا کر کوئی نرس بھرتی کر سکتے ہیں۔ دنیا کے کسی دوسرے کونے سے آیا کوئی اجنبی جو ہماری اس خیر خواہی سے دیکھ بھال کرتا ہے جس کی خود اپنے بچوں سے امید نہیں ہوتی۔ اگر آپ کے پاس وسائل ہوں تو آپ اپنے سنہرے سال کسی بزرگ شہریوں کے دارالامان میں گزار سکتے ہیں۔ مالیہ کے عہدیدار ہمیں ایک فرد کی مانند قبول کرتے ہیں اور ہم سے پڑوسی کے مالیے کی وصولی کی توقع نہیں رکھتے۔ عدالتیں بھی ہمیں منفرد شخص کے طور پر دیکھتی ہیں، اور کبھی ہمیں ہمارے عمزادوں کے گناہوں کی سزا نہیں دیتیں۔

نہ صرف بالغ مرد بلکہ عورتیں اور بچے بھی انفرادی حیثیت میں شناخت کیے جاتے ہیں۔ تاریخ کے بیشتر دورانیے میں عورتوں کو اکثر خاندان یا برادری کی جاگیر سمجھا جاتا تھا۔ جب کہ دوسری جانب جدید ریاستیں عورتوں کو منفرد شخصیات مانتی ہیں۔ جو خاندان اور برادری سے الگ ہو کر بھی اقتصادی اور قانونی حقوق سے لطف اندوز ہو سکتی ہیں۔ وہ خود اپنا بینک اکاؤنٹ کھول سکتی ہیں، اپنی مرضی کا شریک حیات منتخب کر سکتی ہیں، طلاق دے سکتی ہیں اور تنہا رہنے کا فیصلہ بھی۔

لیکن اس شخصی آزادی کی ایک قیمت ہے۔ ہم میں سے بہت سے افراد اب مضبوط خاندان اور برادری کو کھو دینے پر رنجیدہ ہیں۔ غیر جذباتی ریاست اور مارکیٹ ہماری زندگیوں میں جو روسوخ رکھتی ہیں، اس سے تنہائی اور خطرہ محسوس کرتے ہیں۔ ریاست اور مارکیٹ جو اجنبی افراد پر مشتمل ہو، وہ اپنے اراکین کی زندگیوں میں زیادہ آسانی سے دخیل ہو سکتی ہیں، بجائے ایسی ریاست اور مارکیٹ کے کہ جو مضبوط خاندان اور برادری پر مشتمل ہو۔ جب کسی فلک بوس عمارت کے رہائشی اس بات پر متفق نہیں ہو سکتے کہ دربان کو کتنے پیسے دیں، تو ان سے ریاست کا مقابلہ کرنے کی کیسے توقع کی جا سکتی ہے؟

ریاست، مارکیٹ اور فرد کے درمیان تعلق مضطرب سا ہے۔ ریاست اور مارکیٹ خود اپنے باہمی حقوق اور ذمہ داریوں پر متفق نہیں ہوتے، اور فرد کو یہ شکایت رہتی ہے کہ دونوں طلب بہت زیادہ کرتے ہیں اور فراہم بہت کم۔ بہت سے معاملات میں مارکیٹ فرد کا استحصال کرتی ہے، اور ریاست اپنی پولیس، فوج اور نوکر شاہی کے ذریعے افراد کی حفاظت کے بجائے انہیں دق کرتی ہے۔ پھر بھی یہ معاملہ چاہے کتنا ہی ناقص کیوں نہ ہو، حیرت یہ ہے کہ کیسے فعال رہتا ہے۔ کیوں کہ اس سے ان گنت سماجی انتظامات کی شاخیں نکلتی ہیں۔ لاکھوں سال کی ارتقا نے ہمیں اس ڈھنگ سے تراشا ہے کہ ہم برادری کے فرد کی مانند سوچیں اور زندہ رہیں۔ صرف دو صدیوں میں ہم اجنبی افراد بن گئے ہیں۔ ثقافت کی عظیم طاقت کی اس سے بہتر مثال نہیں ملتی۔

جدید منظرنامے سے مرکزی خاندان مکمل طور پر ختم تو نہیں ہوا۔ جب ریاست اور مارکیٹ نے خاندان سے اس کا بیشتر معاشی اور سیاسی کردار لے لیا، پھر بھی انہوں نے چند ضروری جذباتی عمل باقی رہنے دیے۔ جدید خاندان اب بھی ضروریات کے لیے ذمہ دار سمجھا جاتا ہے، جو کہ ریاست اور مارکیٹ (ابھی تک) پہنچانے سے قاصر ہیں۔ لیکن یہاں بھی خاندانوں کو بڑھتی مداخلت کا سامنا ہے۔ لوگ اپنے رومانوی اور جنسی اوقات کیسے گزارتے ہیں اس پر بھی مارکیٹ کا اثر بڑھتا رہتا ہے۔ جب کہ روایتی طور پر خاندان شریک حیات چننے کا کردار ادا کرتا تھا، آج

مارکیٹ ہماری جنسی اور رومانوی ترجیحات مرتب کرتی ہے، اور پھر ان ضروریات کو پوری کرنے میں ایک گرانقدر معاوضے کے عوض مددگار بھی ہوتی ہے۔ پہلے دولہا اور دلہن خاندان کے مرکزی کمرے میں ملتے تھے، اور پیسا ایک باپ سے دوسرے باپ کے ہاتھوں میں منتقل ہوتا تھا۔ آج ملاقاتیں کیفے اور شراب خانوں میں ہوتی ہیں، اور پیسہ عشاق کے ہاتھوں سے ویٹرس کے ہاتھوں میں منتقل ہوتا ہے۔ اس سے بھی زیادہ پیسہ فیشن ڈیزائنرز، جمنازیم مینیجر، غذائی ماہرین، میک اپ ماہرین اور پلاسٹک سرجنوں کے بینک اکاؤنٹوں میں منتقل ہوتا ہے۔ یہ ہمیں وہ روپ اپنانے میں مدد کرتے ہیں جو مارکیٹ کا خیال حسن ہے۔

ریاست بھی خاندانی تعلقات بالخصوص والدین اور اولاد پر بہت قریبی نظر رکھتی ہے۔ کئی ممالک میں والدین بچوں کو سرکاری اسکولوں میں تعلیم کے لیے بھیجنے پر پابند ہیں۔ جہاں نجی تعلیم کی اجازت ہو وہاں بھی ریاست نصاب متعین کرتی ہے اور نگراں رہتی ہے۔ جو والدین اپنے بچوں پر بے جا سختی یا تشدد کریں، ریاست انہیں پابند کرسکتی ہے۔ اور ضرورت پڑنے پر والدین کو قید یا بچوں کو رضائی والدین کے سپرد کرسکتی ہے۔ ابھی زیادہ وقت نہیں گزرا جب یہ خیال بھی مضحکہ خیز اور ناممکن سمجھا جاتا تھا کہ والدین کو بچوں کی بے عزتی کرنے یا انہیں مارنے سے ریاست باز رکھ سکتی ہے۔ زیادہ تر معاشروں میں والدین کا اجارہ مقدس تھا۔ والدین کی تعظیم اور اطاعت سب سے مقدس اوصاف تھے، والدین جو بھی چاہتے کرسکتے تھے۔ نوزائیدہ اولاد کو قتل کرنے، بچوں کو غلامی میں فروخت کرنے اور اپنی بیٹیوں کو ان کی عمر سے دوگنا مردوں سے بیاہنے تک۔ آج والدین کا اجارہ پسپائی پر مائل ہے۔ نوجوانوں کو اپنے بزرگوں کی اطاعت سے معاف کردیا جاتا ہے۔ ہر غلطی کے لیے والدین کو مورد الزام ٹھہرایا جاتا ہے۔ والدین فرائڈ کی کسی عدالت میں بے گناہ قرار دیے جانے کا اتنا ہی امکان رکھتے ہیں جتنا اسٹالن کے دکھاوے کے مقدمات۔

مفروضہ برادریاں

مرکزی خاندان کی مانند برادری بھی ہماری دنیا سے بغیر جذباتی نعم البدل کے غائب نہیں ہوسکتیں۔ آج برادری کی جگہ تمام مادی ضروریات مارکیٹ اور ریاست فراہم کرتی ہے، لیکن انہیں قبائلی روابط بھی فراہم کرنے ہوں گے۔

مارکیٹ اور ریاست مفروضہ برادریوں کے ذریعہ ایسا کرتی ہیں۔ جن میں لاکھوں اجنبی شامل ہوتے ہیں، جو قومی اور تجارتی ضروریات کے مطابق تراشے گئے ہوں۔ کوئی مفروضہ برادری ایک ایسی برادری ہے، جس میں افراد ایک دوسرے سے واقعی واقف نہیں ہوتے، لیکن فرض کرلیتے ہیں کہ وہ واقف ہیں۔ ایسی برادریاں کوئی نئی دریافت نہیں۔ مملکتیں، ریاستیں اور چرچ ہزاروں سالوں سے فرضی برادری کے طور پر رہتی رہی ہیں۔ قدیم چین میں کروڑوں افراد اپنے آپ کو ایک ہی خاندان کے افراد سمجھتے، جس میں شہنشاہ باپ ہوتا۔ قرون وسطی میں کروڑوں دیندار مسلمان یہ فرض کرتے تھے کہ وہ سب اسلام کی عظیم برادری میں بہن بھائی ہیں۔ لیکن تاریخ کے تمام ادوار میں ان قریبی برادریوں کے مقابلے میں جن میں کئی درجن افراد ایک دوسرے کو بہت اچھی طرح جانتے تھے، ایسی مفروضہ برادریں دوسرے درجے کا کردار ادا کرتی تھیں۔ یہ قریبی برادریاں اپنے اراکین کی جذباتی ضروریات پوری کرتیں، اور ایک کی فلاح وبقا کے لیے ضروری تھیں۔ گزشتہ دو صدیوں میں یہ قریبی برادریاں کمزور

ہوئی ہیں، اپنی جگہ فرضی برادریوں کو وہ جذباتی خلا پورا کرنے چھوڑ دیا ہے۔
ان فرضی برادریوں کی دو اہم امثال قوم اور صارفین کا قبیلہ ہے۔قوم ایک ریاست کی فرضی برادری ہے، صارفین کا قبیلہ مارکیٹ کی فرضی برادری ہے۔ یہ دونوں اس لیے فرضی ہیں کیوں کہ یہ ناممکن ہے کہ کسی مارکیٹ کے سب گاہک یا کسی ایک قوم کے تمام افراد ایک دوسرے سے اسی طرح واقف ہوں جس طرح ماضی میں دیہاتی ایک دوسرے سے واقف ہوتے تھے۔ کوئی جرمن بھی آٹھ کروڑ دوسرے جرمن قوم کے افراد سے واقف نہیں ہوسکتا، یا یورپی مشترکہ مارکیٹ میں پچاس کروڑ دوسرے گاہکوں سے (جو پہلے یورپی برادری اور پھر یورپی یونین بن گئی)۔
صارفین اور قوم پرستی ہمیں یہ باور کرانے میں بہت وقت لگاتے ہیں کہ فرض کر لیجیے یہ لاکھوں اجنبی اسی برادری سے تعلق رکھتے ہیں جس سے کہ ہم: مشترکہ ماضی، مشترکہ مفادات اور مشترکہ مستقبل سمیت۔ یہ جھوٹ نہیں ہے، یہ مفروضہ ہے۔ پیسے، محدود ذمہ داری کی کمپنیوں اور انسانی حقوق کی مانند قومیت اور صارفین بھی بین الانسانی حقائق ہیں۔ یہ صرف ہمارے تصور میں زندہ ہیں، لیکن یہ بہت طاقتور ہیں۔ جب تک کروڑوں جرمن ایک جرمن قوم کی موجودگی پر یقین رکھتے ہیں، جرمنی کا قومی نشان دیکھ کر جذباتی ہوتے ہیں، جرمن روایات دہراتے ہیں اور جرمن قوم کے لیے دامے درمے قدمے قربانیوں پر آمادہ ہیں، جرمنی دنیا کی طاقت ور ترین قوموں میں سے ایک ہے۔
قوم اپنا فرضی روپ پوشیدہ رکھنے کی پوری کوشش کرتی ہے۔ زیادہ تر قومیں خود کو فطری اور ابدی وجود بتاتی ہیں، جو کسی ابتدائی زمانے میں مادرِ وطن کی مٹی کو اس کے افراد سے گوندھ کر بنایا ہے۔ لیکن یہ دعوے عموماً بڑھا چڑھا کر بیان کیے جاتے ہیں۔ قومیں ماضی بعید میں موجود تھیں، لیکن آج کے مقابلے میں ان کی اہمیت بہت کم تھی، کیوں کہ ریاست کی اہمیت بہت کم تھی۔ قدیم نیورمبرگ کا کوئی باشندہ ممکن ہے کہ جرمن قوم سے وفاداری محسوس کرے، لیکن وہ اپنے خاندان اور مقامی برادری سے زیادہ وفاداری محسوس کرے گا، جس نے اس کی بیشتر ضروریات پوری کیں۔ مزید یہ کہ قدیم قومیتوں کی جو بھی اہمیت رہی ہو، ان میں سے چند ہی باقی رہ گئی ہیں۔ بیشتر قومیں صنعتی انقلاب کے بعد وجود میں آئیں۔
مشرقِ وسطیٰ اس کی خاص مثالیں فراہم کرتا ہے۔ شامی، لبنانی، اردنی اور عراقی قومیں غیر مستحکم سرحدوں کی پیداوار ہیں، جو فرانسیسی اور برطانوی سفارت کاروں نے مقامی تاریخ، جغرافیہ اور معیشت کو نظر انداز کر کے ریت پر کھینچ دی تھیں۔ ان سفیروں نے 1918 میں طے کر لیا تھا کہ کردستان، بغداد اور بصرہ کے باشندے آئندہ عراقی کہلائیں گے۔ بنیادی طور پر یہ فرانسیسی تھے جنھوں نے طے کیا کہ شامی اور لبنانی کون ہوں گے۔ حافظ الاسد اور صدام حسین نے اپنی سی بھرپور کوشش کر لی کہ وہ اس انگلو فرنچ کے بنائے قومی تشخص کو بڑھائیں اور مزید اجاگر کریں، لیکن ابدی شامی اور عراقی قومیت کے بارے میں ان کی پرجوش تقاریر میں سچائی کا فقدان تھا۔
یہ کہنا بیکار ہے کہ قومیں ہوا میں نہیں بنتیں۔ جنھوں نے عراق اور شام کی تعمیر میں سخت محنت کی انھوں نے تاریخی، جغرافیائی اور ثقافتی خام مال استعمال کیا، جن میں سے کچھ صدیوں، ہزاروں سال پرانا ہے۔ صدام حسین نے عباسی خلافت اور بابل کی سلطنت کا ورثہ منتخب کیا۔ اس نے تو اپنے ایک اعلیٰ بکتر بند ڈویژن کا نام بھی حمورابی رکھا، لیکن اس سے عراقی قوم ایک قدیم وجود تو نہیں بن گئی۔ اگر میں آٹے، تیل اور شکر سے ایک کیک بناؤں جو میرے

توشہ خانے میں دو ماہ سے رکھے ہوئے تھے، تو اس یہ مطلب تو نہیں کہ یہ کیک دو ماہ پرانا ہے۔

جدید دہائیوں میں قومی برادریاں اب خریداروں کے قبیلوں میں چھپ گئی ہیں، جو ایک دوسرے کو قریب سے تو نہیں جانتے، لیکن ان کی دلچسپیاں اور استعمال ایک جیسے ہیں، لہٰذا وہ اپنے آپ کو ایک ہی خریداری قبیلے سے وابستہ سمجھتے ہیں، اور اپنی یہی تعریف بیان کرتے ہیں۔ یہ بیان بہت عجیب لگ رہا ہوگا لیکن اس کی امثال ہمارے اطراف بکھری ہوئی ہیں، مثلاً میڈونا کے پرستار صارفین کا ایک قبیلہ ہیں۔ وہ اپنی شناخت زیادہ تر خریداری سے بیان کرتے ہیں۔ وہ میڈونا کے کنسرٹ کے ٹکٹ، سی ڈی، پوسٹر، قمیضیں اور فون کی گھنٹیاں خریدتے ہیں، یوں ان کی شناخت متعین ہوتی ہے۔ مانچسٹر یونائیٹڈ کے مداح، سبزی خور اور ماحولیات پرست دوسری مثالیں ہیں۔ ان کی تعریف بھی عموماً ان کی خریداری سے متعین ہوتی ہے۔ یہ ان کی شناخت کی بنیاد ہے۔ کسی گوشت خور جرمن کے مقابلے میں، ایک جرمن سبزی خور شاید ایک فرانسیسی سبزی خور سے شادی کرنا زیادہ پسند کرے۔

بے قرار تغیر (Pertpetuum mobile)

گزشتہ دو صدیوں کے انقلاب اس قدر انتہا پسند تھے کہ انہوں نے سماجی نظام کی بنیادیں ہلا دی ہیں۔ روایتی سماجی نظم سخت گیر اور کٹر تھا۔ لفظ نظام سے استحکام اور استقلال کا عندیہ ملتا ہے۔ تیز سماجی انقلاب اس سے سوا تھے اور بیشتر سماجی تبدیلیاں بہت سے چھوٹے اقدامات کی صورت میں نمودار ہوئیں۔ لوگوں کا خیال تھا کہ سماجی نظام ابدی اور ناقابل تغیر ہے۔ خاندان اور برادریاں اس نظام میں اپنے مقام کے لیے جدوجہد کر سکتی تھیں، لیکن یہ خیال کہ آپ اس نظام کا بنیادی ڈھانچہ بھی بدل سکتے ہیں اجنبی تھا۔ حالات کے 'جیسا ہے' کی صورت حال سے لوگ مطمئن تھے، "ہمیشہ سے ایسا ہی رہا ہے اور ایسا ہی رہے گا"۔

گزشتہ دو صدیوں میں ترقی کی رفتار اتنی تیز ہوگئی کہ سماجی نظام کی فطرت محرک اور قابل تغیر ہوگئی، اب وہ مستقل حالت تغیر میں باقی ہے۔ جب ہم جدید انقلابات کی بات کرتے ہیں تو ہمارے ذہن میں ۱۷۸۹ء (انقلاب فرانس)، ۱۸۴۸ء (انقلاب آزادی) یا ۱۹۱۷ء (انقلاب روس) آتے ہیں۔ لیکن حقیقت میں آج کل تو ہر سال ہی انقلابی ہے۔ آج تو ایک تیس سالہ شخص بھی بے یقین نوعمروں کو ایمانداری سے یہ بتا سکتا ہے کہ "جب میں جوان تھا تو دنیا بہت مختلف تھی"۔ مثلاً انٹرنیٹ صرف بیس برس پہلے نوے کی دہائی میں ہی جنگل کی آگ کی طرح پھیلا۔ آج اس کے بغیر دنیا کا تصور دشوار ہے۔

لہٰذا جدید معاشرے کو بیان کرنے کی کوئی بھی کوشش کسی گرگٹ کا رنگ بیان کرنے کی کوشش ہے۔ اب ہم صرف یہ خصوصیت بیان کر سکتے ہیں کہ تغیر کو ثبات حاصل ہے۔ اب لوگ اس کے عادی ہو گئے ہیں۔۔ ہم میں سے بیشتر سماجی نظام کو تغیر پذیر سمجھتے ہیں جسے ہم مرضی سے سنوار اور بہتر بنا سکتے ہیں۔ قبل از جدید سربراہوں کا مرکزی کردار روایتی نظام کو برقرار رکھنا یا ممکنہ طور پر سنہری ماضی کی طرف لوٹنا تھا۔ گزشتہ دو صدیوں میں سیاست کی وقعت یہ وعدہ ہے کہ پرانی دنیا کو منہدم کر کے ایک نئی دنیا تعمیر کریں گے۔ سب سے زیادہ قدامت پسند سیاسی جماعتیں بھی چیزوں کو بس موجودہ حالت میں برقرار رکھنے کا ہی وعدہ کرتی ہیں۔ ہر ایک سماجی اصلاحات، تعلیمی اور اقتصادی اصلاحات کا وعدہ کرتا ہے، اور وہ اکثر ان وعدوں کو پورا بھی کرتے ہیں۔ جیسے ماہرین ارضیات زمین کی تہوں میں

حرکت سے زلزلوں اور آتش فشاں پھٹنے کا اندازہ لگا سکتے ہیں، اسی طرح بڑی سماجی تبدیلیوں سے خونی تشدد پھوٹنے کی امید کر سکتے ہیں۔انیسویں اور بیسویں صدی کی سیاسی تاریخ اکثر ہولناک جنگوں، عالمگیر بربادی اور انقلابات کی زبان میں بیان کی جاتی ہے۔ کسی بچے کی مانند جو نئے جوتے پہنے، مینڈک کی مانند کودتا، پانی کے جوہڑ میں چھینٹے اڑا رہا ہو، یہ نظر بھی تاریخ کو ایک خونی واقعے سے دوسرے کی جانب چھلانگ لگاتے دیکھتی ہے۔پہلی جنگ عظیم سے دوسری، وہاں سے سرد جنگ، آرمینائی نسل کشی سے یہودیوں کی نسل کشی اور پھر وہاں سے روانڈا کی نسل کشی تک، روبس پئیر (Robespierre) سے لینن اور وہاں سے ہٹلر تک۔

یہ سچ تو ہے مگر تباہ کاریوں کی یہ مانوس فہرست کچھ گمراہ کن ہے۔ہم پانی کے جوہڑوں پر تو زور دیتے ہیں لیکن ان کے درمیان خشک زمین کو فراموش کر دیتے ہیں۔موجودہ جدید دور نے نہ صرف ناقابل مثال تشدد اور ہولناکی دیکھی ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی امن و سکون بھی۔ چارلس ڈکنز نے انقلاب فرانس کو بیان کرتے ہوئے کہا تھا کہ "یہی بہترین وقت تھا، یہی بدترین وقت تھا"۔یہ نہ صرف انقلاب فرانس کے بارے میں درست ہے بلکہ اس تمام دور کا جس کا اس سے آغاز ہوا۔

خاص طور پر یہ دوسری جنگ عظیم کے بعد کی سات دہائیوں کے بارے میں درست ہے۔اس دور میں انسانیت نے پہلی بار خود اپنی مکمل تباہی کا امکان دیکھا ہے، خاصی تعداد میں جنگیں اور نسل کشی بھی دیکھی ہے۔لیکن یہی دہائیاں انسانی تاریخ کا سب سے پرامن دور بھی رہی ہیں، اور وہ بھی ایک واضح فرق کے ساتھ۔یہ اس لیے بھی حیرت انگیز ہے کیوں کہ ان دہائیوں نے گزشتہ کسی دور کے مقابلے میں زیادہ اقتصادی، سماجی اور سیاسی تبدیلی دیکھی ہے۔تاریخ کی تہیں تیزی سے جگہ بدل رہی ہیں، لیکن آتش فشاں خاموش رہے ہیں۔نیا قابل تغیر نظام بغیر کسی پر تشدد جنگ میں ختم ہوئے، بڑی انتظامی تبدیلیوں کی ابتدا کرنے اور انہیں برقرار رکھنے کا اہل نظر آتا ہے۔

دورِ حاضر کا امن

زیادہ تر افراد اس کے معترف نہیں کہ ہم کتنے پرامن دور میں رہ رہے ہیں۔ہم میں سے کوئی بھی ہزار سال پہلے زندہ نہیں تھا، لہذا ہم بہت آسانی سے یہ بھول جاتے ہیں کہ دنیا کتنی پر تشدد تھی۔جب جنگیں نایاب ہونے لگیں تو ان کی جانب توجہ بھی زیادہ مبذول ہونے لگی۔آج برازیل اور انڈیا کے امن کے مقابلے میں افغانستان اور عراق کی جنگ کے بارے میں لوگ زیادہ سوچتے ہیں۔

اس سے زیادہ اہم یہ کہ اب پوری آبادی کے بجائے فرد کی بہتری بھی نمایاں ہے۔لیکن عمومی تاریخ کو سمجھنے کے لیے انفرادی کہانیوں کے بجائے، ہمیں عمومی اعداد و شمار کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ ۲۰۰۰ء میں تین لاکھ دس ہزار افراد جنگوں سے ہلاک ہوئے، اور پر تشدد جرائم کے ہاتھوں پانچ لاکھ بیس ہزار انسان مارے گئے۔ان میں سے ہر موت کے ساتھ ایک دنیا ختم ہوئی، ایک خاندان تباہ ہوا، دوست اور رشتہ دار بقیہ زندگی کے لیے داغ دار ہو گئے۔لیکن ایک عمومی نکتہ نظر سے یہ آٹھ لاکھ تیس ہزار ہلاکتیں ۲۰۰۰ء میں مرنے والے کل پانچ کروڑ ساٹھ لاکھ کا محض ایک اعشاریہ پانچ فیصد تھیں۔اس سال بارہ لاکھ ساٹھ ہزار اموات کار کے حادثے کے نتیجے میں ہوئیں (تمام ہلاکتوں کا دو اعشاریہ دو پانچ فیصد)، اور آٹھ لاکھ پندرہ ہزار افراد نے خودکشی کی (ایک اعشاریہ چار پانچ فیصد)۔

۲۰۰۲ کے اعداد و شمار اور بھی زیادہ حیران کن ہیں۔ کل پانچ کروڑ ستر لاکھ ہلاکتوں میں سے صرف ایک لاکھ بہتر ہزار جنگوں میں مارے گئے، جب کہ پانچ لاکھ اکہتر ہزار پر تشدد جرائم میں (انسانی تشدد کے شکار کی کل تعداد سات لاکھ اکتالیس ہزار)، اس کے مقابلے میں آٹھ لاکھ تہتر ہزار افراد نے خودکشی کی۔ تو معلوم یہ ہوا کہ گیارہ ستمبر کے حملے کے بعد دہشت گردی اور جنگ پر تمام گفتگو کے باوجود ایک عام آدمی کا کسی دہشت گرد، فوجی، ڈرگس مافیا کے ہاتھوں مارے جانے کے مقابلے میں خود اپنی جان لے لینے کا زیادہ امکان تھا۔

دنیا کے بیشتر علاقوں میں لوگ اس خوف کے بغیر سوتے ہیں کہ درمیان شب کوئی پڑوسی قبیلہ ان کے گاؤں کا محاصرہ کر کے تمام افراد کو قتل کر دے گا۔ متمول برطانوی باشندے روزانہ شروڈ جنگل سے گزر کر، ناٹنگھم سے لندن جاتے ہیں، بغیر اس خوف کے کہ کوئی ہرے لباس میں ملبوس لٹیرا انہیں لوٹ کر ان کا مال غریبوں میں بانٹ دے گا (یا زیادہ ممکنہ طور پر انہیں قتل کر کے ان کا مال خود رکھ لے گا)۔ طلبہ کو اپنے اساتذہ کے ڈنڈے نہیں کھانے پڑتے، نہ بچوں کو یہ خوف ہے کہ اگر ان کے والدین اپنے اخراجات پورے نہ کر سکے تو انہیں غلامی میں فروخت کر دیں گے۔ اور خواتین جانتی ہیں کہ قانون ان کے شوہروں کو ان پر تشدد کرنے اور گھر میں بند رکھنے کی ممانعت کرتا ہے۔ دنیا بھر میں یہ امنگیں بڑھتی تعداد میں پوری ہو رہی ہیں۔

تشدد میں کمی کی بڑی وجہ ریاست کا غلبہ ہے۔ تمام تاریخ، زیادہ تر تشدد خاندانوں اور برادریوں کے مقامی جھگڑوں سے شروع ہوا (جیسا کہ اوپر کے اعداد و شمار سے ظاہر ہے، آج بھی مقامی جرائم بین الاقوامی جنگوں سے زیادہ ہلاکت خیز ہیں)۔ جیسا کہ ہم نے دیکھا ہے، ابتدائی کسان جن کی مقامی برادری سے زیادہ کوئی سیاسی وابستگی نہیں ہوتی تھی، انہیں وسیع پیمانے پر تشدد کا سامنا تھا۔ جب مملکت اور سلطنت زیادہ طاقت ور ہوئی تو اس نے برادری کو تابع کیا اور تشدد کم ہو گیا۔ قدیم یورپ کی غیر مرکزی مملکتوں میں ہر ایک لاکھ آبادی میں سے بیس سے چالیس ہزار افراد ہر سال قتل ہو جاتے تھے۔ جدید دہائیوں میں جب کہ ریاست اور مارکیٹ طاقت کل حاصل کر چکی ہیں، اور برادریاں مٹ گئی ہیں تو تشدد کا تناسب مزید کم ہو گیا ہے۔ آج کا عالمی اوسط ہر لاکھ کی آبادی میں سالانہ نو افراد کا قتل ہے۔ اور ان میں سے بیشتر قتل کمزور ریاستوں مثلاً صومالیہ اور کولمبیا میں ہوتے ہیں۔ یورپ کی مرکزی ریاستوں میں اوسطاً ہر ایک لاکھ کی آبادی میں سالانہ ایک قتل ہوتا ہے۔

ایسے بھی واقعات یقیناً ہیں جہاں ریاستیں خود اپنے شہریوں کو قتل کرتی ہیں۔ یہ یقیناً ہماری یادداشت اور خوف میں واضح طور پر نقش ہیں۔ بیسویں صدی میں اگر کروڑوں نہیں تو لاکھوں افراد ریاست کی دفاعی قوتوں کے ہاتھوں ہلاک ہوئے۔ لیکن پھر بھی ایک عمومی منظر نامے میں ریاست کی قائم کردہ عدالتوں اور پولیس نے عمومی طور پر غالباً تحفظ کی سطح بلند کی ہے۔ جابر حکمراں مملکتوں میں بھی ایک اوسط آدمی کا کسی اور آدمی کے ہاتھوں قتل پس از جدید زمانوں سے کم ہی ممکن ہے۔ ۱۹۶۴ میں برازیل میں ایک فوجی ڈکٹیٹر شپ قائم ہوئی، جو ۱۹۸۵ تک برازیل پر حاکم رہی۔ اس دورانیے میں کئی ہزار برازیلی باشندے حکومت کے ہاتھوں مارے گئے۔ مزید ہزاروں افراد قید ہوئے اور تشدد کا نشانہ بنے۔ لیکن اپنے بدترین سالوں میں ریوڈی جنیرا کے ایک اوسط برازیلی کا کسی انسانی ہاتھوں قتل ہونے کا امکان کسی اوسط واؤرانی (Waorani)، اراویٹ (Arawete) یا یانومامو (Yanomamo) سے کم ہے، یہ مقامی آبادی جو امیزون جنگل میں کسی فوج، پولیس یا قید خانوں کے بغیر رہتی ہے۔ علم البشریات کی تحقیق سے معلوم

ہوا ہے کہ ان کے نصف یا چوتھائی مرد، جلد یا بدیر، زن، زمین یا عزت کی خاطر پر تشدد جھگڑوں میں مارے جاتے ہیں۔

سامراج کی فارغ خطی

یہ بات قابل بحث ہے کہ ریاستوں کے اندر تشدد ۱۹۴۵ کے بعد بڑھا ہے کیا کم ہوا ہے۔ اس بات سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ بین الاقوامی تشدد اپنی کم ترین سطح پر ہے۔ شاید اس کی سب سے واضح مثال برطانوی سامراج کا انہدام ہے۔ تمام تاریخ میں سلطنتوں نے بغاوتوں کو ایک دست آہنی سے کچلا ہے۔ اور جب اس کا وقت پورا ہو جائے تو ایک ڈوبتی سلطنت اپنے بچاؤ کے لیے اپنی پوری قوت کو استعمال کرتی ہے۔ اس کا انجام عموماً لہو خیز ہوتا ہے۔ اس کا اختتام عموماً انتشار اور جانشینی کی جنگ پر ہوتا ہے۔ ۱۹۴۵ کے بعد زیادہ تر سلطنتوں نے فارغ خطی لکھی ہے۔ ان کے انہدام کا عمل نسبتاً تیز، پر سکون اور منظم تھا۔

۱۹۴۵ میں برطانیہ چوتھائی دنیا پر حاکم تھا۔ تیس سال بعد اس کی حکومت محض چند چھوٹے جزائر تک محدود رہ گئی تھی۔ اس درمیانے عرصے میں وہ اپنی بیشتر نوآبادیات سے پرامن اور منظم انداز میں پسپا ہو گیا۔ گو چند مقامات مثلاً ملایا اور کینیا میں برطانیہ نے بزور طاقت برقرار رہنے کی کوشش کی، لیکن زیادہ تر مقامات پر انھوں نے سلطنت کا خاتمہ غصے کے اظہار کے بجائے ایک آہ بھر کے کیا۔ انہوں نے اپنی کوشش طاقت برقرار رکھنے کے بجائے، جتنا ممکن ہو پر سکون انداز میں منتقل کرنے پر مرکوز رکھی۔ مہاتما گاندھی کے عدم تشدد کے پرچار پر کی جانے والی کچھ تعریف کا تو سلطنت برطانیہ کو بھی حق ہے۔ کئی برسوں کی تلخ اور اکثر پر تشدد جدوجہد کے بعد، جب راج کے خاتمے کا وقت آیا تو ہندوستانیوں کو برطانیہ سے دہلی اور کلکتہ کی سڑکوں پر جنگ نہیں کرنی پڑی تھی۔ سلطنت کی جگہ چند آزاد ریاستیں قائم ہو گئیں، جن میں سے بیشتر کی سرحدیں مستحکم ہیں، اور زیادہ تر وہ اپنے ہمسایوں کے ساتھ پرامن رہے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ خطرات میں گھری برطانوی سلطنت کے ہاتھوں ہزاروں ہندوستانی مارے گئے، اور کئی کشیدہ مقامات پر لاکھوں جانیں (بالخصوص انڈیا میں)، نسلی تشدد کے ہاتھوں تلف ہوئیں، پھر بھی اگر تاریخی مماثل کا جائزہ لیں تو برطانوی پسپائی پرامن اور منظم تھی۔ فرانسیسی سلطنت زیادہ ضدی تھی۔ اس کے انہدام میں خون آلود مدافعت شامل تھی، جس سے ویتنام اور الجیریا میں لاکھوں جانیں ضائع ہوئیں۔ لیکن فرانسیسی بھی اپنی بقایا نوآبادیت سے جلدی اور پرامن نکل گئے، انتشار اور باہمی دست و گریباں کے بجائے، اپنے پیچھے مستحکم ریاستیں چھوڑ کر۔

بلقان، کاکیشیا اور وسطی ایشیا میں نسلی تصادم پھوٹ پڑنے کے باوجود، ۱۹۸۹ میں سوویت انہدام تو اس سے بھی زیادہ پرامن تھا۔ اس سے پہلے کبھی اتنی عظیم سلطنت اتنی تیزی اور اتنی خاموشی سے مسمار نہیں ہوئی تھی۔ ۱۹۸۹ کی سوویت سلطنت کو افغانستان کے علاوہ کہیں شکست نہیں ہوئی تھی، اس پر کوئی بیرونی حملہ نہیں ہوا تھا، کوئی بغاوت اور نہ ہی مارٹن لوتھر کنگ کے انداز کی بڑے پیمانے پر کسی سول نافرمانی کی تحریک کا سامنا تھا۔ سوویت میں اس وقت بھی لاکھوں سپاہی، ہزاروں ٹینک اور فضائی طیارے اور کئی جوہری ہتھیار تھے، جو تمام انسانیت کو کئی بار مٹا دینے پر قادر تھے۔ سرخ فوج اور معاہدہ وارسا کی دوسری افواج وفادار رہی تھیں۔ اگر آخری سوویت حکمران میخائل گورباچوف حکم دیتے، تو سرخ فوج محکوم عوام پر فائر کھول دیتی۔

پھر بھی سویت اشرافیہ اور تمام مشرقی یورپ (سوائے رومانیہ اور سربیہ کے) نے اپنی فوجی قوت کا ایک معمولی حصہ بھی استعمال نہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ جب اس کے اراکین کو احساس ہوا کہ کیمونزم دیوالیہ ہو چکا ہے، تو انہوں نے طاقت کے استعمال کی مذمت، کی، اپنی ناکامیوں کو تسلی کیا اور بوریا باندھ کر گھر کو لوٹ گئے۔ گوربچوف اور ان کے ساتھیوں نے نہ صرف جنگ عظیم کی سویت فتوحات کو بغیر جنگ کیے چھوڑ دیا، بلکہ زار کے زمانے کے زیادہ قدیم بالٹک، یوکرین، قفقاز اور وسطی ایشیا کو بھی۔ یہ سوچ کر ہی خون جم جاتا ہے کہ اگر گوربچوف بھی سربیا کے لیڈروں، یا الجیریا میں فرانس کی مانند عمل کرتے تو کیا ہوتا؟

جوہری امن

ان سلطنتوں کے بعد جو آزاد ریاستیں قائم ہوئیں، وہ حیرت انگیز حد تک جنگ سے دلچسپی نہیں رکھتی تھیں۔ سوائے چند مثالوں کے، ۱۹۴۵ کے بعد کوئی ریاست دوسری ریاست کو فتح کرنے اور نگل لینے کے لیے حملہ آور نہیں ہوئی۔ ورنہ جہاں تک یادداشت جاتی ہے ایسی فتوحات تو سیاسی تاریخ کا اوڑھنا بچھونا تھیں۔ بڑی سلطنتیں اسی طرح تو قائم ہوئی تھیں۔ حکمران و آبادی ان ہی اقدامات کی توقع کرتے تھے۔ لیکن فتوحات کے وہ سلسلے مثلاً رومن، منگول اور عثمانی آج کی دنیا میں کہیں ممکن نہیں ہیں۔ ۱۹۴۵ کے بعد سے کوئی آزاد ملک جسے اقوام متحدہ تسلیم کرتا ہو فتح ہو کر دنیا کے نقشے سے مٹ نہیں گیا۔ وقتاً فوقتاً محدود بین الاقوامی جنگیں اب بھی ہوتی ہیں اور جنگوں میں لاکھوں افراد مرتے بھی ہیں لیکن اب جنگ معمول کا عمل نہیں ہے۔

بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ بین الاقوامی جنگوں کا خاتمہ امیر مغربی یورپی جمہوریتوں ہی کا حصہ ہے۔ درحقیقت یورپ میں امن دنیا کے دوسرے خطوں کے بعد پہنچا۔ جنوبی امریکہ کے ممالک کے درمیان آخری سنجیدہ جنگ ۱۹۴۱ میں پیرو اور ایکواڈور کے مابین، اور ۱۹۳۲ سے ۱۹۳۵ تک بولیویا اور پیراگوئے کے درمیان تھی۔ اس سے قبل جنوبی امریکی ممالک کے درمیان ۱۸۷۹ سے ۱۸۸۴ کے بعد کوئی جنگ نہیں ہوئی تھی، جب چلی ایک جانب تھا تو بولیویا اور پیرو دوسری جانب۔

عرب دنیا کے لیے ہم عموماً پرامن ممالک کا لفظ استعمال نہیں کرتے۔ لیکن آزادی حاصل کرنے کے بعد سے ان میں سے صرف ایک ملک نے دوسرے ملک پر چڑھائی کی تھی (عراق کا کویت پر ۱۹۹۰ میں حملہ)۔ بہت سی سرحدی جھڑپیں ضرور ہوئی ہیں، (مثلاً ۱۹۷۰ میں شام و اردن کی)، ایک دوسرے کے اندرونی معاملات میں مسلح دخل اندازی (مثلاً شام اور لبنان)، خانہ جنگیاں (مثلاً الجیریا، یمن اور لیبیا) اور بہت سی بغاوتیں اور شورشیں بھی۔ لیکن عرب ممالک میں گلف وار کے علاوہ بھرپور قوت سے کوئی بین الاقوامی جنگ نہیں ہوئی۔ اگر ہم اس منظرنامے کو پوری اسلامی دنیا تک پھیلا دیں تب بھی صرف ایک ہی مثال ملتی ہے، ایران: عراق جنگ۔ لیکن کوئی ایران۔ ترکی، پاکستان۔ افغانستان یا انڈونیشیا۔ ملائیشیا میں جنگ نہیں ہوئی۔

افریقہ میں حالات اتنے موافق نہیں۔ لیکن وہاں بھی زیادہ تر جھڑپیں خانہ جنگی اور بغاوت پر مشتمل ہیں۔ ۱۹۶۰ اور ۱۹۷۰ کی دہائیوں میں آزادی حاصل کرنے کے بعد سے افریقی ریاستوں نے شاذ و نادر ہی کسی دوسری ریاست پر فتح کی امید میں حملہ کیا ہے۔

نسبتاً سکون کے ادوار پہلے بھی گزرے ہیں۔ مثلاً یورپ میں ۱۸۷۱ اور ۱۹۱۴ تک درمیان، لیکن وہ بعد میں ہمیشہ خرابی پر ہی ختم ہوئے۔ لیکن اس بار معاملہ ذرا مختلف ہے، کیوں کہ صحیح معنوں میں امن صرف دنیا سے جنگ کی عدم موجودگی ہی نہیں، صحیح معنوں میں امن جنگ کا امکان نہ ہونا ہے۔ دنیا میں اصلی امن کبھی نہیں رہا۔ ۱۸۷۱ سے ۱۹۱۴ کے دوران یورپ میں جنگ کا امکان موجود تھا۔ افواج، سیاست دانوں اور عام شہریوں سب ہی کے دماغ پر جنگ کا امکان ایک ہی طرح سے سوار تھا۔ یہی خطرہ تاریخ کے دوسرے پرامن ادوار میں بھی لاحق تھا۔ بین الاقوامی سیاست کے ایک آہنی قانون کے مطابق "ہر دو ہمسایہ سربراہوں کے درمیان کوئی ایسی بات ضرور موجود رہتی جو ایک سال کے اندر انہیں جنگ کی آگ میں دھکیل دے"۔ جنگل کا یہ قانون یورپ میں انیسویں صدی کے اواخر، قدیم یورپ، قدیم چین اور کلاسیک یونان میں رائج رہا۔ اگر ایتھنز اور اسپارٹا کے درمیان ۴۵۰ ق م میں امن قائم تھا تو اس بات کا امکان موجود تھا کہ ۴۴۹ ق م میں ان کے درمین جنگ چھڑ جائے۔

نوع انسانی نے جنگل کا وہ قانون توڑ دیا ہے۔ آج صرف جنگ عدم موجود ہی نہیں بلکہ صحیح معنوں میں امن قائم ہے۔ بیشتر ریاستوں کے مابین کوئی ایسی وجہ موجود نہیں جو ایک سال کے اندر انہیں جنگ میں دھکیل دے۔ جرمنی اور فرانس کے درمیان آئندہ سال کس بات پر جنگ ہو سکتی ہے؟ یا چین اور جاپان کے درمیان، یا برازیل اور ارجینٹینا کے درمیان؟ کچھ معمولی سرحدی جھڑپیں چھڑ سکتی ہیں، لیکن صرف کوئی قیامت خیز واقعہ ہی برازیل اور ارجنٹینیا کے درمیان ۲۰۱۴ میں بھرپور جنگ کا آغاز کر سکتا ہے۔۔۔ جس میں ارجنٹینیا کے بکتر بند دستے ریو کے گیٹ کو کچل دیں اور برازیل کے بھاری بمبار بیونس آئرس کے محلوں کو کھنڈر بنا دیں۔ اس قسم کی جنگیں کئی ریاستی جوڑوں کے مابین چھڑ سکتی ہیں مثلاً اسرائیل اور شام، ایتھوپیا اور اریٹیریا، امریکہ اور ایران، لیکن یہ محض اس قاعدے کو ثابت کرنے والے استثنیٰ ہیں۔

ممکن ہے کہ مستقبل میں یہ صورت حال بدل جائے، اور پس اندیشی سے ممکن ہے کہ آج کی دنیا بہت معصوم نظر آئے۔ لیکن تاریخی اعتبار سے ہماری معصومیت بہت دلچسپ ہے۔ اس سے پہلے امن کبھی اتنا عام نہیں تھا کہ لوگ جنگ کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے ہوں۔

اسکالروں نے اس خوشگوار موڑ کو سمجھانے کے لیے اتنی کتابیں اور مضامین لکھے ہیں جتنے آپ پڑھ بھی نہیں سکیں۔ انہوں نے اس کے کئی معاون عناصر بیان کیے ہیں۔ سب سے پہلے تو یہ کہ جنگ کی قیمت ڈرامائی طور پر بہت بڑھ گئی ہے۔ امن کے تمام انعامات پر بھاری امن کا نوبل انعام رابرٹ اوپن ہائمر اور اس کے ساتھی ایٹم بم کے خالقوں کو دینا چاہیے تھا۔ جوہری ہتھیاروں نے بڑی طاقتوں کے درمیان جنگ کو اجتماعی خودکشی میں تبدیل کر دیا ہے، اور دنیا پر حاکمیت کے لیے قوت کے استعمال کو ناممکن بنا دیا ہے۔

دوسرے یہ کہ جنگ کی قیمت بہت بڑھ گئی ہے لیکن منافع کم ہو گیا ہے۔ تمام تاریخ ریاستیں اپنے خزانوں کو لوٹ مار یا دشمن کے علاقے قبضہ کر لینے سے بھرتی تھیں۔ بیشتر دولت مادی چیزوں پر مشتمل ہوتی تھی مثلاً فصل، مویشی، غلام اور سونا۔ انہیں لوٹ کر ان پر قابض ہونا آسان تھا۔ آج دولت زیادہ تر انسانی کمال اور تنظیمی سوجھ بوجھ پر مشتمل ہے، لہٰذا اسے لوٹنا یا فوجی قوت سے تسخیر کرنا دشوار ہے۔

کیلی فورنیا کی مثال لیجیے۔ اس کی ابتدائی دولت سونے کے کانوں سے حاصل ہوئی۔ لیکن آج یہ سلی کون

اور فلم کی دنیا پر مشتمل ہے: وادی سلی کون اور ہالی وڈ کی پہاڑیاں۔ اگر چین کیلی فورنیا پر حملہ کردے، دس لاکھ فوجی سان فرانسسکو کے ساحلوں پر اتار دے اور اندر بڑھ آئے تب بھی اسے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ وادی سلی کون میں سلی کون کی دکانیں نہیں ہیں۔ اس کا خزانہ تو گوگل انجینیروں کے ذہنوں اور ہالی وڈ کے اسکرپٹ لکھنے والوں، ڈائرکٹروں اور خصوصی عملیات کے ماہروں میں پوشیدہ ہے، جو چینی ٹینکوں کے سن سیٹ بلوارڈ پر چہل قدمی سے بہت پہلے بنگلور یا ممبئی جانے والے پہلے مہیا جہاز سے جا چکے ہوں گے۔ یہ محض اتفاق نہیں ہے کہ دنیا میں اب بھی جو بین الاقوامی جنگیں ہوتی ہیں، مثلاً کویت پر عراق کا حملہ، وہ ایسی جگہوں پر ہوتی ہیں جہاں روایتی مادی دولت موجود ہے۔ گو کویت کے شیخ تو بھاگ سکتے ہیں لیکن پیچھے رہ جانے والے تیل کے کنویں تو محکوم ہو گئے تھے۔

جب کہ جنگ پہلے سے کم منافع بخش ہو گئی اسی وقت امن پہلے سے زیادہ فائدہ مند ہو گیا۔ روایتی زرعی معیشت میں دور دراز کی تجارت اور بیرونی سرمایہ کاری ذیلی تماشے تھے۔ لہذا امن زیادہ منافع بخش نہیں تھا بس جنگ کی قیمت بچ جاتی تھی۔ فرض کیجیے کہ ۱۴۰۰ میں انگلستان اور فرانس پر امن ہوتے، تو فرانسیسیوں کو بھاری جنگی مالیہ ادا کرنا پڑتا اور نہ ہی تباہ کن برطانوی حملوں کا سامنا۔ لیکن اس سے ان کی جیبیں بھی نہیں بھر رہی تھیں۔ جدید سرمایہ داری اور معیشت میں بیرونی تجارت اور سرمایہ کاری بہت اہم ہیں، لہذا امن کے منفرد فوائد ہیں۔ جب تک امریکہ اور چین میں امن قائم ہے، چین امریکہ کو اشیا فروخت کر کے وال اسٹریٹ پر تجارت اور امریکی سرمائے کی وصولی سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔
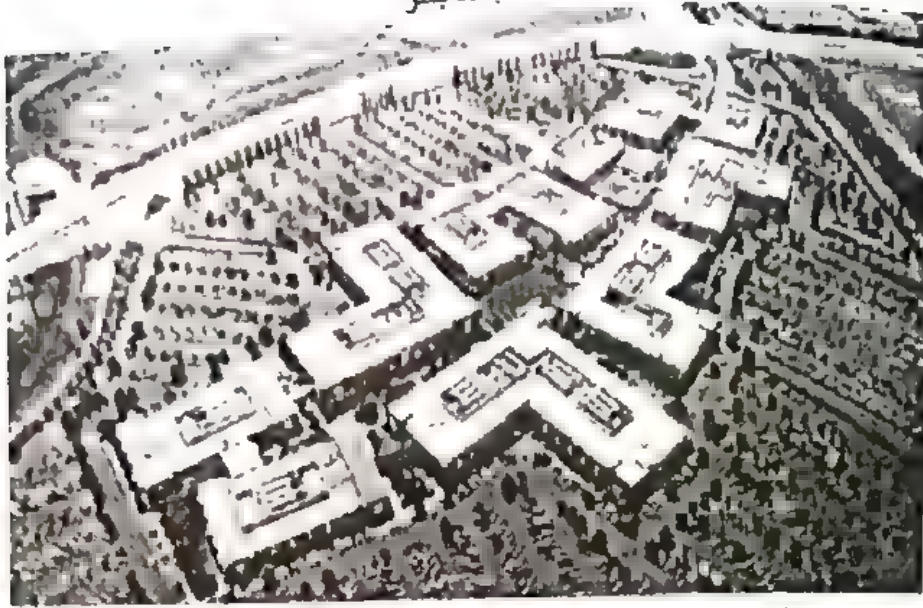
سونے کی دوڑ کے دوران کیلی فورنیا میں سونے کے کان کن، اور سان فرانسسکو میں فیس بک کا صدر دفتر۔ ۱۸۴۹ میں کیلی فورنیا نے اپنا تموں سونے کے حصول سے حاصل کیا۔ آج کیلی فورنیا اپنا تموّل سلی کون (Silicon) پر تعمیر کرتا ہے۔ لیکن ۱۸۴۹ میں سونا مادی طور پر کیلی فورنیا کی زمین میں موجود تھا، سلی کون وادی کا خزانہ اعلیٰ تربیت یافتہ ملازمین کے دماغوں میں قید ہے۔

اور آخری لیکن انتہائی اہم یہ عنصر کہ عالمی سیاسی ثقافت میں بنیادی تبدیلی واقع ہو رہی ہے۔ تاریخ کے سب سے ممتاز افراد ہن کے سردار، وائکنگ کے اشرافیہ اور ازٹیک پادری جنگ کو مثبت چیز سمجھتے تھے۔ دوسرے اسے برائی سمجھتے، لیکن ایک لازمی برائی جسے ہم اپنے مفاد میں استعمال کر سکیں۔ ہمارا دور تاریخ میں اولین ہے کہ جب دنیا پر امن کے خواہاں ممتاز افراد۔ سیاست دان، تاجر، مفکر اور آرٹسٹ جنگ کو واقعی برا اور قابل گریز سمجھتے ہیں۔ گزشتہ ادوار میں بھی پر امن افراد تھے، مثلاً ابتدائی عیسائی، لیکن اگر کبھی وہ بھی طاقت حاصل کر لیتے تو دوسرا رخسار پیش کرنے کی روایت فراموش کر بیٹھتے تھے۔

ان چاروں عناصر کے درمیان ایک مثبت افزائشی دائرہ ہے (feed back loop)۔ جوہری تباہی کا خوف امن کو فروغ دیتا ہے، جب امن پھیلتا ہے تو جنگ پسپا ہوتی ہے اور تجارت نمو پاتی ہے۔ تجارت سے امن کا منافع اور جنگ کی قیمت دونوں بڑھتے ہیں۔ وقت کے ساتھ یہ افزائشی دائرہ جنگ کے راستے میں ایک اور رکاوٹ پیدا کرتا ہے جو بالآخر شاید سب سے اہم ثابت ہو۔ بین الاقوامی تعلقات کا مضبوط پھندا بیشتر ریاستوں کی آزادی پر اثر انداز ہوتا ہے، یہ یقینی بنانے کے لیے کہ ان میں سے کوئی تنہا جنگ کے کتوں کو آزاد نہ کر دے۔ زیادہ تر ممالک اس لیے بھرپور جنگ میں حصہ نہیں لیتے کیوں اب وہ آزاد نہیں رہے۔ گو اسرائیل، اٹلی، میکسیکو اور تھائی لینڈ کے باشندے آزادی کی غلط فہمی میں مبتلا ہیں، لیکن درحقیقت ان کی حکومتیں آزاد اقتصادی یا خارجہ پالیسیاں نہیں وضع کر سکتیں، اور یقیناً وہ تنہا ایک بھرپور جنگ شروع کرنے اور جاری رکھنے کے اہل نہیں ہیں۔ جیسا کہ ہم گیارھویں باب میں بیان کر چکے ہیں، ہم ایک عالمی سلطنت کا قیام دیکھ رہے ہیں۔ گزشتہ سلطنتوں کی طرح یہ بھی اپنی سرحدوں پر امن کی خواہاں ہے۔ اور کیوں کہ اس کی سرحدیں پوری دنیا کے گرد گھیرا ڈالے ہیں، تو یہ عالمی سلطنت موثر انداز میں دنیا میں امن قائم رکھتی ہے۔

تو کیا یہ جدید دور بھی ایک احمقانہ قتل، جنگ اور جبر کا دور ہے، جس کی مثالیں پہلی جنگ عظیم کی

خندقوں، ہیروشیما پر جوہری بادل اور ہٹلر و اسٹالن کے ہولناک خبط تھے؟ یا یہ امن کا دور ہے جس کا خلاصہ جنوبی امریکہ میں نہ کھودی جانے والی خندقیں ہیں، وہ جوہری بادل جو کبھی میکسیکو یا نیویارک پر سایہ فگن نہیں ہوا، اور مہاتما گاندھی اور مارٹن لوتھر کنگ کی پر سکون صورتیں ہیں؟

اس کا جواب وقت دے گا۔ یہ متانت کی بات ہے کہ کتنی ہی بار ہمارا ماضی کے بارے میں رویہ گزشتہ چند سالوں کے واقعات سے بدل گیا ہے۔ اگر یہ باب ۱۹۴۵ یا ۱۹۶۲ میں لکھا گیا ہوتا تو شاید یہ زیادہ اداس ہوتا۔ کیوں کہ یہ ۲۰۱۴ میں لکھا گیا تو یہ جدید تاریخ کا نسبتاً خوش طبع مطالعہ ہے۔

مایوس اور پر امید افراد، دونوں کو خوش کرنے کے لیے ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ ہم جنت اور دوزخ دونوں کے سنگم پر ہیں۔ ایک کے دروازے اور دوسرے کی دہلیز کے درمیان مضطرب ٹہل رہے ہیں۔ تاریخ نے ابھی تک یہ طے نہیں کیا کہ ہمارا اختتام کیا ہوگا۔ اتفاقات کا کوئی سلسلہ ہمیں کسی بھی جانب کھینچ سکتا ہے۔

○

پھر وہ ہمیشہ خوش و خرم رہے

گزشتہ پانچ سو سالوں نے انقلابات کا ایک حیرت انگیز سلسلہ دیکھا ہے۔ ساری دنیا ایک واحد ماحولیاتی اور تاریخی گولے میں جڑ گئی ہے۔ معیشت نے دن دوگنی ترقی کی ہے، اور آج نوع انسانی کے پاس جو تمول ہے وہ صرف کہانیوں کا حصہ تھا۔ سائنس اور صنعتی انقلاب نے نوع انسان کو مافوق البشر طاقت اور لامحدود قوت دی ہے۔ سماجی نظام مکمل طور پر بدل گیا ہے، جیسے سیاست، روزمرہ کی زندگی اور انسانی نفسیات۔

لیکن کیا ہم زیادہ خوش ہیں؟ کیا نوع انساں نے گزشتہ پانچ صدیوں میں جو دولت اکٹھی کی ہے، کیا اس سے ہمیں کوئی نیا سکون میسر ہوا ہے؟ کیا ختم نہ ہونے والے توانائی کے وسائل نے ہمارے سامنے ختم نہ ہونے والی خوشیوں کے در وا کر دیے ہیں؟ اس سے پیچھے جائیں تو کیا ادراکی انقلاب کے ستر ہزار سالوں میں دنیا رہنے کے لیے ایک بہتر جگہ بن گئی ہے؟ کیا نیل آرمسٹرانگ جس کا نقش قدم ہوا سے عاری چاند پر ثبت ہے، اس تیس ہزار سال پہلے کے شکاری/متلاشی سے زیادہ خوش تھا جس نے شاوے غار کی دیوار پر اپنے ہاتھ کا نقش چھوڑا تھا؟ اگر نہیں، تو ان تمام ایجادات کا کیا فائدہ تھا: زراعت، شہر، تحریر، سکے، سلطنتیں، سائنس اور صنعت؟

مورخ ایسے سوالات شاذ و نادر ہی پوچھتے ہیں۔ وہ یہ نہیں پوچھتے کہ کیا اراک اور بابل کے شہری اپنے اکٹھا کرنے والے آبا سے زیادہ خوش تھے، کیا اسلام کی آمد سے مصری اپنی زندگیوں سے زیادہ مطمئن ہو گئے تھے، یا افریقہ میں یورپی سلطنتوں کا انہدام ان گنت کروڑوں افراد کی مسرت پر کیسے اثر انداز ہوا؟ لیکن یہی تو سب سے اہم سوالات ہیں جو کوئی تاریخ سے پوچھ سکتا ہے۔ بیشتر حالیہ نظریات اور سیاسی پروگرام انسانی خوشی کی اصل وجہ کے کمزور نظریے پر قائم ہیں۔ قوم پرست یہ سمجھتے ہیں کہ سیاسی خود اختیاری انسانی مسرت کے لیے لازم ہے۔ کیمونسٹ کا خیال ہے کہ پرولتاری کی حاکمیت میں سب خوش رہیں گے۔ سرمایہ داری کا خیال ہے کہ صرف آزاد تجارت ہی سے افراد کی بڑی تعداد سب سے زیادہ خوشی حاصل کر سکتی ہے، اقتصادی نمو اور مادی فراوانی کے ذریعے اور لوگوں کو خود پر انحصار اور کاروباری سوجھ بوجھ کے سبق دے کر۔ اگر سنجیدہ تحقیق سے یہ سب نظریات غلط ثابت ہوئے تو کیا ہوگا؟ اگر معاشی ترقی اور خود انحصاری سے افراد خوش نہ ہوں تو سرمایہ داری کا کیا فائدہ؟ اگر یہ معلوم ہو کہ بڑی سلطنتوں کی رعایا آزاد ریاستوں کے شہریوں سے زیادہ خوش تھی، مثلاً گھانا کے شہری برطانوی نوآبادیاتی راج میں خود اپنے گھریلو جابر سے زیادہ خوش تھے؟ تو اس سے نوآبادیات کی آزادی اور قومی خود مختاری کے عمل کو کیا کہا جائے گا؟

یہ تمام نظریاتی امکانات ہیں۔ کیوں کہ اب تک مورخوں نے یہ سوالات پوچھنے سے اجتناب برتا ہے،

ان کے جوابات دینے کا تو ذکر ہی کیا۔ انہوں نے تقریباً ہر چیز کی تاریخ پر تحقیق کی ہے: سیاست، معاشرت، اقتصادیات، صنف، بیماری، جنسیات، غذا اور کپڑے وغیرہ۔ لیکن انہوں نے کبھی رک کر یہ نہیں معلوم کیا کہ ان سے انسانی مسرت پر کیا اثرات مرتب ہوئے ہیں۔

گو کہ کم ہی نے مسرت کی طویل تاریخ کا مطالعہ کیا ہے، لیکن تقریباً ہر مفکر اور عام انسان کا اس بارے میں ایک مبہم متعصبانہ خیال ضرور ہے۔ ایک عام خیال یہ ہے کہ تمام تاریخ انسانی اہلیت میں اضافہ ہوتا رہا ہے۔ کیوں کہ انسان عموماً اپنی اہلیت کو مصائب دور کرنے اور خواہشات پوری کرنے میں استعمال کرتے ہیں، تو یقیناً ہم اپنے آبا سے زیادہ خوش ہوں گے، اور وہ یقیناً پتھر دور کے شکاری/متلاشی سے۔

لیکن یہ بتدریج بیان اطمینان بخش نہیں۔ جیسا کہ ہم دیکھ ہی چکے ہیں، نئی استعداد، رویے اور اہلیت لازماً ایک بہتر زندگی کا پیغام نہیں لاتے۔ جب انسانوں نے زرعی انقلاب سے کھیتی باڑی شروع کی تو ان کی اجتماعی طاقت سے ماحول تراشنے کی اہلیت بڑھ گئی، لیکن بہت سے منفرد افراد کی زندگیاں بدتر ہو گئیں۔ کم متنوع اور کم غذائیت والی خوراک مہیا کرنے کے لیے بھی کسان متلاشیوں سے زیادہ محنت کرتے، پھر انہیں بیماری اور استحصال کا بھی زیادہ خطرہ تھا۔ اسی طرح یورپی سلطنتوں کے فروغ سے بھی نظریات، ٹیکنالوجی، فصلوں کی منتقلی اور معیشت کے نئے راستوں کی دریافت کی وجہ سے نوع انسان کی اجتماعی طاقت بہت بڑھ گئی تھی۔ لیکن کروڑوں افریقیوں، مقامی امریکیوں اور ابوریجنل آسٹریلیا والوں کے لیے یہ کوئی اچھی خبر نہیں تھی۔ طاقت کے ناجائز استعمال کی انسانی عادت کو دیکھتے ہوئے یہ یقین کرنا سادہ لوحی ہوتی کہ لوگ جتنا زیادہ اثر رکھیں گے اتنا ہی زیادہ خوش ہوں گے۔

اس نظریے کے کچھ مخالفین ایک بہت ڈرامائی، مختلف رخ لیتے ہیں۔ وہ انسانی اہلیت اور مسرت کے درمیان الٹا تعلق بیان کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ طاقت بگاڑتی ہے۔ نوع انسانی نے بڑھتی ہوئی طاقت کے ساتھ ایک ایسی میکانکی دنیا تشکیل دی جو ہماری ضروریات کے لیے ناموزوں ہے۔ ارتقا کی چاک نے ہمارے اجسام و اذہان کو شکاری/متلاشی زندگی کے لیے ڈھال دیا تھا۔ اب یہ پہلے زراعت اور پھر صنعتی تبدیلی نے ہمیں ایک مصنوعی زندگی گزارنے پر مجبور کر دیا ہے، جو ہمارے فطری رجحانات اور حسیات کو پوری طرح استعمال نہیں کر پاتی، اور ہماری اندرونی خواہشات کی سیرابی نہیں ہوتی۔ درمیانے طبقے کی آرام دہ شہری زندگی میں کچھ بھی اس جوش اور مسرت کا مقابلہ نہیں کر سکتی جو ایک متلاشی گروہ کو کسی میمتھ کے شکار سے حاصل ہوتا ہوگا۔ ہر نئی ایجاد ہمارے اور باغ عدن کے درمیان مزید ایک میل کا فاصلہ بڑھا دیتی ہے۔

لیکن یہ رومانوی اصرار کہ ہر ایجاد کے پیچھے ایک سایہ منڈلا رہا ہے، اتنا ہی پرمسرت ہے کہ جتنا مسلسل ترقی پر یقین۔ ہم شاید اپنے اندر چھپے شکاری/متلاشی سے رابطہ کھو چکے ہیں، لیکن یہ سب اتنا برا بھی نہیں۔ مثلاً گزشتہ دو صدیوں میں بچوں کی شرح اموات ۳۳ فیصد سے کم ہو کر ۵ فیصد رہ گئی ہے۔ کیا کوئی اس بات سے انکار کر سکتا ہے کہ اس سے نہ صرف ان بچوں کی زندگیوں میں بہت مسرت پیدا ہوتی ہے جو ورنہ مر گئے ہوتے، بلکہ ان کے خاندانوں اور دوستوں میں بھی۔

ایک زیادہ حساس پوزیشن درمیانہ راستہ اپناتی ہے۔ سائنسی انقلاب کی آمد سے پہلے طاقت اور مسرت میں کوئی واضح تعلق نہیں تھا۔ ممکن ہے کہ شکاری/متلاشی انسان اپنے آبا سے زیادہ دکھی رہے ہوں۔ لیکن گزشتہ چند

صدیوں میں انسانیت نے اپنی اہلیت کا زیادہ ذہانت سے استعمال سیکھ لیا تھا۔ جدید طب کے کمالات ایک اور مثال ہیں۔ دوسرے کمالات جن کی پہلے مثال نہیں ملتی، ان میں تشدد میں تیزی سے کمی، بین الاقوامی جنگوں کا خاتمہ اور بڑے پیمانے پر قحط سے تقریباً نجات شامل ہیں۔

لیکن یہ بھی بات کو فریب دہی کی حد تک سادہ کر دینے کے مترادف ہے۔ اول تو یہ کہ یہ امید افزا اندازہ بہت کم سالوں کے عرصے کے مطالعے سے لگایا گیا ہے۔ انسانوں کی اکثریت نے جدید طب کے فوائد کا پھل ۱۸۵۰ کے بعد سے چکھا، اور بچوں کی شرح اموات میں بے تحاشہ کمی بیسویں صدی کا قصہ ہے۔ بڑے پیمانے پر قحط ابھی بیسویں صدی کے وسط تک انسانیت کا دشمن تھا۔ ۱۹۵۸ سے ۱۹۶۱ میں کیمونسٹ چین کی ترقی کی جانب بڑی چھلانگ کے دوران کوئی ایک سے پانچ کروڑ افراد قحط کا شکار ہو کر مرے۔ بین الاقوامی جنگیں ۱۹۴۵ کے بعد نایاب ہوئیں، جس کی بیشتر وجہ جوہری تباہی کا خوف ہے۔ لہذا اگرچہ گزشتہ چند دہائیاں انسانیت کے لیے ایک بے مثال سنہری دور ثابت ہوئی ہیں، لیکن یہ کہنا دشوار ہے کہ آیا یہ تاریخ کے بہاؤ میں ایک بنیادی موڑ ہے یا خوش قسمتی کا ایک عارضی بھنور۔ جب ہم جدیدیت کا جائزہ لیں تو اکیسویں صدی کے اوسط طبقے کے مغربی فرد کا نکتہ نظر بہت پرکشش لگتا ہے۔ لیکن ہمیں انیسویں صدی میں ویلز کے کوئلے کے کان کن، چین کے افیونچی یا تسمانیہ کے ابورجنل افراد کا نکتہ نظر بھی فراموش نہیں کرنا چاہیے۔ تروگاننی کسی طرح بھی ہومر سمپسن سے کم نہیں۔

پھر یہ کہ گزشتہ نصف صدی کا سنہری دور ممکن ہے کہ مستقبل میں تباہی کا بیج بونا ثابت ہو۔ گزشتہ چند دہائیوں سے ہم اس سیارے کا ماحولیاتی توازن بے شمار نئے طریقوں سے بگاڑ رہے ہیں، جس سے لگتا ہے کہ بہت خطرناک نتائج مرتب ہوں گے۔ اس بات کے بہت شواہد موجود ہیں کہ ہم انسانی بہبود کی بنیادوں کو غیر ذمہ دارانہ رنگ رلیوں سے نقصان پہنچا رہے ہیں۔

آخر میں، ہم جدید سیپین کی بے مثال کامیابیوں پر اپنے آپ کو اسی صورت مبارک باد دے سکتے ہیں کہ ہم دوسرے تمام جانوروں کی حالت زار کو مکمل طور پر فراموش کر دیں۔ مادی دولت کا یہ انبار جو ہمیں بیماری اور قحط سے محفوظ رکھتا ہے، یہ لیبارٹری کے بندروں، دودھ دیتی گایوں اور منتقلی کی پٹی پر مرغیوں کے سبب ممکن ہوا۔ گزشتہ دو صدیوں میں کھربوں جانور صنعتی استحصال کا شکار ہوئے جن کی بے رحمی کی اس کرہ ارض پر کوئی مثال نہیں ملتی۔ جانوروں کے حقوق کے طرف دار جو بھی کہتے ہیں اگر ہم اس میں سے دس فیصد بھی تسلیم کر لیں تو جدید صنعتی زراعت شاید تاریخ کا سب سے بڑا جرم ہے۔ عالمی مسرت کا جائزہ لیتے ہوئے یہ غلط ہے کہ ہم صرف یورپ کے بالائی طبقوں یا صرف مردوں کی مسرت کا جائزہ لیں۔ شاید یہ بھی غلط ہے کہ ہم صرف انسانوں ہی کی مسرت کا جائزہ لیں۔

مسرت کا شمار

اب تک ہم نے مسرت کا ایسے ذکر کیا ہے جیسے وہ صرف مادی اشیا ہی سے ممکن ہو: مثلاً صحت، غذا اور تمول۔ اگر لوگ زیادہ امیر اور صحت مند ہیں تو وہ یقیناً زیادہ خوش بھی ہوں گے۔ لیکن کیا یہ واقعی اتنا ہی واضح ہے؟ فلسفی، راہب اور شاعر ہزارہا سالوں سے مسرت کی اصلیت پر غور کرتے رہے ہیں، اور وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ہماری مسرت میں سماجی، اخلاقی اور روحانی قوتوں کا اتنا ہی ہاتھ ہے جتنا کہ مادی چیزوں کا۔ شاید جدید متمول

معاشروں میں افراد تنہائی اور بے مقصدیت سے دکھی رہتے ہیں۔اور شاید ہمارے نسبتاً مفلس آبائے برادری، مذہب اور فطرت سے تعلق میں زیادہ سکون پایا تھا۔

گزشتہ دہائیوں میں ماہرین نفسیات اور حیاتیات نے اس بات پر تحقیق کا بیڑہ اٹھایا ہے کہ لوگوں کو کیا چیز خوش رکھتی ہے۔کیا یہ دولت ہے، خاندان، جینیات یا پھر اخلاقیات؟ پہلا قدم تو یہ دیکھنا ہے کہ ہم کس چیز کی پیمائش کر رہے ہیں؟ مسرت کی ایک عمومی تسلیم شدہ تعریف 'شخصی بہبود' ہے۔اس نظریے کے مطابق مسرت وہ احساس ہے جو میں خود اپنے اندر محسوس کروں، ایک فوری خوشی کا احساس یا اپنی زندگی کے دیرپا رخ سے اطمینان۔اگر یہ کوئی اندرونی چیز ہے تو اسے بیرونی طور پر کیسے ناپا جا سکتا ہے؟ شاید ہم لوگوں سے استفسار کر سکتے ہیں کہ وہ کیسا محسوس کر رہے ہیں۔لہٰذا ماہرین نفسیات یا حیاتیات جو افراد کی مسرت پر تحقیق کر رہے ہوں انہیں اکثر سوالنامے بھرنے کے لیے دیتے ہیں تاکہ نتائج کو شمار کیا جا سکے۔

شخصی مسرت کے سوالنامے کا ایک عام سوال فرد سے یہ پوچھتا ہے وہ صفر سے دس کے میزان پر یہ عندیہ دیں کہ "میں اپنے حال پر خوش ہوں"۔"میرے خیال میں زندگی بہت خوشگوار ہے"، "میں مستقبل کے بارے میں پرامید ہوں" اور "زندگی اچھی ہے"۔پھر محققین تمام جوابات کو شمار کر کے حساب کرتے ہیں کہ افراد کی عمومی شخصی مسرت کی سطح کیا ہے۔

ان سوالناموں سے مسرت کا کئی بیرونی عناصر سے تعلق معلوم کیا جاتا ہے۔کسی تحقیق میں ایک لاکھ افراد جو ایک لاکھ ڈالر سالانہ کماتے ہوں، ان کا مقابلہ ایک لاکھ افراد سے کیا جا سکتا ہے جو پچاس ہزار ڈالر سالانہ کماتے ہوں۔اگر اس تحقیق سے یہ معلوم ہوا کہ پہلے گروہ کی شخصی مسرت کی سطح ۸.۷ ہے، جب کہ دوسرے کی اوسط سطح ۳.۷ تو محققین اس نتیجے پر پہنچ سکتے ہیں کہ تمول اور شخصی مسرت کے درمیان تعلق ہے۔اسے سادہ زبان میں یوں بیان کیا جائے گا کہ دولت مسرت لاتی ہے۔اسی طریقے سے یہ بھی معلوم کیا جا سکتا ہے کہ وہ افراد جو جمہوریت میں رہتے ہیں ان افراد سے زیادہ خوش ہیں جو کسی ڈکٹیٹر کی رعایا ہوں، اور اسی طرح کیا شادی شدہ افراد کنواروں، طلاق یافتہ یا رنڈووں سے زیادہ خوش ہیں۔اس سے مورخوں کو ایک سطح دستیاب ہوگئی جہاں سے وہ گزشتہ تمول، سیاسی آزادی اور طلاق کی شرحوں کا جائزہ لے سکتے ہیں۔اگر افراد جمہوریت میں زیادہ خوش ہیں اور شادی شدہ افراد طلاق یافتہ سے زیادہ مسرور ہیں تو مورخ اس بنیاد پر یہ بحث کر سکتے ہیں کہ گزشتہ چند دہائیوں کے جمہوری عمل نے نوع انسانی کی خوشیوں کو دوبالا کیا ہے، جب کہ طلاقوں کی بڑھتی ہوئی شرح ایک متضاد سمت میں اضافہ کرتی ہے۔

یہ انداز فکر غلطیوں سے پاک نہیں۔لیکن ان کی نشان دہی سے پہلے یہ بہتر ہوگا کہ ہم ان نتائج پر ایک نظر دوڑا لیں۔

ایک دلچسپ نتیجہ یہ ہے کہ دولت واقعی مسرت بخشتی ہے، لیکن صرف ایک حد تک اور اس حد کے بعد اس کا زیادہ اثر نہیں ہوتا۔جو لوگ اقتصادی سیڑھی پر بالکل نیچے کھڑے ہیں ان کے لیے زیادہ دولت زیادہ خوشی لاتی ہے۔اگر آپ ایک امریکی تنہا ماں ہیں جو گھروں کی صفائی کر کے سالانہ بارہ ہزار ڈالر کماتی ہے، اور آپ اچانک پانچ لاکھ ڈالر کی لاٹری جیت جائیں، تو آپ کو اپنی شخصی مسرت میں شاید ایک طویل مدت تک قابل ذکر بہتری ملے گی۔آپ قرض کی دلدل میں مزید ڈوبے بغیر اپنے بچوں کے لیے غذا اور لباس فراہم کر سکیں گے۔لیکن اگر آپ ایک

بڑے عہدیدار ہیں اور ڈھائی لاکھ ڈالر سالانہ کماتے ہیں، اور آپ کی دس لاکھ ڈالر کی لاٹری نکل آئے یا کمپنی کا بورڈ اچانک آپ کی تنخواہ دوگنی کر دے تو آپ کی مسرت میں اضافہ شاید چند ہفتے رہے گا۔ تجربہ ہمیں یہ بتاتا ہے کہ آپ کی طویل المعیاد حساسیت میں بہت زیادہ فرق پیدا نہیں ہوگا۔ آپ ایک بہت زیادہ شاندار کار خرید لیں گے، ایک محل نما گھر میں منتقل ہو جائیں گے، سستی وائن کے بجائے مہنگی وائن پینے لگیں گے، لیکن پھر جلد ہی یہ سب روزمرہ کا معمول لگنے لگے گا۔

ایک اور دلچسپ نتیجہ یہ اخذ ہوا کہ بیماری تھوڑی مدت کے لیے ہی مسرت میں کمی کرتی ہے۔ یہ طویل المدت پریشانی اسی وقت پیدا کرتی ہے جب کسی شخص کی حالت مسلسل گر رہی ہو، یا مرض کی وجہ سے مسلسل نیم جاں کر دینے والا درد لاحق ہو۔ وہ افراد جنہیں کوئی دائمی مرض تشخیص ہو، مثلاً ذیابطیس تو وہ عموماً کچھ مدت کے لیے اداس رہتے ہیں، لیکن اگر وہ بیماری مزید نہ بگڑے تو وہ اپنی نئی حالت سے مفاہمت کر لیتے ہیں، اور وہ اپنی مسرت کی سطح صحت مند افراد جتنی ہی نشان زد کرتے ہیں۔ فرض کیجیے کہ لوسی اور لیوک اوسط طبقے کے جڑواں ہیں جو ایک شخصی بہبود کی تحقیق میں حصہ لینے پر آمادہ ہوتے ہیں۔ نفسیاتی لیبارٹری سے واپسی کے راستے میں لوسی کی کار ایک بس سے ٹکرا جاتی ہے جس سے لوسی کی کئی ہڈیاں ٹوٹ جاتی ہیں اور ایک پاؤں ہمیشہ کے لیے ناکارہ ہو جاتا ہے۔ عین اسی وقت جب کہ مدد گار عملہ اس کی کار کاٹ کر اسے باہر نکال رہا تھا، فون بجتا ہے اور لیوک بتاتا ہے کہ اس نے ایک کروڑ ڈالر کا لاٹری میں بڑا انعام جیت لیا ہے۔ دو سال بعد لوسی پھر بھی لنگڑی ہوگا اور لیوک خاصہ متمول ہوگا، لیکن جب نفسیات دان دوبارہ تحقیقی سوالات کے لیے آئیں گے تو امکان ہے کہ وہ دونوں پھر وہی جوابات دیں گے جو انہوں نے اس اہم دن کی صبح دیے تھے۔

خاندان اور برادری کا ہماری خوشی پر صحت اور دولت سے زیادہ اثر مرتب ہوتا ہے۔ وہ لوگ جو مضبوط خاندانوں میں ایک مربوط اور مددگار برادری میں رہتے ہیں، وہ دوسرے افراد سے بہت زیادہ خوش رہتے ہیں جن کے خاندان انتشار کا شکار ہوں اور جو کسی برادری کا بھی حصہ نہ ہوں۔ شادی بالخصوص بہت اہم ہے۔ متعدد تحقیقات نے یہ بتایا ہے کہ کامیاب شادی اور اعلیٰ شخصی مسرت کے درمیان قریبی نسبت ہے، اور ناکام شادی اور افسردگی کے درمیان بھی۔ یہ نسبت معاشی یا جسمانی صورت حال سے مبرا ہے۔ ایک محتاج، معذور جسے ایک محبت کرنے والا شریک حیات، جاں نثار خاندان یا گرم جوش برادری میسر ہو وہ کسی تنہا ارب پتی سے شدید بہتر محسوس کرے۔ اگر اس محتاج کی غربت بہت شدید نہ ہو اور اس کی معذوری دردانگیز یا روبہ زوال نہ ہو۔

اس سے یہ امکان پیدا ہوتا ہے کہ گزشتہ دو صدیوں کی زبردست مادی ترقی کا اثر شاید خاندان اور برادری کے انہدام سے کم ہو گیا ہو۔ اگر ایسا ہے تو شاید اوسط آدمی آج بھی اس سے زیادہ خوش نہ ہو جتنا ۱۸۰۰ میں تھا۔ وہ آزادی جسے ہم اتنا عزیز رکھتے ہیں وہ بھی شاید ہمارے خلاف کام کر رہی ہو۔ ہم اپنی شریک حیات، دوست اور ہمسائے منتخب کر سکتے ہیں، مگر وہ بھی ہمیں چھوڑ دینا انتخاب کر سکتے ہیں۔ اب زندگی میں ہر شخص کو اپنا راستہ منتخب کرنے کے بے مثال اختیار کے ساتھ، ہم پابند ہونا مشکل سمجھتے ہیں۔ لہذا ہم ایک بڑھتی ہوئی تنہا دنیا میں رہ رہے ہیں جس میں برادری اور خاندان زوال پذیر ہیں۔

لیکن سب سے اہم دریافت یہ ہے کہ مسرت واقعتاً بیرونی صورتوں یعنی دولت، صحت یا برادری پر بھی

منحصر نہیں۔ بلکہ یہ خارجی صورتوں اور اندرونی امنگوں کے ربط پر منحصر ہے۔ اگر آپ کو ایک بیل گاڑی کی ضرورت ہے، اور وہ آپ کو مل جائے تو آپ مطمئن ہیں۔ اگر آپ کو ایک نئی فیراری کار چاہیے، لیکن آپ کو ایک استعمال شدہ فیاٹ ملے تو آپ محرومی محسوس کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کچھ عرصے کے بعد لوگوں کی خوشی پر لاٹری جیتنے اور معذور کردینے والے کار کے حادثے کا اثر یکساں ہوتا ہے۔ جب چیزیں بہتر ہو جاتی ہیں تو امیدیں بڑھ جاتی ہیں اور نتیجے میں خارجی عوامل میں ڈرامائی تبدیلی بھی ہمیں غیر مطمئن رکھتی ہے۔ جب حالات خراب ہوں تو امیدیں کم ہو جاتی ہیں اور کوئی سخت بیماری بھی آپ کو پہلے کی مانند خوش ہی رکھ سکتی ہے۔

آپ شاید یہ کہیں کہ یہ معلوم کرنے کے لیے ہمیں نفسیات دانوں یا ان کے سوالناموں کا ایک گروہ درکار نہیں تھا۔ پیغمبروں، شاعروں اور فلسفیوں نے ہزاروں سال پہلے ہی معلوم کر لیا تھا کہ زیادہ کی خواہش کے مقابلے میں اپنے موجودہ حال سے اطمینان کہیں زیادہ ضروری ہے۔ پھر بھی اچھا ہے کہ جدید تحقیق جسے بہت سے اعداد و شمار اور چارٹوں کی کمک حاصل ہوا اسی نتیجے پر پہنچے جس پر قدما پہنچے تھے۔

مسرت کی تاریخ سمجھنے میں انسانی امیدوں کی بنیادی اہمیت کے بہت دوررس مضمرات ہیں۔ اگر مسرت صرف خارجی عوامل مثلاً دولت، صحت یا ثقافتی رشتوں پر منحصر ہوتی تو اس کی تاریخ پر تحقیق نسبتاً آسان ہوتی۔ یہ معلومات کہ اس کا انحصار اندرونی امیدوں پر ہے مورخوں کا کام دشوار کر دیا ہے۔ آج ہم جدیدیوں کے پاس سکون آور اور درد رفع کرنے والی ادویات کا ایک اسلحہ خانہ موجود ہے، لیکن آسانی اور مسرت کی ہماری امیدیں، اور زحمت و تکلیف کی عدم برداشت اس قدر بڑھ گئی ہیں کہ شاید ہم اپنے اجداد سے زیادہ تکلیف اٹھائیں۔

یہ زاویہ فکر قبول کرنا دشوار ہے۔ مسئلہ ہماری نفسیات میں شامل غلط منطق کا ہے۔ جب ہم یہ اندازہ لگانے کی کوشش کرتے ہیں کہ آج لوگ کتنے خوش ہیں یا ماضی میں کتنے خوش تھے تو ہم ہمیشہ اپنے آپ کو ان کی جگہ تصور کر لیتے ہیں۔ لیکن یہ اس لیے غلط ہے کہ ہم اپنی امیدوں کو دوسروں کی مادی صورت حال پر نافذ کرتے ہیں۔ جدید متمول معاشروں میں یہ رواج ہے کہ روز نہا کر کپڑے تبدیل کیے جائیں۔ قدیم زمانوں کے کسان مہینوں بغیر نہائے ہوئے رہتے، اور شاید ہی کبھی کپڑے بدلتے تھے۔ ان کی طرح گندا اور بدبودار رہنے کا خیال ہی ہمارے لیے قابل نفرت ہے۔ لیکن لگتا نہیں کہ اس سے قدیم کسانوں کو کوئی فرق پڑتا تھا۔ وہ تو کبھی نہ دھلنے والی قمیض کے لمس اور بو کے عادی تھے۔ ایسا نہیں ہے کہ وہ کپڑے بدلنا چاہ رہے ہوں لیکن وہ میسر نہ ہوں، جو وہ چاہتے تھے ان کے پاس تھا، یا کم از کم کپڑوں کی حد تک وہ مطمئن تھے۔

اگر آپ اس پر غور کریں تو یہ اتنی حیرت کی بات بھی نہیں ہے۔ آخر ہمارے چمپنزی کزن بھی شاید ہی کبھی نہاتے ہوں، اور کپڑے تو کبھی نہیں بدلتے۔ نہ ہی ہم اس بات سے نالاں ہوتے ہیں کہ ہمارے پالتو کتے اور بلیاں نہ نہاتے ہیں اور نہ روز لباس بدلتے ہیں۔ پھر بھی ہم انہیں چھوتے ہیں، گلے سے لگاتے اور بوسہ دیتے ہیں۔ متمول معاشروں میں اکثر چھوٹے بچے نہانے سے گھبراتے ہیں، سالوں کی تعلیم اور والدین کی تربیت کے بعد وہ اس پر کشش روایت کو اپناتے ہیں، یہ سب امیدوں کا کھیل ہے۔

اگر مسرت کا تعین امیدوں سے ہوتا ہے تو ہمارے معاشرے کے دو ستون، ذرائع مواصلات اور اشتہاری صنعت شاید غیر ارادی طور پر زمین سے اطمینان کا ذخیرہ کم کر رہے ہیں۔ اگر آپ پانچ ہزار سال پہلے کسی

چھوٹے دیہات میں ایک اٹھارہ سالہ نوجوان ہوتے تو آپ شاید یہ سوچتے کہ آپ بہت خوبرو ہیں، کیوں کہ گاؤں میں صرف پچاس ہی دیگر مرد تھے، اور ان میں سے بیشتر بزرگ، داغدار، جھریاں پڑے یا ابھی کمسن بچے تھے۔ لیکن اگر آپ آج کے نوعمر ہیں تو آپ کے غیر مطمئن ہونے کا خاصہ زیادہ امکان ہے۔ اگر سکول کے دیگر لڑکے خاصے بدشکل ہوں، تب بھی آپ اپنا موازنہ ان سے نہیں کرتے، بلکہ فلمی ستاروں، اتھلیٹس اور سپر ماڈل سے جنہیں آپ سارا دن ٹی وی، فیس بک اور بہت بڑے اشتہاری بورڈ پر دیکھتے ہیں۔

فٹ بال کا ستارہ کرسٹیانو رونالڈو اپنے زیر جامہ کو مشتہر کر رہا ہے۔ پرانے ادوار میں خوبصورتی کا معیار ان چند لوگوں سے قائم ہوتا تھا جو آپ کے پڑوس میں مقیم تھے۔ آج ذرائع ابلاغ اور فیشن کی صنعت ہمیں حسن کے مکمل غیر یقینی معیار سے آگاہ کرتے ہیں۔ وہ سیارے کے سب سے خوبرو لوگوں کو تلاش کر کے، انہیں مستقل آپ کی نگاہوں کے سامنے پھراتے ہیں۔ کیا عجب ہے کہ ہم کبھی اپنے حلیے سے مطمئن نہیں رہتے۔

ممکن ہے کہ تیسری دنیا کا عدم اطمینان محض غربت، بیماری، بدعنوانی اور سیاسی جبر سے ہی پیدا نہیں ہوتا بلکہ پہلی دنیا کے معیار سے بھی۔ ایک عام مصری کا حسنی مبارک کے دور میں، رامسس ثانی یا قلوپطرہ کے دور کے مقابلے میں، فاقے، طاعون یا تشدد سے مرنے کا امکان کم ہے۔ بیشتر مصریوں کی مادی حالت کبھی اتنی اچھی نہیں رہی۔ آپ سمجھیں گے کہ ۲۰۱۱ میں جب وہ اٹھے اور غصے میں مبارک کا تختہ الٹ دیا تو وہ سڑکوں پر رقص کر رہے ہوں گے اپنی خوش قسمتی پر اللہ کا شکر ادا کر رہے ہوں گے۔ وہ اپنا موازنہ فرعون کے دور میں اپنے اجداد سے نہیں بلکہ متمول مغرب میں اپنے ہم عصروں سے کر رہے تھے۔

اگر یہ بات ہے تو شاید ابدیت بھی غیر اطمینان بخش ہو۔ فرض کریں کہ سائنس تمام امراض کا علاج تلاش

کرلیتی ہے۔ بڑھاپے کے خلاف موثر دوائیں، اور ایسے علاج جو لوگوں کو ہمیشہ جوان رکھیں۔ امکان یہ ہے کہ اس سے غصے اور بے چینی کی ایسی وبا پھیلے گی جس کی پہلے مثال نہ رہی ہو۔
وہ افراد جوان دواؤں کا خرچ نہیں اٹھا سکتے ہوں، غالباً بیشتر افراد، وہ غصے میں آپے سے باہر ہو جائیں گے۔ تمام تاریخ میں مفلس اور لاچار اس بات سے اپنے آپ کو تسلی دیتے تھے کہ کم از کم موت سب سے برابری کا سلوک کرتی ہے۔ امیر اور طاقت ور بھی مریں گے۔ غریب اس بات سے بے سکون رہیں گے کہ انہیں تو مرنا ہے، لیکن امیر ہمیشہ جوان و خوبصورت رہیں گے۔
لیکن وہ چھوٹی اقلیت جو اس علاج کا خرچ برداشت کرسکتی ہے، وہ بھی خوش نہیں ہوگی۔ انہیں بہت سی باتوں سے بے اطمینانی ہوگی۔ گرچہ یہ نئے علاج زندگی اور جوانی میں اضافہ کرسکتے ہیں، لیکن وہ مردوں کو تو زندہ نہیں کرسکتے۔ کس قدر تشویش ناک سوچ ہے کہ میں اور میرے پیارے تو ہمیشہ زندہ رہیں گے، جب تک کہ ہم کسی گاڑی سے نہ ٹکرا جائیں یا کوئی دہشت گرو ہمارے چیتھڑے نہ اڑا دے۔ ممکن ہے کہ لافانی افراد معمولی خطرہ مول لینے سے بھی گھبرائیں۔ کسی شریک حیات، اولاد یا قریبی دوست کو کھودینے کا دکھ نا قابل برداشت ہوگا۔

کیمیائی مسرت

سماجی سائنس دان شخصی مسرت کے سوالنامے تقسیم کرتے ہیں اور ان کے نتائج کو سماجی و اقتصادی عناصر سے مربوط کرتے ہیں، مثلاً دولت اور سیاسی آزادی۔ حیاتیات دان بھی سوالنامے استعمال کرتے ہیں، لیکن لوگوں کے دیے جوابات کو حیاتیاتی کیمیا اور جینیاتی عناصر سے مربوط کرتے ہیں۔ ان کی دریافتیں حیرت انگیز ہیں۔
حیاتیات دان بتاتے ہیں کہ ہماری ذہنی اور جذباتی دنیا کو بایو کیمیائی نظام چلاتے ہیں جو لاکھوں برس کے ارتقا سے مرتب ہوئے۔ ہماری ذہنی کیفیت کی مانند ہماری شخصی مسرت کا دارومدار بھی خارجی عوامل پر نہیں: مثلاً تنخواہ، سماجی روابط یا سیاسی آزادی۔ بلکہ اس کا انحصار رگوں، عصبی خلیات، عصبی رابطوں اور متنوع کیمائی مادوں پر ہے،: مثلاً سیرٹونن، ڈوپامین اور اوکسی ٹوسن۔
کبھی بھی کوئی لاٹری جیتنے، گھر خریدنے، ترقی پانے یا سچی محبت کے حصول سے خوش نہیں ہوتا۔ خوشی صرف ایک چیز سے ہوتی ہے، صرف ایک ہی چیز اور وہ ہے ان کے جسم میں اندرونی مسرت کا احساس۔ کوئی شخص جو لاٹری جیت جائے، یا نئی محبت پالے اور خوشی سے اچھلنے لگے تو وہ پیسے یا معشوق کے ردعمل میں نہیں کودرہا۔ یہ تو رگوں میں دوڑتے مختلف ہارمون کا ردعمل ہے، اور دماغ کے مختلف حصوں میں اٹھتے بجلی کے سگنلوں کے ایک طوفان کا۔
بدقسمتی سے زمین پر ہی جنت بنالینے کی تمام خواہشات کے باوجود، ہمارا اندرونی بایو کیمیائی نظام ایسا مرتب ہے کہ خوشی کی سطح نسبتاً ایک ہی رہتی ہے۔ اس میں فطری چناؤ کا کوئی کردار نہیں ہے۔ جب دو بے چین والدین کی جینیں نئی نسل میں منتقل ہوں تو کسی پرسکون زاہد کی جینیات بھی بدل جائے گی۔ خوشی اور افسردگی ارتقا میں محض اتنا ہی کردار ادا کرتے ہیں کہ وہ بقا اور افزائشِ نسل کی حوصلہ افزائی کریں یا حوصلہ شکنی۔ لہذا یہ حیران کن نہیں ہے کہ ارتقا نے ہمیں ایسے تراشا ہے کہ ہم نہ بہت خوش ہوں اور نہ بہت غمگین۔ اس نے ہمیں اس قابل بنادیا ہے کہ ہم لمحاتی خوشی کی حسیت سے لطف اندوز ہوں، لیکن یہ احساس ہمیشہ نہیں رہتا۔ جلد یا بدیر یہ ختم ہو کر اپنی جگہ ناخوشی کی حسیت

چھوڑ دیتے ہیں۔ مثلاً ارتقا نے مرد کو کسی زرخیز عورت سے جفتی کر کے اپنی جین پھیلانے میں کیف آگیں حسیت کا انعام رکھا۔ اگر جنسی عمل سے اس قدر کیف وابستہ نہ ہوتا تو چند ہی مرد زحمت کرتے۔ اس کے ساتھ ہی ارتقا نے اس کا بھی خیال رکھا کہ یہ کیف انگیز حس لحاتی ہو۔ اگر یہ کیفِ انزال ہمیشہ کے لیے جاری رہتا، تو ایک بہت خوش مرد غذا میں دلچسپی نہ لینے سے بھوک سے مر جاتا، اور وہ مزید زرخیز عورتوں کی تلاش کی زحمت نہ کرتا۔

کچھ اسکالر انسانی بایو کیمسٹری کو ایک ایر کنڈیشنر سے تشبیہ دیتے ہیں، جو درجہ حرارت کو مستقل رکھتا ہے چاہے برف کا طوفان ہو یا گرمی کی لہر۔ حالات سے درجہ حرارت عارضی طور پر بدل سکتا ہے لیکن ایر کنڈیشنگ کا نظام جلد ہی درجہ حرارت کو واپس معمول کی طرف لے جاتا ہے۔ کچھ ایر کنڈیشنر ستر ڈگری فارن ہائیٹ پر مقرر ہیں، تو کچھ بیس ڈگری پر۔ اسی طرح انسانی مسرت کا درجہ حرارت انسانوں کے درمیان مختلف ہوتا ہے۔ ایک سے دس کے میزان میں کچھ لوگ پیدا ہی ایک ایسے پر مسرت بایو کیمیائی نظام کے ساتھ ہوتے ہیں، جس میں ان کا موڈ چھ سے دس کے درمیان بدلتا رہتا ہے، اور وقت کے ساتھ آٹھ پر مستحکم ہو جاتا ہے۔ ایسا شخص اگر ایک بڑے، اجنبی شہر میں رہ رہا ہو، اپنی ساری دولت حصص کے بازار میں کھو دینے پر یا ذیابطیس کی تشخیص پر بھی خوش رہتا ہے۔ دوسرے افراد ایک افسردہ بایو کیمیا کے ساتھ پیدا ہوتے ہیں جو تین سے ساتھ کے درمیان بدلتا ہے اور پانچ پر مستحکم ہو جاتا ہے۔ ایک ایسا ناخوش شخص بہت قریبی برادری کی مدد، لاٹری میں کروڑوں کے انعام اور کسی ایتھلیٹ جیسی اچھی صحت کے باوجود افسردہ ہی رہتا ہے۔ یقیناً اگر ہمارا یہ افسردہ دوست صبح میں پانچ کروڑ کی لاٹری جیت لے، ایڈز اور سرطان دونوں کا دوپہر تک علاج دریافت کر لے، سہ پہر میں اسرائیل اور فلسطین کے درمیان امن قائم کر دے، ا ور شام میں اپنے برسوں پہلے کھوئے ہوئے بچے سے مل جائے، وہ پھر بھی ساتھ کی سطح سے اوپر خوشی کے حصول کے لیے نا اہل ہے۔ کچھ بھی ہو جائے، اس کا دماغ اس پر جوش مسرت کو محسوس کرنے کے لیے بنا ہی نہیں ہے۔

کچھ دیر کے لیے اپنے خاندان اور دوستوں کو ذہن میں لائیے۔ آپ یہ جانتے ہیں کہ کچھ افراد خواہ ان پر کیسا بھی وقت پڑ جائے، ہمیشہ نسبتاً خوش رہتے ہیں۔ کچھ ایسے ہیں کہ دنیا ان کے قدموں میں کچھ بھی نچھاور کر دے وہ ناخوش ہی رہتے ہیں۔ ہم اپنے آپ کو یہی یقین دلاتے ہیں کہ اگر ہماری نوکری بدل جائے، شادی ہو جائے، اس ناول کی تحریر مکمل ہو جائے، ایک نئی کار خرید لیں، اور مکان پر قرض اتر جائے تو ہم دنیا فتح کر لیں گے۔ لیکن جب ہماری یہ خواہش پوری ہو جاتی ہے تب بھی ہم زیادہ خوش تو نظر نہیں آتے۔ کار خریدنے یا ناول مکمل ہونے سے ہماری بایو کیمیا بدل نہیں جاتی۔ وہ اسے ایک لمحے کے لیے حیران کر سکتی ہیں، لیکن پھر وہ فوراً ہی اپنے مقررہ نکتے پر واپس آجاتی ہے۔

اب اس بات کو اوپر بیان کیے گئے نفسیاتی یا سماجی نتائج سے کیسے سمجھا جا سکتا ہے؟ مثلاً یہ کہ شادی شدہ افراد کنوارے افراد سے زیادہ خوش ہوتے ہیں۔ اول تو یہ کہ یہ نتائج تعلقی ہیں، یعنی ممکن ہے کہ نتیجے کی وجہ کا رخ محققین کی امید کے برعکس ہو۔ یہ درست ہے کہ شادی شدہ افراد کنوارے اور طلاق یافتہ سے زیادہ خوش ہوتے ہیں لیکن اس کا یہ مطلب ضروری نہیں کہ شادی خوشی پیدا کرتی ہے۔ ممکن ہے کہ خود مسرت شادی میں معاون ہوتی ہو؟ زیادہ درست یہ ہے کہ وہ سیروٹونن، ڈوپامین اور اوکسی ٹوسن شادی کے انعقاد اور اس کے استحکام کے ذمہ دار ہوں۔ وہ افراد جو ایک پر مسرت حیاتیاتی کیمیا کے ساتھ پیدا ہوں وہ عموماً خوش اور مطمئن ہوتے ہیں۔ ایسے افراد

زیادہ پرکشش شریک حیات ہیں، لہذا ان کی شادی ہونے کا امکان زیادہ ہے۔ ان میں طلاق ہو جانے کا امکان کم ہے۔ کیوں کہ ایک افسردہ اور غیر مطمئن شریک حیات کے مقابلے میں ایک خوش اور مطمئن فرد کے ساتھ رہنا زیادہ آسان ہے۔ لہذا یہ کہنا درست ہے کہ اوسطاً شادی شدہ افراد تنہا افراد سے زیادہ خوش رہتے ہیں، لیکن ایک تنہا عورت جو اپنی بایوکیمیائی ساخت سے افسردگی پر مائل ہو وہ ضروری نہیں ہے کہ شوہر مل جانے پر خوش رہنے لگے۔

مزید یہ کہ زیادہ تر حیاتیات دان انتہا پسند نہیں۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ مسرت کا ایک بڑا حصہ بایوکیمیائی ہے، لیکن وہ تسلیم کرتے ہیں کہ نفسیاتی اور سماجی عوامل بھی اپنا کردار ادا کرتے ہیں۔ ہمارا دماغی ایرکنڈیشننگ کا نظام اپنی مقررہ حدود میں کچھ گنجائش رکھتا ہے۔ بالائی اور زیریں جذباتی حدود کو پار کرنا تقریباً ناممکن ہے۔ لیکن شادی اور طلاق سے ان کے درمیانی علاقے پر اثر پڑ سکتا ہے۔ کوئی شخص جو درجہ پانچ کی اوسط کے ساتھ پیدا ہوا ہو وہ کبھی بھی سڑکوں پر خوشی سے ناچنے نہیں لگے گا۔ لیکن ایک کامیاب شادی سے وہ کبھی کبھار سات کی سطح پر لطف اندوز ہو سکتا ہے، اور تین کی سطح کی افسردگی سے بچا رہ سکتا ہے۔

اگر ہم مسرت کے حیاتیاتی نظریے کو قبول کر لیں تو تاریخ کی زیادہ اہمیت نہیں رہ جاتی کیوں کہ بیشتر تاریخی واقعات کا ہماری بایوکیمیا پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ تاریخ خارجی محرکات کو بدل سکتی ہے جس سے سیروٹونن کا اجرا متاثر ہو، لیکن وہ سیروٹونن کی سطح نہیں بدل سکتی، لہذا وہ لوگوں کو خوش نہیں کر سکتی۔

کسی قدیم فرانسیسی کسان کا ایک جدید پیرس کے بینکر سے موازنہ کیجیے۔ وہ کسان سرد مٹی سے بنی ایک کٹھیا میں رہتا تھا جس سے باہر سور کا فارم نظر آتا تھا۔ جب کہ وہ بینکر سب سے اوپر کی منزل پر ایک شاندار اپارٹمنٹ میں واپس لوٹتا ہے، جس میں تمام جدید کل پرزے نصب ہیں، اور جس سے شانزے لیزا کا منظر دکھائی دیتا ہے۔ وجدانی طور پر ہم یہ توقع کریں گے کہ بینکر اس کسان سے بہت زیادہ خوش ہوگا۔ مگر مٹی کی کٹھیا، شاندار گھر اور شانزے لیزا ہمارا موڈ متعین نہیں کرتیں، سیروٹونن کرتا ہے۔ جب اس کسان نے اس مٹی کی کٹھیا کی تعمیر مکمل کی تھی تو اس کے دماغ میں عصبی خلیات نے سیروٹونن پیدا کیا تھا جو اسے مسرت کی دس کی سطح پر لے گیا تھا۔ لیکن جب ۲۰۱۴ میں اس بینکر نے اپنے شاندار اپارٹمنٹ کی آخری قسط ادا کی تو اس کے دماغ نے بھی اتنا ہی سیروٹونن پیدا کیا اور اسے بھی دس کی سطح پر لے آیا۔ دماغ کو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ وہ شاندار اپارٹمنٹ اس کٹھیا سے کہیں زیادہ آرام دہ تھا۔ صرف یہ اہم تھا کہ اس وقت سیروٹونن کی سطح دس ہے۔ لہذا وہ بینکر اپنے پرداد اکے پردادا، اس کسان سے ایک رتی بھی زیادہ خوش نہیں ہے۔

یہ صرف نجی زندگی ہی نہیں بلکہ بڑے اجتماعی واقعات کے لیے بھی درست ہے۔ مثلاً انقلاب فرانس کی مثال لیجیے۔ انقلابی بہت مصروف تھے۔ انہوں نے بادشاہ کو قتل کیا، کسانوں میں زمین تقسیم کی، انسانی حقوق کا اعلان کیا، اشرافیہ کے استحقاق کا اختتام کیا اور تمام یورپ کے خلاف جنگ کی۔ لیکن ان تمام واقعات سے فرانسیسی بایوکیمیا تبدیل نہیں ہوئی۔ لہذا انقلاب سے پیدا ہونے والی تمام سیاسی، سماجی، نظریاتی اور اقتصادی تبدیلی کے باوجود فرانس کی مسرت پر اس کا اثر بہت کم تھا۔ جینیاتی لاٹری میں جنہیں پر مسرت بایوکیمیا ملی تھی، وہ انقلاب کے بعد بھی اتنے ہی خوش تھے جتنا انقلاب سے پہلے۔ جن کی بایوکیمیا افسردہ تھی وہ اسی تلخی سے نپولین اور رابس پیئر کی شکایت کرتے رہے، جیسے وہ پہلے لوئی سولہ اور میری انتوانیٹ کی کرتے تھے۔

اگر ایسا ہے تو انقلاب فرانس کا کیا فائدہ؟ اگر لوگوں کو زیادہ مسرت حاصل نہیں ہوئی تو اس تمام انتشار، خوف، خون اور جنگ کا کیا فائدہ تھا؟ حیاتیات دان تو کبھی باسٹیل (Bastille) پر حملہ نہیں کرتے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ سیاسی انقلاب یا وہ سماجی اصلاح انہیں خوش کر دے گی لیکن ان کی بایو کیمیا انہیں بار بار فریب دیتی ہے۔

صرف ایک تاریخی واقعہ ایسا تھا جو واقعی اہم تھا۔ آج جب ہم اس نتیجے پر پہنچ گئے ہیں کہ ہماری مسرت کی کلید ہماری بایو کیمیائی ترکیب ہے، تو ہمیں سیاسی اور سماجی اصلاحات، نظریات اور بغاوتوں پر اپنا وقت ضائع کرنے کے بجائے اپنی تمام توجہ اس چیز پر مرکوز کرنی چاہیے جو واقعی ہمیں خوشی دینے پر قادر ہے، ہماری بایو کیمیا۔ اگر ہم اپنے دماغ کی کیمیا سمجھنے پر اربوں خرچ کریں، اور اس کے علاج دریافت کریں، تو ہم کوئی انقلاب لائے بغیر لوگوں کو پہلے سے کہیں زیادہ خوش رکھ سکتے ہیں۔ مثلاً پروزیک (Prozac) حکومتیں تبدیل نہیں کرتی لیکن سیروٹونن کی سطح تبدیل کر کے وہ افراد کو ان کی افسردگی سے نجات دلا دے گی۔

اس حیاتیاتی نظریے کو اس نئے دور کے فقرے سے بہتر کوئی بیان نہیں کر سکتا کہ " خوشی اندر سے شروع ہوتی ہے"۔ دولت، سماجی مقام، پلاسٹک سرجری، خوبصورت گھر، طاقت ور عہدے ان میں سے کچھ بھی آپ کو خوشی نہیں بخش سکتے۔ طویل المعیاد خوشی آپ کو صرف سیروٹونن، ڈوپامین اور اوکسی ٹوسن سے پیدا ہوتی ہے۔ الڈوس ہکسلے کی مضطرب کر دینے والی ناول "بہادر نئی دنیا" جو ۱۹۳۲ء کے عظیم دور افسردگی میں لکھی گئی تھی، اس میں مسرت سب سے اہم اثاثہ تھا اور پولیس اور ووٹ کی جگہ نفسیاتی دوائیں سیاست کی بنیاد بن گئی تھیں۔ ہر روز، ہر شخص سوما (Soma) کی ایک خوراک لیتا ہے، ایجاد ہوئی ایک دوا جو افراد کی پیداواری صلاحیت متاثر کیے بغیر انہیں خوش رکھتی ہے۔ ایک عالمی ریاست جو ساری دنیا پر حاکم ہے، جسے کہیں جنگ، انقلاب، ہڑتال یا مظاہروں کا سامنا نہیں، بلکہ خواہ جیسی بھی ہو تمام افراد اپنی موجودہ صورت حال سے مطمئن رہتے ہیں۔ مستقبل کے بارے میں ہکسلے کا منظر نامہ جارج آرویل کی "انیس سو چوراسی" سے بہت زیدہ تکلیف دہ ہے۔ ہکسلے کی دنیا قاری کو بہت بدصورت لگتی ہے۔ لیکن یہ بتانا دشوار ہے کہ کیوں۔ ہر شخص ہر وقت خوش ہے، اس میں کیا برائی ہے؟

زندگی کا مقصد

ہکسلے کی مضطرب دنیا اس حیاتیاتی مفروضے پر قائم ہے کہ خوشی، اندرونی مسرت کا نام ہے۔ خوش ہونا جسم میں لطیف حسیات کی آگاہی سے زیادہ کچھ نہیں۔ کیوں کہ ہماری بایو کیمیا ان حسیات کی تعداد اور دورانیے کو متعین کرتی ہے، تو لوگوں کے پاس اعلیٰ درجے کی خوشی ایک طویل عرصے کے لیے محسوس کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے، ان کے بایو کیمیائی نظام میں تبدیلی۔

لیکن خوشی کی اس تعریف پر کئی اسکالروں نے اعتراض کیا ہے۔ ایک مشہور تحقیق کے مطابق، اقتصادیات میں نوبل انعام یافتہ ڈینیل کینی مین نے لوگوں سے کہا کہ وہ کام کے ایک عام سے دن کو لمحہ بہ لمحہ یاد کریں اور دیکھیں کہ وہ ہر لمحہ خوش تھے یا ناخوش۔ اس کی دریافت افراد کی اپنی زندگی کے بارے میں عام فہم سے مختلف تھی۔ مثلاً کسی بچے کی پرورش دیکھیے۔ کینی مین نے دریافت کیا کہ خوشی اور مسرت کے لحاظ سے، کسی بچے کی پرورش ایک خاصہ ناخوشگوار مرحلہ ثابت ہوا۔ اس میں پوتڑے بدلنا، برتن دھونا اور بچوں کی ناخوشی کے دوروں سے

ہنسنا شامل تھا جو کسی کو پسند نہیں۔ لیکن زیادہ تر والدین کا کہنا ہے کہ اولاد ان کی خوشیوں کا مرکز ہے۔ کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ لوگ یہ نہیں جانتے کہ ان کے لیے کیا بہتر ہے؟

یہ ایک امکان ہے۔ دوسرا امکان یہ ہے کہ خوشی محض لطیف لمحات کا غیر لطیف لحات پر غلبے کا نام نہیں۔ بلکہ خوشی زندگی کو اس کی مکمل مقصدیت اور اہمیت میں دیکھتی ہے۔ خوشی کا اہلیت اور اخلاقیات پر مبنی بھی ایک اہم پہلو ہے۔ ہماری اخلاقیات اس بات کا تعین کرتی ہیں کہ کیا ہم اپنے آپ کو "ایک ننھے جابر کا ناخوش غلام سمجھتے ہیں"، یا "محبت سے کسی نئی زندگی کو پروان چڑھانے کا ذمہ دار"۔ جیسا کہ نطشے نے کہا تھا کہ اگر آپ کے پاس زندگی گزارنے کا کوئی مقصد ہے، تو آپ اس سوال کو برداشت کرلیں گے کہ کیسے گزاریں۔۔۔ بہت دشواریوں کے درمیان بھی ایک بامقصد زندگی بہت اطمینان بخش ہوسکتی ہے، لیکن ایک بے مقصد زندگی گزارنا چاہے کتنی آرامدہ ہی کیوں نہ ہو، ایک مصیبت ہی ہے۔

اگرچہ ہر دور اور ہر ثقافت میں افراد نے ایک ہی قسم کے درد و مسرت کے تجربے کیے ہیں، لیکن وہ شاید اپنے تجربات کو بہت متنوع معنی دیتے ہیں۔ اگر ایسا ہے تو حیاتیات دانوں کی توقع کے برخلاف مسرت کی تاریخ بہت شور انگیز رہی ہوگی۔ یہ نتیجہ لازماً جدیدیت کے موافق نہیں ہے۔ اگر زندگی کو لحہ بہ لحہ دیکھیں تو یقیناً قدمانے بہت مشکلات اٹھائیں۔ لیکن اگر وہ حیات بعد الموت کی مسرت پر یقین رکھتے تھے تو جدید سیکولر لوگوں کے مقابلے میں جو عمر کے اختتام کو مکمل بے مقصد زیاں دیکھتے ہیں، وہ شاید اپنی زندگی کو کہیں زیادہ بامقصد اور قیمتی سمجھتے ہوں گے۔ اگر قرون وسطیٰ کے لوگوں سے سوال کیا جاتا کہ " کیا وہ مجموعی طور پر اپنی زندگی سے مطمئن ہیں"، تو شاید وہ شخصی مسرت کے سوالنامے میں بہت اچھے نمبر حاصل کرتے۔

تو کیا ہمارے قدیم آبا اس لیے خوش تھے کیوں کہ انہوں نے زندگی کا مقصد ایک اجتماعی حیات بعد الموت کے فریب میں تلاش کرلیا تھا۔ جی ہاں، جب تک کہ کوئی ان کے گمان میں سوراخ نہ کردیتا، کیوں نہیں۔ جہاں تک ہم سائنسی نکتہ نظر سے بتا سکتے ہیں انسانی حیات کا کوئی مقصد نہیں۔ انسان ایک بے سمت ارتقائی عمل کا نتیجہ ہیں جو بغیر کسی مقصد یا نصب العین کے فعال ہے۔ ہماری حرکات کسی الہی آفاقی پلان کے تابع نہیں اور اگر کل صبح ہمارا یہ سیارہ بھسم ہوجائے تب بھی یہ کائنات اسی طرح جاری رہے گی۔ جہاں تک ہم اس وقت بتاسکتے ہیں انسان کا وجود یاد نہیں کیا جائے گا۔ لہذا لوگ جو بھی مقصد اپنی زندگی سے وابستہ کرتے ہیں وہ محض فریب ہے۔ قدیم افراد نے اپنی زندگی میں دوسری دنیا سے جو معنی وابستہ کرلیے تھے وہ آج کی جدید دنیا کی انسانیت، قومیت اور سرمایہ داری کے فریب سے زیادہ مختلف نہیں تھے۔ وہ سائنس دان جو یہ کہے کہ اس کی زندگی بامقصد ہے کیوں کہ وہ انسانی علم کے ذخیرے میں اضافہ کرتا ہے، یا وہ سپاہی جو یہ کہے کہ اس کی زندگی بامقصد ہے کیوں کہ وہ اپنی مادر وطن کا دفاع کرتا ہے، اور وہ کاروباری جو کسی نئی کمپنی کی تعمیر میں حیات کا مقصد ڈھونڈلے، وہ بھی کسی طرح ان قدما سے کم فریب کا شکار نہیں جو صحیفوں کو پڑھنے، صلیبی جنگ پر جانے یا نئے چرچ کی تعمیر میں زندگی کا مقصد ڈھونڈتے تھے۔

تو شاید خوشی کا مطلب نجی فریب کو موجودہ اجتماعی فریب سے مناسبت دینا ہے۔ جب تک میرا ذاتی خیال میرے اطراف موجود افراد کے خیالات سے مناسبت رکھتا ہے، میں اپنے آپ کو زندگی کی مقصدیت کا یقین دلاسکتا ہوں، اور اس یقین میں خوشی تلاش کرسکتا ہوں۔

یہ ایک بہت افسردہ نتیجہ ہے۔ کیا خوشی واقعی خود فریبی پر منحصر ہے؟

اپنے آپ کو پہچانو

اگر خوشی کا انحصار کیف آگیں احساسات پر ہے، تو خوش ہونے کے لیے ہمیں اپنے بایو کیمیائی نظام کو دوبارہ مرتب کرنا ہوگا۔ اگر خوشی کا احساس اس زندگی کی مقصدیت سے منسلک ہے تو خوش رہنے کے لیے ہمیں اپنے آپ کو زیادہ موثر طریقے سے دھوکہ دینا ہوگا۔ کیا کوئی تیسرا راستہ بھی ہے؟

اوپر دیے ہوئے دونوں نکتہ نظر یہ فرض کرتے ہیں کہ خوشی ایک شخصی احساس ہے (مسرت یا معنی کا)، تو لوگوں کی خوشی معلوم کرنے کے لیے صرف ان سے پوچھنے کی ضرورت ہے کہ وہ کیسا محسوس کر رہے ہیں۔ بہت سے افراد کے لیے یہ بات منطقی ہے کیوں کہ ہمارے دور کا غالب مذہب آزاد خیالی ہے۔ آزاد خیالی فرد کی نجی حسیات کو مقدس قرار دیتی ہے۔ اس کے خیال میں یہ حس حاکیت کی سب سے بڑی قوت ہے۔ کیا اچھا ہے، کیا برا؟ کیا خوبصورت ہے، کیا بدصورت؟ کیا ہونا چاہیے اور کیا نہیں؟ ان سب کا دارومدار اس بات پر ہے کہ ہم میں سے ہر ایک کیسا محسوس کر رہا ہے۔

آزاد خیال سیاست اس نظریے پر قائم ہے کہ رائے دہندگان سب سے بہتر سمجھتے ہیں اور کسی نگران کی ضرورت نہیں جو ہمیں سمجھائے کہ ہمارے لیے کیا بہتر ہے۔ آزاد معیشت اس نظریے پر قائم ہے کہ گاہک ہمیشہ درست ہوتا ہے۔ آزاد خیال آرٹس یہ اعلان کرتی ہے کہ خوبصورتی دراصل دیکھنے والے کی آنکھ میں ہوتی ہے۔ لہذا سکولوں اور جامعات میں یہ پڑھایا جاتا ہے کہ اپنے بارے میں سوچو۔ اشتہارات ہمیں اکساتے ہیں کہ "بس کر گزرو"۔ مار دھاڑ سے بھرپور فلمیں، اسٹیج ڈرامے، سماجی ڈرامے، ناول اور مقبول نغمے سب ہم سے یہی کہتے رہتے ہیں "کہ اپنے آپ کو دھوکہ مت دو، اپنے اندر کی آواز سنو، اپنے دل کی بات سنو"۔ جین جیکس روسو نے اس نظریے کو بہت خوبصورتی سے بیان کیا تھا: "جو مجھے اچھا لگے، وہ اچھا ہے، جو مجھے برا لگے۔۔۔ وہ برا ہے"۔

وہ لوگ جو بچپن سے ایسے نعروں پر پلتے ہیں وہ باآسانی یہ یقین کر سکتے ہیں کہ خوشی ایک اندرونی جذبہ ہے، اور کوئی شخص ہی یہ جان سکتا ہے کہ وہ خوش ہے یا ناخوش۔ لیکن یہ فکر صرف آزاد خیالی کے لیے مخصوص ہے۔ تمام تاریخ بیشتر مذاہب اور نظریات یہ بتاتے رہے کہ اچھائی اور حسن کے، اور چیزوں کو کیسا ہونا چاہیے، ان کے خارجی پیمانے ہیں۔ یہ ایک عام فرد کے احساسات اور ترجیحات سے مشکوک رہتے۔ ڈیلفائی میں اپولو کے معبد میں داخل ہونے والے زائرین کے استقبال کے لیے یہ درج تھا "خود کو پہچانو!" اس سے مقصد یہ تھا کہ ایک عام آدمی اپنی اصلیت سے ناواقف ہے، لہذا اپنی مسرت سے بھی لاعلم۔۔۔ فرائیڈ یقیناً اس سے متفق ہوتا*۔

اور یقیناً عیسائی ماہرین الٰہیات بھی متفق ہوتے۔ سینٹ پال اور سینٹ آگسٹین اس بات سے بخوبی واقف تھے کہ اگر لوگوں کو موقع دیا جائے تو ان میں بیشتر ہم بستری کو عبادت پر ترجیح دیں گے۔ کیا اس سے یہ ثابت

* اس کے متضاد، شخصی صحت کی نفسیاتی تحقیق میں افراد کی اس اہلیت پر قائم ہے کہ وہ خود اپنی مسرت کو تشخیص کر سکیں۔ نفسیاتی علاج کا سب سے اہم نکتہ یہ ہے کہ لوگ واقعتاً اپنے آپ سے واقف نہیں، اور ان کو اکثر پیشہ ور مدد کی ضرورت ہوتی ہے، جو انہیں خود کو برباد کرنے والے رویے سے نجات دلا سکے۔

ہوتا ہے کہ ہم بستری مسرت کی کلید ہے؟ پال اور آگسٹین کے خیال میں تو نہیں۔ اس سے صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ گناہ نوع انسانی کی سرشت میں داخل ہے اور لوگ با آسانی شیطان کے بہکائے میں آ جاتے ہیں۔ عیسائی نکتہ نظر سے لوگوں کی اکثریت کسی افیونچی کی سی کیفیت میں ہے۔ فرض کیجیے کہ کوئی نفسیات دان نشے کے عادی افراد میں مسرت پر تحقیق کرتا ہے۔ وہ ان کی رائے وہی کرتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے ہر ایک اس وقت خوش ہوتا ہے کہ جب اسے نشے کا ٹیکہ لگ جائے۔ کیا یہ نفسیات دان اپنی تحقیق اس اعلان کے ساتھ شائع کرے گا کہ افیون ہی مسرت کی کلید ہے۔

یہ خیال کہ احساسات نا قابل بھروسہ ہیں محض عیسائیت تک ہی محدود نہیں۔ جہاں تک حساسیت کی قدر کا سوال ہے تو ڈارون اور ڈاکنز بھی کسی حد تک سینٹ پال اور آگسٹین سے متفق ہوں گے۔ خود غرض جین کے نظریے کے مطابق، دوسری حیات کی مانند فطری چناؤ افراد کو بھی وہ منتخب کرنے پر مجبور کرتا ہے جو ان کی جینیاتی افزائش کے لیے اچھا ہو، خواہ انفرادی شخص کے لیے وہ برا ہی کیوں نہ ہو۔ بیشتر مرد پر امن زندگی کا لطف اٹھانے کے بجائے اپنی زندگی تفکر، محنت، مشقت، مقابلہ بازی اور لڑائی جھگڑے میں بسر کرتے ہیں۔ کیوں کہ ان کا ڈی این اے اپنے خود غرضانہ مقاصد کے لیے انہیں اکساتا ہے۔ شیطان کی طرح ڈی این اے بھی لوگوں کو اکسانے اور اپنے قابو میں رکھنے کے لیے لحاتی مسرت کو استعمال کرتا ہے۔

لہٰذا بیشتر مذاہب اور فلسفوں نے مسرت کی بابت آزاد خیالی کے مقابلے میں مختلف رویہ اپنایا ہے۔ بدھ ازم کا رویہ خاص طور پر دلچسپ ہے۔ بدھ ازم نے مسرت کے سوال کو کسی دوسرے انسانی عقیدے سے زیادہ اہمیت دی ہے۔ کوئی ڈھائی ہزار سالوں تک بدھ مت نے خوشیوں کے عطر اور وجوہات پر باقاعدہ تحقیق کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سائنسی برادری میں ان کے فلسفے اور مراقبے کے عمل میں بہت دلچسپی رکھتی ہے۔

بدھ ازم مسرت کے بارے میں حیاتیات کے بنیادی رویے سے متفق ہے کہ مسرت فرد کے اندرون سے پیدا ہوتی ہے، بیرونی دنیا کے کسی خارجی عوامل سے نہیں۔ لیکن اس نکتے سے ابتدا کر کے بدھ ازم ایک بہت مختلف نتیجے پر پہنچا ہے۔

بدھ ازم کے مطابق بیشتر افراد مسرت کو کیف آگیں احساس سے وابستہ کرتے ہیں اور افسردگی کو تکلیف کے احساس سے۔ لہٰذا لوگ اپنے احساسات کو بہت زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ درد سے نجات کے لیے زیادہ سے زیادہ کیف کی تلاش میں رہتے ہیں۔ ہم زندگی میں جو بھی کریں، پیر کھجائیں، کرسی میں پہلو بدلیں یا جنگ عظیم میں حصہ لیں، ہم محض کیف آگیں احساس حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ بدھ ازم کے مطابق مسئلہ یہ ہے کہ ہمارے احساسات لحاتی، کسی ارتعاش سے زیادہ نہیں ہیں، سمندری موجوں کی مانند ہر لمحہ بدلتے ہوئے۔ پانچ منٹ پہلے تک میں بہت با مقصد اور پر مسرت محسوس کر رہا تھا، اب وہ احساس مٹ چکا ہے اور ممکن ہے میں بے کار اور افسردہ محسوس کروں۔ لہٰذا اگر مجھے کیف آگیں احساسات کی ضرورت ہے تو مجھے ہمیشہ ان کے تعاقب میں رہنا پڑتا ہے، اور تکلیف دہ احساسات کو بھگانا پڑتا ہے۔ اگر میں کامیاب بھی ہو جاؤں تب بھی مجھے دوبارہ شروع ہونا ہوتا ہے، اپنی کوششوں کے لیے کبھی بھی دیرپا انعام حاصل کیے بغیر۔

ایسے لحاتی انعامات کے حصول میں ایسی کیا بات ہے؟ کسی ایسی چیز کے حصول کے لیے اتنی محنت کی کیا

ضرورت ہے جو پیدا ہوتے ہی ختم ہو جاتی ہے۔ بدھ ازم کے مطابق تکلیف کی بنیاد نہ درد کا احساس ہے، نہ افسردگی، نہ بے معنی ہونے کا۔ بلکہ تکلیف کی اصل وجہ ان لمحاتی احساسات کا فضول تعاقب ہے جو ہمیں مستقل تناؤ، بے چینی اور غیر اطمینان میں مبتلا رکھتے ہیں۔ اس تعاقب کی وجہ سے دماغ کبھی مطمئن نہیں ہوتا۔ اس خوف سے کہ یہ احساس جلد ہی ختم ہو جائے گا، یہ مسرت کا احساس کرتے وقت بھی مطمئن نہیں ہوتا۔ ان کی تمنا ہوتی ہے کہ یہ احساس بڑھ جائے اور باقی رہے۔

لوگ تکلیف سے اس وقت آزاد نہیں ہوتے جب وہ اس یا اس لمحاتی مسرت کی گرفت میں ہوں، بلکہ جب انہیں اپنے احساس کی لمحاتی زندگی کا ادراک ہو جائے اور وہ اس کا تعاقب بند کر دیں۔ بدھ مت کے مراقبے کا یہی نصب العین ہے۔ مراقبے میں آپ اپنے جسم و ذہن کا قریبی جائزہ لیتے ہیں، اپنے احساسات کے کبھی نہ ختم ہونے والے احساسات کو دیکھتے ہیں اور یہ معلوم کرتے ہیں کہ ان کا تعاقب کتنا فضول ہے۔ جب یہ تعاقب ختم ہو جائے تو دماغ بہت صاف، پرسکون اور مطمئن ہو جاتا ہے۔ ہر قسم کا احساس آتا جاتا رہتا ہے؛ خوشی، غصہ، بوریت، شہوت لیکن ایک بار آپ نے کسی خاص احساس کی تمنا چھوڑ دی ہو تو آپ انہیں قبول کر لیتے ہیں۔ وہ کیسے بھی ہوں، بجائے یہ تصور کرنے کے کہ کیا ممکن ہو سکتا تھا، آپ لمحہ موجود میں زندہ رہتے ہیں۔

اس سے حاصل کردہ سکون اس قدر حیرت انگیز ہے کہ جو اپنی تمام عمر کیف آگیں احساسات کے تعاقب میں گزارتے ہیں وہ اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ یہ ایسا ہی ہے کہ جیسے کوئی کئی دہائیوں سے ساحل پر کھڑا، کچھ اچھی لہروں کو بکھرنے سے بچانے کی کوشش کر رہا ہو، اور ساتھ ہی خراب لہروں کو اپنے قریب آنے سے روکنے کی کوشش کر رہا ہو۔ روزانہ یہ آدمی ساحل پر کھڑا اپنے آپ کو اس بے کار جدوجہد میں مصروف پاگل ہو رہا ہے۔ بالآخر وہ بس ریت پر بیٹھ جاتا ہے اور لہروں کو ان کی مرضی سے آنے جانے کی اجازت دیتا ہے، اب وہ کتنا پرسکون ہے۔

جدید آزاد خیال ثقافتوں کے لیے یہ خیال اتنا اچھوتا ہے کہ جب نئے دور کی مغربی تحریکوں نے بدھ ازم کی فکروں کا سامنا کیا تو انہوں نے اس کا آزاد خیالی فکر سے ترجمہ کر کے اسے بالکل بدل دیا۔ نئے دور کے فرقے اکثر یہ بحث کرتے ہیں کہ مسرت خارجی عوامل پر منحصر نہیں۔ یہ صرف ہماری داخلی حساسیت پر منحصر ہے۔ لوگوں کو دولت اور رتبے جیسی بیرونی اشیا کی تحصیل کی کوششیں ترک کر دینی چاہیے، اور اس کے بجائے اپنے اندرونی احساسات سے ربط رکھنا چاہیے۔ یا زیادہ جامع انداز میں یہ کہیے "کہ خوشی کی ابتدا اندر سے ہوتی ہے"۔ یہی تو حیاتیات دان بھی کہتے ہیں، مگر یہ بدھ مت کے بتائے نظریہ کا الٹ ہے۔

بدھا جدید حیاتیات اور دور جدید کی تحریکوں سے اتفاق کرتا ہے کہ خوشی بیرونی محرکات سے مبرا ہے۔ لیکن اس کی زیادہ اہم اور گہری فکر یہ تھی کہ سچی خوشی تو اندرونی احساسات سے بھی ماورا ہوتی ہے۔ اور درحقیقت ہم اپنے احساسات کو جتنی زیادہ اہمیت دیں، ہم اتنا ہی زیادہ ان کے لیے تڑپتے ہیں، اتنی ہی زیادہ تکلیف اٹھاتے ہیں۔ بدھ کی تعلیمات یہ بتاتی ہیں کہ نہ صرف خارجی عوامل کا تعاقب بند کیا جائے بلکہ اندرونی احساسات کا بھی۔

اس کا خلاصہ یہ ہے کہ شخصی خوشی کے سوالنامے ہمارے شخصی احساسات کے ذریعے ہماری فلاح کو شناخت کرتے ہیں، اور مخصوص مسرتوں کو کسی مخصوص جذباتی کیفیت سے منسلک کرتے ہیں۔ اس کے متضاد کئی روایتی

فلسفوں اور مذاہب مثلاً بدھ مت میں، سچائی کی کلید اپنی ذات کی شناخت ہے۔ یہ جاننے کے لیے کہ آپ کون ہیں، کیا ہیں، زیادہ تر افراد اپنی شناخت اپنے احساسات، فکر، پسند و ناپسند سے قائم کرتے ہیں۔ جب وہ غصہ محسوس کرتے ہیں تو سوچتے ہیں کہ میں غصے میں ہوں، یہ میرا غصہ ہے۔ لہٰذا وہ اپنی ساری زندگی کچھ احساسات کے تعاقب اور اور باقی سے گریز میں گزار دیتے ہیں۔ وہ یہ نہیں سمجھتے کہ یہ ان کے حقیقی محسوسات نہیں ہیں، اور چند مخصوص احساسات کا تعاقب انہیں افسردگی میں قید رکھتا ہے۔

اگر یہ درست ہے تو ہماری مسرت کی تاریخ کے بارے میں تمام فکر شاید غلط ہے۔ شاید یہ اتنا ضروری نہیں ہے کہ کیا لوگوں کی امیدیں پوری ہو رہی ہیں، اور کیا وہ مسرت کے انداز سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ مرکزی سوال یہ ہے کہ کیا لوگ اپنے بارے میں سچ جانتے ہیں۔ ہمارے پاس کیا ثبوت ہے کہ آج افراد اس حقیقت کو قدیم متلاشیوں اور قدیم کسانوں سے بہتر سمجھتے ہیں؟

اسکالروں نے مسرت کی تاریخ پر تحقیق ابھی چند سال پہلے ہی شروع کی ہے، اور ابھی ہم ابتدائی نظریات قائم کر کے ان پر مناسب تحقیقاتی طریقے تلاش کر رہے ہیں۔ ابھی یہ بہت ابتدائی ہوگا کہ ہم اس بارے میں کوئی مستحکم رائے قائم کر کے اس بحث کو ختم کر دیں جو ابھی صحیح طور سے شروع بھی نہیں ہوئی۔ اہم یہ ہے کہ جتنے زیادہ ممکنہ طریقے ہوں ان سے انہیں جانا جائے اور صحیح سوالات اٹھائے جائیں۔

تاریخ کی بیشتر کتب عظیم مفکروں کے خیالات، جنگجوؤں کی بہادری، صوفیوں کی دریا دلی اور آرٹسٹوں کی تخلیق کاری پر زور دیتی ہیں۔ ان سے سماجی نظام کے قیام اور انتشار، سلطنتوں کا بننا اور بکھرنا اور ٹیکنالوجی کی دریافت اور اس کے پھیلنے کے بارے میں معلوم ہوتا ہے۔ لیکن ان سے اس بارے میں کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ ان سے فرد کی خوشی اور تکلیف کیسے متاثر ہوتی ہے۔ تاریخ پر ہمارے علم میں یہ ایک بڑا خلا ہے۔ ہمیں چاہیے کہ اسے پر کرنا شروع کر دیں۔

○

ہوموسیپین کا اختتام

اس کتاب کی ابتدا میں تاریخ کو طبیعات، کیمیا اور حیاتیات کے سلسلے کی اگلی کڑی کے طور پر پیش کیا گیا تھا۔ سیپین بھی ان ہی طبیعاتی قوتوں، کیمیائی تبدیلیوں اور فطری چناؤ کے عمل کے تابع ہیں جو تمام حیات پر حاکم ہیں۔ فطری چناؤ نے ممکن ہے ہوموسیپین کو دوسری حیات کے مقابلے میں زیادہ بڑا کھیل کا میدان دے دیا ہو، لیکن اس میدان کی بہر حال حدود ہیں۔ اس سے یہ تاثر ابھرتا ہے کہ چاہے کچھ بھی ہو جائے، سیپین ان حیاتیاتی مقررہ حدود کو عبور کرنے کے اہل نہیں۔

لیکن اکیسویں صدی کے آغاز میں یہ درست معلوم نہیں ہوتا۔ ہوموسیپین اب ان حدود کو عبور کر رہے ہیں۔ اب یہ فطری چناؤ کے قوانین کو توڑ کر ان کی جگہ ذہین تخلیق (Intelligent Design) کے قوانین لاگو کر رہے ہیں۔

تقریباً چار ارب سالوں تک اس سیارے پر حیات کا ارتقا فطری چناؤ کے ذریعے ہوا۔ کوئی حیات بھی کسی ذہین خلاق کی تراشی ہوئی نہیں تھی۔ مثلاً زراف نے اپنی لمبی گردن قدیم زرافوں سے مقابلے میں اختیار کی، کسی مافوق الذہن وجود کے اشارے پر نہیں۔ ابتدا میں لمبی گردن والے زراف کو زیادہ غذا میسر تھی، انہوں نے زیادہ بچے پیدا کیے اور اس سے چھوٹی گردن والے زراف ختم ہوئے۔ کسی نے، بالخصوص کسی زراف نے تو یہ نہیں کہا کہ لمبی گردن سے زراف کو بلندی کے زیادہ پتے میسر ہوں گے، لہذا اگر دن لمبی کر لیتے ہیں۔ ڈارون کے نظریے کی خوبصورتی یہ ہے کہ زراف کی لمبی گردن سمجھانے کے لیے اس میں کسی ذہین خلاق کی ضرورت نہیں پڑتی۔

اربوں سالوں تک ذہین تخلیق ممکن ہی نہیں تھی، کیوں کہ کوئی ایسی ذہانت موجود ہی نہیں تھی جو چیزوں کو تراش سکے۔ ابھی کل ہی کی بات ہے کہ حیات صرف دوربینی شکل میں ہی موجود تھی، جو بہت سے اہم کام انجام دینے کی اہل تھی۔ کسی ایک اسپیسی کی دوربینی حیات کسی دوسری بالکل مختلف اسپیسی کا جینیاتی کوڈ اپنے نقشے میں شامل کر کے بالکل نئی اہلیت حاصل کر لیتی، جیسے اینٹی بایوٹک سے مزاحمت کی صلاحیت پیدا کر لینا۔ لیکن پھر بھی جہاں تک ہم جانتے ہیں ان جرثوموں میں کوئی شعور نہیں تھا، نہ کوئی زندگی کا مقصد اور نہ ہی مستقبل کی منصوبہ بندی۔

کسی مرحلے پر حیات مثلاً زراف، ڈولفن، چمپینزی اور نینڈرتھال میں شعور پیدا ہوا اور مستقبل کی منصوبہ بندی کی اہلیت بھی۔ لیکن اگر کوئی نینڈرتھال یہ خواب دیکھتا کہ مرغابی اتنی موٹی اور سست رفتار ہو جائے کہ وہ جب بھی بھوکا ہو اسے پکڑ سکے، تب بھی اس کے پاس اس خواب کو حقیقت میں تبدیل کرنے کی اہلیت نہیں تھی۔

اسے وہ پرندے شکار کرنے پڑتے جو فطری طور پر منتخب کیے گئے تھے۔

اس پرانی حاکمیت میں پہلی دراڑ کوئی دس ہزار سال قبل زرعی انقلاب کے دوران پڑی۔ سیپین جو موٹی سست مرغابیوں کا خواب دیکھتے تھے، انہوں نے دریافت کیا کہ اگر وہ موٹی مرغی کی سست رفتار مرغے سے جفتی کرائیں تو ان کے کچھ بچے سست اور موٹے ہوں گے۔ اگر آپ ان بچوں کی آپس میں افزائش کریں تو آپ کو فربہ سست مرغیوں کی ایک نسل مل جائے گی۔ یہ مرغیوں کی ایک نسل تھی جس سے فطرت ناواقف تھی، اسے ذہانت سے ڈیزائن کیا گیا تھا، لیکن کسی خدا نے نہیں بلکہ انسان نے۔

پھر بھی کسی قادر المطلق کے مقابلے میں ہوموسیپین کی ڈیزائن کرنے کی اہلیت محدود تھی۔ سیپین منتخب افزائش کے ذریعے مرغیوں پر اثر انداز ہونے والے فطری چناؤ کے عمل کو استعمال اور تیز رفتار کر سکتے تھے۔ وہ مرغیوں میں بالکل نئی خصوصیات تو پیدا نہیں کر سکتے تھے جو جنگلی مرغیوں کے جینیاتی ذخیروں میں موجود ہی نہ رہی ہوں۔ ایک طرح سے ہوموسیپین اور مرغیوں کے درمیان تعلق دوسرے نئے امداد باہمی کے رشتوں کی مانند ہے۔ سیپین نے مرغیوں پر مخصوص منتخب دباؤ ڈالا جس سے موٹی، سست رفتار مرغیاں پیدا ہوئیں۔ بالکل جیسے بیج پھیلاتی مکھیاں پھولوں کا انتخاب کرتی ہیں، اور شوخ رنگ کے پھول بڑھ جاتے ہیں۔

آج فطری چناؤ کی چار ارب سالہ پرانی حاکمیت ایک مکمل نئے مرحلے سے گزر رہی ہے۔ دنیا بھر کی لیبارٹریوں میں سائنس دان حیات میں دخل اندازی کر رہے ہیں۔ کسی حیات کی اصل خصوصیات سے بے پرواہ، وہ فطری چناؤ کے قوانین آزادی سے پامال کر رہے ہیں۔ برازیل کے ایک حیاتیاتی آرٹسٹ ایڈوارڈو کاک نے ۲۰۰۰ میں آرٹ کے ایک نئے کام کا ارادہ کیا: ایک چمکدار ہرے خرگوش کی پیدائش۔ کاک نے ایک فرانسیسی لیبارٹری سے رابطہ کر کے انہیں ایک مقررہ فیس کے عوض ایک روشن خرگوش پیدا کرنے پر راضی کر لیا۔ فرانسیسی سائنس دانوں نے ایک عام خرگوش لے کر اس میں ہری چمک دار جیلی فش کا ڈی این اے منتقل کر دیا، اور واہ، عالی جناب کاک کے لیے ایک ہرا چمک دار خرگوش تیار تھا۔ کاک نے خرگوش کا نام البا رکھا۔

فطری چناؤ کے قانون کے تحت البا کی موجودگی سمجھانا ناممکن ہے۔ یہ ذہین ڈیزائن کی پیداوار ہے اور آنے والے دنوں کی ایک علامت بھی۔ اگر انسان نے اپنے آپ کو اس وقت تک تباہ نہیں کر لیا، تو البا میں جو امکانات موجود ہیں اس اعتبار سے سائنسی انقلاب محض ایک تاریخی انقلاب سے کہیں زیادہ ثابت ہوگا۔ زمین پر حیات کے نمودار ہونے کے بعد سے یہ اہم ترین حیاتیاتی انقلاب ہوگا۔ فطری چناؤ کے چار ارب سال بعد البا ایک نئے کائناتی دور کا آغاز ہے، جس میں حیات پر ذہین ڈیزائن کی حاکمیت ہے۔ اگر ایسا ہوا تو اس مقام تک ہونے والی تمام انسانی تاریخ پیچھے نظر دوڑانے پر محض تجربات اور نو آموزی کا دور ثابت ہوگا جس نے زندگی کے روپ میں انقلاب پیدا کر دیا۔ ایسے عمل کو اربوں سالوں کے کائناتی عمل میں دیکھنا چاہیے، انسانی سوچ کے ہزاروں سالوں میں نہیں۔

دنیا بھر کے سائنس دان ذہین ڈیزائن کی تحریک سے نبرد آزما ہیں، جو اسکولوں میں ڈارون کے ارتقا کی تعلیم کی مخالفت کرتے ہیں ان کا کہنا ہے کہ حیاتیاتی پیچیدگی یہ ثابت کرتی ہے کہ کوئی خالق موجود ہے جس نے یہ تمام حیاتیاتی تفاصیل پہلے ہی سوچ رکھی تھیں۔ حیاتیات دان ماضی کے بیان میں درست ہیں، لیکن المیہ یہ ہے کہ ذہین

تخلیق کے خالق شاید مستقبل کے بارے میں درست ثابت ہوں۔

اس وقت تک ذہین تخلیق تین طریقوں سے فطری چناؤ کی جگہ لے سکتی ہے: حیاتیاتی انجینئرنگ سے، سائی بورگ انجیرنگ (سائی بورگ نامیاتی اور غیر نامیاتی کے ملاپ سے جنم لیتے ہیں) یا کسی غیر نامیاتی حیات کی انجینئرنگ سے۔

چوہا اور آدمی

حیاتیاتی انجیرنگ حیاتیات کی سطح پر ارادی انسانی دخل اندازی ہے (مثلا ایک جین کا اضافہ کردینا)۔ تاکہ کسی حیات کی شکل، اہلیت، ضروریات خواہشات کو تبدیل کیا جاسکے۔ اس سے کچھ پہلے سے قائم شدہ ثقافتی نظریات کو حاصل کیا جاسکتا ہے، مثلا ایڈوارڈو کاک کے جمالیاتی رجحانات۔۔ حیاتیاتی انجینیرنگ از خود کوئی نئی بات نہیں ہے۔ لوگ اسے ہزاروں سالوں سے اپنا اور دوسری حیات کا روپ بدلنے کے لیے استعمال کررہے ہیں۔ اس کی ایک سادہ مثال خصی کرنا ہے۔ انسان سانڈوں کو دس ہزار سالوں سے خصی کررہے ہیں تاکہ بیل پیدا کیے جاسکیں۔ بیل اتنے جارح نہیں ہوتے اور انہیں ہل چلانے کے لیے بآسانی مطیع کیا جاسکتا ہے۔ انسان اپنے نوجوان مردوں کو بھی خصی کرتے رہے ہیں، تاکہ بلند آواز سے گانے والی، دل موہ لینے والی آواز پیدا ہوسکے، اور خواجہ سراجن پر سلطان کے حرم کی نگہبانی کی ذمہ داری پر بھروسہ کیا جاسکے۔ لیکن حیات کی کارکردگی کے بارے میں ہماری خلیاتی اور نیوکلیائی سطح تک نئی معلومات ، اس سے پہلے ناممکن امکانات کا دروازہ کھولتی ہے۔ مثلاً آج ہم نہ صرف کسی مرد کو خصی کرسکتے ہیں بلکہ جراحی اور ہارمون علاج سے اس کی جنس بھی تبدیل کرسکتے ہیں۔ لیکن صرف یہی نہیں ہے۔ اس حیرت، ملامت اور فکرمندی کا جائزہ لیجیے جو ۱۹۹۶ میں اخبارات اور ٹی وی پر اس تصویر کی نمائش سے پیدا ہوئی۔
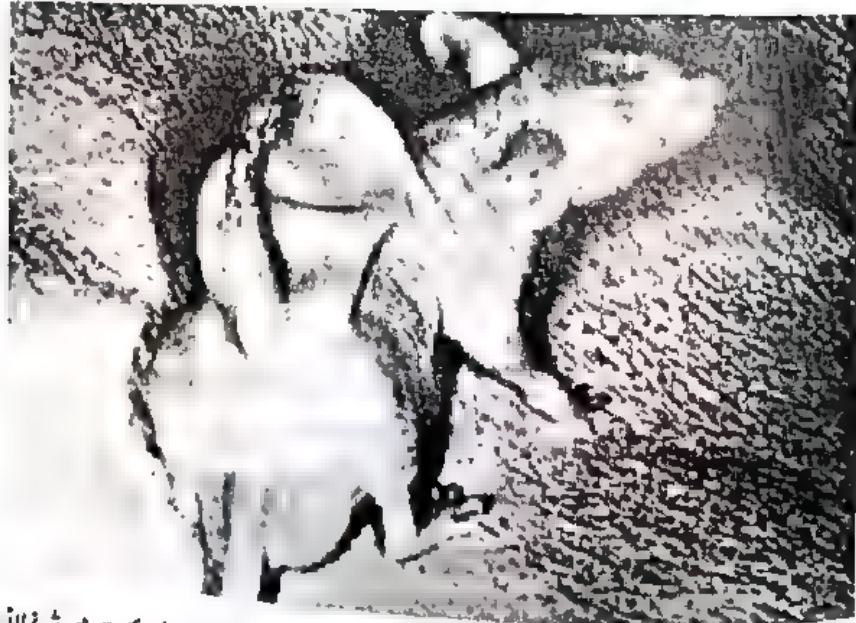
ایک چوہا جس کی پشت پر سائنس دانوں نے مویشی کے کارٹیج خلیات سے ایک کان اگا دیا۔ یہ اسٹاڈیل کے غار میں شیر نما انسان کے بت کی بازگشت کراتی ہے۔ تیس ہزار سال قبل انسان پہلے ہی مختلف اسپیشیز کے ملاپ کے خواب دیکھ رہا تھا۔ آج وہ ایسے کلومد (چائمرہ) پیدا کرسکتا ہے۔

نہیں، یہ فوٹوشاپ کا کمال نہیں تھا۔ یہ ایک زندہ چوہے کی ان چھوئی تصویر ہے جس کی پشت پر سائنس دانوں نے مویشیوں کے کارٹلیج خلیے قلم کیے تھے۔ سائنس دان نئے ٹشو کی نشو و نما کی نگرانی پر قادر تھے۔ اس موقع پر انہوں نے اسے ایک انسانی کان کی شکل میں تراشا تھا۔ اس عمل سے سائنس دان عنقریب انسانی کان تیار کر سکتے ہیں، جنہیں پھر انسانوں میں لگایا جا سکتا ہے۔

اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز کمالات جینیاتی انجینیر نگ میں دکھائے جا سکتے ہیں، جس سے بہت سے اخلاقی، سیاسی اور نظریاتی سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ اور یہ محض ایک خدا کو ماننے والے عابد ہی نہیں ہیں جو انسان کا خدائی کردار اپنانے پر معترض ہیں۔ بہت سے لامذہب بھی اس خیال سے کچھ کم صدمے کا شکار نہیں کہ سائنس دان فطرت کے جوتوں میں پاؤں ڈال رہے ہیں۔ جانوروں کے حقوق کے علم بردار لیبارٹری میں جینیاتی انجینیر نگ کے تجربات سے گزرنے والے جانوروں کی تکلیف کی مذمت کرتے ہیں، جو ان خواہشات و ضروریات کو مکمل نظر انداز کر کے مویشیوں پر تجربے کرتے ہیں۔ انسانی حقوق کے علم برداروں کو خوف ہے کہ جینیاتی انجینیر نگ کے استعمال سے ایسے مافوق البشر انسان پیدا کیے جا سکتے ہیں جو باقی ہم سب کو غلام بنا سکتے ہیں۔ غیب دان بیوڈکٹیٹر شپ کے ایسے قیامت خیز مناظر دکھاتے ہیں جس میں بے خوف سپاہیوں اور غلاموں کی نقلیں (کلون) تیار کیے جا سکتے ہیں۔ موجودہ فکر یہ ہے کہ بہت زیادہ، مکانات بہت تیزی سے پیدا ہو رہے ہیں۔ جینیاتی تبدیلی کی انسانی اہلیت ہمارے سوچے سمجھے فیصلوں اور اس اہلیت کے دوررس استعمال سے زیادہ تیزی سے بڑھ رہی ہے۔

اس کا نتیجہ یہ ہے کہ فی الوقت ہم جینیاتی انجینیر نگ کے امکان کی صرف ایک کسر استعمال کر رہے ہیں۔ اس وقت صرف ان جانداروں پر جینیاتی انجینیر نگ ہو رہی ہے جنہیں کوئی سیاسی پشت پناہی حاصل نہیں۔۔ پودے، پھپھوند، جرثومے اور حشرات الارض۔ مثلاً ای کولائی (E. Coli) کی ایک نسل، ایک جرثومہ جو انسانی آنت میں امداد باہمی کے طور پر رہتا ہے (اور جب کبھی وہاں سے نکل کر مہلک بیماری پھیلائے تو شہ سرخی بنتا ہے) اس کی جینیاتی انجینیر نگ کر کے حیاتیاتی ایندھن پیدا کیا جا رہا ہے۔ ای کولائی اور پھپھوند کی کئی اقسام کی انجینیر نگ سے انسولین پیدا کی جا رہی ہے، جس سے ذیابطیس کے علاج کی قیمت کم ہو رہی ہے۔ ایک آرکٹک مچھلی سے جین حاصل کر کے آلو میں داخل کی گئی جس سے یہ سبزی انجمادی درجہ حرارت برداشت کرنے کے قابل ہو گئی۔

کچھ پستیانے جانوروں پر بھی جینیاتی انجینیر نگ کی گئی ہے۔ ہر سال مویشیوں کی صنعت میں پستان کی بیماری سے اربوں ڈالر کا نقصان ہوتا ہے، ایک بیماری جو دودھ دینے والی گائے کے تھن کو متاثر کرتی ہے۔ اس وقت سائنس دان گائے پر ایسی جینیاتی انجینیر نگ کے تجربات کر رہے ہیں جس سے ان کے دودھ میں ایک بایو کیمیکل لائسو ٹامن پیدا ہوگا جو بیماری پیدا کرنے والے جرثومے کا خاتمہ کر دے گا۔ سور کی صنعت جس کی خریداری اس کے گوشت میں چربی کی مقدار سے متاثر ہو رہی تھی، اب سور کی ایسی نسل پیدا کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے جس میں کیچوے سے جینیاتی مادہ شامل کیا جائے گا۔ نئی جین سے سور میں اومیگا چھ نامی خراب چربی اپنی صحت مند خالہ زاد اومیگا تین میں بدل جائے گی۔

جینیاتی انجینیر نگ کے دوسرے باب میں سور میں اچھی چربی کی تبدیلی بچوں کا کھیل معلوم ہوگا۔ جینیات دان کیچوے کی زندگی میں نہ صرف چھ گنا اضافہ کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں، بلکہ ایسے ذہین چوہے پیدا کرنے

میں جن کی یادداشت اور سیکھنے کی اہلیت بہت عمدہ ہے۔ چھوٹے چوہوں (Vole) کی بیشتر اقسام بہت زیادہ جنسی آزادی کی قائل ہوتی ہیں، لیکن ان کی ایک نسل ایسی ہے جس میں نر اور مادہ چوہے ایک ہی ساتھی سے دیرپا تعلق قائم کرتے ہیں۔ اگر کسی جین کے اضافے سے ایک آوارہ منش چوہا ایک وفادار، محبت کرنے والے چوہے میں بدل سکتا ہے، تو کیا ہم چوہوں (اور انسانوں) کی انفرادی اہلیت، ان کے سماجی نظام کو جینیاتی انجینیرنگ سے تبدیل کرنے سے بہت زیادہ دور ہیں؟

نینڈرتھال کی واپسی

لیکن سائنس دان صرف زندہ نسلوں کو ہی نہیں بدلنا چاہتے، وہ مٹ جانے والی مخلوق کو بھی واپس لانا چاہتے ہیں۔ صرف ہالی وڈ کی مقبول فلم جیوراسک پارک کی مانند ڈائنوسار ہی کو نہیں۔ روس، جاپان اور کوریا کی ایک ٹیم نے حال ہی میں سائبیریا کی برف میں دفن قدیم میمتھ کا جینیاتی نقشہ تیار کیا ہے۔ اب وہ کسی موجودہ دور کے ہاتھی کے افزائش کے لیے تیار انڈے کو لے کر، اس ہاتھی کے ڈی این اے کی جگہ، میمتھ کے ڈی این اے کو داخل کر کے اس انڈے کو دوبارہ ہتھنی کے رحم میں داخل کرنا چاہتے ہیں، تقریباً بائیس ماہ بعد وہ پانچ ہزار سالوں میں پہلا میمتھ دوبارہ پیدا کرنا چاہتے ہیں۔

لیکن میمتھ پر ہی اکتفا کیوں کریں؟ جامعہ ہارورڈ کے پروفیسر جارج چرچ نے حال ہی میں تجویز کیا ہے کہ نینڈرتھال جینوم پراجیکٹ مکمل ہونے کے بعد اب ہم نینڈرتھال کے مرتب کیے ڈی این اے کو کسی سیپین کے انڈے میں داخل کر کے تین ہزار سالوں میں پہلا نینڈرتھال بچہ پیدا کر سکتے ہیں۔ چرچ کا کہنا ہے کہ محض تیس ملین ڈالر میں وہ یہ کام کر سکتا ہے۔ بہت سی خواتین پہلے ہی متبادل (surrogate) ماں کے لیے اپنی تجاویز پیش کر چکی ہیں۔ ہمیں نینڈرتھال کی کیوں ضرورت ہے؟ کچھ کہتے ہیں کہ زندہ نینڈرتھال کے مطالعے سے ہمیں ہوموسیپین کی ابتدا اور انوکھے پن کے بارے میں سب سے زیادہ ستانے والے سوالات کے جوابات مل جائیں گے۔ نینڈرتھال کے دماغ کا سیپین کے دماغ سے موازنہ کر کے، اور ان کی ساخت میں فرق دیکھ کر شاید ہم جان سکیں کہ ہم جس شعور کا تجربہ کرتے ہیں وہ کیسے پیدا ہوا تھا۔ پھر اس کی ایک اخلاقی وجہ بھی ہے۔ کچھ کہتے ہیں کہ نینڈرتھال کے خاتمے کی ذمہ داری ہوموسیپین پر عائد ہوتی ہے، تو ان ہی کا اخلاقی فرض ہے کہ انہیں دوبارہ پیدا کریں۔ پھر یہ کہ چند نینڈرتھال اگر آس پاس موجود ہوں تو بہت کام آسکتے ہیں۔ بہت سے صنعت کار ایک نینڈرتھال کو ملازم رکھ کر خوش ہوں گے جو دو سیپین کا جسمانی کام کر سکتا ہے۔

لیکن پھر نینڈرتھال پر ہی کیوں رکا جائے؟ خدا کے ڈرائنگ بورڈ پر واپس جا کر ایک بہتر ہوموسیپین ہی کیوں نہ تخلیق کیا جائے۔ ہوموسیپین کی اہلیت، ضرورت اور خواہش کی بنیاد جینیاتی ہے، اور سیپین کا جینیاتی نقشہ کسی چھوٹے چوہے یا جنگلی چوہے سے زیادہ پیچیدہ نہیں (چوہے کے جینیاتی نقشے میں ۲.۵ ارب نیوکلائی بیس ہوتے ہیں، سیپین کے جینوم میں ۲.۹ ارب، یعنی بعد الذکر صرف چودہ فیصد ہی زیادہ بڑا ہے۔ کچھ درمیانی مدت میں، شاید چند دہائیوں میں ہی جینیاتی اور دوسری اقسام کی حیاتیاتی انجینیرنگ ہمیں اس قابل بنا دے کہ ہم نہ صرف اپنی عملیات، مدافعانہ نظام اور مدت حیات میں دور رس تبدیلیاں پیدا کر سکیں، بلکہ اپنی ذہنی اور جذباتی اہلیت میں

بھی۔ اگر جینیاتی انجینیر نگ سے ذہین چوہے پیدا ہو سکتے ہیں تو ذہین انسان کیوں نہیں۔ اگر اس سے باوفا چھوٹے چوہے پیدا ہو سکتے ہیں تو انسانوں کو اپنے شریک حیات سے وفادار کیوں نہیں کیا جا سکتا۔

اہلیت کا انقلاب جس نے ہوموسیپین کو ایک غیر اہم بن مانس سے دنیا کا حاکم بنا دیا تھا، اس کے لیے دماغ کے حجم، بیرونی شکل یا عملیات میں کسی تبدیلی کی ضرورت نہیں تھی۔ اس کے لیے تو محض چند چھوٹی اندرونی دماغی تبدیلیاں درکار تھیں۔ شاید کوئی اور چھوٹی تبدیلی ایک دوسرے اہلیاتی انقلاب کے لیے کافی ہو۔ ایک بالکل نئے قسم کے شعور کی ابتدا، جو ہوموسیپین کو بدل کر کوئی بالکل نئی شے بنا دے۔

یہ درست ہے کہ فی الوقت ہمارے پاس ایسا کرنے کا علم نہیں، لیکن ایک مافوق البشر انسان بنانے سے ہمیں روکنے کی کوئی تکنیکی رکاوٹ نظر نہیں آتی۔ انسانوں پر تحقیق سست ہو جانے کی بنیادی وجوہات اخلاقی اور سیاسی اعتراضات ہیں۔ اخلاقی دلائل چاہے جتنے بھی مضبوط کیوں نہ ہوں، یہ تصور دشوار ہے کہ اگر حیات لامحدود مدت تک بڑھنے کا امکان ہو، ناقابل علاج امراض کو فتح کرنے کا یا ہماری شعوری اور جذباتی اہلیت میں اضافے کا، تو یہ کیسے رک سکے گی۔

مثلاً اگر ہم الزھائمر کا علاج دریافت کر لیں، جس کا ایک اضافی فائدہ یہ ہو کہ انسانوں کی یادداشت بھی ڈرامائی طور پر بہتر ہو جائے؟ کیا کوئی متعلقہ تحقیق کو روک سکے گا؟ اور اگر یہ علاج دریافت ہو جائے تو کیا کوئی قانون نافذ کرنے والا ادارہ اسے محض الزھائمر کے مرض تک محدود رکھ سکے گا، اور صحت مند افراد کو بہترین یادداشت کے حصول سے باز رکھ سکے گا؟

یہ بات واضح نہیں کہ حیاتیاتی انجینیر نگ واقعی دوبارہ نینڈرتھال پیدا کر سکے گی، لیکن اس سے ممکنہ طور پر ہوموسیپین پر پردہ گر جائے گا۔ اپنی جین میں دخل اندازی ہمیں ختم نہیں کر دے گی، لیکن یہ ممکن ہے کہ ہم ہوموسیپین کو اس قدر بدل دیں کہ وہ ہوموسیپین ہی نہ رہے۔

بایونک حیات

قوانین زندگی بدل سکنے والی ایک اور ٹیکنالوجی بھی موجود ہے، سائی بورگ انجینیر نگ۔ سائی بورگ وہ افراد ہیں جن میں نامیاتی اور غیر نامیاتی دونوں اعضا ہوتے ہیں، مثلاً بایونک ہاتھوں والے انسان۔ ایک لحاظ سے تو آج کل ہم سب ہی بایونک ہیں۔ کیوں کہ ہمارے قدرتی احساسات اور عملیات کو ایسے آلات سے مدد ملتی ہے مثلاً عینک، پیس میکر، آرتھوٹک (نقل و حرکت کے اعضا میں مدد)، کمپیوٹر اور موبائل فون (جس سے ہمارے ذہن کو کچھ اعداد و شمار جمع کرنے اور ان پر عملیات کے بوجھ سے نجات ملتی ہے)۔ ہم حقیقی سائی بورگ بننے کے بہت قریب ہیں۔ ایسے غیر نامیاتی حصے جو ہمارے جسم سے علیحدہ نہ کیے جا سکیں، ایسی مخصوصیات جن سے ہماری اہلیت، خواہش، شخصیت اور شناخت بدل جاتی ہے۔

جدید دفاعی تحقیقی پراجیکٹ ایجنسی، ایک امریکی تحقیقی عسکری ادارہ کیڑوں کا ایک سائی بورگ تیار کر رہا ہے۔ وہ کسی مکھی یا کاک روچ میں برقی چپس میں حساس آلے اور کمپیوٹر لگانا چاہتے ہیں، جو کسی انسانی یا خودکار آپریٹر کو اس کیڑے کی حرکات کو ایک فاصلے سے کنٹرول کر کے معلومات حاصل اور ترسیل کر سکے۔ ایسی مکھی دشمن

کے ہیڈکوارٹر میں کسی دیوار پر بیٹھی خفیہ ترین گفتگو سن رہی ہو، اور اگر اسے کوئی مکڑی نہ نگل لے تو یہ ہمیں بالکل درست طور پر دشمن کا پلان بتا سکتی ہے۔ ۲۰۰۶ء میں امریکی بحریہ کی زیر سمندر جنگی مرکز نے سائی بورگ شارک بنانے کا عندیہ دیا۔ ایک ایسے کارکی ایجاد جس کا کام حیاتی پیوندکاری کے ذریعے اپنے میزبان کے رویے کو قابو کرنا ہے۔ اس کے محقق امید کرتے ہیں کہ وہ آبدوزوں اور بارودی سرنگوں سے پیدا ہونے والی مقناطیسی لہروں کو شارک کی حسیات کے ذریعے پہچان سکتے ہیں، جو کسی انسان کے بنائے کھوجی آلات سے زیادہ حساس ہیں۔

سیپین بھی سائی بورگ میں تبدیل ہو رہے ہیں۔ آلہ سماعت کی نئی اقسام کو اکثر برقی حیاتی کان کہتے ہیں۔ اس آلے میں کان کے بیرونی حصے میں ایک آواز جذب کرنے والا آلہ لگا ہوتا ہے۔ یہ آلہ آوازوں کو چھانتا ہے پھر انسانی آواز شناخت کر کے انہیں برقی سگنل میں تبدیل کرتا ہے جو براہ راست مرکزی رگ سماعت تک پہنچاتا ہے، اور پھر وہاں سے دماغ تک۔

آنکھ کی پشت کا پردہ (رے ٹائنا) بدلنے والی کمپنی جسے جرمن حکومت کی سرپرستی میسر ہے، ایک مصنوعی رے ٹائنا بنا رہی ہے، جس سے نابینا افراد کو شاید نصف بینائی واپس مل جائے۔ اس میں مریض کی آنکھ کے اندر مائکرو چپ لگایا جائے گا۔ روشنی کا احساس کرنے والے خلیات آنکھ پر پڑنے والی روشنی جذب کر کے اسے برقی لہروں میں بدلے گی جو رے ٹائنا میں موجود حسی خلیات کو کھٹکھٹائے گی۔ ان خلیات سے حسی رو دماغ تک جاتی ہے، جہاں وہ واپس عکس میں تبدیل ہوتی ہے۔ اس وقت موجود ٹیکنالوجی سے مریض کو اپنے اطراف، حروف اور چہروں کی شناخت ہو جاتی ہے۔

۲۰۰۱ء میں ایک حادثے کے نتیجے میں جیسی سولی ون، ایک امریکی برقی کارکن دونوں ہاتھوں سے شانوں تک محروم ہو گیا۔ آج وہ شکاگو کے بحالیاتی انسٹی ٹیوٹ کی مدد سے دو بایونک ہاتھ استعمال کرتا ہے۔ جیسی کے مصنوعی ہاتھوں کی خاص بات یہ ہے کہ وہ محض سوچ کے تابع ہی محرک ہو جاتے ہیں۔ جیسی کے دماغ سے شروع ہونے والے حسی سگنل مائکرو کمپیوٹر کے ذریعے برقی احکامات میں بدل جاتے ہیں، جن سے ہاتھ محرک ہوتے ہیں۔ جب جیسی اپنا ہاتھ اٹھانا چاہتا ہے تو وہ کسی عام فرد کی مانند غیر شعوری طور پر ہاتھ اٹھا لیتا ہے۔ نامیاتی ہاتھوں کے مقابلے میں ان ہاتھوں کی حرکات محدود ہیں، لیکن ان کی مدد سے جیسی روزمرہ کے عام کام انجام دے لیتا ہے۔ ایک ایسا ہی بایونک ہاتھ حال ہی میں امریکی سپاہی کلاڈیا مچل کو لگایا گیا جو ایک موٹر سائکل کے حادثے میں اپنے ہاتھ سے محروم ہو گئی۔ سائنس دانوں کا خیال ہے کہ جلد ہی ہم ایسے بایونک ہاتھ بنا میں گے جو نہ صرف اس وقت حرکت کریں جب ہم سوچیں کہ انہیں حرکت کرنا چاہیے، بلکہ شاید حسیات کو واپس دماغ تک بھی پہنچا سکیں گے، یوں ان محروم افراد کو چھونے کی حس بھی واپس مل جائے گی۔

فی الوقت یہ برقی حیاتی بازو ہمارے نامیاتی بازوؤں کا کمزور نعم البدل ہیں، لیکن ان میں بہتری کے غیر معمولی امکانات ہیں۔ مثلاً بایونک ہاتھوں کو اپنے نامیاتی ساتھیوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ طاقت ور بنایا جا سکتا ہے، کوئی باکسنگ چیمپین ان کے مقابلے میں بہت کمزور نظر آئے گا۔ بایونک ہاتھوں کا یہ فائدہ بھی ہے کہ ہر چند سالوں میں انہیں بدلا بھی جا سکتا ہے، یا جسم سے علیحدہ کر کے ایک فاصلے سے محرک کیا جا سکتا ہے۔

جیسی سولی ون اور کلاڈیا مچل ہاتھ ملاتے ہوئے۔ ان کے ہاتھوں کی حیرت انگیز بات یہ ہے کہ وہ سوچ کی اطاعت میں محرک ہوتے ہیں۔

شمالی کیرولائنا کی جامعہ ڈیوک میں حال ہی میں اس کا مظاہرہ سائنس دانوں نے بندروں پر کیا ہے جن میں الیکٹروڈ لگائے گئے تھے۔ یہ الیکٹروڈ دماغ سے سگنل وصول کر کے انہیں بیرونی آلات تک ترسیل کرتا ہے۔ بندروں کو سدھایا جاتا ہے کہ وہ ان بایونک ہاتھوں اور پاؤں کو محض سوچ سے محرک کر سکیں۔ ارورا نامی ایک بندر نے ایک جدا ہوئے بایونک ہاتھ کو اپنی سوچ سے محرک کرنا سیکھ لیا تھا اور ساتھ ہی اپنے دونوں قدرتی ہاتھوں کو بھی۔ کسی ہندو دیوی کی مانند اب ارورا کے تین ہاتھ تھے اور یہ ہاتھ مختلف کمروں یا شہروں میں بھی ہو سکتے تھے۔ کیرولائنا کی لیبارٹری میں اپنے کمرے میں بیٹھا وہ ایک ہاتھ سے اپنی کمر کھجاتا، دوسرے ہاتھ سے سر اور اسی وقت نیویارک میں کوئی کیلا چرا لیتا (لیکن کسی مسروقہ پھل کو فاصلے سے ہی کھا لینا بہر حال ایک خواب ہی ہے)۔ ایک اور بندریا اڈویا ہے جس نے شمالی کیرولائنا میں اپنی کرسی سے ہی کیوٹو جاپان میں سوچ کے تابع بایونک پیروں کے ایک جوڑے کو محرک کر کے عالمی شہرت حاصل کر لی تھی۔ یہ پاؤں اڈویا کے اپنے وزن سے بیس گنا زیادہ وزنی تھے۔

لاک ان سنڈروم (Locked in Syndrome) ایک ایسی بیماری ہے جس میں مریض جسم کے کسی بھی حصے کو حرکت دینے کی اہلیت سے محروم ہو جاتا ہے، جب کہ اس کی ادراک کی اہلیت برقرار رہتی ہے۔ اس بیماری میں مبتلا افراد اب تک بیرونی دنیا سے صرف آنکھوں کی معمولی حرکت سے ہی رابطہ کر سکتے تھے۔ لیکن اب چند مریضوں کے دماغ میں دماغی سگنل جمع کرنے والے الیکٹروڈ لگائے گئے ہیں۔ کوششیں جاری ہیں کہ ان سگنل کو نہ صرف حرکت بلکہ الفاظ میں بدلا جا سکے۔ اگر یہ تجربات کامیاب رہے تو لاک ان مریض بیرونی دنیا سے براہ راست گفتگو کر سکیں گے، اور ہم اس ٹیکنالوجی کے استعمال سے دوسرے افراد کی سوچ پڑھنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

پھر بھی جن پراجیکٹ پر اس وقت کام ہو رہا ہے ان میں سب سے انقلابی کوشش یہ ہے کہ براہ راست ایک دماغ اور کمپیوٹر کے درمیان دو طرفہ رابطہ قائم کیا جائے، جس سے کمپیوٹر انسانی دماغ کے سگنل پڑھ سکے، اور اسی وقت دماغ کو سگنل واپس بھیج سکے جو انہیں پڑھ سکے۔ دماغ اور انٹرنیٹ کے درمیان ایسا براہ راست رابطہ قائم

ہو جانے سے کیا امکانات بنیں گے، یا مختلف دماغوں کو ایک دوسرے سے ربط میں کرنے سے، گویا ایک قسم کا بین الدماغی نیٹ۔ انسانی یادداشت، انسانی شعور اور انسانی شناخت پر کیا اثرات مرتب ہوں گے اگر کسی دماغ کو ایک اجتماعی یادداشت کے بینک سے منسلک کر دیا جائے۔ تو ایسی صورت حال میں ایک دماغ دوسرے دماغوں کی یاد دشت حاصل کر سکتا ہے۔ انہیں کسی سوانح عمری میں سننے یا پڑھنے کے بجائے، انہیں تصور کرنے کے بجائے ایسے ہی یاد کر لے جیسے وہ خود اس ہی کی یادیں ہوں۔ جب دماغ اجتماعی ہو جائیں تو صنف اور ذات کی شناخت کا کیا ہوگا؟ آپ خود کو کیسے دریافت کریں گے، یا اپنی امنگوں کا کیسے تعاقب کریں گے، اگر یہ امنگیں آپ کے دماغ کے بجائے امنگوں کے کسی اجتماعی گودام میں ہوں؟

ایسا سائی بورگ نہ تو انسان ہوگا اور نہ ہی نامیاتی، یہ تو کوئی بالکل ہی مختلف شے ہوگی۔ یہ اس قدر بنیادی طور پر مختلف ہوگا کہ ہم اس کے فلسفیانہ، نفسیاتی اور سیاسی اثرات کو سمجھ ہی نہیں سکتے۔

حیات دیگر

قوانین حیات کو بدلنے کا ایک تیسرا طریقہ یہ ہے کہ مکمل غیر نامیاتی حیات کو تشکیل کیا جائے۔ اس کی سب سے واضح مثال کمپیوٹر پروگرام اور کمپیوٹر وائرس ہیں جو آزادانہ ارتقا رکھتے ہیں۔

آج کمپیوٹر سائنس کی دنیا میں جینیاتی پروگرام سب سے دلچسپ میدان ہے۔ یہ جینیاتی ارتقا کے طریقوں کی نقل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ زیادہ تر پروگرامر ایسا پروگرام بنانے کا خواب دیکھتے ہیں جو اپنے خالق سے آزاد از خود سیکھ کر آزادی سے ارتقائی مراحل طے کرے۔ ایسی صورت میں پروگرامر وہ اولین محرک ہوگا، لیکن اس کی تخلیق ایسی سمتوں میں بڑھنے کے لیے آزاد ہوگی جو نہ اس کے خالق اور نہ کسی اور شخص کے ذہن میں آئی ہو۔

اس قسم کے پروگرام کی ایک مثال تو موجود ہی ہے۔۔ کمپیوٹر وائرس۔ جب یہ انٹرنیٹ میں پھیلتا ہے تو یہ وائرس کروڑوں بار اپنی افزائش کر لیتا ہے۔ اس تمام وقت اس وائرس کے خلاف بنائے گئے تحفظات اس کے تعاقب میں رہتے ہیں، اور یہ کمپیوٹر کی دنیا میں مقام حاصل کرنے کے لیے دوسرے وائرسوں سے مقابلہ کرتا ہے۔ کسی دن اپنی نقل بناتے ہوئے اس پروگرام میں کوئی غلطی ہو جاتی ہے۔۔ کمپیوٹر میوٹیشن۔ ممکن ہے کہ یہ میوٹیشن اس لیے ہوئی ہو کہ جب کسی انسان نے یہ پروگرام بنایا تھا تو اس میں یہ تحریر تھا کہ وقتاً فوقتاً نقل بناتے ہوئے اس میں غلطی ہوتی رہے، یا شاید میوٹیشن ایک امکانی غلطی تھی۔ اگر اتفاق سے یہ بدلی ہوئی نقل وائرس کے خلاف تحفظات سے بچنے میں زیدہ کامیاب ہے، کمپیوٹر پر اپنے حملہ‌آور ہونے کی صلاحیت میں کمی کے بغیر، تو یہ کمپیوٹر کی دنیا میں پھیل جائے گا۔ یوں نئی نقول تیار ہو جائیں گی اور مزید افزائش کریں گی۔ وقت گزرنے کے ساتھ کمپیوٹر کی دنیا نئے وائرس سے بھر جائے گی جسے کسی نے انجینئر نہیں کیا ہوگا اور جو غیر نامیاتی ارتقا حاصل کرے گی۔

کیا یہ زندہ وجود ہیں؟ اس کا جواب اس میں پوشیدہ ہے کہ زندہ وجود سے آپ کا کیا مطلب ہے۔ یہ یقیناً ایک نئے ارتقائی عمل سے پیدا ہوئے ہیں۔ کسی نامیاتی ارتقائی قوانین اور حدود سے بالکل آزاد۔

اب ایک اور امکان فرض کیجیے۔ تصور کیجیے کہ آپ اپنے ذہن کی ایک نقل کسی کمپیوٹر پر اتار کر اسے کسی گودی کمپیوٹر میں چلاتے ہیں۔ کیا آپ کا گودی کمپیوٹر بالکل کسی سیپین کی مانند سوچنے اور محسوس کرنے لگے گا۔ اگر ایسا ہے تو

کیا وہ آپ ہیں، یا کوئی اور؟ اگر کمپیوٹر پروگرام لکھنے والے ایک بالکل نیا لیکن عددی دماغ بنالیں تو کیا ہو؟ جو کمپیوٹر کوڈ میں لکھا ہو، جس میں خودی کا شعور اور یادداشت کا احساس ہو۔ اگر آپ اس پروگرام کو اپنے کمپیوٹر پر چلائیں تو کیا یہ کوئی شخص ہوگا؟ اگر آپ اسے مٹا دیں تو کیا آپ قتل عمد کے مرتکب ہوں گے؟

ممکن ہے کہ ہم جلد ہی ان سوالات کے جوابات حاصل کرلیں۔ ۲۰۰۵ء میں شروع ہونے والا انسانی دماغی پراجیکٹ، امید رکھتا ہے کہ وہ جلد ہی انسانی ذہن کی نقل کمپیوٹر پر بنالے گا، جس میں کمپیوٹر کے برقی سرکٹ دماغ کے حیاتی سرکٹ کی نقل کریں گے۔ اس پراجیکٹ کے ڈائرکٹر کا دعویٰ ہے کہ اگر وسائل میہار ہے تو دس یا بیس سال کے اندر ہی ایک مصنوعی ذہن کمپیوٹر میں اتر آئے گا جو انسانوں کی مانند ہی گفتگو اور رویے اختیار کرسکے گا۔ اگر یہ کامیاب ہوگیا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ کوئی چار ارب سال نامیاتی دنیا میں پھرنے کے بعد اب اچانک حیات غیر نامیاتی دنیا میں پھوٹے گی، جو ہمارے وہم وگمان سے بھی ماورا کوئی صورت اختیار کرسکتی ہے۔ تمام اسکالر اس بات پر متفق نہیں ہیں کہ ذہن آج کے عددی کمپیوٹر کی مانند ہی کام کرتا ہے۔ اگر ایسا ہے تو پھر آج کے کمپیوٹر اس کی نقل نہیں کرسکیں گے۔ پھر بھی اسے آزمائے بغیر ہی ترک کردینا تو حماقت ہوگی۔ ۲۰۱۳ء میں اس پراجیکٹ کو یورپین یونین سے ایک ارب پونڈ کا عطیہ ملا۔

یکتائی

فی الوقت ان امکانات میں سے محض ایک کسر ہی پوری ہوئی ہے۔ پھر بھی ۲۰۱۴ء کی دنیا ایسی دنیا ہے جس میں ثقافت حیاتیات کی زنجیروں سے آزاد ہورہی ہے۔ ہماری یہ اہمیت کہ ہم نہ صرف اپنے اطراف کی دنیا بلکہ سب سے بڑھ کر اپنے اندر کی دنیا، اپنے اذہان واجسام کو تراش سکیں بہت تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ عمل کے زیادہ سے زیادہ دائرے اپنی سستی کو ترک کررہے ہیں۔ وکلا کو شناخت اور نجی معلومات کے مسائل پر دوبارہ غور کرنا ہے؛ حکومتوں کو صحت اور برابری کے معاملات کا دوبارہ سامنا ہے، کھیلوں اور تعلیمی اداروں کو جائز اور کامیابی کی تعریف دوبارہ متعین کرنی ہے، پنشن فنڈ اور محنت کشوں کی مارکیٹ کو ایک نئی دنیا سے معاملہ کرنا ہے، جس میں ساٹھ سال کی عمر اب شاید تیس ہو۔ ان سب کو حیاتیاتی انجینیرنگ، سائی بورگ اور غیر نامیاتی حیات کے معموں کو حل کرنا ہے۔

انسان کا پہلا جینیاتی نقشہ تیار کرنے میں پندرہ سال اور تین ارب ڈالر لگے تھے۔ آج آپ کسی بھی انسان کا ڈی این اے چند ہفتوں میں، چند سو ڈالر خرچ کرکے معلوم کرسکتے ہیں۔ اب انفرادی علاج، ایسا علاج جس میں ادویات مریض کے ڈی این اے سے مطابقت رکھتی ہوں کا وقت آگیا ہے۔ اب آپ کا ڈاکٹر خاصی قطعیت سے یہ بتاسکے گا کہ آپ کو جگر کے سرطان کا بہت خطرہ ہے، جب کہ آپ کو دل کے دورے کے بارے میں فکرمند ہونے کی زیادہ ضرورت نہیں۔ وہ یہ معلوم کرسکتا ہے کہ ایک مقبول دوا جو بانوے فیصد افراد پر اثر کرتی ہے، آپ کے لیے بے کار ہے۔ بلکہ آپ کو تو ایک اور دوا لینی چاہیے جو دوسروں کے لیے مہلک ہوتی ہے لیکن آپ کے لیے موافق ہے۔ بالکل درست ادویات کا راستہ ہمارے سامنے موجود ہے۔

لیکن طبی معلومات میں اضافے نے اخلاقی معمے پیدا کیے ہیں۔ ماہرین اخلاقیات اور قانون ابھی سے ڈی این اے سے متعلقہ نجی علم کے مشکل سوال سے دوچار ہیں۔ کیا بیمہ کمپنی کو یہ اختیار ہونا چاہیے کہ وہ ہمارے ڈی این کا نمونہ طلب کرے۔ اور اگر اس سے لاپرواہی کا جینیاتی عندیہ ملے تو وہ پریمیم بڑھادیں؟ کیا ممکنہ آجروں کے

پاس اپنے تجربات کی فہرست کے بجائے ڈی این اے کی نقل بھیجنے کی ضرورت پڑے گی؟ کیا کوئی آجر کسی امیدوار کو اس لیے ترجیح دے سکتا ہے کہ اس کا ڈی این اے بہتر لگتا ہے؟ کیا ہم ایسے واقعات میں جینیاتی تعصب کی بنا پر قانونی چارہ جوئی کر سکتے ہیں؟ کیا کوئی کمپنی جو ایک نیا وجود یا نیا عضو تیار کرے وہ اس ڈی این اے کی ترتیب کا ٹریڈ مارک حاصل کر سکتی ہے؟ یہ تو ظاہر ہے کہ کوئی شخص ایک مرغی کی ملکیت رکھ سکتا ہے لیکن کیا کوئی تمام آبادی پر حق جتا سکتا ہے؟

یہ معمے بھی ان اخلاقی، سماجی اور سیاسی اثرات کے سامنے طفل مکتب ہیں جو ہمارے گلگمش پراجیکٹ اور نئے مافوق البشر پیدا کرنے کی اہلیت سے پیدا ہوتے ہیں۔ انسانی حقوق کا عالمی اعلان، دنیا بھر میں علاج کی حکومتی سہولتیں، قومی صحت کا بیمہ اور دنیا بھر میں قومی آئین اس بات کا اعادہ کرتے ہیں کہ کسی انسانی معاشرے کو اپنے تمام اراکین کو اچھا علاج فراہم کر کے انہیں اچھی صحت دینی چاہیے۔ یہ سب اس وقت تک اچھا اور درست تھا جب تک کہ طب کا بنیادی کام بیماری سے بچاؤ اور بیمار کا علاج تھا۔ لیکن جب طب انسانی اہلیت میں اضافے میں مصروف ہو جائے گی تب کیا ہوگا؟ کیا تمام انسان اس اہلیت میں اضافے کے حقدار ہوں گے یا کوئی نئی مافوق البشر اشرافیہ جنم لے گی؟۔

ہماری نئی جدید دنیا اس بات پر فخر کرتی ہے کہ تاریخ میں پہلی بار تمام انسانوں کو برابری دی گئی ہے۔ لیکن اب یہ شاید سب سے زیادہ ناہموار معاشرے کے دہانے پر کھڑی ہے۔ تمام تاریخ میں طبقہ بالا نے زیادہ ذہین، توانا اور عموماً نچلے طبقے سے بہتر ہونے کا دعویٰ کیا ہے۔ عموماً یہ اپنے آپ کو دھوکہ دے رہے ہوتے تھے۔ کسی غریب کسان کے گھر میں پیدا ہونے والا بچہ بھی اتنا ہی ذہین ہوتا ہے جتنا کسی ولی عہد کے گھر میں۔ اب نئی طبی اہلیت کی بنا پر طبقہ اعلیٰ کے یہ دعوے شاید حقیقت بن جائیں۔

یہ سائنس فکشن نہیں ہے۔ زیادہ تر سائنس فکشن کی کہانیوں میں ایک ایسی دنیا دکھائی جاتی ہے جہاں سیپین یعنی ہم سے مشابہ بہتر ٹیکنالوجی کے حامل ہوں، مثلاً روشنی سے تیز رفتار خلائی جہاز اور لیزر گن۔ ان کہانیوں کے اخلاقی اور سیاسی مسائل خود ہماری دنیا سے لیے گئے ہیں، اور وہ مستقبل کے منظر نامے میں ممکنہ جذباتی اور سماجی تناؤ کا بیان ہیں۔ لیکن مستقبل کی ٹیکنالوجی کا اصل بیان تو یہ ہے کہ خود ہوموسیپین ہی بدل جائے، صرف ہمارے جہاز اور ہتھیار ہی نہیں بلکہ ہمارے جذبے اور خواہشات بھی۔ کسی نوجوان سائی بورگ کے سامنے خلائی جہاز کیا چیز ہے جو نہ جنسی عمل کرتا ہے اور نہ افزائش، جو دوسروں سے براہ راست فکری تبادلہ کر سکتا ہے، جس کی سوچ اور یادداشت ہماری اہلیت سے ہزاروں گنا بہتر ہے، جو کبھی اداس نہیں ہوتا، غصے میں نہیں آتا، لیکن جس کے جذبات و خواہشات ہم سوچ بھی نہیں سکتے؟

سائنس فکشن ایسے مستقبل کا شاذ و نادر ہی تذکرہ کرتا ہے کیوں کہ کوئی درست تعریف و تفصیل ناقابل فہم ہے۔ کسی سپر سائی بورگ کی زندگی کے بارے میں فلم بنانا ایسا ہی ہے جیسے نینڈرتھال تماشائیوں کے لیے ہیملٹ۔ یقیناً دنیا کے مستقبل کے آقا ہم سے اس سے زیادہ مختلف ہوں گے جتنے ہم نینڈرتھل سے ہیں۔ یعنی ہم اور نینڈرتال کم از کم انسان تو تھے، ہمارے وارث تو خدا جیسے ہوں گے۔

طبیعات دان بگ بینگ کو ایک اکلوتا واقعہ بتاتے ہیں۔ یہ وہ نکتہ ہے جس سے پہلے قدرت کے تمام معلوم قوانین موجود نہیں تھے۔ وقت بھی وجود نہیں رکھتا تھا۔ لہذا یہ کہنا بیکار ہے کہ بگ بینگ سے پہلے کچھ بھی وجود رکھتا تھا۔ ہم شاید تیزی سے ایک نئی یکتائی کی جانب بڑھ رہے ہیں۔ جب وہ تمام نظریے جو اس دنیا کو بیان کرتے ہیں۔۔ میں، آپ، مرد، عورت، محبت، نفرت۔۔ یہ سب غیر متعلق ہو جائیں گے۔ اس مقام کے بعد ہونے

والی ہر شے ہمارے لیے بے معنی ہوگی۔

فرینکنسٹائن کی پیشن گوئی

۱۸۱۸ میں میری شیلے نے ایک کہانی شائع کی، فرینکنسٹائن۔ایک سائنس دان کی کہانی جو کسی، فوق البشر کی تخلیق کے دوران ایک عفریت کو جنم دیتا ہے۔گزشتہ دو صدیوں میں یہ کہانی کئی بار مختلف روپ میں سنائی گئی ہے۔ یہ ہماری نئی سائنسی کہانی گوئی کا مرکزی جزو بن گئی ہے۔ایک سرسری نظر میں فرینکنسٹائن کی کہانی ہمیں خبردار کرنے کی کوشش کرتی ہے کہ اگر ہم نے خدائی کردار اپنانے کی کوشش میں زندگی میں ردوبدل کی تو ہمیں سخت سزا مل سکتی ہے۔ لیکن اس کہانی کے ایک گہرے معنی بھی ہیں۔

فرینکنسٹائن کی کہانی ہوموسیپین کے سامنے یہ حقیقت دہراتی ہے کہ اختتام تیزی سے قریب آرہا ہے۔کہانی کے مطابق اگر کوئی ماحولیاتی یا جوہری تباہی نہ ہوئی تو تکنیکی ترقی کی رفتار ہمیں بہت جلد ہوموسیپین کو کسی اور وجود میں بدل دیں گے، جن کی نہ صرف جسمانی ساخت بلکہ اہلیت اور جذباتی دنیا بھی بہت مختلف ہوگی۔اس بات سے بیشتر سیپین پریشان ہوجاتے ہیں۔ہم یہ یقین کرنا چاہتے ہیں کہ مستقبل میں ہم ہی جیسے لوگ تیز رفتار خلائی جہاز میں ایک سیارے سے کسی دوسرے کی جانب سفر کریں گے۔ہم یہ تصور نہیں کرنا چاہتے کہ مستقبل میں ہماری طرح جذبات اور شناخت رکھنے والے افراد وجود نہیں رکھتے ہوں گے، اور ہماری جگہ اجنبی حیات وجود رکھے گی جو ہماری اہلیت کو بہت پستہ ثابت کردے گی۔

ہم اس تصور میں سکون پاتے ہیں کہ ڈاکٹر فرینکنسٹائن صرف عفریت ہی تخلیق کر سکتا ہے، جسے ہم دنیا کو بچانے کے لیے تباہ کر سکتے ہیں۔ہم یہ کہانی اس انداز سے اس لیے استعمال کرنا چاہتا ہیں کہ اس سے یہ تاثر ملتا ہے کہ ہم ہی سب سے بہتر وجود رکھتے ہیں۔اور ہم سے بہتر نہ کوئی پہلے تھا اور نہ کوئی بعد میں ہوگا۔ہم سے بہتر وجود کی کوئی کوشش لازماً ناکام ہوگی کیوں کہ اگر آپ انسانی جسم کو بہتر کر بھی لیں تب بھی انسانی جذبے کو نہیں چھو سکتے۔

ہمیں یہ تسلیم کرنے میں بہت وقت ہوگی کہ سائنس دان نہ صرف جسم بلکہ جذبہ بھی سنوار سکتے ہیں، اور مستقبل کے ڈاکٹر فر[illegible]ئن یقیناً ہم سے بہت بہتر وجود تخلیق کریں گے۔ایسا وجود جو ہماری جانب اسی حقارت سے دیکھے گا جیسے ہم نینڈر تھال کو دیکھتے ہیں۔

ہم یہ یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ کیا آج کے فرینکنسٹائن اس پیشن گوئی کو پورا کریں گے۔مستقبل نامعلوم ہے اور یہ حیرت انگیز ہوگا اگر گزشتہ چند صفحات کی تمام پیشن گوئیاں پوری ہوجائیں۔تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ جو بات ہمیں بس نکڑ پر ہی لگتی ہے اس کی راہ میں اکثر ناقابل عبور رکاوٹیں کھڑی ہوجاتی ہیں، وہ کبھی وجود میں نہیں آتی۔اس کی جگہ ایسے حقائق ہم سے آملتے ہیں جو ہم نے سوچے بھی نہیں تھے۔جب سن ۱۹۴۰ میں جوہری دنیا وجود میں آئی تو ۲۰۰۰ کے مستقبل کی جوہری دنیا کے بارے میں بہت کچھ کہا گیا تھا۔جب اسپٹنک اور اپولو گیارہ نے دنیا کے تصور کو فروزاں رکھا تھا تو ہر شخص یہ پیشن گوئی کررہا تھا کہ اختتام صدی تک افراد مریخ اور پلوٹو پر قائم خلائی آبادیوں میں رہ رہے ہوں گے۔ان میں سے کچھ ہی پیشن گوئیاں درست ثابت ہوئیں۔جب کہ دوسری جانب کسی نے انٹرنیٹ کے بارے میں سوچا بھی نہیں تھا۔

تو آپ ابھی سے جا کر ذمہ داری کی بیمہ پالیسی مت خریدیے کہ کہیں عددی وجود آپ کے خلاف مقدمہ نہ کردیں۔اوپر بیان کیے گئے تصورات یا بھیانک خواب صرف آپ کی فکر کو برانگیختہ کرنے کے لیے بیان کیے گئے

ہیں۔ ہمیں اس بات پر سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے کہ تاریخ کے اگلے موڑ پر نہ صرف تکنیکی اور انتظامی تبدیلیاں ملیں گی، بلکہ انسانی شعور اور شناخت میں بھی بہت بنیادی تبدیلیاں ہوں گی۔ اور یہ تبدیلیاں اتنی بنیادی ہوں گی کہ ان سے لفظ 'انسان' پر ہی سوال اٹھایا جائے گا۔ ہمارے پاس کتنا وقت ہے؟ کوئی نہیں جانتا جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے کچھ تو کہتے ہیں کہ ۲۰۵۰ء سے چند انسان لافانی ہو جائیں گے۔ ذرا کم انتہا پسند پیش گوئیاں آئندہ صدی یا آئندہ ہزار سال کی بات کرتی ہیں، لیکن پھر بھی ستر ہزار برس کی سیپین کی تاریخ میں چند ہزار سال کیا معنی رکھتے ہیں؟

اگر سیپین کی تاریخ پر واقعی پردہ گرنے والا ہے، تو ہمیں یعنی اس کی آخری نسلوں کے افراد کو کچھ وقت اس آخری سوال کا جواب ڈھونڈنے میں خرچ کرنا چاہیے کہ: ہم کیا بننا چاہتے ہیں؟ یہ سوال جسے اکثر انسان میں اضافت کا سوال کہا جاتا ہے اس بحث کو بہت چھوٹا کر دیتا ہے جو فی الوقت سیاست دانوں، فلسفیوں، مفکروں اور عام آدمی میں چھڑی ہوئی ہے۔ آخر کار موجودہ مذاہب، نظریات، قوموں اور طبقات پر بحث تو ہوموسیپین کے ساتھ ہی مٹ جائے گی۔ اگر ہمارے وارث واقعی ایک مختلف شعوری سطح پر کام کریں گے (یا شاید شعور سے ماورا کوئی شے جس کے بارے میں ہم سوچنے سے بھی قاصر ہیں) تو لگتا نہیں کہ انہیں اسلام یا عیسائیت سے کوئی دلچسپی ہوگی۔ یا ان کا سماجی نظام کیمونسٹ یا سرمایہ دارانہ ہوگا، یا ان کی صنف نر و مادہ ہوگی۔

پھر بھی اہم تاریخی مباحث ضروری ہیں کیوں کہ کم از کم ان خداؤں کی پہلی نسل تو ان کے انسانی صورت گروں کے ثقافتی خیالات پر منحصر ہوگی۔ کیا وہ سرمایہ داری کے عکس میں تراشے جائیں گے؟ اسلام کے، یا حقوق نسواں کے؟ اس سوال کا جواب ممکن ہے کہ انہیں بہت مختلف سمت میں بھیج دے۔

زیادہ تر افراد اس بارے میں سوچنا بھی نہیں چاہتے۔ حیاتیاتی اخلاقیات کا میدان بھی دوسرے سوالات پر گفتگو زیادہ آسان سمجھتا ہے کہ اس کے لیے کونسا عمل ممنوع ہے؟ کیا زندہ انسانوں پر جینیاتی تجربات کرنا جائز ہے؟ یا حمل ضائع ہوئے بچوں پر؟ یا اسٹیم خلیوں پر؟ کیا دنبے کی نقل تیار کرنا اخلاقی طور پر درست ہے؟ اور چمپنزی کی نقل؟ تو انسان کے بارے میں کیا خیال ہے؟ یہ سب اہم سوالات ہیں، لیکن یہ سوچنا بیوقوفی ہوگی کہ ہم اچانک بریک لگا کر وہ سائنسی پراجیکٹ بند کر سکتے ہیں جس سے ہوموسیپین ایک مختلف وجود میں ڈھل رہے ہیں۔ کیوں کہ یہ پراجیکٹ اندرونی طور پر گلگمش پراجیکٹ سے پیوست ہو گئے ہیں۔ سائنس دانوں سے دریافت کیجیے کہ وہ جینیاتی نقشے کا مطالعہ کیوں کرنا چاہتے ہیں، یا کسی دماغ کو کسی کمپیوٹر سے منسلک کرنا یا کسی کمپیوٹر کے اندر ذہن کا عکس اتارنا کیوں چاہتے ہیں؟ دس میں سے نو بار آپ کو وہی جواب ملے گا کہ وہ یہ سب بیماری کے علاج اور انسانی زندگی بچانے کے لیے کر رہے ہیں۔ جب کہ کمپیوٹر میں انسانی دماغ کا عکس بنانے کے اثرات کسی نفسیاتی علاج سے بہت زیادہ ڈرامائی ہیں۔ یہی عمومی جواب ملتا ہے کیوں کہ اس پر کوئی تردد نہیں کر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ گلگمش کا پراجیکٹ سائنس کا ہراول دستہ ہے۔ یوں سائنس دان جو بھی کر رہے ہوں اس سے انہیں جواز مل جاتا ہے۔ ڈاکٹر فرینکسٹائن گلگمش کی آڑ میں کام نکال لیتا ہے، کیوں کہ گلگمش کو روکنا دشوار ہے لہذا ڈاکٹر فرینکسٹائن کو بھی۔

ہم محض اس سمت پر اثر انداز ہو سکتے ہیں جس میں سائنس دان سفر کر رہے ہیں۔ لیکن کیوں کہ جلد ہی ہم اپنی خواہشات کو بھی تراشنے کے قابل ہو جائیں گے، تو اصل سوال یہ نہیں کہ ہم کیا بننا چاہتے ہیں، بلکہ یہ کہ ہم کیا چاہنے کی خواہش کرتے ہیں۔ جو اس سوال سے زیادہ خوف زدہ نہیں ہوتے انہوں نے غالباً اس پر زیادہ غور و فکر نہیں کیا۔

پس نوشت

جانور جو خدا بن گئے

ستر ہزار سال پہلے ہوموسیپین ایک غیر اہم حیوان تھا، جو افریقہ کے ایک کونے میں اپنے کام سے کام رکھے ہوئے تھا۔ آنے والے ہزاروں سالوں میں وہ سارے سیارے کا حاکم، اور ماحولیات کے لیے خطرہ بن گیا۔ آج وہ خدا بننے کے لیے تیار ہے۔ نہ صرف لافانی جوانی کے حصول بلکہ تخلیق وتباہی کی الٰہی صلاحیتوں پر آمادہ۔

بدقسمتی سے سیپین کی حاکمیت نے تاحال زمین پر کچھ ایسا نہیں چھوڑا جس پر ہم فخر کر سکیں۔ ہم نے اپنے ماحول کو فتح کر لیا ہے، اپنی غذائی پیداوار بڑھالی ہے، شہر تعمیر کیے ہیں، سلطنتیں بنائیں اور دور دراز تک تجارتی نظام قائم کیے، لیکن کیا ان مہمات نے دنیا میں تکالیف کم کر دیں؟ ہر مرتبہ انسانی قوت میں بے تحاشہ اضافے کے باوجود انفرادی سیپین کی فلاح میں بہتری نہیں آئی، بلکہ اکثر اس سے دونوں جانوروں کو بہت تکلیف اٹھانی پڑی۔

جہاں تک انسانی حالت کا تعلق ہے گزشتہ چند دہائیوں میں آخر کار ہم نے کچھ قرار واقعی ترقی کی ہے: قحط، طاعون اور جنگ میں کمی واقع ہوئی ہے۔ لیکن دوسرے جانوروں کی زندگی بہت تیزی سے پہلے سے زیادہ ابتر ہو رہی ہے، اور نوع انساں میں بہتری ابھی اتنی تازہ اور نازک ہے کہ اس بارے میں یقین سے رائے قائم نہیں کی جا سکتی۔

مزید یہ کہ انسانی اہلیت میں حیرت انگیز کارکردگی کے باوجود، ہم اپنے مقاصد کے بارے میں غیر یقینی اور پہلے سے زیادہ بے اطمینانی کا شکار ہیں۔ ہم نے کشتی کھینے سے بحری جہاز اور بھاپ کے انجن سے خلائی جہاز تک ترقی کر لی، لیکن یہ کوئی نہیں جانتا کہ ہماری منزل کیا ہے۔ ہم پہلے سے بہت زیادہ طاقت ور ہیں لیکن یہ نہیں جانتے کہ اس طاقت کو کیسے استعمال کریں۔ اس سے زیادہ برا یہ ہوا کہ انسان پہلے سے کہیں زیادہ غیر ذمہ دار ہو گئے۔ خود ساختہ خدا، جن کے ہم پلہ صرف قوانین فطرت ہیں، ہم کسی کو جواب دہ نہیں ہیں۔ لہذا نتیجے میں محض اپنے ذاتی آرام اور تفریح کی خاطر، ہم اپنے ہم عصر جانوروں اور اطراف کے ماحول کو اجاڑ رہے ہیں، لیکن پھر بھی سکون نہیں پا رہے۔

کیا غیر مطمئن اور لاپرواہ خداؤں سے زیادہ کوئی خطرناک وجود ہو سکتا ہے، جسے یہ بھی معلوم نہ ہو کہ وہ چاہتا کیا ہے؟

○

PDF By:-

ہنگامہ ادب، عشقانِ بہاراں

علی — RAAM

حیدر — Prometheus

Waseem — نزہت

Dani — گل کامش

ارسلان — Noora

مصنف کی دیگر تصانیف:

افسانوں کے مجموعے:

☆ نامہ بر

☆ دوسرا رُخ

☆ ٹک ٹک دیدم

☆ ڈھائی خانے کی چال

ناول:

☆ گرداب

☆ بارش سے پہلے

شعری مجموعہ:

☆ دامِ خیال

انگریزی سے تراجم:

☆ منگل والے لوگ (ناول)

☆ سکوت (عالمی ادب سے افسانوں کا انتخاب)

☆ یادِ مفارقت (ناول)

☆ جینیات کی ان کہی تاریخ (نان فکشن)

☆ فریب نظر (عالمی ادب سے انتخاب)

☆ اسٹونر (ناول)

اُردو سے انگریزی ترجمہ:

☆ In Search Of Butterflies (منتخب ہم عصر اُردو افسانے)